وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ
تسہیل البیان
فی
تفسیر القرآن
تالیف
محمد اسلم شیخوپوری
www.toobaaelibrary.com
مکتبہ حلیمیہ
سائٹ کراچی

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ
تسہیلُ البیانُ
فی
تفسیرِ القرآن
جلد نمبر ۳
تالیف
محمد اسلم شیخوپوری
ناشر
مکتبہ حلیمیہ
سائٹ، کراچی

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

تسہیل البیان فی تفسیر القرآن

جلد نمبر ۳

تالیف

محمد اسلم شیخوپوری

ناشر

مکتبہ حلیمیہ

سائٹ، کراچی

موضوع.................. تفسیر القرآن
نام.................. تسہیل البیان فی تفسیر القرآن
تالیف.................. مولانا محمد اسلم شیخوپوری
مقام تالیف.................. جامع مسجد توابین، گلشن معمار کراچی
کمپوزر.................. منور علی مبارک
صفحات.................. ۵۷۵
سائز.................. ۲۳ x ۲۹
تعداد.................. ۱۰۰۰
ناشر.................. مکتبہ حلیمیہ سائٹ کراچی ۷۵۷۰۰

☆.................. اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
☆.................. نعمانی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
☆.................. دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
☆.................. مکتبہ سید احمد شہید، الکریم مارکیٹ لاہور
☆.................. مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللّٰھم اجعل القرآن
ربیع قلبی ونور بصری
وجلاء ھمّی وذھاب حزنی

اے اللہ! قرآنِ کریم کو میرے دل کی بہار،
آنکھوں کا نور اور غموں اور پریشانیوں کا علاج بنادے۔

تیسری جلد ایک نظر میں

فہرست مضامین

سُورَةُ الاَعْرَافِ
مَكِّيَّةٌ

سورۂ الاعراف کے اہم مضامین

یہ مکی سورت ہے اور اس میں دو سو چھ آیات ہیں، دوسری مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی تینوں بنیادی عقائد کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ اس سورت کی ابتداء میں حضور اکرم ﷺ کے دائمی معجزہ یعنی قرآن کا ذکر ہے جو کہ سارے انسانوں کے لیے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے، اس سورت میں انسان کو اللہ کی اس نعمت کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ اس نے سب انسانوں کو ایک ہی باپ سے پیدا کیا ہے تا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ وہ انسانیت میں بھائی بھائی ہیں۔ اسی طرح اس سورت میں انسان کو اللہ نے جو تکریم بخشی اس کا بھی ذکر ہے، وہ یہ کہ اللہ نے پہلے انسان کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، اس میں اپنی روح پھونکی اور فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اس قصہ کے ضمن میں شیطان کے مکروفریب سے بچنے کی بھی تلقین کی گئی ہے کیونکہ وہ ایسا مکار دشمن ہے جو انسان کی راہ کھوٹی کرنے کے لیے ہر راستے پر بیٹھا ہوا ہے اور انسان کے ساتھ ٹکراؤ کی جو ابتداء ابلیس کے انکارِ سجدہ سے ہوئی تھی اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان کشمکش کسی نہ کسی انداز میں باقی رہے گی۔

سورۂ اعراف کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے مسلسل چار بار انسانوں کو ''یا بنی آدم'' کے صیغہ سے خطاب فرمایا ہے، یہ چار ندائیں سورۂ اعراف کے علاوہ کسی اور سورت میں نہیں ہیں۔

پہلی ندا دسویں رکوع میں ہے، جس میں اللہ نے لباس کی نعمت کا ذکر کیا ہے، فرمایا گیا ''اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا ہے جو تمہارے ستر کو بھی چھپاتا ہے اور زینت کا بھی باعث ہے اور تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے''

دوسری ندا دسویں رکوع کی آیت نمبر ۲۷ میں ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے فتنہ سے بچنے کی تلقین کی ہے، فرمایا: ''اے اولادِ آدم! کہیں شیطان تم کو بہکا نہ دے جیسے اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا اور ان کے لباس اتروا دیے تا کہ انہیں ان کا ستر دکھادے''

تیسری ندا دسویں رکوع کی آیت نمبر ۳۱ میں ہے جس میں فرمایا گیا: ''اے اولادِ آدم! اپنی زینت کا (لباس) لے لو ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو، بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''

چوتھی ندا گیارہویں رکوع کی آیت نمبر ۳۵ میں ہے جس میں فرمایا گیا: ''اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس تمہی

میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیات سنائیں تو جو تقوی اختیار کر لیں گے اور اپنی اصلاح کر لیں گے تو ایسوں پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''

اولادِ آدم کو یہ بار بار خطاب انہیں شیطان کے وساوس اور مکاریوں سے بچانے کے لیے ہے تاکہ انسان اس ملمع سازی کی باتیں سن کر دھوکہ نہ کھا جائے کیونکہ وہ ایسا چالاک دشمن ہے جو بظاہر دوست کا لباس پہن کر آتا ہے اور ایسی مکار لومڑی ہے جو اپنے آپ کو خیر خواہ کے روپ میں پیش کرتی ہے، اسے حق کو باطل اور باطل کو حق، شر کو خیر اور خیر کو شر بنا کر پیش کرنے کا فن آتا ہے، دنیا میں جو لوگ بھی یہ کام کر رہے ہیں وہ حقیقت میں شیطان کے ایجنٹ ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پہلی تین ندائیں لباس کے بارے میں ہیں، ان میں سے دوسری ندا میں یہ بتایا گیا کہ ابلیس لعین نے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کے لباس اتروا دیے تھے اور ان کے ستر کھلوا دیے تھے، گویا ابلیس کا ایک بڑا ہدف یہ ہے کہ اولادِ آدم کو شرم وحیا کے لباس سے محروم کر دے اور انہیں فحاشی اور عریانیت کی راہ پر لگا دے۔ ستر کے تقاضے پورے کرنے والا لباس، انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے، حیوان ننگا پیدا ہوتا ہے اور زندگی بھر ننگا ہی رہتا ہے جبکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے لباس کے ساتھ عزت اور فضیلت بخشی ہے۔

آج جب ہم مغربی میڈیا کے ذریعہ بے حیائی کے امڈتے ہوئے سیلاب اور عورت کی آزادی کے نام پر حیا باختگی کی فضاء دیکھتے ہیں تو پھر یہ بات سمجھ آجاتی ہے کہ قرآن نے لباس کے بارے میں تاکید اور تکرار کا اسلوب کیوں اختیار کیا ہے، ان نداؤں کے علاوہ سورۂ اعراف کے اہم مضامین درج ذیل ہیں:

(۱) مشرکین بیت اللہ کا ننگے طواف کرتے تھے اور اپنے اس قبیح عمل اور اس جیسے دوسرے اعمال کے بارے میں حجت یہ پیش کرتے تھے کہ ہمارے آباء واجداد بھی یوں ہی کیا کرتے تھے اور بعض اوقات یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے، ان کے اس دعوی کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''اللہ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیتا'' لہٰذا تمہارا یہ دعوی جھوٹ اور افتراء کے سوا کچھ نہیں، اسلام زندگی کے تمام جائز مطالبات پورے کرنے والا دین ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ لباس پہننے سے اور پاکیزہ چیزوں کے استعمال سے منع کرے، اس سے ان لوگوں کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو رہبانیت کے قائل ہیں اور حلال اور پاک چیزوں سے اجتناب کو اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جسم اور روح، دین اور دنیا دونوں کے جائز مطالبات اور تقاضے پورے کرنے والا ہی حقیقت میں کامل مسلمان ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب پتہ چلا کہ حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ دن کو مستقل

روزے رکھتے ہیں اور رات کو قیام کرتے ہیں، عبادت میں یہ مشغولیت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اہلیہ تک کے حقوق ادا نہیں کرتے تو آپ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''تمہارے اوپر تمہارے ربّ کا بھی حق ہے، تمہارے نفس کا بھی حق ہے، تمہارے گھر والوں کا بھی حق ہے، لہٰذا ہر حق والے کو اس کا حق دو'' حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی اس نصیحت کا ذکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تو آپ نے فرمایا ''سلمان نے سچ کہا ہے۔''

(۲) آٹھویں پارہ کے گیارہویں اور بارہویں رکوع میں ایسے دو گروہوں کا ذکر ہے جو فکر و نظر اور عقیدہ و عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں، ایک گروہ ضد اور عناد، کفر اور استکبار کی راہ اپنانے والوں کا ہے جن کا ٹھکانہ جہنم کے سوا کچھ نہیں، دوسرا گروہ تسلیم و انقیاد اور ایمان اور اطاعت کی راہ پر چلنے والوں کا ہے جو بفضلہٖ تعالیٰ جنت کے حقدار ہوں گے، یہ دونوں گروہ جب اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے تو قرآن بتاتا ہے کہ ان کے درمیان مکالمہ ہوگا، اہلِ جنت دوزخیوں سے سوال کریں گے کہ کیا تمہیں آج اللہ کے وعدوں کے سچ ہونے کا یقین آیا یا نہیں؟ وہ جواب میں اقرار کریں گے کہ ہاں ہم نے اللہ کے وعدوں کو سچا اور برحق پایا۔

دوزخی جب جہنم کی ہولناک گرمی اور بھوک پیاس سے پریشان ہوجائیں گے تو جنتیوں کے سامنے دستِ سوال دراز کریں گے کہ ہمیں کچھ کھانے اور پینے کو دو لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ سوال رائیگاں جائے گا، یہ مکالمہ اس پارہ کے بارہویں اور تیرہویں رکوع میں مذکور ہے۔

ایک تیسرا گروہ بھی ہے جسے قرآن نے ''اصحابِ اعراف'' کا نام دیا ہے، یہ وہ لوگ ہوں گے جو مؤمن تھے لیکن اعمالِ صالحہ میں دوسرے جنتیوں سے پیچھے رہ گئے تھے، انہیں نہ تو جنت میں داخل کیا جائے گا اور نہ ہی دوزخ میں بلکہ ان کا فیصلہ مؤخر کردیا جائے گا، لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ ان کو بھی جنت میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرمادیں گے، ان اصحابِ اعراف اور دوزخیوں کے درمیان بھی مکالمہ ہوگا جو کہ تیرہویں رکوع میں مذکور ہے۔ ان مکالمات کے بعد اللہ کی قدرت اور توحید کے تین اہم دلائل بیان کیے گئے ہیں:

(۱) تہہ بہ تہہ سات آسمان جن میں سے ہر ایک دوسرے کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے قبہ ہوتا ہے یہ ساتوں آسمان وسعت اور عظمت کے باوجود کسی ستون کے بغیر کھڑے ہیں۔

(۲) رحمٰن کا عرش جس کی وسعت کا یہ حال ہے کہ سارے آسمان اور ساری زمینیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتے اور کسی

کا خیال اس کی عظمت کا تصور نہیں کر سکتا کیونکہ عرش کے مقابلے میں کرسی ایسی ہے جیسے کوئی حلقہ جو کہ وسیع و عریض صحراء میں پڑا ہو، کرسی کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ وہ ارض و سما میں نہیں سما سکتی تو عرش کی وسعت کیا ہوگی، عرش اور کرسی ان حقیقتوں میں سے ہیں جن پر ہم ایمان تو رکھتے ہیں مگر ان کی کیفیت ہم نہیں جانتے۔

(۳) تیسری دلیل جو یہاں بیان کی گئی ہے وہ سورج چاند اور ستاروں کی تخلیق ہے یہ سب چیزیں اللہ کی مشیت اور غلبہ کے تحت ہیں، ایسی فضا میں تیر رہے ہیں، جس کی وسعتوں کا کسی کو بھی اندازہ نہیں، نہ تو یہ آپس میں ٹکراتے ہیں اور نہ ہی اپنے مدار سے باہر نکلتے ہیں۔

یہ دلائل اور آخر میں چھ انبیاء کرام یعنی حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کے قصے اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے پہلا قصہ شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام کا ہے اور آخری قصہ حضرت شعیب علیہ السلام کا ہے، ان قصوں میں جو مختلف حکمتیں اور عبرتیں پوشیدہ ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱......رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی ایذاؤں پر تسلی دینا۔

۲......متکبروں کا انجامِ بد اور نیکوکاروں کا اچھا انجام بتانا۔

۳......اس بات پر تنبیہ کرنا کہ اللہ کے ہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں، بالآخر ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا مل کر رہتی ہے۔

۴......ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سچائی کی دلیل پیش کرنا کہ اُمّی ہونے کے باوجود آپ تاریخ کے گمشدہ اوراق، حقائق کے مطابق پیش فرماتے تھے۔

۵......انسانوں کے لیے عبرت و نصیحت کا سامان پیش کرنا۔

قرآنِ کریم کی اتّباع

﴿۱......۳﴾

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

الٓمّٓصٓ ﴿١﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى

یہ کتاب اتری ہے تجھ پر سو چاہیے کہ تیرا جی تنگ نہ ہو اس کے پہنچانے سے، تا کہ تو ڈرائے اس سے اور نصیحت ہو ایمان

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢﴾ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ

والوں کو۔ چلو اسی پر جو اترا تم پر تمہارے رب کی طرف سے اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے

قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٣﴾

تم بہت کم دھیان کرتے ہو۔

تسہیل: الٓمّٓصٓ ○ یہ کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے، اس کی تبلیغ کے حوالے سے آپ کے دل میں کوئی گھٹن نہیں ہونی چاہیے، اسے نازل کیے جانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس کے ذریعے لوگوں کو خبردار کریں اور یہ نصیحت ہے ایمان والوں کے لیے ○ اے لوگو! اتباع کرو اس کی جو تمہاری طرف تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ دوسرے سرپرستوں کی اتباع نہ کرو، تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱﴾...... **الٓمّٓصٓ:** حروفِ مقطعات میں سے ہیں، قرآنِ کریم کی تقریباً اٹھائیس (۲۸) سورتوں کا آغاز انہی حروف سے ہوا ہے اور حسنِ اتفاق یہ ہے کہ تین سورتوں کے علاوہ ہر وہ سورت جس کا آغاز ان حروف سے ہوا ہے وہاں قرآن کا ذکر آیا ہے اسی لیے علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ حروف، قرآنِ کریم کی صداقت میں شک کرنے والوں کو چیلنج دینے کے لیے لائے گئے ہیں کہ اگر تم قرآن کو انسانی کاوش سمجھتے ہو تو پھر تم اس جیسا کلام بنا کر لے آؤ، اس لیے کہ قرآن کے الفاظ اور آیات انہی حروفِ ابجد سے مرکّب ہیں جن حروف کو تم روزمرّہ کی زبان میں استعمال کرتے ہو۔

﴿۲﴾......اے ہمارے رسول! قرآن جیسی عظیم کتاب آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اسے انسانوں تک پہنچانے کے حوالے سے آپ کے دل میں گھٹن اور پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔

ایک تو کلام اتنا عظیم تھا کہ اگر اسے کسی پہاڑ پر نازل کر دیا جاتا تو وہ بھی اللہ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتا، خود آقا ﷺ کا یہ حال تھا کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو سخت سردی میں بھی جبین مبارک عرق آلود ہو جاتی، دوسرا پہلو یہ تھا کہ آپ کو جن وانس کی ہدایت، پورے عالم کی اصلاح اور راز حد بگڑے ہوئے ماحول کی درستگی کے لیے بھیجا گیا تھا، پتھر کو تراش کر مورت بنانا آسان ہے مگر فساد زدہ انسان کے ظاہر اور باطن کو بنا سنوار کر اس کی حقیقی صورت برآمد کرنا مشکل ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ وہ انسان، انسان بننا چاہتا ہی نہ ہو، طرفہ تماشا یہ کہ وہ اپنے فساد کو صلاح اور بگاڑ کو سنوار سمجھ رہا ہو۔

گھٹن اور پریشانی:

نبی کریم ﷺ کے مخاطب اسی قسم کے لوگ تھے، فساد ہمہ گیر بھی تھا اور ہمہ جہت بھی، سب بیمار تھے مگر کسی کو اپنی بیماری کا احساس نہ تھا، معالج کو اپنا دشمن سمجھتے تھے، کونسی نظریاتی، عملی اور اخلاقی خرابی تھی جو ان کے اندر نہیں تھی، آپ جب ان خرابیوں کی نشاندہی فرماتے تو وہ اعراض، نفرت، جدال اور تکبّر پر مبنی رویّہ اختیار کرتے، ان کا یہ رویّہ ہی سبب تھا دل میں گھٹن اور پریشانی پیدا ہونے کا۔

اس تنگی اور حزن وملال کا قرآن کریم میں کئی جگہ ذکر آیا ہے، سورۂ حجر میں ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ {۱}

ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس سے آپ کے دل میں گھٹن پیدا ہوتی ہے۔

سورۂ حجر سے اگلی سورت، سورۂ نحل میں ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ {۲}

آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے، ان کے رویّے سے آپ غمگین نہ ہوں اور نہ ہی ان کی سازشوں سے تنگی محسوس کریں۔

یہی آیت سورۂ نمل میں بھی آئی ہے۔

اس گھٹن اور قلبی رنج والم کو وہ والدین محسوس کر سکتے ہیں جو اپنی اولاد کے دین اور دنیا کا بھلا چاہتے ہوں، مگر خودسر اور بغاوت پر آمادہ اولاد نہ صرف والدین کی خلوص اور محبت پر مبنی درخواست ٹھکرا دے بلکہ انہیں گالی گلوچ کرنے

{۱} الحجر ۱۵-۹۷

{۲} النحل ۱۶-۱۲۸

اوران پر ہاتھ اٹھانے سے بھی باز نہ آئے......اللہ کے نبی کے دل میں اپنی امّت کے لیے محبت، اس محبت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو والدین کے دل میں اولاد کے لیے ہوتی ہے اس مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس گھٹن، درد، غم اور پریشانی کا جو مشرکوں کے تکبرّ، سرکشی اور انکار کی وجہ سے پیغمبر ﷺ کے حساس دل میں پیدا ہوتی تھی۔

﴿لِتُنْذِرَبِهٖ﴾ نزولِ قرآن کی علّت اور مقصد بتایا جارہا ہے جو کہ ''انذار'' اور ''ذکریٰ'' ہے، لغت میں ''انذار'' ایسی خبر کو کہتے ہیں جس میں کسی بُرے کام کے انجام سے ڈرایا گیا ہو۔{۳}

ویسے تو ''تخویف'' کا معنیٰ بھی ڈرانا ہے لیکن یہ ڈرانا دشمن کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے اور درندے کی طرف سے بھی، جبکہ ''انذار'' کا لفظ ایسے ڈراوے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو خیر خواہی پر مبنی ہو، اسی لیے قرآن کریم میں انبیاء کو ''نذیر'' تو کہا گیا ہے مگر ''مخوّف'' نہیں کہا گیا، اردو کی تنگ دامنی کی وجہ سے ''نذیر'' کا معنیٰ ''ڈرانے والا'' کیا جاتا ہے تو دشمن کے ڈرانے اور پیغمبر کے ڈرانے میں فرق ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہے حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے پیغمبر کے ڈرانے میں ممتا کی خیر خواہی سے بھی زیادہ خیر خواہی پوشیدہ ہوتی ہے۔{۴}

ذِكْرٰى اور ذکــر قریب قریب ہیں دونوں کا معنیٰ نصیحت کرنا اور ذکر کرنا ہے لیکن ''ذکریٰ'' میں ذکرِ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے ''ذِكْرٰى'' کا معنی ہے کثرتِ ذکر، ذکر دل سے بھی ہوتا ہے اور زبان سے بھی، قرآنِ کریم کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسے عام طور پر نصیحت اور موعظت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔{۵}

زیرِ بحث آیتِ کریمہ میں ''مؤمنین'' سے مراد وہ بھی ہیں جو اس سورت کے نزول کے وقت ایمان لاچکے تھے اور وہ بھی ہیں جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے۔

قرآنِ کریم کے نزول کا مقصد سارے انسانوں اور بالخصوص اہلِ ایمان کو برے اعمال کے انجام سے ڈرانا اور نصیحت کرنا ہے، مگر چونکہ حقیقی فائدہ اہلِ ایمان ہی کو حاصل ہوتا ہے اس لیے ان کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ کتاب جو کہ انذار اور نصیحت پر مشتمل ہے، انسان کی دنیا اور آخرت، ظاہر اور باطن کو سنوارنے والی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سارے انسانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

﴿۳﴾......اے انسانو! تم اس کتاب کی اتباع کرو جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے تمہارے اس ربّ کی طرف سے جو

{۳} والانذار أخبار فيه تخويف كما أنّه التبشير أخبار فيه سرور (المفردات صفحه ۴۸۷)

{۴} نذير القوم ای طليعتهم الذی ينذرهم العدو۔ (بصائر ذوی التمييز ۵/۳۴)

{۵} اس کے لیے دیکھیے سورۂ ذاریات آیت ۵۵، عنکبوت آیت ۵۱، الانبیاء آیت ۸۴، ص آیت ۴۳، ق آیت ۸

تمہارا خالق اور مربی ہے، تمہارے نفع نقصان، دینی اور دنیاوی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے، صرف اسی کو حق ہے کہ وہ تمہارے لیے شریعت وضع کرے اور تمہارے اوپر عبادت فرض کرے۔{۶}

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ﴾{۷} اللہ کو چھوڑ کر کسی کی بھی اتباع نہ کرو، نہ اپنے آباء کی جن کی زندگی جہالت کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے گزر گئی، نہ ان مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کی جو تمہیں شریعت سے بے نیاز ہو کر کامیابی کی نوید سناتے ہیں اور آخرت میں سفارش کا جھانسا دیتے ہیں، نہ اپنے نفس اور شیطان کی جو تمہارے سامنے کفر اور گناہ کو مزیّن کر کے پیش کرتے ہیں۔

﴿قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ﴾ تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو، ایسی نصیحت حاصل نہیں کرتے جو تمہیں "دوسرے سرپرستوں" کی اتباع سے روک دے۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم بہت تھوڑے وقت کے لیے نصیحت قبول کرتے ہو چنانچہ بہت جلد بھول بھال کر دوبارہ جہالت اور ضلالت کی راہوں پر چلنے لگتے ہو۔{۸}

حکمت وہدایت:

۱.....قرآن، اللہ کا نازل کردہ کلام ہے، عقل اور نقل ہر اعتبار سے ثابت ہو چکا کہ ایسا کلام انسان بنا ہی نہیں سکتا۔

۲.....سچا داعی وہ ہوتا ہے جس کا سینہ انسانوں کی ہدایت کے لیے بے تاب اور درد سے بھرا ہوا ہو۔(۲)

۳.....ہمارے آقا ﷺ کی دعوت وتبلیغ کا ماخذ، قرآنِ کریم تھا۔(۳) قیامت تک آنے والے ہر مبلّغ پر لازم ہے کہ وہ قرآن ہی کو ماخذ بنائے۔

۴.....نبیٔ کریم ﷺ اپنے قلبِ مبارک میں جو گھٹن محسوس کرتے تھے اس کا سبب وحی کا عظیم بوجھ اور قوم کا اعراض اور انکار تھا، معاذ اللہ! یہ گھٹن اس لیے نہیں تھی کہ آپ کو اپنے موقف یا وحیِ الٰہی کی صداقت میں کوئی شک تھا، آپ تو دوسرے کے دلوں سے شک کی بیماری دور کرنے کے لیے آئے تھے، خود آپ کے دل میں کیسے شک ہو سکتا تھا۔

{۶} واعلم ان قوله "اتّبعوا ما انزل اليكم من ربّكم" يتناول القرآن والسنة (تفسير كبير ۵/۱۹۶)

{۷} يضلّونكم من الجن والانس (بيضاوى ۳/۴)

{۸} اى تذكرا قليلا او زمانا قليلا تذكرون لا كثيرا حيث لا تتاثرون بذلك الخ (تفسير ابى سعود ۲/۲۷۴)

۵......وحی کی اتباع واجب ہے اور وحی کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی اتباع حرام ہے (۳)

وحی کی دو قسمیں ہیں، متلوّ (قرآن) اور غیر متلوّ (سنت)، دونوں قسم کی وحی کی اتباع ضروری ہے۔

۶......جن نافرمان قوموں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا، ان کے انجام سے نصیحت حاصل کرنا مسلمان پر لازم ہے۔ (۳)

تکذیبِ وحی کا انجام

﴿۴......۱۰﴾

وَكَمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا فَجَآءَهَا بَاۡسُنَا بَيَاتًا اَوۡ هُمۡ قَآئِلُوۡنَ ۝۴ فَمَا كَانَ دَعۡوٰىهُمۡ اِذۡ جَآءَهُمۡ

اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب راتوں رات یا دوپہر کو سوتے ہوئے۔ پھر یہی تھی ان کی پکار

بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ۝۵ فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِيۡنَ اُرۡسِلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ

جس وقت پہنچا ان پر ہمارا عذاب کہ کہنے لگے بیشک ہم ہی تھے گنہگار۔ سو ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان سے جن کے پاس

الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝۶ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيۡهِمۡ بِعِلۡمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيۡنَ ۝۷ وَالۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذِ اِلۡحَقُّ

رسول بھیجے گئے تھے اور ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے۔ پھر ہم ان کو احوال سنائیں گے اپنے علم سے اور ہم کہیں غائب نہ

فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝۸ وَمَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ

تھے۔ اور تول اس دن ٹھیک ہوگی پھر جس کی تولیں بھاریں ہوئیں سو وہی ہیں نجات پانے والے۔ اور جس کی تولیں ہلکی

الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ بِمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَظۡلِمُوۡنَ ۝۹ وَلَقَدۡ مَكَّنّٰكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَ

ہوئیں سو وہی ہیں جنہوں نے اپنا نقصان کیا اس واسطے کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ اور ہم نے تم کو جگہ دی زمین میں

جَعَلۡنَا لَكُمۡ فِيۡهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ۝۱۰

اور مقرر کر دیں اس میں تمہارے لئے روزیاں، تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

ربط: پہلے وحی کی اتباع کا حکم دیا گیا اور اب وحی کو جھٹلانے کا دنیوی اور اخروی انجام ذکر کیا جا رہا ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نزولِ وحی کے دو مقاصد اللہ نے بیان فرمائے ہیں، انذار (خبردار کرنا) اور ذکریٰ (نصیحت) زیرِ نظر آیات میں ہلاک شدہ قوموں اور روزِ قیامت کے سوال و جواب کے ذکر سے انذار ہی مقصود ہے۔

تسہیل: اور کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے تباہ کر دیا، ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آیا یا جب وہ دوپہر کو سو رہے تھے ○ جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کی زبان پر یہی تھا کہ ہم یقیناً ظالم تھے ○ جن کی طرف

رسول بھیجے گئے ہم ان سے بھی ضرور سوال کریں گے اور جنہیں بھیجا گیا ان سے بھی ضرور پوچھیں گے ○ اس دن اعمال کا وزن انصاف سے ہوگا، جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی لوگ کامیاب ہوں گے ○ اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے، یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لیا کیونکہ وہ ہماری آیتوں سے ناانصافی کرتے تھے ○ اور اے انسانو! ہم نے تمہیں زمین میں اختیار دیا اور اس میں تمہارے لیے معیشت اور زندگی کے اسباب پیدا کیے مگر تم ان نعمتوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

﴿تفسیر﴾

﴿۴﴾...... اللہ فرماتے ہیں، بے شمار بستیوں اور شہروں والے ایسے ہیں جنہیں ہم نے ان کے گناہوں اور وحی کے انکار کی وجہ سے ہلاک کر دیا، ان میں سے بعض ایسے تھے جن پر ہمارا عذاب رات کے وقت آیا جب کہ وہ میٹھی نیند سو رہے تھے جیسے کہ قوم لوط، جنکی بستی رات کے آخری پہر اٹھا کر پٹخ دی گئی اور اوپر سے پتھر بھی برسائے گئے۔

اور بعض ایسے تھے جن پر اس وقت عذاب آیا جب وہ دوپہر کے وقت قیلولہ کر رہے تھے جیسے قومِ شعیب، ان پر سیاہ بادل چھا گیا اور اس میں سے آگ کے شعلے برسنا شروع ہو گئے، ان کا قیلولہ، دائمی نیند میں بدل گیا۔

﴿۵﴾...... جب وہ اچانک عذاب میں گھر گئے تو ان کے پاس اعترافِ گناہ کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا، لیکن اس اعتراف سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا اس لیے کہ توبہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ جب کوئی شخص گناہوں کی نحوست اور آفت میں گرفتار ہو جائے تو وہ نادم اور شرمندہ ہوتا ہے اور اپنے مظالم اور جرائم کا اعتراف کر لیتا ہے۔ اس آیت سے اس حدیث کی بھی تائید ہوتی ہے جس میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

''کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا گیا جب تک کہ انہوں نے اپنی غلطی کا اقرار اور اس پر معذرت نہیں کر لی'' {۹}

مگر معذرت کی قبولیت کا بھی ایک وقت ہے، اس وقت کے گزرنے کے بعد معذرت قبول نہیں کی جاتی، چنانچہ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے کہ موت یا عذاب کی علامات ظاہر ہونے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔

پھر یہ بھی ہے کہ بہت سارے لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ اللہ کا عذاب ہے اور ہمارے فلاں گناہ کے سبب ہم پر نازل ہو رہا ہے کیونکہ اللہ کا دستور یہ ہے کہ وہ قوموں اور جماعتوں کو فوراً سزا نہیں دیتا

{۹} قال ابن جریر رحمه الله: فی هذه الآیة الدلالة علی صحة ماجاء ت به الروایة عن رسول الله ﷺ من قوله "ماهلك قوم حتّی یعذروا من أنفسهم" (التفسیر المنیر ۸/ ۱۴۱)

بلکہ ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ان میں سے بعض کے ذہن سے اس کا گناہ ہونا بھی نکل جاتا ہے اور وہ اللہ کی گرفت کو بھی فراموش کر دیتے ہیں، ایسے بدنصیب بھی ہوتے ہیں جو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اللہ ہمارے اس فعل پر راضی ہے اسی لیے تو گرفت نہیں فرمارہا۔

جہالت اور حماقت:

آپ مغربی اقوام کو دیکھیں وہ زنا، شراب نوشی، جوا، سودخوری اور نجس چیزوں کو بالکل گناہ نہیں سمجھتے حالانکہ ان کی مذہبی کتابوں میں ان چیزوں کی حرمت کا واضح طور پر ذکر ہے۔

آپ عالمِ اسلام ہی پر ایک نظر ڈال لیجیے جہاں ہر شعبۂ زندگی میں تقلیدِ مغرب کی انتھک کوشش ہو رہی ہے اور یہاں ظلم، جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، لوٹ کھسوٹ اور منافقوں والی خصلتیں عام ہو چکی ہیں جن کے نتیجے میں عالمی رسوائی، پسپائی، مہنگائی، افراتفری، فرقہ واریت، ظالم قیادت اور عدمِ تحفظ مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے۔

اللہ کی کتاب بتارہی ہے کہ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے آتی ہے اور مصیبت سے نجات کا راستہ صرف توبہ ہے مگر کون ہے جسے اللہ کی کتاب سے ہدایت حاصل کرنے کی فکر ہو اور کون ہے جو تباہ شدہ قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرے؟ اہلِ مغرب جہالت میں مبتلا ہیں تو عالمِ اسلام حماقت اور ضلالت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔

اللہ کے کلام کو جھٹلانے والوں کو دنیا میں تو یہ سزا ملی کہ انہیں اس وقت ہلاک کر دیا گیا جب وہ بظاہر بڑے مطمئن تھے۔ آخرت میں یہ ہوگا کہ:

﴿۶﴾ ......’’جن کی طرف رسول بھیجے گئے ہم ان سے بھی ضرور سوال کریں گے اور جنہیں بھیجا گیا ان سے بھی ضرور سوال کریں گے‘‘۔

انبیاء سے یہ سوال ہوگا کہ تم نے میرا پیغام اپنی امت تک پہنچا دیا تھا یا نہیں اور امت سے یہ سوال ہوگا کہ تم نے میرے پیغمبروں کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا؟ یہاں جوبات اجمالی طور پر بیان کی گئی ہے، دوسری کئی سورتوں میں اس کی تفصیل کی گئی ہے۔

ماخذِ تفسیر:

یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر کا سب سے پہلا ماخذ خود قرآن ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن ایک

بات کوایک جگہ مجمل اور مطلق ذکر کرتا ہے تو دوسری جگہ مفصل اور مقید ذکر کر دیتا ہے لہٰذا کسی بھی آیت کا مفہوم متعین کرنے کے لیے ان تمام مقامات کا مطالعہ ضروری ہے جہاں وہ مضمون بیان ہوا ہے۔

زیرِ بحث آیت کریمہ میں یہ تو بتایا گیا ہے کہ سوال ہوگا لیکن کیا سوال ہوگا؟ اس کا کوئی ذکر نہیں، دوسرے متعدّد مواقع پر اس سوال کی وضاحت کی گئی ہے۔

سورۂ مائدہ میں ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ {۱۰}

''اس دن کو یاد کیجیے جب اللہ سارے رسولوں کو جمع کر کے ان سے پوچھے گا، تمہیں، قوم کی طرف سے کیا جواب دیا گیا؟''

اور سورۂ انعام میں ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا {۱۱}

''اللہ فرمائے گا اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمہارے ہاں تمہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تمہارے سامنے میری آیات بیان کرتے تھے اور آج کے دن کی ملاقات سے تمہیں ڈراتے تھے؟''

قرآن کریم کے بعد اگر ہم حدیث کا مطالعہ کریں تو ثابت ہوتا ہے کہ سوال صرف انبیاء ہی سے نہیں ہوگا، ہر چھوٹے بڑے ذمہ دار سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر کوئی ذمہ دار ہے اور ہر کسی سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا، حکمران سے رعایا کے بارے میں، اپنے مالک کے مال کے نگران سے اس کی امانت کے بارے میں، گھر کے سربراہ سے اہل وعیال کے بارے میں، بیوی سے شوہر کے گھر کے بارے میں، خادم سے اپنے آقا اور بیٹے سے اپنے والد کے مال کے بارے میں سوال کیا جائے گا، مختصر یہ کہ ہر انسان ذمہ دار ہے اور اس سے ضرور سوال کیا جائے گا کہ اس نے اپنی ذمہ داری پوری کی تھی یا نہیں'' {۱۲}

اپنی رعیّت اور ذمہ داری کے علاوہ ہر شخص سے اس کی اپنی ذات کے حوالے سے بھی پوچھا جائے گا، حضرت

{۱۰} سورۃ مائدہ ۵/ ۱۱۲

{۱۱} سورۃ انعام ۶/ ۱۳۰

{۱۲} بخاری/ جمعہ/ باب ۱۱، مسلم/ امارۃ/ باب ۲۰، ترمذی/ جہاد/ باب ۲۷، ابن ماجہ/ اقامۃ/ ۱۵۴

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ''ابنِ آدم کو قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے سے قدم اٹھانے کی اجازت نہ ہوگی جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرلیا جائے، عمر کے بارے میں کہ کیسے گزاری، جوانی کے بارے میں کہ کہاں ختم کی، مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور علم کے بارے میں کہ اس پر کتنا عمل کیا''۔ {۱۳}

﴿۷﴾......اللہ کا یہ سوال کرنا معلومات حاصل کرنے کے لیے نہیں ہوگا بلکہ ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہوگا اس لیے کہ اللہ کو اس کائنات میں سرزد ہونے والے ہر چھوٹے بڑے عمل کا علم ہے اور اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں یہاں تک کہ اسے نظروں کی خیانت اور دلوں کے رازوں کا بھی علم ہے۔

﴿۸﴾......پیغمبر ہو یا اس کی قوم، قیامت کے دن ہر کسی کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا جس کی صورت یہ ہوگی کہ اعمال کا وزن اور جانچ پرکھ ہوگی جس کے عمل میں جان ہوگی اور اس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ کامیاب شمار ہوگا اور جس کا حال اس کے برعکس ہوگا اسے ناکام قرار دیا جائے گا۔

جیسے اس آیتِ کریمہ سے قیامت کے دن وزنِ اعمال ثابت ہوتا ہے اسی طرح بعض دوسری آیات اور متعدد احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

سورۃ الانبیاء میں ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۖ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۖ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ {۱۴}

''اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے پھر کسی پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے، اور اگر کسی کا رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا تو ہم اسے سامنے لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے کے لیے کافی ہیں''۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے:

توضع الموازين يوم القيامة فتوزن الحسنات و السيئات فمن رجحت حسناته على سيأته مثقال حبة دخل الجنة ومن رجحت سيئاته على حسناته مثقال حبة دخل النار، قيل: ومن استوت حسناته وسيئاته؟ قال: اولئك أصحاب الأعراف. {۱۵}

''قیامت کے دن ترازو رکھے جائیں گے جن کے ذریعے نیکیوں اور گناہوں کا وزن کیا جائے گا، جس کی نیکیوں کا پلڑا گناہوں پر رائی برابر بھی بھاری ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس کے گناہوں کا پلڑا نیکیوں پر رائی برابر بھاری ہوگا وہ دوزخ میں داخل ہوگا، سوال کیا گیا کہ جس کے نیک اور برے اعمال برابر ہوئے، اس کا کیا بنے گا؟ فرمایا وہ اصحاب اعراف میں سے ہوگا''

{۱۳} ترمذی/۲۴۱۷

{۱۴} الانبیاء ۲۱/۴۷

{۱۵} مسند احمد ۲/۲۲۱

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن بعض لوگوں کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا، اس میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا رکھ دیا جائے گا جس پر "لا الہ الا اللہ" لکھا ہوگا، اس کی برکت سے وہ بھاری ہو جائے گا" {۱۶}

اسی طرح صحیح بخاری کی آخری حدیث سے بھی وزنِ اعمال ثابت ہوتا ہے، اس حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا "دو کلمے ایسے ہیں جو رحمٰن کو بہت محبوب ہیں، میزان میں بہت بھاری ہوں گے، زباں پر بڑے ہلکے ہیں (یعنی) سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم" {۱۷}

وزنِ اعمال کیسے ہوگا؟

مشہور تابعی اور مفسّرِ قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ وہ "وزن" سے مراد عدل لیتے تھے، مسلمانوں میں سے ایک فرقہ، معتزلہ نام کا گزرا ہے، یہ لوگ حقیقی وزن کا انکار کرتے تھے اس لیے کہ وزن جسم والی چیز کا ہوسکتا ہے جبکہ اعمال اعراض ہیں، ان کا کوئی خارجی وجود اور جسم نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا وزن نہیں ہوسکتا۔

اہلِ سنت والجماعت کا ابتداء ہی سے یہ قول رہا ہے کہ قیامت کے دن، اعمال کا وزن ہوگا اس لیے کہ اللہ قادرِ مطلق ہے، وہ ایسی چیزوں کے وزن کی بھی قدرت رکھتا ہے جن کے وزن کی ہم قدرت نہیں رکھتے۔ لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ہم اس پر ایمان رکھیں خواہ اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ چونکہ اُس زمانے کے اعتبار سے معتزلہ کا قول عقل کے زیادہ قریب تھا اس لیے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اہلِ حق مختلف تاویلیں کرتے تھے۔

(۱)......بعض حضرات نے کہا قیامت میں عمل کا نہیں، عامل کا وزن ہوگا، ان حضرات نے بخاری اور مسلم کی اس روایت سے استدلال کیا جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"قیامت کے دن بعض موٹے موٹے آدمی آئیں گے لیکن اللہ کے نزدیک ان کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا" {۱۸}

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بظاہر ان کی ٹانگیں دُبلی پتلی ہیں لیکن اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ قیامت کی میزانِ عدل میں ان کا وزن اُحد پہاڑ کے برابر ہوگا۔ {۱۹}

(۲)......دوسرا قول یہ ہے کہ وہ صحیفے اور رجسٹر تولے جائیں گے جن کے اندر اعمال لکھے ہوں گے، "حدیثِ بطاقہ" جو

{۱۶} مسند احمد/۱/۱۹۸

{۱۷} بخاری ۲/۱۱۹

{۱۸} صحیح بخاری/کتاب التفسیر/سورۃ ۱۸، مسلم/منافقین/باب ۱۸

{۱۹} ابن کثیر/۲/۲۷۲

ہم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اوپر نقل کر آئے ہیں، اس سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

(۳)......تیسرا قول یہ ہے کہ وہ اعمال جو آج اعراض کی صورت میں ہیں، قیامت کے دن ان میں سے ہر ایک کی کوئی نہ کوئی صورت اور جسم ہوگا اور یہ جو اجسام ہوں گے انہی کا وزن کیا جائے گا، یہ حضرات اپنے موقف کی تائید میں کئی احادیث پیش کرتے ہیں جن میں سے دو یہ ہیں:

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

فیأتی المؤمن شاب حسن اللون طیب الریح فیقول: من أنت؟ فیقول انا عملک الصالح. {۲۰}

''مؤمن کے پاس قبر میں ایک خوبصورت نوجوان آئے گا جس سے خوشبو آ رہی ہوگی، وہ اس سے پوچھے گا تم کون ہو؟ وہ جواب دے گا کہ میں تمہارا نیک عمل ہوں''

☆ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

مامن احد لایؤدی زکاة ماله الامثل له یوم القیمة شجاعا أقرع حتیٰ یطوق به عنقه. {۲۱}

''جو کوئی اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا، قیامت کے دن اس کا مال گنجے سانپ کی صورت میں اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا''

ان تاویلوں کی ضرورت اس وقت پیش آتی تھی جب نئی تحقیقات سامنے نہ آئی تھیں اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صرف اجسام ہی کا وزن نہیں ہوتا بلکہ اعراض کا بھی وزن ہو سکتا ہے، ہوا، حرارت اور برقی رو اعراض میں سے ہیں لیکن میٹر کے ذریعے ان کا وزن کیا جاتا ہے۔

سب سے محفوظ راستہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں ہم بلا چون و چرا ان پر ایمان لے آئیں اور ان کی صورت اور کیفیت کے بارے میں بحث اور تحقیق اللہ کے حوالے کر دیں۔

ہمیں وزنِ اعمال کی حقیقت سے زیادہ اعمالِ حسنہ کا ذخیرہ کرنے اور ان اسباب کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے جن کی وجہ سے عمل میں وزن اور جان پیدا ہوتی ہے اور وہ دو چیزیں ہیں ''اخلاص اور اتباعِ سنت'' اگر یہ دو چیزیں نہ ہوں تو خود مسلمان کا عمل بھی بے قیمت ہوتا ہے۔

{۲۰} مسند احمد/۴/۲۹۶

{۲۱} ابن ماجہ صفحہ ۱۲۸/باب ماجاء فی منع الزکوٰۃ/ بخاری/زکوٰۃ، باب ۴/مسلم/زکوٰۃ/۲۷،۲۸/ نسائی/زکوٰۃ، باب ۲۰، بتغیّرِ یسیر

﴿۹﴾......جن لوگوں کے پلڑے ہلکے ہوئے، یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ہدایت کا راستہ دکھایا تھا اور حق سمجھنے اور حق پر چلنے کی استعداد ان کو بھی عطا کی تھی لیکن کفر اور معاصی کی وجہ سے انہوں نے اپنی استعداد کو تباہ کر لیا اور پھر زندگی بھر اللہ کی نافرمانی پر ہی اصرار کرتے رہے یہاں ایک سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ کیا کفار کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا یا نہیں؟ بعض حضرات اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں کیونکہ سورۂ کھف میں کفار کے بارے میں ہے:

فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا {۲۲} ''قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہیں کریں گے''

اور جو حضرات کفار کے وزنِ اعمال کے قائل ہیں وہ درج ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں:

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ {۲۳} ''اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لیا یہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے''۔

ہمیشہ کے لیے جہنم میں صرف کافروں کو ڈالا جائے گا، گنہگار مسلمانوں کو نہیں۔

﴿۱۰﴾......پہلی آیات میں تکذیبِ وحی کا دنیوی اور اخروی انجام بیان فرما کر ڈرایا گیا تھا تو آخری آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر فرما کر حق کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ:

ہم نے تمہیں زمین پر پوری قدرت اور تصرّف کا اختیار دیا ہے، اس کے سارے منافع تمہارے لیے حلال کیے ہیں، اس میں رہائش گاہ بنا لیتے ہو، سڑکیں اور راستے، کہیں دکانیں اور بازار بناتے ہو، یہی زمین جو تمہاری خوابگاہ بھی بنتی ہے اور سیر و تفریح کا میدان بھی، اسی زمین کو اس نے تمہارے لیے سامانِ زندگی کا وسیع و عریض گودام اور دستر خوان بھی بنایا ہے، بعض چیزیں انسان کو تیار شدہ دستیاب ہو جاتی ہیں جیسے ہزاروں قسم کے پھل اور میوہ جات اور بعض کو قابلِ استعمال بنانے کے لیے اسے کچھ محنت کرنی پڑتی ہے، لیکن یہ چیزیں بھی اسے حقیقت میں اللہ کے فضل ہی سے حاصل ہوتی ہیں، اسی نے ہاتھ پاؤں دیے، اسی نے سوچنے کے لیے دماغ دیا اور اسی نے زمین اور پہاڑوں کے دامن میں خام مواد رکھ دیا تاکہ انسان ان سے فائدہ اٹھائے اور اللہ کا شکر ادا کرے لیکن وہ پورا شکر ادا نہیں کرتا، اوّل تو شکر ادا کرنے والے تھوڑے، پھر جو شکر ادا کرتے ہیں وہ بھی بہت کم ادا کرتے ہیں۔

{۲۲} الکہف/۱۸/۱۰۵

{۲۳} المؤمنون/۲۲/۱۰۲

حکمت وہدایت:

۱......اللہ کے عذاب سے کسی وقت بھی اور کسی کو بھی بے خوف نہیں ہونا چاہیے، وہ دن میں بھی آ سکتا ہے اور رات میں بھی۔(۴)

۲......جس گنہگار کے ضمیر میں زندگی کی تھوڑی سی رمق بھی باقی ہو وہ اللہ کا عذاب دیکھ کر اپنے گناہ کا اعتراف ضرور کرتا ہے مگر اس وقت کے اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔(۵)

۳......بچاؤ کا راستہ صرف یہ ہے کہ عذاب کی گرفت میں آنے سے پہلے توبہ کر لی جائے۔

۴......بدنصیب ہیں جن کے دل میں گناہ کی خلش ہی باقی نہیں رہی اور وہ اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہو چکے ہیں۔

۵......قیامت کے دن ہر کسی سے سوال ہوگا، اللہ کے نبی سے بھی اور اس کی امّت سے بھی، حکمران سے بھی اور رعایا سے بھی۔(۵)

۶......وزنِ اعمال برحق ہے لیکن اس کی کیفیت اور صورت صرف اللہ ہی جانتا ہے۔(۷)

وہ لوگ شدید غلطی پر ہیں جو وزنِ اعمال کا محض اس لیے انکار کر دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ ان کی عقل میں نہیں آتا، اگر غیبی امور کے اثبات کے لیے بھی عقل ہی کو معیار بنا لیا جائے تو پھر دین، بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔

۷......اخروی کامیابی اور ناکامی کا تعلق دنیوی اعمال کے ساتھ ہے، جس نے نیک اعمال کیے وہ کامیاب ہوگا اور جس نے برے اعمال کیے وہ ناکام ہوگا۔(۹)

۸......حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ آیت (۱۰) میں اللہ نے اپنی دو نعمتیں ذکر فرمائی ہیں، جاہ اور مال، "مَكَّنّٰكُمْ" میں جاہ کا اور "مَعَايِش" میں مال کا ذکر ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ یہ نعمتیں مطلقاً مذموم نہیں البتہ ان میں انہماک اور مبالغہ مذموم ہے۔

انسان کی تکریم، شیطان کا تکبر

﴿۱۱......۱۸﴾

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ

اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر صورتیں بنائیں تمہاری، پھر حکم کیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو، پس سجدہ کیا سب نے مگر ابلیس نہ تھا

لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ

سجدہ والوں میں۔ کہا تجھ کو کیا مانع تھا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے حکم دیا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں، مجھ کو تو نے بنایا آگ

مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ

سے اور اس کو بنایا مٹی سے۔ کہا تو اتر یہاں سے، تو اس لائق نہیں کہ تکبر کرے یہاں، پس باہر نکل تو ذلیل ہے۔ بولا کہ مجھے

اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ

مہلت دے اس دن تک کہ لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں۔ فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی۔ بولا تو جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے

فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ

میں بھی ضرور بیٹھوں گا ان کی تاک میں تیری سیدھی راہ پر۔ پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے اور پیچھے سے اور دائیں سے

وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا

اور بائیں سے اور نہ پائے گا تو اکثروں کو ان میں شکر گزار۔ کہا نکل یہاں سے برے حال سے مردود ہو کر، جو کوئی ان میں

مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

سے تیری راہ پر چلے گا تو میں ضرور بھر دوں گا دوزخ کو تم سب سے۔

ربط: پہلے اتباع وحی کا حکم دیا گیا، ترغیب سے بھی اور ترہیب (ڈرانے) سے بھی، اب آدم علیہ السلام کی تکریم اور ابلیس کا کبر وغرور بتا کر، وحی کی اتباع اور شیطان سے اجتناب کی تلقین کی جارہی ہے۔

تسہیل: ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر ہم نے تمہاری تصویر بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کے سامنے سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا، وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا○ اللہ نے اس سے پوچھا جب میں نے تجھے حکم دیا تھا، تو پھر تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا؟ اس نے جواب دیا میں آدم سے بہتر ہوں، مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے○ اللہ نے فرمایا تم جنت سے نیچے اتر جاؤ تمہارے لیے مناسب نہ

تھا کہ تم یہاں تکبّر کرتے لہٰذا نکل جاؤ، بلاشبہ تم ذلیل لوگوں میں سے ہوO ابلیس نے کہا مجھے دوسری زندگی تک مہلت دے دیجیےO فرمایا تمہیں مہلت دی جاتی ہےO کہنے لگا چونکہ آپ نے مجھے گمراہ کیا ہے اس لیے میں انہیں گمراہ کرنے کے لیے صراطِ مستقیم پر بیٹھوں گاO پھر انسانوں کو آگے سے، پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے گھیرلوں گا اور آپ ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہیں پائیں گےO فرمایا یہاں سے نکل جاؤ تم ٹھکرائے ہوئے اور مردود ہو، انسانوں میں سے جو بھی تمہاری اتباع کرے گا میں تم سب سے دوزخ کو بھر دوں گاO

﴿تفسیر﴾

﴿۱۱﴾......اے انسانو! ہم نے تمہاری جنس کو پیدا کرنے کا ایک اندازہ مقرر کیا اور مادّے کو وجود دیا پھر ہم نے مادہ سے تمہاری ایک تصویر بنائی پھر اس میں روح ڈال دی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو...... یہ سجدۂ عبادت نہیں تھا بلکہ سجدۂ تعظیمی تھا جو کہ پہلی شریعتوں میں غیر اللہ کے لیے جائز تھا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سجدہ اللہ کے لیے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کی حیثیت محض قبلہ کی سی تھی۔{۲۴}

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں ''سجدہ'' سے فقہی سجدہ مراد نہیں ہے جس میں زمین پر پیشانی رکھی جاتی ہے بلکہ صرف تواضع اور تذلیل کے معنی میں ہے۔{۲۵}

فرشتوں کی یہ تواضع صرف آدم علیہ السلام کے سامنے نہیں تھی بلکہ وہ اولادِ آدم کے سامنے بھی تواضع کیے ہوئے ہیں اور اس کی زمینی اور آسمانی، ظاہری اور باطنی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

آدم کو اللہ نے جو عزت و تکریم عطا کی اس نے ابلیس کو حسد میں مبتلا کر دیا۔

سورۂ اسراء میں ہے، ابلیس نے کہا:

أَرَءَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ{۲۶} ''مجھے بتایئے کیا یہی ہے جسے آپ نے میرے مقابلے میں عزت دی ہے؟''

یہ حسد سبب بنا تکبر اور نافرمانی کا، چنانچہ سجدہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

﴿۱۲﴾......اللہ نے فرمایا جب میں نے تجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس پر عمل کرنے سے کیا چیز مانع ہوئی، تجھے یہ نہیں

{۲۴} المراد هو السجدة الا ان المسجود له هو الله تعالىٰ فآدم كان كالقبلة (تفسیر کبیر ۵/۲۰۶)

{۲۵} قيل المعنى اللغوى ولم يكن فيه وضع الجباه بل كان ذلك مجرّد تذلل وانقياد (روح المعانی/۱/۳۶۴)

{۲۶} الاسراء/۱۰/۶۲

دیکھنا چاہیے تھا کہ کسے سجدہ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ حکم دینے والا کون ہے؟

ابلیس نے جواب دیا، میرا آدم سے افضل اور بہتر ہونا مانع بن گیا اس لیے کہ آدم کا مادۂ تخلیق مٹی ہے جبکہ میرا مادۂ تخلیق آگ ہے، آگ مٹی سے بہتر ہے اس لیے کہ آگ میں روشنی اور بلندی ہوتی ہے جبکہ مٹی میں ظلمت اور پستی ہوتی ہے۔

ابلیس کے آگ سے پیدا ہونے کا ذکر حدیث میں بھی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خلقت الملائکة من نور و خلق إبلیس من مّارج من نّار و خلق آدم مما وصف لکم. {۲۷}

''فرشتوں کو نور سے اور ابلیس کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا گیا اور آدم کو اس چیز سے پیدا کیا گیا جو اللہ نے بیان فرمایا ہے۔''

ابلیس نے یہ تو دیکھا کہ مٹی میں پستی اور آگ میں بلندی ہوتی ہے مگر یہ نہ دیکھا کہ مٹی میں سنجیدگی، وقار، حلم اور تواضع جبکہ آگ میں طیش، تیزی اور جلانے کی صفت پائی جاتی ہے...... اپنے اپنے عنصر کی خصوصیات کی جھلک ہمیں حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے مقابلے میں ابلیس میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

﴿۱۳﴾...... ابلیس نے جب اللہ کے حکم کے مقابلے میں منطق چلائی اور بے اصل قیاس کیا تو اللہ نے اسے عزت والے اس مقام سے اترنے کا حکم دیا جو اسے حاصل تھا اور اسے بتا دیا گیا کہ یہاں متکبرین کے لیے کوئی جگہ نہیں، اس کے دل میں تو نجانے کب سے کبر پیدا ہو چکا تھا مگر اس کا اظہار آج ہوا اور اسے اس کی ضد کے ساتھ سزا دی گئی یعنی وہ تو اپنے آپ کو عزت اور بڑائی کے مقام پر فائز کرنا چاہتا تھا مگر اللہ نے اسے ذلت اور پستی میں گرا دیا۔

﴿۱۴﴾...... ابلیس نے اپنے لیے اور اپنی ذرّیت کے لیے انسانوں کے دوبارہ اٹھائے جانے تک زندہ رہنے کی مہلت مانگی تا کہ وہ انسانیت کے خاتمہ اور دوبارہ احیاء کا منظر دیکھ سکے۔

﴿۱۵﴾...... اللہ تعالیٰ نے اس کی درخواست قبول کر لی اور اسے ایک خاص وقت تک مہلت دے دی، یہاں اگرچہ مطلق مہلت کا ذکر ہے لیکن سورۂ حجر میں ''وقتِ معلوم'' کے الفاظ آئے ہیں، اللہ فرماتے ہیں:

قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ {۲۸}

''فرمایا کہ اچھا تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت ملی ہے روزِ مقرر تک''

{۲۷} صحیح مسلم/ کتاب الزھد/ باب ۶۰

{۲۸} سورة الحجر آیت ۳۶-۳۷

''وقتِ معلوم'' سے مراد ''نفخۃ اولیٰ'' ہے۔{۲۹} یعنی جب پہلی بار صور پھونکا جائے گا اور زمین پر بسنے والی ساری مخلوق فنا کے گھاٹ اُتر جائے گی اس وقت ابلیس کو بھی موت آجائے گی۔

﴿۱۶﴾...... ابلیس نے کہا یارب! چونکہ آپ نے مجھے گمراہ کیا ہے اس لیے میں آپ کے بندوں کو گمراہ کروں گا، وہ گمراہ تو ہوا تھا اپنے حسد اور تکبر کی بناء پر مگر اس نے اپنی گمراہی کی نسبت رب العٰلمین کی طرف کردی۔

﴿۱۷﴾...... شیطان نے کہا میں انسانوں پر چاروں جانب سے حملہ کردوں گا دنیا کے اعتبار سے بھی اور آخرت کے اعتبار سے بھی، نیکیوں کے اعتبار سے بھی اور گناہوں کے اعتبار سے بھی۔

﴿وَلَا تَجِدُ﴾ اور آپ ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہیں پائیں گے، ابلیس نے انسانوں کے بارے میں جس گمان کا اظہار کیا تھا وہ سچا ثابت ہوا، خود باری تعالیٰ نے بھی اس کی تصدیق فرمائی ہے، سورۂ سبأ میں ہے:

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ {۳۰}

''ابلیس نے ان کے بارے میں اپنے گمان کو سچا کر دکھایا پس انہوں نے اس کی اتباع کی سوائے مؤمنین کی ایک جماعت کے''

(عن ابن عباس رضی الله عنه: امامن بين ايديهم فمن قبل دنياهم وأما من خلفهم فأمر آخرتهم واما عن ايمانهم فمن قبل حسناتهم وأماعن شمائلهم فمن قبل سيأتهم){۳۱}

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شیطان کا یہ کہنا کہ میں ان کے آگے کی طرف سے آؤں گا، اس معنیٰ میں ہے کہ دنیا کی طرف سے آؤں گا یعنی بعث بعد الموت کا یقین، جنت کا اشتیاق اور جہنم کا خوف ان کے دل سے نکال دوں گا، اور اس کا یہ کہنا کہ ان کے پیچھے کی طرف سے آؤں گا، بایں معنیٰ کہ دنیا کو ان کے سامنے مزیّن کر کے پیش کروں گا اور دائیں طرف سے آنے کا مطلب، نیکیوں سے غافل کرنا جبکہ بائیں طرف سے آنے کا مطلب گناہوں کو پرکشش بنا کر اولادِ آدم کے سامنے پیش کرنا ہے''

﴿۱۸﴾...... اللہ نے اسے عزت والے مقام سے نکل جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی خبردار کردیا کہ میں تم سے اور تمہاری اتباع کرنے والوں سے دوزخ کو بھردوں گا۔

{۲۹} بیضاوی ۳/۹

{۳۰} سبا/۳۴/۲۰

{۳۱} ابنِ کثیر ۲/۲۷۵

حکمت وہدایت:

۱......انسان کو اللہ نے مکرّم اور محترم مخلوق بنایا ہے، اس کی تکریم اور عزت ظاہر کرنے کے لیے فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔(۱۱)

۲......حسد اور تکبر بدترین گناہ ہیں، ابلیس دونوں گناہوں میں مبتلا ہو کر مردود ٹھہرا، اور زمین پر انسان کے اترنے کے بعد جو سب سے پہلا باطنی گناہ کیا گیا وہ حسد تھا اور سب سے پہلا ظاہری گناہ جو انسان سے ہوا وہ قتل تھا مگر قتل کا سبب حسد ہی بنا تھا۔(۱۲)

۳......شیطان کے پیدا کرنے میں بھی اللہ پاک کی حکمت پوشیدہ ہے، اس کا کوئی عمل اور کوئی فیصلہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہے، دیکھا جائے تو اس کائنات میں کوئی چیز بھی شرِ محض نہیں بلکہ شر ایک اعتباری چیز ہے، انسان کو جس چیز سے تکلیف پہنچے یا جس سے اس کی کوئی مصلحت فوت ہو جائے یا کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے وہ اسے شر سمجھتا ہے حالانکہ اس میں بھی کوئی منفعت ہوتی ہے، کڑوی دوا پینے، آپریشن کروانے، کوئی عضو کٹوانے اور بھوکا پیاسا رہنے سے بھی تکلیف ہوتی ہے اور نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اس میں بھی فوائد پوشیدہ ہوتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم کے مصائب دوسری قوم کے فوائد ہوتے ہیں، کسی چیز کا حقیقی حُسن اس کی ضد کے وقت ظاہر ہوتا ہے، اگر دنیا میں خیر ہی خیر ہوتا اس کے مقابلے میں شر نہ ہوتا تو خیر کا حسن پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکتا تھا، انسان کو نیکی اور بدی کے دواعی کے ٹکراؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، فرشتہ اسے تقوٰی کی دعوت دیتا ہے اور شیطان فسق فجور کی طرف بلاتا ہے، وہ شیطان پر دو حرف بھیج کر تقوٰی اختیار کرتا ہے تو اسے اعلیٰ مقامات سے نوازا جاتا ہے، بلکہ اگر شیطان کے بہکاوے میں آ کر اس سے گناہ ہو بھی جائے، مگر وہ نادم ہو کر سچی توبہ کر لے تو فوراً غفور رّحیم مولیٰ اسے رحمت اور مغفرت کی چادر میں چھپا لیتا ہے۔ یہی سب کچھ قصۂ آدم وابلیس سے بھی ظاہر ہو رہا ہے، شیطان کے بہکاوے میں آ کر آدم علیہ السلام سے غلطی تو ہو گئی مگر انہوں نے نہ تکبر کیا، نہ اصرار کیا اور نہ ہی تاویل کی بلکہ بلا تاخیر توبہ کر لی جبکہ ابلیس اپنی غلطی پر ڈٹ گیا اور اپنی غلطی کو درست ثابت کرنے کے لیے تاویلیں کرنے لگا، ایک کو توبہ نے اللہ کا محبوب اور دوسرے کو غلطی پر اصرار نے مردود بنا دیا۔

۴......**غلط قیاس**...... اللہ کے واضح حکم کے مقابلے میں عقلی گھوڑے دوڑانا اور قیاسِ فاسد کرنا شیطانی عمل

ہے، شیطان نے قیاس کیا کہ جس کا مادۂ تخلیق اعلیٰ ہو وہ خود بھی اعلیٰ ہوتا ہے لہٰذا میں آدم سے اعلیٰ ہوں، اوّل تو یہ قیاس ہی غلط تھا اس لیے کہ مٹی میں جو مسکینی، تواضع اور سنجیدگی ہے وہ اللہ کو بہت محبوب ہے، مٹی میں دانہ مل کر پھل بھی بنتا ہے، پھول بھی، انسانوں کے لیے اناج بھی بنتا ہے اور حیوانوں کے لیے بھوسہ بھی، انبیاء، اولیاء اور دنیا بھر کے انسان مٹی ہی سے پیدا ہوئے، اسی میں دفن ہوئے اور اسی سے نکالے جائیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک مواد کا دوسرے مواد پر بہتر ہونا کوئی ایسی قطعی حقیقت نہیں جسے یقینی دلیل سے ثابت کیا جاسکے بلکہ یہ اعتباری امور میں سے ہے جس کے بارے میں مختلف اقوال اور آراء ہوسکتی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ بہت ساری قیمتی اشیاء ایسی ہیں جو اصل کے اعتبار سے خسیس ہیں، آپ مشک کو لے لیں جو دنیا کی سب سے قیمتی خوشبو ہے مگر خون سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح الماس ہیرا جسے بادشاہ اپنے تاج میں لگانا اور خزانے میں رکھنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں، کوئلے سے بنتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ فرشتے نُور سے پیدا ہوئے اور ابلیس نار سے، نور اعلیٰ اور افضل ہے نار سے، افضل سے پیدا ہونے والوں نے بلاچون وچرا سجدہ کردیا جبکہ ادنیٰ سے پیدا ہونے والے کو تکبّر نے جھکنے سے روک دیا۔

پانچویں بات یہ کہ فضیلت محض مادہ کے افضل ہونے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ظاہری اور باطنی صفات کی بناء پر حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا، ان کے اندر اپنی روح پھونکی، انہیں ایسی علمی اور عملی استعداد عطا فرمائی جو کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں، ان کے دل کو محبت اور معرفت کا مرکز بنایا، ان کے لیے روحانی بلندی کے اس مقام تک پہنچنا ممکن بنایا جہاں کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔

۵......ایک حدیث میں ہے:

ان رسول الله ﷺ قال اوّل من قاس أمر الدين برأيه ابليس قال الله تعالىٰ له اسجد لآدم فقال انا خير منه. {۳۲}

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے جس نے دین کے حکم کو اپنی رائے پر قیاس کیا وہ ابلیس تھا اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا آدم کو سجدہ کرو، اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں“

اسی طرح حضرت ابنِ سیرین رحمہ اللہ سے منقول ہے:

{۳۲} الدارمی/ مقدمہ/ باب ۲۲

اوّل من قاس ابلیس. {۳۳} ''سب سے پہلے جس نے قیاس کیا وہ ابلیس تھا''

اس حدیث اور قول کی آڑ میں بعض لوگ قیاسِ شرعی کے حجت ہونے کا انکار کرتے ہیں اور ائمہ مجتہدین کو تنقید کا نشانہ بناتے اور ان پر پھبتیاں کستے ہیں حالانکہ قیاس، شریعت کے چار مآ خذ میں سے ایک اہم ماخذ ہے جس کا حجت اور دلیل ہونا کتاب وسنت اور آثارِ صحابہ سے ثابت ہے، حدیث میں جس کی مذمت کی گئی ہے اس سے وہ قیاس مراد ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مقابلے میں کیا جائے۔{۳۴}

۶......صاحبِ علم بھی گمراہ ہوسکتا ہے، شیطان کے صاحبِ علم ہونے میں کسی کو شک نہیں اس لیے کہ اس نے ''صراط مستقیم'' پر بیٹھنے کی قسم کھائی تھی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ جانتا تھا کہ ''صراطِ مستقیم'' کونسا ہے۔(۱۶)

۷......اس میں شک نہیں کہ دعا کی قبولیت، اللہ کا بہت بڑا فضل ہے مگر اس کی وجہ سے گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ شیطان نے مہلت کی جو درخواست کی تھی وہ قبول کرلی گئی تھی۔(۱۵){۳۵}

۸......بعض اوقات شیاطین کو بھی کشف ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے مستقبل کے بارے میں ان کی پیشگوئی سچی ثابت ہوجاتی ہے......شیطان نے کہا تھا ''آپ ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہیں پائیں گے'' اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

۹......انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کسی ایک لگے بندھے طریقہ پر عمل نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے مختلف حربے آزماتا ہے، جاہلوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک چال چلتا ہے تو اہلِ علم کو گمراہ کرنے کے لیے یہ کوئی دوسری تدبیر اختیار کرتا ہے، اسی بناء پر ایک عظیم صاحبِ تقویٰ فرمایا کرتے تھے ''مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے'' شیطان نے کہا تھا میں ہر جانب اور ہر پہلو سے حملہ آور ہوں گا، ہمارے آقا ﷺ کی دعا میں یہ الفاظ بھی تھے:

﴿واحفظنی من بین یدی ومن خلفی وعن یمینی وعن شمالی ومن فوقی﴾

''میری حفاظت فرمانا سامنے سے بھی، پیچھے سے بھی، دائیں اور بائیں سے بھی اور اوپر سے بھی''۔{۳۶}

{۳۳}ابنِ کثیر/۲/۲۷۴

{۳۴}واجیب عن ذلک بان المذموم ھوالقیاس والرّأی فی مقابلة النص اوالذی یعدم فیه شرط من الشروط المعتبرة(روح المعانی ج۵/۱۳۳)

{۳۵}بیان القرآن۴/۵

{۳۶}ابنِ ماجه /ص ۲۷۲

جنّت میں آدم علیہ السلام کا دخول اور خروج

﴿۱۹......۲۵﴾

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا

اور اے آدم! رہ تو اور تیری عورت جنت میں پھر کھاؤ جہاں سے چاہو اور پاس نہ جاؤ اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے گنہگار۔ پھر بہکایا

مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا

ان کو شیطان نے تاکہ کھول دے ان پر وہ چیز کہ ان کی نظر سے پوشیدہ تھی ان کی شرمگاہوں سے اور وہ بولا کہ تم کو نہیں روکا تمہارے رب

وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

نے اس درخت سے مگر اس لئے کہ کبھی تم ہو جاؤ فرشتے یا ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے۔ اور ان کے آگے قسم کھائی کہ میں البتہ تمہارا دوست ہوں۔

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا

پھر مائل کر لیا ان کو فریب سے پھر جب چکھا ان دونوں نے درخت کو تو کھل گئیں ان پر شرمگاہیں ان کی اور لگے جوڑنے اپنے اوپر بہشت

وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ

کے پتے اور پکارا ان کو ان کے رب نے کیا میں نے منع نہ کیا تھا تم کو اس درخت سے اور نہ کہہ دیا تھا تم کو کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ

بولے وہ دونوں اے رب ہمارے! ظلم کیا ہم نے اپنی جان پر اور اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور ہو جائیں گے تباہ۔

الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى

فرمایا تم اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک۔ فرمایا اسی

حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾

میں تم زندہ رہو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے۔

ربط: یہ آیات پہلے مضمون اور قصّہ کا تتمہ ہیں، اس قصہ سے مقصود، شیطان کے ہتھکنڈوں اور وساوس سے انسان کو بچانا ہے جو اللہ کے نبی کے دل میں وسوسہ ڈال سکتا ہے اس کے شر سے دوسروں کو بھی اپنے آپ کو مامون اور محفوظ نہیں سمجھنا چاہیے۔

تسہیل: اور اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں اس جنت میں رہو اور جہاں سے دل چاہے کھاؤ مگر اس درخت کے

قریب نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے O پھر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا تا کہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں، ان کے سامنے کھول دے، وہ کہنے لگا تمہیں تمہارے ربّ نے اس درخت کے قریب جانے سے اس لیے منع کیا ہے تا کہ تم کہیں فرشتے یا ہمیشہ رہنے والے نہ بن جاؤ O پھر ان کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں O چنانچہ اس نے انہیں دھوکے سے مائل کر لیا، پس جب ان دونوں نے درخت کا پھل چکھ لیا تو ان کا ستر کھل گیا اور وہ جنت کے درختوں کے پتے چپکا کر اسے چھپانے لگے، اور ان کے ربّ نے انہیں پکارا ''کیا میں نے تمہیں اس درخت کے قریب جانے سے منع نہیں کیا تھا اور تمہیں بتایا نہیں تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟'' O انہوں نے عرض کیا اے ہمارے رب! ہم نے تیری نافرمانی کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم یقیناً خسارے میں رہیں گے O اللہ نے فرمایا تم جنت سے اتر جاؤ، تمہارے درمیان عداوت رہے گی، تمہارے لیے زمین میں ایک معیّن مدّت تک جائے قرار اور متاعِ حیات ہے O فرمایا ''تم اسی میں زندگی بسر کرو گے، اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے O

تفسیر

﴿۱۹﴾......اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے کہا تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو۔ قرآن سے بس اتنا ثابت ہے کہ پہلا انسان اکیلا نہ تھا اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی مگر یہ بیوی کیسے پیدا ہوئی تھی؟ قرآن میں اشارۃً بھی اس کا ذکر نہیں ہے البتہ بائبل میں تفصیل سے اسے ذکر کیا گیا ہے، توریت میں ہے:

''اور خداوند خدا نے کہا کہ اچھا نہیں آدم اکیلا رہے، بس اس کے لیے ایک ساتھی اس کے مانند بناؤں گا......اور خداوند خدا نے آدم پر نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا نے اس کی پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے، اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی کہ وہ نر سے نکالی گئی'' {۳۷}

اس قسم کی تفصیلات کا بیان کرنا توریت ہی کی خصوصیت ہے ورنہ قرآن صرف مقصد کی بات کرنے پر اکتفاء کرتا ہے۔

{۳۷}(پیدائش ۲:۱۸ و ۲۴)

ہمارے تفسیری ذخیرہ میں بائبل سے ملتی جلتی جو روایات ہیں وہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں، البتہ بخاری اور مسلم میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث منقول ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

فان المرأة خلقت عن ضلعٍ. {۳۸} ''کیونکہ عورت کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے''

علماء کی رائے یہ ہے کہ اس حدیث کا وہی مفہوم ہے جو اس آیتِ کریمہ کا ہے:

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ {۳۹} ''انسان کو عجلت سے پیدا کیا گیا ہے''

ظاہر ہے اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کا مادۂ تخلیق عجلت ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کی فطرت میں جلد بازی پائی جاتی ہے، یونہی مذکورہ بالا حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جیسے پسلی میں کجی ہوتی ہے یونہی عورت کے مزاج میں بھی ایک قسم کی کجی ہوتی ہے، یہ کجی (اگر) حد کے اندر ہو تو عیب نہیں، حسن اور خوبی شمار ہوگی، کیونکہ پسلی کا حسن بھی کجی میں ہوتا ہے، اگر وہ بالکل سیدھی ہو تو یہ بہت بڑا عیب ہوگا۔

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ ''اس درخت کے قریب نہ جانا'' نہ ضرورت تھی نہ قرآن نے اس کی وضاحت کی کہ یہ کونسا درخت تھا البتہ تفسیروں میں گندم، انگور، کھجور، کافور، انجیر، حنظل اور نہ معلوم کون کونسے درختوں کے نام مذکور ہیں، بعض کا خیال ہے کہ وہ محض مجازی معنیٰ میں تھا یعنی شجرِ علم، شجرِ محبت اور شجرِ معرفت وغیرہ۔{۴۰}

اکثر محققین نے خاموشی اختیار فرمائی ہے اور تعیین کو غیر ضروری خیال کیا ہے۔{۴۱}

اصل حکم تو یہ تھا کہ اس درخت کا پھل نہ کھایا جائے لیکن نہی میں مبالغہ کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع کر دیا گیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ اور حرام کے محل سے بھی دور رہنا چاہیے ورنہ ابتلاء کا اندیشہ ہے۔

﴿۲۰﴾...... بغض اور حسد کی آگ میں جلے ہوئے ابلیس نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا، وسوسہ چونکہ خیالی تصرف کا نام ہے اس لیے اتصالِ مکانی شرط نہیں، دور رہ کر بھی ایسا تصرف ہوسکتا ہے۔

{۳۸} بخاری ۱/۴۶۹، مسلم/ رضاع، باب ۶۱، ۶۲، الدارمی/ نکاح، باب ۴۵

{۳۹} الانبیآء/۲۱/۳۷

{۴۰} قیل الحنطة وقیل النخلة وقیل شجرة الکافور وقیل التین وقیل الحنظل وقیل شجرة المحبة وقیل شجرة الطبیعة والھوی (روح المعانی ۱/۳۷۳)

{۴۱} واعلم انّه لیس فی الظاھر مایدل علی التعیین فلاحاجة ایضا الی بیانه لأنّه لیس المقصود من ھذا الکلام ان یّعرفنا تلك الشجرة (تفسیر کبیر/۱/۴۵۴)

قرآن، وسوسہ کا شکار ہونے کی ذمہ داری دونوں پر ڈالتا ہے جبکہ بائبل صرف حضرت حوّاء کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے:

''اور عورت نے جو دیکھا کہ درخت کھانے میں اچھا اور دیکھنے میں خوشنما اور عقل بخشنے میں خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے خصم کو بھی دیا'' {۴۲}

جیسا کہ مذاہبِ عالم پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ حضرت حوّاء کو ذمہ دار ٹھہرانے کا اصل مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مرد کو گناہ میں مبتلا کرنے اور دنیا میں وقوع پذیر ہونے والی خرابیوں کی ذمہ داری عورت پر عائد ہوتی ہے۔

﴿۲۱﴾......ابلیس جانتا تھا کہ آدم اور حوّاء آسانی سے میری بات پر اعتماد نہیں کریں گے اس لیے کہ اللہ نے مخصوص درخت کے قریب جانے سے منع کیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ ابلیس تمہارا دشمن ہے اس لیے اس نے اپنی بات کو قسم سمیت کئی تاکیدات سے مؤکد کر کے پیش کیا۔ {۴۳}

﴿۲۲﴾......شیطان نے اپنی دعوت کو ایسا مزیّن اور مؤکد کر کے پیش کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام اس کی باتوں میں آگئے اور کچھ دیر کے لیے اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہد و پیمان کو بھول گئے، سورۂ طٰہٰ میں ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا {۴۴}

''اور اس سے قبل ہم نے آدم سے ایک عہد لیا تھا مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس کے عزم کو پختہ نہ پایا''

جب دونوں نے درخت کا پھل چکھ لیا تو نور کا لباس جس نے ان کی شرمگاہوں کو ایک دوسرے سے چھپا رکھا تھا۔ {۴۵} اتر گیا اور وہ شہوت کا زور اپنے اندر محسوس کرنے لگے، بائبل میں ہے:

''تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انہیں معلوم ہوا کہ ہم ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں'' {۴۶}

تب اللہ کی طرف سے ڈانٹ پڑی کہ ہم نے جس کام سے تمہیں منع کیا تھا، اس کا ارتکاب تم نے کیوں کیا؟ {۴۷}

{۴۲} بائبل پیدائش ۳:۶ ۱۷:۲۰

{۴۳} ابلیس کے قول میں چار تاکیدات پائی جاتی ہیں (۱) قسم (۲) حرف انّ (۳) لام (۴) لکما کی تقدیم جو کہ حصر پر دلالت کرتی ہے)

{۴۴} طٰہٰ/۲۰/۱۱۵

{۴۵} وقال وهب بن منبه في قوله "ينزع عنهما لباسهما" قال: كان لباس آدم وحوّاء نورا على فروجهما (تفسیر ابنِ کثیر ۲/۲۷۸)

{۴۶} پیدائش ۳:۷

{۴۷} عتاب على مخالفة النهي وتوبيخ على الاغترار بقول العدو (بیضاوی ۳/۱۳)

﴿۲۳﴾......غلطی کا احساس ہوا تو دونوں رونے لگے مگر کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ اعترافِ گناہ کیسے کریں چنانچہ باری تعالیٰ نے خود ہی مبارک کلمات سکھائے جو کہ انہوں نے انتہائی عاجزی اور تواضع کے ساتھ بار بار دہرائے اور انہیں معاف کر دیا گیا۔

﴿۲۴﴾......آدم اور حوّاء علیہا السلام اور ابلیس تینوں کو زمین پر اُترنے کا حکم ہوا، اترتے ہوئے یہ بھی بتا دیا گیا کہ تمہارے درمیان ہمیشہ عداوت رہے گی اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ زمین پر بسیرا ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ محدود اور متعین مدّت کے لیے ہوگا۔

﴿۲۵﴾......اس اجمال کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم اپنی پوری زندگی...... وہ جتنی بھی ہے...... زمین پر گزارو گے، اختتامِ زندگی پر موت بھی یہیں آئے گی پھر جب اللہ دوبارہ زندہ کرنا چاہے گا تو یہیں سے نکالے جاؤ گے۔

حکمت وہدایت:

۱......اللہ کے نزدیک بہترین زندگی، ازدواجی زندگی ہے، اسی لیے کاروانِ انسانی کے پہلے فرد اور نبی نے بھی ازدواجی زندگی گزاری اور دیگر انبیاء بھی شادی شدہ تھے (۱۹) {۴۸}

۲......کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں شوہر ہو وہیں اس کی بیوی بھی ہو۔ (۱۹)

۳......وسوسہ، شیطان کا انتہائی کارگر ہتھیار ہے، اللہ کے نیک بندے بھی اس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ (۲۰)

۴......مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے مقابلہ میں نہ کسی کے پروپیگنڈا سے متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی زوردار قسموں سے۔ (۲۱)

۵......شیطان کی سب سے زیادہ کوشش اس مقصد کے لیے ہے کہ وہ انسان کو عریاں کردے۔ (۲۲)

۶......غلطی کا اعتراف اور استغفار بندگی کی علامت اور ابوالبشر کی سنت ہے۔ (۲۳)

۷......شیطان کی انسان کے ساتھ دشمنی دائمی ہے۔ (۲۴) احمق ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اسے دوست بناتا ہے۔

۸......بائبل اور قرآن...... بائبل میں حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کے حوالے سے جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے چند اشارات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

{۴۸} ولقد أرسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لهم أزواجا وذرّيّة (سورة الرّعد آیت ۳۸)

بشکریہ اطلس القرآن اردو
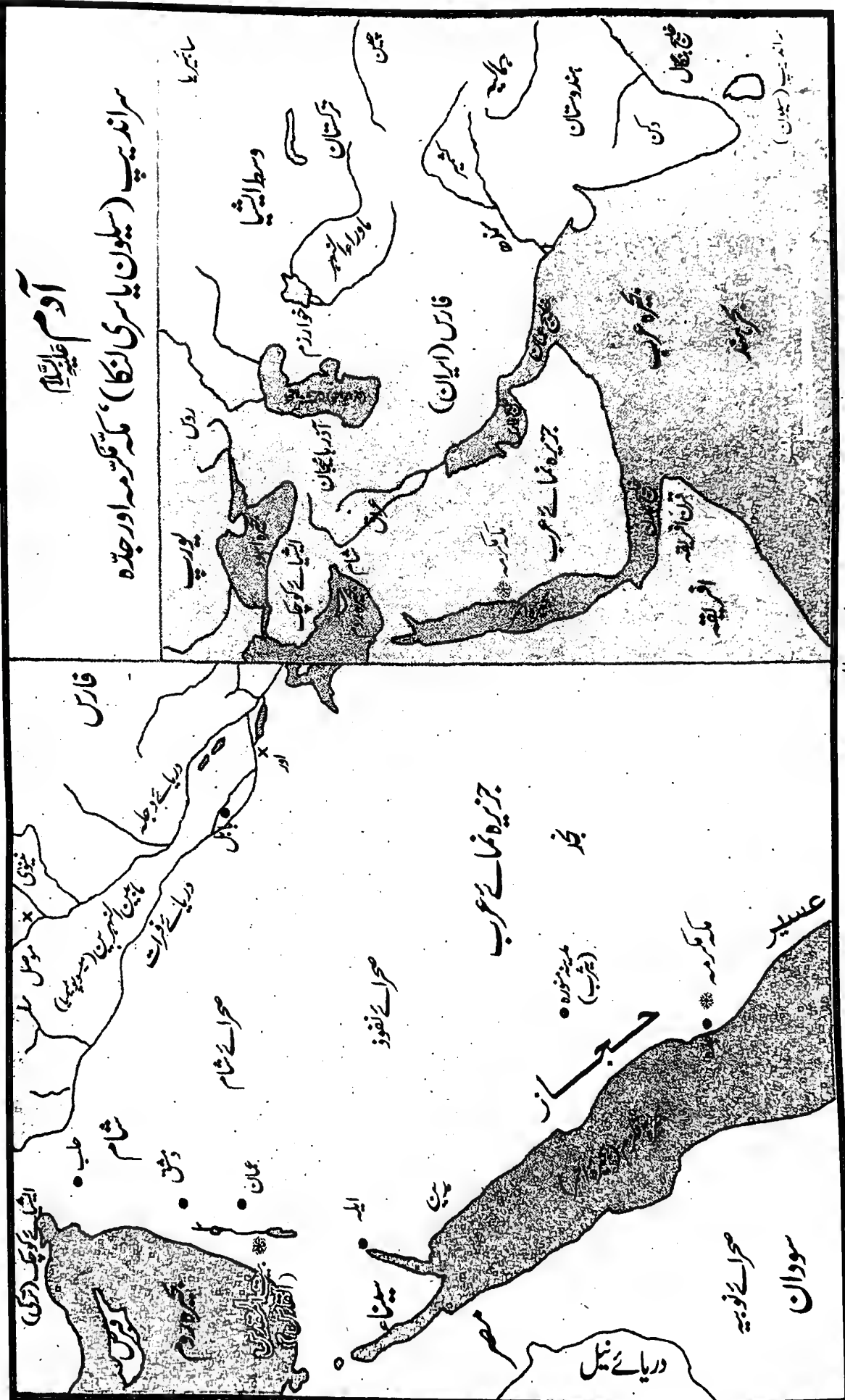
☆......آدم کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکال کر اسے عورت بنادیا گیا، اسی لیے مرد اپنے والدین سے دور اور بیوی کے قریب رہتا ہے۔

☆......زمین کے سارے جانوروں میں مکّار جانور سانپ ہے، سانپ ہی نے حوّاء کو ورغلایا تھا۔

☆......خداوند شام کے وقت باغ میں پھر رہا تھا، آدم اور حوّاء اسے دیکھ کر درختوں میں چھپ گئے۔

☆......سانپ کی پوری نسل کو پیٹ کے بل گھسٹنے کی سزا دی گئی اور اس کی نسل اور عورت کی نسل کے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ڈال دی گئی۔

☆......چونکہ آدم نے اپنی بیوی کی بات مان کر ممنوعہ پھل کھالیا تھا اس لیے اس کے سبب سے زمین لعنتی ہوگئی۔

☆......پھل کھا کر آدم نیک وبد کی پہچان میں خداوند خدا کی مانند ہوگیا اب اندیشہ تھا کہ وہ شجرِ حیات کا پھل کھا کر ہمیشہ جیتا رہے اس لیے اسے باغِ عدن سے باہر کر دیا گیا۔

ایک طرف بائبل کا بیان ہے جس کے مطالعہ سے قدم قدم پر عقل اور عدل کے تقاضوں پر حرف آتا ہے، دوسری طرف قرآن ہے جو فکر وشعور کو پروان چڑھاتے ہوئے بلندی کی طرف لیجاتا ہے......قارئین خود موازنہ کر سکتے ہیں۔

اگر قرآنِ کریم کی کسی تفسیر میں بائبل سے ملتی جلتی تفصیلات ملیں تو جان لیں کہ یہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں اور اسرائیلی روایات کے بارے میں اصول یہ ہے کہ ہم صرف ان روایات کی تصدیق کرتے ہیں جو کتاب وسنت کے موافق ہوں اور جو ان کے مخالف ہوں، انہیں ہم ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔

نعمتِ لباس اور شیطان کی کوشش

﴿۲۶......۲۷﴾

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ

اے اولادِ آدم کی، ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری شرمگاہیں اور اتارے آرائش کے کپڑے، اور لباس پرہیزگاری کا وہ سب سے

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ

بہتر ہے، یہ نشانیاں ہیں اللہ کی قدرت کی تاکہ وہ لوگ غور کریں۔ اے اولادِ آدم کی، نہ بہکائے تم کو شیطان جیسا کہ اس نے نکالا تمہارے ماں باپ کو بہشت

الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا

سے، اتروائے ان سے ان کے کپڑے تاکہ دکھلائے ان کو شرمگاہیں ان کی، وہ دیکھتا ہے تم کو اور اس کی قوم جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے

الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

ہم نے کر دیا شیطانوں کو رفیق ان لوگوں کا جو ایمان نہیں لاتے۔

ربط: گزشتہ آیات میں بتایا گیا کہ انسان کو زمین پر اتار دیا گیا، یہاں بتایا جارہا ہے کہ انسان کو دین اور دنیا کے تقاضے پورے کرنے کے لیے جن اشیاء کی ضرورت تھی وہ اشیاء بھی اسے مہیا کر دی گئیں۔

تسہیل: اے آدم کی اولاد! ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا جو تمہارا ستر بھی چھپاتا ہے اور باعثِ زینت بھی ہے اور لباس تو بس تقویٰ ہی کا بہتر ہے، یہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں○ اے آدم کی اولاد، شیطان تمہیں کہیں فتنے میں نہ ڈال دے جیسے اس نے تمہارے والدین کو جنت میں سے نکلوایا، ان کے لباس اتروا دیے تاکہ انہیں ان کی شرمگاہیں دکھلا دے، بے شک شیطان اور اس کی جماعت تمہیں ایسی جگہ سے دیکھ رہے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے، ہم نے شیاطین کو ایسے لوگوں کا والی بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے○

﴿تفسیر﴾

﴿۲۶﴾......اے آدم کی اولاد! ان نعمتوں کو یاد کرو جو تم پر اور تمہارے باپ آدم پر نازل ہوئیں، ان میں سے ایک نعمت لباس بھی ہے۔

نازل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تیار شدہ لباس آسمان سے اتارا جاتا ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے وہ مادہ پیدا کیا جس سے لباس تیار ہوتا ہے۔{۴۹}

ظاہر ہے زمین بھی اللہ نے پیدا فرمائی، زمین میں جو بیج ڈالا جاتا ہے اس کی نشوونما بھی اللہ کرتا ہے، اون اور وہ جانور جن سے اون حاصل ہوتی ہے، ریشم اور ریشم کا کیڑا سب اللہ ہی نے پیدا کیے ہیں، خام روئی، اون اور ریشم کا دھاگہ بنانے اور اسے کپڑے کی شکل دینے کی صنعت بھی اللہ ہی نے سکھائی ہے، یوں تو ہر دور کے انسان پر اللہ کا شکر ادا کرنا واجب تھا مگر آج کی دنیا میں رہنے بسنے والے انسان پر شکر کی ادائیگی سب سے زیادہ ضروری ہے اس لیے کہ آج کل لباس کی صنعت نے جتنی ترقی کی ہے، ماضی کا انسان اس سے نا آشنا تھا، پھر یہ بھی ہے کہ ایسے حضرات اور خواتین آپ کو کثرت سے ملیں گے جن کے پاس درجنوں لباس ہوں گے بلکہ ایسے بھی جن میں سے ایک ایک کی

{۴۹} جعل ما فی الارض منزلا من السماء لانہ قضی ثم وکتب) (کشاف ۹۳/۲)(وقال آلوسی "ای خلقنالکم ذلک باسباب نازلۃ من السماء(روح المعانی ۵/الجزء الثامن ۱۵۳)

الماریوں میں سینکڑوں لباس سجے ہوں گے، ورزش کا لباس اور، سونے کا لباس اور، گھر کا لباس اور، باہر کا لباس اور، دعوت کا لباس اور، دفتر کا لباس اور، گرمی کا لباس اور، سردی کا لباس اور۔

لباس کا اوّلین مقصد:

لباس کا اوّلین مقصد ستر پوشی ہے، ایسا لباس پہننے والے کو عریاں شمار کیا جائے گا جو ستر پوشی کے تقاضے پورے نہ کرتا ہو، برہنگی اور نیم برہنگی کا فلسفہ جاہلیت کا فلسفہ ہے خواہ اس کی تبلیغ یورپ کے ''روشن خیالوں'' کی جانب سے ہو رہی ہو یا افریقہ اور عرب کے وحشی اس کے علمبردار ہوں، مسلمان کی نظر میں جاہلیتِ قدیمہ اور جدیدہ میں لیبل کے علاوہ کوئی فرق نہیں، قرآن بتاتا ہے کہ جب اللہ کی نافرمانی کی جائے تو اس کا پہلا نتیجہ عریانیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

﴿وَرِيْشًا﴾ لباس کا دوسرا مقصد زیب و زینت بھی ہے۔{۵۰}

ستر پوشی کے لیے تو لنگوٹی بھی کافی تھی لیکن اللہ نے ہمارے لیے ایسے لباس کا انتظام فرمایا ہے جو ستر پوش بھی ہے، گرمی اور سردی سے بھی ہماری حفاظت کرتا ہے اور ہماری شخصیت کو جاذبِ نظر بھی بناتا ہے، لباس کی بناوٹ میں آرائش اور زیبائش کو پیشِ نظر رکھنا قابلِ اعتراض نہیں البتہ دکھاوا اور نمائش سخت معیوب ہے۔

ایسے لوگوں کو یقیناً اسلام کے غلط ترجمان اور بے علم ہی قرار دیا جائے گا جو ننگ دھڑنگ رہنے والوں کو درجۂ ولایت پر فائز سمجھتے ہیں، ہمارے آقا ﷺ کا لباس سادہ تو ہوتا تھا مگر میلا کچیلا یا ادھورا نہیں ہوتا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ لباس پہنتے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

''الحمدلله الذی رزقنی من الریاش ماأتجمل به فی الناس و أواری به عورتی''

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے ایسا لباس عطا کیا ہے جو میرے حسن میں اضافہ بھی کرتا ہے اور اس سے میں اپنا ستر بھی چھپاتا ہوں'' {۵۱}

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے نیا لباس پہنتے ہوئے یہ دُعا پڑھی:

''الحمدلله الذی کسانی ماأواری به عورتی وأتجمل به فی حیاتی''

{۵۰}''وریشا'' ولباسا تتجملون به، والریش الجمال (ابی سعود ۲/۴۸۷)

{۵۱}مسند احمد/۱/۱۵۷

اس کے بعد اس نے اپنا پرانا لباس اللہ کی راہ میں دے دیا تو ایسا شخص زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد اللہ کے ذمہ، اللہ کے پڑوس اور اللہ کی ستر پوشی میں ہوگا۔{۵۲}

﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ اور لباس تو بس تقویٰ ہی کا بہتر ہے' لباسِ تقویٰ سے مراد ظاہری لباس ہے یا باطنی؟ دونوں قسم کے اقوال مفسرین سے منقول ہیں، بعض حضرات نے میدانِ جنگ میں پہنے جانے والی ذرہ، خود اور ہتھیاروں کو ''لباسِ تقویٰ'' قرار دیا ہے لیکن اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اس سے باطنی اور معنوی لباس مراد ہے یعنی ایمان، اللہ کا خوف، اچھے اخلاق، حیا، بندگی کا احساس اور عملِ صالح، یہ وہ لباس ہے جو انسان کو اللہ کی نظر میں بہت خوبصورت بنا دیتا ہے اور اُس کی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے، یہ لباس نہ ہو تو انسان خلعتِ فاخرہ پہن کر بھی ننگا ہی رہتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ ظاہری اور باطنی لباس کی نعمت اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمتوں اور دلائل میں سے ہے جو بندوں پر اللہ کے فضل، احسان اور رحمت پر دلالت کرتے ہیں، انسان کو چاہیے کہ ان نعمتوں کو یاد رکھے تا کہ اسے شکر کرنے اور شیطان کے فتنوں سے بچنے کی توفیق ہو۔

﴿۲۷﴾......اللہ تعالیٰ انسانوں کو دوبارہ ''يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ'' کہہ کر خطاب فرما رہے ہیں، یہ جو تکرار ہے، یہ نہ صرف عربی بلکہ کم و بیش ہر انسانی زبان میں تنبیہ اور تاثیر کے لیے ہوتا ہے جس کے اندر انسانیت زندہ ہوگی وہ اس خطاب سے ضرور متاثر ہوگا، انبیائے کرام علیہم السلام اپنی قوم کو بار بار ''یٰـقَوْمِ'' کہہ کر جو خطاب فرماتے تھے یا حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو تکرار کے ساتھ ''یٰبنی'' کہا تو اس میں بھی یہی نکتہ پوشیدہ تھا یعنی محبت، خلوص اور درد اور اس میں شک ہی کیا ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت فرماتے ہیں اور انہیں دنیا اور آخرت کی پریشانی اور عذاب سے بچانا چاہتے ہیں، اللہ فرماتے ہیں:

''اے آدم کی اولاد! شیطان تمہیں کہیں فتنہ میں نہ ڈال دے'' وہ تمہارا بھی دشمن ہے اور تمہارے پہلے والدین کا بھی دشمن تھا، اسی کی وسوسہ اندازی ان کے جنت سے نکلنے کا سبب بنی تھی، اس کے لیے تمہیں دخولِ جنت سے محروم رکھنا، جنت سے نکالنے کے مقابلے میں بہت آسان ہے، تم نے نہ جنت دیکھی نہ اس کی نعمتیں، جس جوڑے نے سب کچھ دیکھا تھا وہ اس کی باتوں میں آ گیا، تمہیں دھوکہ دینا تو اس کے لیے بہت زیادہ آسان ہوگا لہٰذا ہر وقت چوکنے رہو اور اپنے بارے میں کبھی بھی مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جاؤ۔

{۵۲} ترمذی/۲/کتاب الدعوات/۱۰۷، ابن ماجہ/ کتاب اللباس/باب ۲

شیطان کی کوشش:

﴿ يَنْزِعُ عَنْهُمَا ﴾ شیطان نے تمہارے والدین کو جنت سے ننگا کر کے نکالا تھا، اس کی کوشش ہے کہ تمہیں بھی ننگا کردے، قصۂ آدم کی یہ کڑی خاص طور پر ذکر کرنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ جہاں قرآن نازل ہوا وہاں جاہلی مشرکوں میں یہ صورتحال عملی طور پر موجود تھی نہ صرف یہ کہ ان کی عمومی زندگی میں بھی فحاشی اور عریانیت داخل ہو چکی تھی بلکہ انہوں نے عریانیت کو اپنی مذہبی روایات کا بھی حصہ بنالیا تھا چنانچہ وہ بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے اور خاص قسم کے لباس کو ضروری قرار دیتے تھے۔

قرآن کی نظر صرف اپنے زمانۂ نزول کے ماحول پر نہیں بلکہ قرآن مستقبل میں پیش آنے والی صورتحال کو بھی سامنے رکھتا ہے، اللہ جانتا تھا کہ شیطان، انسان کو ننگا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا اس لیے اللہ نے انسان کو ہوشیار بن کر رہنے کی تلقین کی مگر افسوس کہ انسان بہکاوے میں آ گیا، کافر تو کا فر مسلمان بھی عریانیت کے فتنے سے اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔

﴿ إِنَّهُ يَرٰكُمْ ﴾ شیطان کی فتنہ اندازی سے چوکنا رہنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ چھپا ہوا دشمن ہے، انسان اس کی نظر میں ہے لیکن وہ انسان کو دکھائی نہیں دیتا اور ایسا دشمن از حد خطرناک ہوتا ہے۔

یہاں سے بھی ثابت ہوا کہ جنّات، انسان کو دکھائی نہیں دیتے البتہ اگر وہ انسان یا حیوان کی شکل میں ہوں تو انہیں دیکھنا ممکن ہوگا۔

﴿ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ ﴾ ''ہم نے شیاطین کو ایسے لوگوں کا والی بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے'' اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے لیکن اس نسبت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس عمل میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا یا یہ کہ وہ ایسا مسبب اور نتیجہ ہے جس کا کوئی سبب نہیں، ایک ہی عمل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور انسان کی طرف بھی ہو سکتی ہے، انسان کی طرف اس لیے کہ وہ عمل اس سے صادر ہوتا ہے اور اللہ کی طرف اس لیے کہ وہ انسانوں اور اعمال و اسباب کا خالق ہے، شیاطین ایسے انسانوں کے دوست بنتے ہیں جو ان کے وساوس قبول کرتے اور ان کی اتباع کرتے ہیں جیسے وہ لوگ جو سڑی ہوئی غذا کھا کر اور آلودہ پانی پی کر بیمار ہو جاتے ہیں تو ہم بیماری کی نسبت اللہ کی طرف کر دیتے ہیں کیونکہ صحت اور مرض سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، دل میں ایمان کا نہ ہونا شیطان کی دوستی کا سبب بن جاتا ہے اور یہی اللہ کا فیصلہ ہے۔{۵۳}

{۵۳} اناحکمنا بأن الشیطن ولی لایؤمن (تفسیر کبیر ۵/۲۲۴)

اسی سورت میں چند آیات آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ {۵۴}

''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں''

یہاں سے ظاہر ہوا کہ ایمان اور یقین سے محروم لوگ شیاطین کو خود دوست بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت محض تکوینی طور پر ہے۔

حکمت و ہدایت:

۱......لباس اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک اہم نعمت ہے۔

۲......لباس کے بڑے مقاصد دو ہیں، زیبائش و آرائش اور سترِ عورت، ان میں سے بھی زیادہ اہمیت سترِ عورت کو حاصل ہے، احناف کے نزدیک مرد کے لیے ناف سے گھٹنوں تک اور عورت کے لیے پورے جسم کا چھپانا ضروری ہے البتہ چہرے اور ہتھیلیوں کا ضرورت کے وقت کھولنا جائز ہے۔

۳......اصل لباس، تقویٰ کا لباس ہے یعنی ایمان، عملِ صالح اور اچھے اخلاق، یہ لباس انسان کو گناہوں سے بچاتا اور اللہ کی نظر میں خوبصورت بنا دیتا ہے۔

۴......جو شخص شیطان کے قابو میں آ جائے وہ اسے فحاشی اور عریانیت کا دلدادہ بنا دیتا ہے۔

۵......جو لوگ اللہ کا ذکر نہیں کرتے اور ان کے سینے ایمان اور یقین سے خالی ہوتے ہیں، انہیں شیطان اپنے قابو میں لے لیتا ہے، البتہ اللہ کو یاد رکھنے والے اس کے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔

{۵۴} الاعراف/۳۰

تقلیدِ آباء یا تقلیدِ وحی

﴿۲۸......۳۰﴾

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَاۤ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ

اور جب کرتے ہیں کوئی برا کام تو کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا اسی طرح کرتے اپنے باپ دادوں کو اور اللہ نے بھی ان کو یہ حکم کیا ہے،

اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۟ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ

تُو کہہ دے کہ اللہ حکم نہیں کرتا برے کام کا، کیوں لگاتے ہو اللہ کے ذمہ وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں؟ تو کہہ دو کہ میرے رب

كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ۬ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَرِیْقًا هَدٰى

نے حکم کر دیا ہے انصاف کا اور سیدھے کرو اپنے منہ ہر نماز کے وقت اور پکارو اس کو خالص اس کے فرمانبردار ہو کر، جیسا تم کو

وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ

پہلے پیدا کیا دوسری بار بھی پیدا ہو گے۔ ایک فرقہ کو ہدایت کی اور ایک فرقہ پر مقرر ہو چکی گمراہی، انہوں نے بنایا شیطانوں کو

یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

رفیق اللہ کو چھوڑ کر اور سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔

ربط: گزشتہ آیات کے آخر میں مذکور ہوا کہ شیاطین، ایمان نہ لانے والوں کے دوست ہوتے ہیں، یہاں اس دوستی کا نتیجہ ذکر کیا گیا ہے یعنی اطاعت اور اتباع۔

تسہیل: اور جب وہ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں جس پر روک ٹوک کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے، آپ فرما دیجیے کہ بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کی طرف ایسی باتوں کی نسبت کرتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے ○ آپ فرما دیجیے، مجھے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور ہر سجدہ اور نماز میں اپنی توجہ اسی کی طرف رکھو اور عبادت کو ہر قسم کے شرک سے پاک کر کے صرف اسی کو پکارو، جیسے اس نے تمہیں پہلے پیدا کیا ہے اسی طرح تم دوبارہ پیدا کیے جاؤ گے ○ ایک فریق کو اس نے ہدایت دی اور دوسرے فریق پر گمراہی واجب ہو گئی کیونکہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا سرپرست بنا لیا تھا اس کے باوجود وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ ہدایت پر ہیں ○

﴿تفسیر﴾

﴿۲۸﴾...... جب مشرک کوئی ایسا قبیح عمل کرتے جو شرعاً قابلِ مذمت ہوتا اور عقل بھی اسے برا سمجھتی اور اس پر انہیں برا

بھلا کہا جاتا تو وہ جواب میں دو باتیں کہتے، ایک تو یہ کہ ہم نے اپنے آباءواجداد کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے اور ہم انہی کے مقلد ہیں، دوسری بات وہ یہ کہتے کہ اللہ نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

ان میں سے جو پہلی حجت تھی اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا اس لیے کہ اسے حجت قرار دینا لفظِ حجت کی توہین ہے، ویسے بھی قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس نام نہاد حجت کی تردید کردی گئی ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے کہ جب مشرکین نے آباء کی تقلید کو دلیل کے طور پر پیش کیا تو انہیں جواب دیا گیا:

﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾{۵۵}

''کیا اگر ان کے آباء نہ تو کسی چیز کی عقل رکھتے تھے اور نہ ہی وہ ہدایت پر تھے، پھر بھی یہ انہی کی اتباع کریں گے؟''

البتہ دوسری حجت کا عقلی جواب بھی دیا گیا ہے اور نقلی جواب بھی۔

عقلی جواب کی تفصیل یہ ہے کہ مشرکین طوافِ کعبہ کرتے ہوئے جس عریانیت کا مظاہرہ کرتے تھے اسے قبیح اور شرمناک تسلیم کرنے کے ساتھ اس قسم کی بے حیائی سے اللہ تعالیٰ کے منزّہ ہونے کا اقرار بھی کرتے تھے اس لیے انہیں یہ کہہ کر عقل استعمال کرنے کا حکم دیا گیا کہ ''بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا'' جو ذات بے حیائی سے پاک بھی ہے اور اس سے نفرت کرنے والی ہے وہ بے حیائی کا حکم کیسے دے سکتی ہے؟ نقلی جواب کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جس امر اور نہی کی نسبت کی جائے وہ صرف دعویٰ سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ وحیِ الٰہی سے اس کا علم ہونا ضروری ہے جبکہ مشرکین کے پاس اس قسم کی کوئی دلیل نہیں تھی اس لیے ان سے کہا گیا ''کیا تم اللہ کی طرف ایسی باتوں کی نسبت کرتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے؟''

اس آیت کریمہ میں جس شرمناک فعل کا ذکر ہے، مفسرین کے بقول اس سے مشرکین کے دوسرے کرتوتوں کے علاوہ خاص طور پر بیت اللہ کا ننگے ہو کر طواف کرنے کی طرف اشارہ ہے، مرد تو مرد خواتین بھی اپنی شرمگاہ پر چمڑے کا چھوٹا سا ٹکڑا رکھ کر یہ کہتے ہوئے طواف شروع کردیتی تھیں کہ ہم اسی حالت میں بیت اللہ کا طواف کریں گی جس حالت میں اپنی ولادت کے دن تھیں، ان میں سے بعض کی زبان پر یہ شعر ہوتا تھا۔

اليوم يبدو بعضه أو كله............ وما بدا منه فلا أحلّه.{۵۶}

ترجمہ: آج اس کا کچھ حصہ ظاہر ہوگا یا پورا......اور جو ظاہر ہوگا اسے میں کسی کے لیے حلال نہیں سمجھتی

{۵۵}البقرۃ/۲/۱۷۰

{۵۶}قرطبی ۷/۱۶۸

شیطان نے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ جن کپڑوں میں ہم گناہ کرتے ہیں انہی کپڑوں میں بیت اللہ کا طواف کرنا مناسب نہیں...... دنیا بھر کے مذہبی پروہت اور پجاری عیاشی کی خاطر فحاشی کی مختلف صورتوں کو رواج دیتے رہے ہیں اور آج بھی ایسوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

﴿۲۹﴾...... آیت ۲۸ میں تھا کہ اللہ ''فحشاء'' یعنی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، اور یہاں فرمایا گیا کہ باری تعالیٰ ''قسط'' یعنی عدل اور اعتدال کا حکم دیتا ہے، ''فحشاء'' اور ''قسط'' ایک دوسرے کی ضد میں ''فحشاء'' میں حد سے تجاوز پایا جاتا ہے جبکہ ''قسط'' حدود کا خیال رکھتے ہوئے اعتدال پر رہنے کا نام ہے، عدل اور اعتدال اسلامی شریعت کی روح ہے، عقائد ہوں یا اعمال، عبادات ہوں یا اخلاق، معیشت ہو یا معاشرت، قانون ہو یا سیاست، زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال مطلوب ہے، ویسے کائنات میں عدل کی سب سے بڑی بات ''لا الہ الا اللہ'' ہے، شاید اسی لیے پہلے ''قسط'' کا اور اس کے متصل بعد نماز کا حکم دیا گیا جو ایمان کا بنیادی رُکن ہے۔{۵۷}

﴿وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ﴾ سجدہ اور نماز بلکہ ہر عبادت میں صرف اللہ کی طرف توجہ رکھنا اور شرک سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا بھی عدل میں شامل ہے۔

شرکِ اکبر ہو یا کہ شرکِ اصغر دونوں ظلم ہیں، شرکِ اکبر کا مطلب ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرنا اور شرکِ اصغر دکھاوے اور شہرت پسندی کو کہا جاتا ہے۔

گناہ آلود لباس میں طواف کے ناجائز ہونے کی طرح شیطان نے مشرکین کے دل میں یہ وسوسہ بھی ڈالا ہوا تھا کہ گناہ گار کو براہِ راست اللہ سے دعا نہیں کرنی چاہیے بلکہ اللہ کے نیک بندوں میں سے کسی کو وسیلہ بنانا ضروری ہے ظاہر ہے یہ ایک افتراء اور جھوٹ تھا، شریعت کا حکم اس کے برعکس یہ ہے کہ اللہ کو پکارنے کے لیے کسی وسیلے کی ضرورت نہیں، اسے ہر جگہ، ہر وقت اور ہر کوئی پکار سکتا ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد ہو۔

﴿كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ﴾ (جیسے اس نے تمہیں پہلے پیدا کیا ہے اسی طرح تم دوبارہ پیدا کیے جاؤ گے) یہ بھی انصاف کا تقاضا ہے کہ مرنے کے بعد ایک اور زندگی ہو جس میں ہر کسی کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے کیونکہ اس زندگی میں پورا انصاف نہیں ہوتا، مجرم اور ظالم عیاشی کرتے ہیں جبکہ عابد و عادل مصائب و آلام کا شکار رہتے ہیں۔

{۵۷} وقال ابن عباس: هو قول لا اله الا الله، والدليل عليه قوله: شهد الله انه لا اله الا هو والملائكة واولوا العلم قائما بالقسط (تفسیر کبیر ۵/۲۲۶)

دوسری زندگی کے لیے انسان اکیلا اٹھے گا، اس کا کوئی شریک، کوئی دیوتا اور کوئی سفارشی اس کے ساتھ نہیں ہوگا، گویا ان الفاظ میں توحید اور آخرت کا تعلق بھی واضح ہو گیا اور آخرت کی ایک مضبوط دلیل بھی بیان ہو گئی۔

﴿۳۰﴾...... قیامت کے دن اٹھنا اس حال میں ہوگا کہ انسانوں کی دو جماعتیں ہوں گی، ایک جماعت وہ ہوگی جسے اللہ نے پیغمبروں کے ذریعے ہدایت دی، اس جماعت نے ایمان قبول کیا، عقیدۂ توحید پر قائم رہی اور اپنے آپ کو شر سے بچائے رکھا۔

دوسری جماعت وہ ہوگی جو نفس اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر راہِ حق سے ہٹ گئی۔ جس جماعت کا جس حالت میں انتقال ہوا ہوگا اسی حالت پر اسے قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔

﴿اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ﴾ دوسری جماعت پر گمراہی مسلط ہونے کی وجہ یہ ہوگی کہ انہوں نے شیطانوں کو اپنا سرپرست بنا کر اپنے سارے معاملات ان کے حوالے کر دیئے تھے، شیطانوں نے ان کے لیے ظلم، زیادتی اور بے حیائی کے سارے کاموں کو مزیّن کر دیا تھا اور انہوں نے انہی کاموں میں زندگی بسر کر دی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ ہدایت پر ہیں اور بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔

حکمت وہدایت:

۱...... دینی معاملات میں ایسے آباء واجداد کی تقلید حرام ہے جو بے علم، بے عقل اور بے دین ہوں البتہ حق پرست آباء کی تقلید نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے، جاہلوں کی تقلید کی مذمت کے بارے میں واردشدہ آیات سے ہر تقلید کے حرام ہونے پر استدلال کرنا قرآن میں معنوی تحریف سے کم نہیں ہے۔(۲۸)

۲...... کسی ایسی بات کی اللہ اور رسول کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں جس پر کوئی شرعی حجّت اور دلیل نہ ہو۔(۲۸)

۳...... اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں عدل اور اعتدال پایا جاتا ہے، اس کے کسی بھی حکم میں بے حیائی اور گناہ کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔(۲۹)

۴...... مؤمن پر لازم ہے کہ وہ اپنی عبادت میں دو چیزوں کا لحاظ رکھے، ایک تو یہ کہ اس کا عمل شریعت کے موافق ہو، دوسری چیز یہ کہ اس کی عبادت خالص اللہ کے لیے اور شرکِ اکبر اور شرکِ اصغر سے پاک ہو۔(۲۹)

۵...... جس اللہ نے انسان کو پہلی بار پیدا کیا ہے وہ اسے دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے اور ایسا کرنا اس کے قانونِ عدل کا تقاضا ہے۔(۲۹)

۶......وہ لوگ بھی گمراہ ہیں جو ضلالت کا راستہ جان بوجھ کر اختیار کرتے ہیں اور وہ بھی گمراہ ہیں جو اپنے خیال میں ہدایت پر ہوتے ہیں حالانکہ وہ گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اگر ضلالت و جہالت کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے لوگ کم ملیں گے جنہوں نے ضد اور عناد کی بناء پر اپنے لیے گمراہی کا انتخاب کیا، اکثریت ایسی جماعتوں، فرقوں اور افراد کی ملے گی جو اندھی تقلید، اتباعِ نفس اور شیطانی حیلوں کی وجہ سے اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے رہے، سورۂ کھف کے آخر میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾

''فرما دیجیے میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں بتاؤں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں ہوں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ضائع ہوگئی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں'' {۵۸}

زینت اور سامانِ خورد و نوش کی اباحت

﴿۳۱.....۳۲﴾

يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝

اے اولادِ آدم کی، لے لو اپنی آرائش ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو اور بے جا خرچ نہ کرو، اس کو خوش نہیں آتے بے جا خرچ کرنے والے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ۚ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي

تو کہہ! کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو اس نے پیدا کی اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی تو کہہ! یہ نعمتیں اصل میں ایمان والوں کے واسطے ہیں

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

دنیا کی زندگی میں، خالص انہی کے واسطے ہیں قیامت کے دن، اسی طرح مفصل بیان کرتے ہیں ہم آیتیں ان کے لئے جو سمجھتے ہیں۔

ربط: پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تمام معاملات میں عدل اور استقامت کا حکم دیا اور اب عبادت کے لیے اچھا لباس پہننے اور اسراف کے بغیر کھانے پینے کی اجازت دی جا رہی ہے۔

{۵۸} الکھف/۱۰۳-۱۰۴

تسہیل: اے اولادِ آدم! تم ہر مسجد کی حاضری کے وقت اچھے لباس کا اہتمام کرلیا کرو اور تم خوب کھاؤ اور پیو مگر حد سے تجاوز نہ کرو بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا O آپ ان سے سوال کیجیے کہ وہ اسبابِ زینت جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے؟ آپ انہیں بتا دیجیے کہ دنیا کی زندگی میں بھی ان چیزوں کے اصل مستحق ایمان والے ہیں اور قیامت کے دن تو خالص انہی کے لیے ہوں گی، ہم ان آیات کو اہلِ علم کے لیے اسی طرح کھول کر بیان کرتے ہیں O

شانِ نزول

آیت ۳۱ کے شانِ نزول کے بارے میں مختلف روایات ہیں، ان میں سے ایک روایت صحیح مسلم میں حضرت عروہ رحمہ اللہ سے ہے، فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب بیت اللہ کا ننگے طواف کرتے تھے، سوائے قریش کے اور سوائے ان لوگوں کے جنہیں قریش کپڑے دے دیتے تھے، مرد، مردوں کو اور عورتیں، عورتوں کو کپڑے دے دیتی تھیں۔ {۵۹}

مسلم کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے کہ قریش کہتے تھے ہم اہلِ حرم ہیں لہٰذا عربوں میں سے جو کوئی طواف کرنا چاہے تو اسے ہمارے ہی کپڑوں میں طواف کرنا چاہیے اور جو کوئی ہماری سرزمین میں آئے اسے ہمارا کھانا، کھانا چاہیے، اگر کوئی ایسا اجنبی ہوتا جس کا مکّہ میں کوئی ایسا دوست نہ ہوتا جو اسے عاریت کے طور پر کپڑا دے اور نہ ہی اسے اجرت پر لینے کی طاقت ہوتی تو اسے دو میں سے ایک کام کرنا پڑتا، یا تو وہ ننگا ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتا اور یا پھر اپنے کپڑوں میں طواف کرنے کے بعد انہیں پھینک دیتا پھر اس کے کپڑوں کو کوئی بھی ہاتھ نہ لگاتا، ایسے لباس کو 'لقی' کا نام دیا جاتا، قرآن نے زمانۂ جاہلیت کی ان تمام رسموں کو باطل قرار دیتے ہوئے حکم دیا۔

﴿۳۱﴾......اے آدم کی اولاد! تم عبادت کے وقت اپنی طاقت کے مطابق اچھے لباس کا اہتمام کیا کرو۔

"زِينَة" ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی شئے یا شخص کو مزیّن کر دے، زینت کا اطلاق، مال، اولاد، زیور، سواری، عہدہ سمیت بہت ساری چیزوں پر ہوسکتا ہے مگر یہاں اس سے مراد اچھا اور باوقار لباس ہے۔ مسجد، بادشاہوں کے بادشاہ کا دربار ہے، اس دربار میں بوسیدہ، گھٹیا، میلا کچیلا اور غیر سنجیدہ لباس پہن کر آنا مناسب نہیں، کم از کم اتنا لباس، ہر مرد اور عورت پر واجب ہے جو 'سترِ عورت'' کا کام دے، گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ عورت کے لیے پورا

{۵۹} مسلم/حج/۱۵۲

جسم اور مرد کے لیے گھٹنوں سے ناف تک ڈھانپنا ضروری ہے، باقی بدن کا چھپانا مسنون ہے۔

لباس کے باعثِ زینت ہونے کے بارے میں ہر شخص کے مالی حالات کو بھی دیکھا جاتا ہے اور مسلمانوں کے مقامی عرف اور عادت کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے، بنابریں شہر اور گاؤں، عرب اور عجم میں لباس کے باوقار ہونے کے مختلف پیمانے ہو سکتے ہیں۔

باوقار لباس:

سترِ عورت اور باوقار لباس کا اہتمام اسلام کے محاسن اور احسانات میں سے ایک ہے وگرنہ بعض مذاہب میں میلا کچیلا اور ننگا رہنے کو مذہب کا حصہ سمجھا جاتا تھا، یورپ جسے آج اپنی تہذیب وتمدن اور صفائی کے نظام پر بڑا ناز ہے، قرونِ وسطیٰ میں اس کا یہ حال تھا کہ عوام ایک ہی لباس سالہا سال تک پہنتے تھے جسے دھوتے نہیں تھے، نتیجۃً وہ چرکین، میلا اور بدبودار ہو جاتا تھا، نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ جب پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی (۱۲۱۲......۱۲۵۰) پر کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرستِ الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے۔{۶۰}

جب اسپین میں اسلامی سلطنت کو زوال آیا تو فلپ دوم (۱۵۵۶......۱۵۹۸) نے تمام حمام حکماً بند کر دیئے کیونکہ ان سے اسلام کی یاد تازہ ہوتی تھی، اسی بادشاہ نے شبیلیہ کے گورنر کو محض اس لیے معزول کر دیا تھا کہ وہ روزانہ ہاتھ منہ دھوتا تھا۔{۶۱}

غلیظ جسم اور میلے لباس کی وجہ سے جوؤں کی یہ کثرت تھی کہ جب کینٹر بری (برطانیہ) کا لاٹ پادری باہر نکلتا تھا تو اس کی قبا پر سینکڑوں جوویں چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔{۶۲}

یہ تیرہویں اور سولہویں صدی کا حال تھا اور اگر ہم چھٹی صدی عیسوی میں چلے جائیں تو اس وقت معاشرت اور اخلاق کا حال اور بھی بُرا تھا۔

ہمارے پڑوسی ملک میں بعض ہندو جوگی آج بھی گندگی، عریانیت اور فحاشی کو مذہب کا لازمی جزء بنائے بیٹھے ہیں۔

{۶۰} یورپ پر اسلام کے احسان صفحہ ۷۷

{۶۱} تہذیب اسلام از مارمڈیوک پکتھال صفحہ ۳۷

{۶۲} معرکہ مذہب وسائنس صفحہ ۳۶۱ تا ۴۲۵

اسلام نے اس وقت باوقار لباس پہننے کا حکم دیا جب سرے سے لباس ہی کو غیر ضروری خیال کیا جارہا تھا، بے شمار لوگ تھے جو صرف دھوتی اور لنگوٹی پر اکتفاء کرتے تھے، اسلام نے انہیں پورا لباس پہننے کا عادی بنایا۔ باوقار اور ساتر لباس کو پوری دنیا میں رواج دینے میں اسلام کا جو عمل دخل ہے شاید کوئی فاتر العقل ہی اس کا انکار کر سکے۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز ادا کرنا چاہے تو وہ دو کپڑے پہنے، کیونکہ جن کے لیے تم آرائش کا اہتمام کرتے ہو ان میں سے سب سے زیادہ آرائش کا حقدار اللہ تعالیٰ ہے، اگر کسی کے پاس دو کپڑے نہ ہوں تو وہ نماز پڑھتے ہوئے ازار باندھ لے لیکن وہ نماز میں یہود کی طرح اپنے آپ کو کپڑے میں نہ لپیٹ لے۔{۶۳}

صحیح بخاری میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے اس حال میں کہ اس کے کندھے پر کچھ بھی نہ ہو۔{۶۴}

لذیذ اور حلال غذا:

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا﴾ لباس کے بعد پاکیزہ، لذیذ اور حلال غذا کھانے پینے کی اجازت دی گئی ہے، دورِ حاضر میں پیدا ہونے والے اور مذاہب و ملل کی تاریخ سے ناواقف انسان کے لیے یہ چیز باعثِ تعجب ہوگی کہ باری تعالیٰ نے خورد و نوش کا حکم دینے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اسے کیا خبر کہ مختلف ملکوں اور حلقوں میں ایسے مذہبی دیوانوں کی کمی نہیں رہی جنھوں نے مسلسل بھوکا رہنے اور لذیذ غذاؤں سے پرہیز کو اپنے معبودوں کی رضا کے لیے لازم قرار دیا، اسلام کا روزہ جس میں سحر و افطار کا حکم دیا گیا ہے اسے کسی طرح بھی جوگیوں اور راہبوں کی اس فاقہ کشی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جس کے نتیجے میں وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتے تھے اور ان میں ایسے بھی ہوتے تھے جن کی پوری زندگی گھاس پات پر گزرتی تھی اور وہ گوشت کو اپنے لیے حرام سمجھتے تھے۔ خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حج کے دنوں میں مرغن غذاؤں سے پرہیز کرتے تھے شاید اسی لیے لباس کے بعد کھانے پینے کا حکم دیا گیا۔

مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ وہ جو چاہیں کھا اور پی سکتے ہیں البتہ اللہ کا شکر ادا کرنا، اعتدال کو ملحوظ رکھنا اور حدود کا خیال رکھنا ضروری ہے، نہ بخل کیا جائے، نہ اسراف اور نہ ہی حلال میں حرام کی آمیزش کی جائے ہمارے آقا ﷺ

{۶۳} طبرانی، بیہقی بحوالہ تفسیر منیر/۸/۱۸۳

{۶۴} بخاری جلد۱، کتاب الصلوٰۃ/باب ۵، مسلم/صلاۃ، ۲۷۷-۲۷۸

کا فرمان ہے:

کلوا واشربوا وتصدّقوا والبسوا فی غیر مخیلة ولاسرف فان اللہ یحب ان یریٰ اثر نعمته علی عبدہ.{۶۵}

''(جو چاہو) کھاؤ پیو اور صدقہ کرو اور پہنو بشرطیکہ نہ تو تکبر کیا جائے اور نہ ہی فضول خرچی کی جائے کیونکہ اللہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا پسند کرتا ہے''

اسی طرح کی روایت حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ہے:

کل ماشئت واشرب ماشئت، والبس ماشئت ما اخطأتک اثنتان: سرف أو مخیلة.{۶۶}

''جو چاہو کھاؤ، جو چاہو پیو اور جو چاہو پہنو بس شرط یہ ہے کہ دو چیزوں سے بچ کر رہو یعنی حد سے نہ نکلو اور تکبر نہ کرو''

اسراف:

﴿وَلَا تُسْرِفُوْا﴾ اسراف کا اصل معنی ہے حد سے تجاوز کرنا، فضول خرچی کو بھی اسی لیے اسراف کہا جاتا ہے کہ اس میں حد سے تجاوز پایا جاتا ہے، حدود کئی قسم کی ہیں، طبعی، اقتصادی، عقلی، عرفی اور شرعی۔

ہر وقت لذیذ سے لذیذ تر کھانوں کی فکر میں لگے رہنا اور بسیار خوری کی عادت میں مبتلا ہو جانا طبعی اور عقلی حد سے تجاوز ہے، چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا اور قلیل آمدنی کے باوجود ہوٹلوں میں گلچھرے اڑانا اقتصادی حد سے تجاوز ہے اور شارع کی حرام کردہ چیزوں کو استعمال میں لانا شرعی حد سے تجاوز ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بار بار ممانعت کے باوجود اسراف ایک لازمی عادت کے طور پر مسلمانوں میں سرایت کر گیا ہے، کھانے پینے سے پہننے اوڑھنے تک، سواری کے انتظام سے مکان کی تعمیر تک، شادی بیاہ سے غمی اور فوتیدگی کی رسموں تک، عوام سے حکمرانوں تک ہر جگہ اسراف ہی اسراف ہے۔

اسراف کی وجہ سے زندگی مشکل سے مشکل تر ہو جاتی ہے، انسان پیسہ کمانے کی مشین بن جاتا ہے اس کے باوجود مسائل حل نہیں ہوتے، معدہ اور جسم کی متعدد بیماریاں بھی کھانے پینے میں حد سے تجاوز کر جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، اسی لیے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چند الفاظ میں ساری طب کو جمع کر دیا ہے ''كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا'' ان الفاظ کے ضمن میں ھارون رشید رحمہ اللہ کے زمانے کا ایک واقعہ بھی نقل کیا گیا ہے جس کے مطابق ایک

{۶۵} بخاری فی اللباس باب ۱

{۶۶} بخاری /لباس /باب ۱ /ابن ماجہ/ کتاب اللباس /باب ۲۴

ماہر نصرانی طبیب نے علی بن حسین سے کہا تھا کہ تمہاری کتاب میں علمِ طب کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ علم کی دو قسمیں ہیں علمِ ادیان اور علمِ ابدان، تو علی بن حسین نے جواب دیا کہ اللہ نے سارا علمِ طب اس نصف آیت میں جمع کر دیا ہے ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا﴾ پھر نصرانی نے سوال کیا کہ کیا تمہارے نبی سے بھی علمِ طب کے بارے میں کچھ منقول ہے؟ تو علی نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مختصر الفاظ میں سارا علمِ طب جمع فرما دیا ہے اور وہ الفاظ یہ ہیں:

المعدة بيت الأدوآء والحمية رأس كلّ دوآء وأعط كل جسد ماعوّدته.{۲۷} ''معدہ بیماریوں کا گھر ہے اور پرہیز ہر دوا سے بہتر ہے۔تم جسم کو اس کی عادت کے مطابق غذا دو''

جیسے ہمہ وقت خورد و نوش کے منصوبے بنانا اور ہرا لابلا پیٹ میں ٹھونس لینا حد سے تجاوز کرنا ہے یونہی کھانے پینے اور پہننے کی حلال اور پاک چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا بھی حد سے تجاوز کرنا ہے اسی لیے ارشاد ہوتا ہے:

﴿۳۲﴾......﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ﴾ ''فرما دیجیے کس نے حرام کیا ہے؟''

اس میں ان لوگوں کی تردید ہے جو بظاہر عبادت اور نیکی سمجھ کر حلال چیزوں کو حرام کر لیتے تھے ایسے بھی تھے جو لباس کے جھنجھٹ ہی سے آزاد ہو جاتے تھے، ایسے بھی تھے جو زندگی بھر ٹاٹ پہنتے تھے اور نرم لباس کو ''درجۂ ولایت'' کے منافی سمجھتے تھے، ایسے بھی تھے جو چوپاؤں میں سے بعض کو اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے، ایسے بھی تھے جو بیوی بچوں کو ''وصول الی اللہ'' کی راہ میں بھاری پتھر تصوّر کرتے تھے، اس آیتِ کریمہ سے ان سب کی تردید ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بڑا خوبصورت بنایا ہے، وہ خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، زینت اور حسن کی کشش اس نے ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر رکھ دی ہے، زینت اور خوب سے خوب تر کی جستجو اس دنیا کی آبادی، نئی نئی ایجادات اور دن بدن ترقی کا بہت بڑا سبب ہے، یہ راحت اور زینت کی تلاش ہی ہے، جو انسان کو فیکٹریوں، کارخانوں اور زندگی کے مختلف میدانوں میں مصروفِ عمل رکھے ہوئے ہے، انسان کی جمال پسند طبیعت ہی کی وجہ سے باری تعالیٰ نے جنت کی خوبصورت نعمتوں کا بار بار ذکر کیا ہے، ذرا تصور کیجیے اس جنت کا جہاں یاقوت اور زمرّد کے محلات اور مشک عنبر کے ٹیلے ہیں، درخت لہلہا رہے ہیں اور سبزہ قالین کی طرح بچھا ہوا ہے، نہریں بہہ رہی ہیں اور ان کے کنارے تختوں پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے ہیں، حور و غلمان سونے اور چاندی کے برتنوں میں متنوع نعمتیں لیے کھڑے ہیں، یہ سب کیا ہے؟ انسان کی حسن پسند طبیعت کی تشنگی کا سامان نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ جس کے دل میں

{۲۷} تفسیر قرطبی ۷/۱۷۱

حُسنِ حقیقی کی محبت سما جائے اس کی نظر میں کوئی دوسرا حسن جچتا ہی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ فی نفسہٖ زینت کی محبت مذموم نہیں ہے، قابلِ مذمت چیز اسراف اور منعم کے شکر سے غفلت ہے، زینت کی تلاش میں غلو کرنا اور ہر وقت لباس کی تراش خراش اور نت نئے فیشن کی جستجو میں رہنا بھی اسراف ہی ہے۔

﴿قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ زینت و جمال، رزقِ حلال اور اسبابِ راحت کے اصل مستحق تو مسلمان ہیں اس لیے کہ قرآن کریم جیسی عظیم کتاب ان کے پاس ہے جو انہیں علوم وفنون کا راستہ دکھاتی اور مخلوقات میں غور وفکر اور ان میں پوشیدہ حکمتیں معلوم کرنے پر آمادہ کرتی ہے، یہ حکمتیں اللہ کی رحمت اور اس کے جود واحسان پر دلالت کرتی ہیں یہ حکمتیں سامنے آنے پر مسلمان کا دل حمد وثنا سے لبریز اور زبان محوِ شکر ہو جاتی ہے جوں جوں نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں بندۂ مؤمن کے سامنے واشگاف ہوتی جاتی ہیں اس کے ایمان اور یقین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، خورد ونوش پر زندگی اور صحت کا مدار ہے، عمدہ اور مناسب لباس صحت کا ضامن ہونے کے ساتھ دوسروں کی نظر میں انسان کو باوقار بناتا ہے ویسے بھی اللہ کی نعمتوں کا اثر انسان پر نظر آنا چاہیے، اس لیے مؤمن اللہ کی نعمتوں سے خود بھی فائدہ اٹھاتا اور ان کا اظہار کرتا ہے اور دوسروں تک بھی انہیں پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔

ابوداؤد میں ابوالاحوص سے روایت ہے وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں بوسیدہ لباس میں حاضر ہوا آپ نے پوچھا تمہارے پاس کچھ مال ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، آپ نے فرمایا کس قسم کا مال ہے؟ میں نے عرض کیا ''اونٹ، بکریاں، گھوڑے اور غلام غرضیکہ ہر قسم کا مال میرے پاس ہے آپ نے فرمایا:

''جب اللہ نے تمہیں دیا ہے تو اللہ کی نعمت اور کرامت کا اثر تمہارے اوپر بھی نظر آنا چاہیے'' {۶۸}

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے باریک قمیص اور عمدہ لباس پہننے پر جب بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو انہوں نے جواب میں یہی آیتِ کریمہ پڑھی تھی:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ ...... الخ﴾

امام مالک رحمہ اللہ قیمتی لباس زیب تن فرماتے اور پُر تکلف کھانا تناول فرماتے تھے، بعض صوفیاء نے اعتراض کیا تو انہوں نے بھی اپنے طرزِ عمل کے جواز پر اسی آیت سے استدلال کیا تھا۔ جب نیت صحیح ہو اور طریقۂ کار بھی درست ہو تو پھر ساری ''حلال نعمتوں کے استعمال سے ثواب حاصل ہوتا ہے اگر چہ اس میں نفسانی خواہش ہی کی تعمیل کیوں نہ

{۶۸} ابو داؤد/۲/ صفحہ ۲۰۷/ باب فی الخلقان وفی غسل الثوب

ہو جیسے اپنی منکوحہ کے ساتھ قضائے شہوت کہ اسے بھی صدقہ اور اجر و ثواب کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ کائنات میں پھیلی ہوئی رنگارنگ نعمتوں کے اصل حقدار مؤمن ہی ہیں اگر وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو یہ ان کی غفلت اور کوتاہی ہے ورنہ ان پر تو لازم تھا کہ وہ دنیا کی زینت اور پاکیزہ چیزوں کے مالک ہوتے، اللہ کا شکر ادا کرتے اور انہیں اللہ کی رضا کے مطابق استعمال کرتے، یہ تو ہے دنیا کا معاملہ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے تو وہاں زینت و راحت صرف ایمان والوں کے لیے ہوگی۔

﴿كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ﴾ زینت اور پاکیزہ اشیاء کے بارے میں بہت ساری امتیں اور افراد گمراہی اور افراط و تفریط کا شکار ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے مطابق اہلِ علم کے لیے ان کا حکم ایسے نبی کی زبان سے بیان کیا ہے جو امّی ہیں اور آپ اس افراط و تفریط اور تمدّن کے تنزّل اور ترقی سے واقف نہیں تھے، واقف نہ ہونے کے باوجود آپ کا ہر بات کو ٹھیک ٹھیک بتانا آپ ﷺ کی صداقت اور قرآن کے اعجاز کی ایک مستقل دلیل ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......اسلام اور قرآن کی ہدایات صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ مادی اور معنوی زندگی کے تمام معاملات سے تعلق رکھتی ہیں، جو کہ قرآن کے قانونِ زندگی ہونے کی واضح دلیل ہے، انہی معاملات میں باوقار لباس کا پہننا اور بخل اور اسراف سے بچتے ہوئے کھانا پینا بھی شامل ہے۔

۲......عام حالات میں سترِ عورت واجب جبکہ نماز میں فرض ہے، اس کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، الّا یہ کہ کوئی شخص ایسی جگہ ہو جہاں اسے کسی صورت بھی کپڑا میسر نہ آ سکے، مسجد میں باوقار لباس پہن کر جانا چاہیے۔

''باوقار'' سے مراد ایسا لباس ہے جسے پہن کر شرفاء اور معززین کی مجلس میں جانے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ایسا لباس پہن کر مسجد میں نہیں جانا چاہیے جس سے چھچھورا پن ظاہر ہوتا ہو یا جسے پہن کر کسی سنجیدہ مجلس میں جانا پسند نہیں کیا جاتا۔

لباس کے سلسلے میں زیادہ تکلفات میں نہیں پڑنا چاہیے لیکن اگر کسی کا ذوق قیمتی اور عمدہ لباس پہننے کا ہو تو یہ کوئی ناجائز امر نہیں ہے، حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار درھم کا جوڑا خریدا تھا جس میں وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔{۲۹}

{۲۹} التفسیر المنیر ۱۸۸/۸

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا، کسی نے سوال کیا کہ بعض لوگ اچھا لباس اور قیمتی جوتا پسند کرتے ہیں (کیا یہ بھی تکبر ہے؟) آپ نے فرمایا بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے (لہٰذا جمال پسندی کو تکبر میں شمار نہیں کیا جاسکتا) تکبر کہتے ہیں حق بات کے ٹھکرانے اور انسانوں کو حقیر سمجھنے کو۔{۷۰}

۳......اگر کھانا پینا ترک کرنے کی وجہ سے جسم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور احکامِ الٰہی کی تعمیل میں خلل واقع ہوتا ہو تو کھانا پینا واجب ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو جائز ہے۔

۴......اسراف (حد سے تجاوز) ناجائز ہے خواہ خورد ونوش میں ہو یا لباس میں، خورد ونوش میں اسراف کی ایک صورت یہ ہے کہ کھانے پینے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے، گویا وہ جینے کے لیے نہیں کھاتا بلکہ کھانے کے لیے جیتا ہے، ضرورت سے زیادہ کھانے کو بعض فقہاء نے حرام اور بعض نے مکروہ کہا ہے۔{۷۱} اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

سرورِ دو عالم ﷺ کے فرمودات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں کم کھانے کی ترغیب ملتی ہے۔ آپ خود بھی کم کھاتے تھے اور اپنی امت کے لیے بھی کم کھانے کو پسند فرماتے تھے۔

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''اس پیٹ سے بُرا برتن کوئی نہیں جسے انسان بھرتا ہے، ابنِ آدم کے لیے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر سیدھی رکھیں، اگر اس سے گزارہ نہ ہو تو پیٹ کا ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے رکھنا چاہیے۔{۷۲}

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ کافر سات انتڑیوں میں جبکہ مؤمن صرف ایک انتڑی میں کھاتا ہے۔{۷۳}

مطلب یہ کہ کافر کھانے کا اتنا حریص ہوتا ہے کہ لگتا ہے اس کے پیٹ میں سات انتڑیاں ہیں اور مسلمان ایسا بے نیاز اور کم خور ہوتا ہے کہ لگتا ہے اس کے پیٹ میں صرف ایک انتڑی ہے، بسیار خوری نہ صرف یہ کہ دینی اور دنیاوی معمولات کی ادائیگی میں رکاوٹ بنتی ہے بلکہ بدہضمی، غباوت، طبیعت کے بوجھل پن اور متعدد دوسری بیماریوں کا سبب

{۷۰}صحیح مسلم، کتاب الایمان/ باب۱۴۷/ ابن ماجه/ دعاء/باب ۱۰/ مسند احمد/۴/۱۵۱

{۷۱}احکام القرآن للجصّاص ۲/۱۷۷

{۷۲}ترمذی/زھد/ باب۴۷/ مسند احمد، ۴/باب ۱۳۲

{۷۳}مسلم/ کتاب الأشربة، ۱۸۲/ بخاری، اطعمة/ باب ۱۲

بھی بنتی ہے۔

اسراف کی ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ انسان حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لے، عام طور پر یہ حرکت دینداری کی بناء پر کی جاتی ہے حالانکہ اس کا دینداری سے کوئی تعلق نہیں۔

۵......اس دنیا میں پھیلے ہوئے زینت اور راحت کے جتنے بھی اسباب ہیں ان کے اصل مستحق اہلِ ایمان ہیں، اس لیے انہیں چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر ان اسباب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جبکہ ہو رہا ہے اس کے برعکس، وہ یہ کہ کفار، مسلمانوں کے وسائل پر قابض ہوتے جا رہے ہیں۔

محرّمات کے اصول

﴿۳۳......۳۴﴾

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا

تو کہہ دے میرے رب نے حرام کیا ہے صرف بے حیائی کی باتوں کو جو ان میں کھلی ہوئی ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو اور

بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ

اس بات کو کہ شریک کرو اللہ کا ایسی چیز کو کہ جس کی اس نے سند نہیں اتاری اور اس بات کو کہ لگاؤ اللہ کے ذمہ وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں۔ اور ہر فرقے کے واسطے

اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

ایک وعدہ ہے پھر جب آپہنچے گا ان کا وعدہ نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے۔

تسہیل: آپ انہیں بتا دیجئے کہ میرے ربّ نے تو صرف ان فحش باتوں کو حرام کیا ہے جو علانیہ اور پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق زیادتی کرنے کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ذمے ایسی بات لگا دو جس کو تم جانتے نہیں ○ اور ہر گروہ کے لیے ایک معیّن مدّت ہے سو جب ان کی معیّن مدّت آ جائے گی وہ اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے ہو سکیں گے اور نہ ہی آگے ہو سکیں گے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۳۳﴾......اس سے پہلی آیت میں جاہل انسانوں کی خودساختہ محرّمات کی تردید تھی جبکہ یہاں حقیقی محرّمات کی

تفصیل ہے، ان حرام چیزوں کی تفصیل بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا اسلوب اختیار فرمایا ہے جس سے اشارۃً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن چیزوں کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، انہیں تو تم نے نہ صرف جائز قرار دے رکھا ہے بلکہ تمہاری مصنوعی دینداری کا مدار بھی انہیں جائز سمجھنے پر ہے اور جو چیزیں حلال اور پاکیزہ ہیں ان کو تم حرام اور ان سے اجتناب کو اپنے تدیّن کا کمال سمجھتے ہو۔

یہاں ایک مشہور سوال ہے وہ یہ کہ ''انّما'' کلمۂ حصر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف یہی چھ چیزیں حرام ہیں ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز حرام نہیں ہے، حالانکہ دوسری بہت ساری چیزیں بھی حرام ہیں اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یعنی حصر والا اسلوب اختیار کرنے میں مشرکین کی تردید مقصود ہے کہ حرام وہ اشیاء نہیں جنہیں تم حرام سمجھتے ہو بلکہ حرام اشیاء وہ ہیں جو اللہ نے حرام کی ہیں اور جن کی حرمت دائمی ہے، کسی بھی شریعت میں وہ حلال نہیں ہوئیں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہ جواب دیا ہے کہ جرم کی پانچ قسمیں ممکن ہیں:

(۱) جس سے نسب متاثر ہو اور یہ زنا سے ہوتا ہے اس لیے ''فواحش'' کو حرام قرار دیا گیا۔

(۲) جو عقل پر اثر انداز ہو، اور یہ شراب نوشی ہے ''الاثم'' سے اسی طرف اشارہ ہے۔

(۳) جو کسی کی عزّت خاک میں ملا دے۔

(۴) جو جان اور مال کے لیے خطرہ ثابت ہو، ان دونوں قسم کے جرائم کی نشاندہی کے لیے ''البغی'' کا لفظ لایا گیا ہے۔

(۵) جس کا حملہ دین پر ہو، اس کی دو صورتیں ممکن ہیں، پہلی یہ کہ توحید میں طعن کیا جائے ''وان تشرکوا'' سے اسی طرف اشارہ ہے، دوسری یہ کہ تحقیق اور علم کے بغیر اللہ کے دین کے بارے میں بات کی جائے ''وان تقولوا'' میں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔ گویا جرائم کے اصول ان پانچ قسموں میں آجاتے ہیں باقی جتنے بھی جرائم ہیں وہ ان کے فروع اور توابع ہیں۔ {۷۴}

لہٰذا کلمۂ حصر ''انّما'' کا لانا خلافِ حقیقت نہیں بلکہ واقعہ کے عین مطابق ہے۔

عام مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ سارے گناہوں کی حرمت پر دلالت کرتی ہے جبکہ پہلی آیت میں یہ

{۷۴} فلمّا کانت اصول الجنایات هی هذه الأشیاء، وکانت البواقی کالفروع والتوابع......الخ (تفسیر کبیر ۱۴/۲۳۳)

بتایا گیا تھا کہ ہر جائز زینت اور پاکیزہ چیز حلال اور مباح ہے گویا پہلی آیت مباحات کے بارے میں جامع تھی اور یہ آیت محرّمات کے بیان میں جامع ہے، جزئیات کو بیان کرنا نہ مقصود تھا اور نہ ہی انہیں بیان کیا گیا ہے، ویسے بھی قرآن، اصول اور کلیات کی کتاب ہے، فروع اور جزئیات کی نہیں۔{۷۵}

﴿الْفَوَاحِشَ﴾ ہر فحش بات حرام ہے خواہ اس کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہو یا باطنی اعضاء سے اور خواہ اسے علانیہ کیا جائے یا چھپ چھپا کر کیا جائے، "فاحشة" ہر ایسے عمل کو کہا جاتا ہے جو بیہودگی میں بہت بڑھا ہوا ہو اور جس کا بیہودہ پن فطرتِ سلیمہ پر ظاہر ہو۔{۷۶}

نزولِ قرآن کے زمانہ میں زنا، لواطت، تہمت زنی اور آباء کی بیویوں سے نکاح پر "فاحشة" کا اطلاق ہوتا تھا، خود اہلِ جاہلیت، ان اعمال کو بہت برا سمجھتے تھے اور ان کا علانیہ ارتکاب کرنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

﴿وَالْبَغْيَ﴾ ہر ایسا گناہ جس کا اثر متعدی ہو، ظلم اور زیادتی کی ساری صورتیں اور معاملات کی ساری خرابیاں اس میں آ گئیں، زیادتی کے ساتھ ناحق ہونے کی قید تاکید کے لیے ہے۔{۷۷}

﴿وَأَنْ تُشْرِكُوا﴾ محرمات میں سے پانچویں چیز شرک ہے جس کے جواز پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل موجود نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود مشرکین، شرک کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دیتے تھے اس لیے آخر میں اس کی حرمت بھی بیان کر دی گئی۔

﴿وَأَنْ تَقُولُوا﴾ علم اور دلیل کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف کسی چیز کی نسبت سب سے بڑا گناہ ہے، تمام باطل ادیان، تحریفات اور بدعات کا مدار اسی گناہ پر رہا ہے، شرک اور کفر کی عمارت بھی اسی کمزور بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے کہ علم کے بغیر اللہ کی طرف بعض چیزوں کی نسبت کر دی جاتی ہے، اسی لیے اللہ فرماتے ہیں:

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا {۷۸} "اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے"

{۷۵}فالآیة جامعة فی المحرمات کما ان ماقبلها جامعة فی المباحات(تفسیر القاسمی ۷/۷۱)

{۷۶}ما تفاحش قبحه ای تزاید(کشاف ۲/۹۷)، والفواحش:الاعمال المفرطة فی القبح(قرطبی ۷/۱۸۰)

{۷۷}"بغیر الحق" متعلق بالبغی مؤکد له معنی(بیضاوی ۲/۱۸)

{۷۸}الاعراف/۷/۳۷

اللہ کی طرف کسی بات کی جھوٹی نسبت کی طرح، اللہ کے رسول کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔

﴿۳۴﴾......اس آیت کی ماقبل سے مناسبت یہ ہے کہ حلال اور حرام کے اصول بیان کرنے کے بعد بتایا جا رہا ہے کہ ان اصولوں کو قبول کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ فرد ہو یا جماعت ہر کسی کے لیے اللہ نے ایک مدّت متعین کی ہے، جب وہ طے شدہ مدّت آجائے گی تو اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوگی۔

اجل اور مدّت سے مراد انسان کی زندگی بھی لی جاسکتی ہے اور ہر امّت اور جماعت کی ہلاکت اور زوال کا وقت بھی مراد لیا جاسکتا ہے، امام رازی رحمہ اللہ دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے کہ آیتِ کریمہ میں ''ہر فرد'' کا نہیں ''ہر جماعت'' کا ذکر ہے۔{۷۹}

دوسری جگہ صراحۃً شہروں، ملکوں اور قوموں کی ہلاکت کے متعین وقت کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝ {۸۰}

''جس بستی کو بھی ہم نے ہلاک کیا اس کے لیے ہمارے پاس متعین نوشتہ تھا، کوئی جماعت اپنی ہلاکت کے وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے''

اللہ تعالیٰ نے ذلّت اور ہلاکت کے کچھ اسباب مقرر کیے ہیں جو قوم ان اسباب میں منہمک ہو جاتی ہے اسے تباہی اور بربادی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی، اسی ہلاکت کا ذکر سورۂ ہود میں کیا گیا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۚ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ {۸۱}

''تیرے رب کے پکڑنے کا یہی طریقہ ہے جب وہ بستیوں میں رہنے والوں کو پکڑتا ہے اس حال میں کہ وہ ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں، بے شک اس کی پکڑ دردناک اور سخت ہوتی ہے''

بے شمار لوگ اہلِ مغرب کی ظاہری چکا چوند سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور وہ سوال کرتے ہیں کہ ہر قسم کی بیہودگیوں، حکم عدولیوں اور گناہوں میں ملوّث ہونے کے باوجود ان کی ترقی کا راز کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دین و شریعت کے یہ باغی اللہ کے عذاب کی لپیٹ میں آچکے ہیں، وہ قلبی اور روحانی اعتبار سے کھوکھلے ہیں، انسانیت کے مقامِ رفیع سے گر کر حیوانوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں، اللہ کا عذاب اپنی فطری رفتار سے انہیں اپنی گرفت میں لے

{۷۹} کبیر/۵/۲۳۴

{۸۰} الحجر/۱۵/۴-۵

{۸۱} ہود/۱۱/۱۰۲

تفصیل ہے، ان حرام چیزوں کی تفصیل بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا اسلوب اختیار فرمایا ہے جس سے اشارۃً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن چیزوں کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، انہیں تو تم نے نہ صرف جائز قرار دے رکھا ہے بلکہ تمہاری مصنوعی دینداری کا مدار بھی انہیں جائز سمجھنے پر ہے اور جو چیزیں حلال اور پاکیزہ ہیں ان کو تم حرام اور ان سے اجتناب کو اپنے تدیّن کا کمال سمجھتے ہو۔

یہاں ایک مشہور سوال ہے وہ یہ کہ ''انما'' کلمۂ حصر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف یہی چھ چیزیں حرام ہیں ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز حرام نہیں ہے، حالانکہ دوسری بہت ساری چیزیں بھی حرام ہیں اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یعنی حصر والا اسلوب اختیار کرنے میں مشرکین کی تردید مقصود ہے کہ حرام وہ اشیاء نہیں جنہیں تم حرام سمجھتے ہو بلکہ حرام اشیاء وہ ہیں جو اللہ نے حرام کی ہیں اور جن کی حرمت دائمی ہے، کسی بھی شریعت میں وہ حلال نہیں ہوئیں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہ جواب دیا ہے کہ جرم کی پانچ قسمیں ممکن ہیں:

(۱) جس سے نسب متأثر ہو اور یہ زنا سے ہوتا ہے اس لیے ''فواحش'' کو حرام قرار دیا گیا۔

(۲) جو عقل پر اثر انداز ہو، اور یہ شراب نوشی ہے ''الاثم'' سے اسی طرف اشارہ ہے۔

(۳) جو کسی کی عزّت خاک میں ملا دے۔

(۴) جو جان اور مال کے لیے خطرہ ثابت ہو، ان دونوں قسم کے جرائم کی نشاندہی کے لیے ''البغی'' کا لفظ لایا گیا ہے۔

(۵) جس کا حملہ دین پر ہو، اس کی دو صورتیں ممکن ہیں، پہلی یہ کہ توحید میں طعن کیا جائے ''وان تشرکوا'' سے اسی طرف اشارہ ہے، دوسری یہ کہ تحقیق اور علم کے بغیر اللہ کے دین کے بارے میں بات کی جائے ''وان تقولوا'' میں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔ گویا جرائم کے اصول ان پانچ قسموں میں آجاتے ہیں باقی جتنے بھی جرائم ہیں وہ ان کے فروع اور توابع ہیں۔ {۷۴}

لہٰذا کلمۂ حصر ''انما'' کا لانا خلافِ حقیقت نہیں بلکہ واقعہ کے عین مطابق ہے۔

عام مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ سارے گناہوں کی حرمت پر دلالت کرتی ہے جبکہ پہلی آیت میں یہ

{۷۴} فلمّا کانت اصول الجنایات هی هذه الأشیاء، وکانت البواقی کالفروع والتوابع......الخ

(تفسیر کبیر ۱۴/۲۳۳)

بتایا گیا تھا کہ ہر جائز زینت اور پاکیزہ چیز حلال اور مباح ہے گویا پہلی آیت مباحات کے بارے میں جامع تھی اور یہ آیت محرّمات کے بیان میں جامع ہے، جزئیات کو بیان کرنا نہ مقصود تھا اور نہ ہی انہیں بیان کیا گیا ہے، ویسے بھی قرآن، اصول اور کلیات کی کتاب ہے، فروع اور جزئیات کی نہیں۔{۷۵}

﴿الْفَوَاحِشَ﴾ ہر فحش بات حرام ہے خواہ اس کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہو یا باطنی اعضاء سے اور خواہ اسے علانیہ کیا جائے یا چھپ چھپا کر کیا جائے، ''فـاحشة'' ہر ایسے عمل کو کہا جاتا ہے جو بیہودگی میں بہت بڑھا ہوا ہو اور جس کا بیہودہ پن فطرتِ سلیمہ پر ظاہر ہو۔{۷۶}

نزولِ قرآن کے زمانہ میں زنا، لواطت، تہمت زنی اور آباء کی بیویوں سے نکاح پر ''فاحشة'' کا اطلاق ہوتا تھا، خود اہلِ جاہلیت، ان اعمال کو بہت برا سمجھتے تھے اور ان کا علانیہ ارتکاب کرنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

﴿وَالْبَغْيَ﴾ ہر ایسا گناہ جس کا اثر متعدی ہو، ظلم اور زیادتی کی ساری صورتیں اور معاملات کی ساری خرابیاں اس میں آ گئیں، زیادتی کے ساتھ ناحق ہونے کی قید تاکید کے لیے ہے۔{۷۷}

﴿وَأَنْ تُشْرِكُوا﴾ محرمات میں سے پانچویں چیز شرک ہے جس کے جواز پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل موجود نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود مشرکین، شرک کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دیتے تھے اس لیے آخر میں اس کی حرمت بھی بیان کر دی گئی۔

﴿وَأَنْ تَقُولُوا﴾ علم اور دلیل کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف کسی چیز کی نسبت سب سے بڑا گناہ ہے، تمام باطل ادیان، تحریفات اور بدعات کا مدار اسی گناہ پر رہا ہے، شرک اور کفر کی عمارت بھی اسی کمزور بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے کہ علم کے بغیر اللہ کی طرف بعض چیزوں کی نسبت کر دی جاتی ہے، اسی لیے اللہ فرماتے ہیں:

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا{۷۸} ''اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے''

{۷۵}فالآية جامعة في المحرمات كما ان ماقبلها جامعة في المباحات(تفسير القاسمي ۷/۷۱)

{۷۶}ماتفاحش قبحه اى تزايد(كشاف ۲/۹۷)، والفواحش:الاعمال المفرطة في القبح(قرطبي ۷/۱۸۰)

{۷۷}"بغير الحق" متعلق بالبغي مؤكد له معنى(بيضاوي ۲/۱۸)

{۷۸}الاعراف/۷/۳۷

اللہ کی طرف کسی بات کی جھوٹی نسبت کی طرح، اللہ کے رسول کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔

﴿۳۴﴾......اس آیت کی ماقبل سے مناسبت یہ ہے کہ حلال اور حرام کے اصول بیان کرنے کے بعد بتایا جارہا ہے کہ ان اصولوں کو قبول کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ فرد ہو یا جماعت ہر کسی کے لیے اللہ نے ایک مدّت متعین کی ہے، جب وہ طے شدہ مدّت آجائے گی تو اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوگی۔

اجل اور مدّت سے مراد انسان کی زندگی بھی لی جاسکتی ہے اور ہر امّت اور جماعت کی ہلاکت اور زوال کا وقت بھی مراد لیا جاسکتا ہے، امام رازی رحمہ اللہ دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے کہ آیتِ کریمہ میں ''ہر فرد'' کا نہیں ''ہر جماعت'' کا ذکر ہے۔{۷۹}

دوسری جگہ صراحۃً شہروں، ملکوں اور قوموں کی ہلاکت کے متعین وقت کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَآ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝ مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ۝ {۸۰}

''جس بستی کو بھی ہم نے ہلاک کیا اس کے لیے ہمارے پاس متعین نوشتہ تھا، کوئی جماعت اپنی ہلاکت کے وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے''

اللہ تعالیٰ نے ذلّت اور ہلاکت کے کچھ اسباب مقرر کیے ہیں جو قوم ان اسباب میں منہمک ہوجاتی ہے اسے تباہی اور بربادی سے کوئی چیز نہیں بچاسکتی، اسی ہلاکت کا ذکر سورۂ ھود میں کیا گیا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الۡقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ {۸۱}

''تیرے رب کے پکڑنے کا یہی طریقہ ہے جب وہ بستیوں میں رہنے والوں کو پکڑتا ہے اس حال میں کہ وہ ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں، بے شک اس کی پکڑ دردناک اور سخت ہوتی ہے''

بے شمار لوگ اہلِ مغرب کی ظاہری چکاچوند سے دھوکا کھاجاتے ہیں اور وہ سوال کرتے ہیں کہ ہر قسم کی بیہودگیوں، حکم عدولیوں اور گناہوں میں ملوّث ہونے کے باوجود ان کی ترقی کا راز کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دین و شریعت کے یہ باغی اللہ کے عذاب کی لپیٹ میں آچکے ہیں، وہ قلبی اور روحانی اعتبار سے کھوکھلے ہیں، انسانیت کے مقامِ رفیع سے گر کر حیوانوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں، اللہ کا عذاب اپنی فطری رفتار سے انہیں اپنی گرفت میں لے

{۷۹} کبیر ۲۳۴/۵

{۸۰} الحجر/۱۵/۴-۵

{۸۱} ھود/۱۱/۱۰۲

رہا ہے، وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب مغربی تہذیب کی ظاہری نقش ونگار سے آراستہ چھت اپنی بوسیدہ دیواروں پر آ گرے گی۔

دو فریقوں کا انجام

﴿۳۵......۳۹﴾

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اے اولاد آدم کی، اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم میں سے کہ سنائیں تم کو آیتیں میری، تو جو کوئی ڈرے اور نیکی پکڑے تو نہ خوف ہوگا

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے وہی ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اس میں

خٰلِدُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَنَالُهُمْ

ہمیشہ رہیں گے۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا یا جھٹلائے اس کے حکموں کو، وہ لوگ ہیں کہ ملے گا ان کو

نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ

جو ان کا حصہ لکھا ہوا ہے کتاب میں یہاں تک کہ جب پہنچیں ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کو تو کہیں کیا ہوئے وہ

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝

جن کو تم پکارا کرتے تھے سوا اللہ کے، بولیں گے وہ ہم سے کھوئے گئے اور اقرار کرلیں گے اپنے اوپر کہ بیشک وہ کافر تھے۔ فرمائے گا

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ

داخل ہو جاؤ ہمراہ اور امتوں کے جو تم سے پہلے ہو چکی ہیں، جن اور آدمیوں میں سے دوزخ کے اندر، جب داخل ہوگی ایک امت تو لعنت

لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا

کرے گی دوسری امت کو یہاں تک کہ جب گر چکیں گے اس میں سارے تو کہیں گے ان کے پچھلے پہلوں کو اے رب

فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ

ہمارے ہم کو انہی نے گمراہ کیا سو تو ان کو دے دونا عذاب آگ کا فرمائے گا دونوں کو دوگنا ہے لیکن تم نہیں جانتے۔ اور کہیں گے

لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝

ان کے پہلے پچھلوں کو پس کچھ نہ ہوئی تم کو ہم پر بڑائی اب چکھو عذاب بسبب اپنی کمائی کے۔

تسہیل: اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمہی میں سے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنائیں، پھر جو کوئی

نافرمانی سے بچ جائے گا اور میرے ساتھ اپنے تعلق کی اصلاح کرلے گا، سو ایسوں کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی کوئی غم لاحق ہوگا O اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے بارے میں تکبّر کا رویہ اختیار کیا، ایسے لوگ دوزخی ہیں وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے O بھلا اس سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ کی طرف جھوٹی باتوں کی نسبت کردے یا اس کی آیات کو جھٹلادے، ایسے لوگوں کو ان کا وہ حصہ تو مل جائے گا جو ان کے لیے اللہ نے لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے لیکن جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے آئیں گے تو ان سے سوال کریں گے کہاں ہیں وہ جن کی عبادت تم اللہ کو چھوڑ کر کرتے تھے؟ وہ جواب دیں گے کہ آج وہ دکھائی نہیں دے رہے، یوں وہ اپنے خلاف خود ہی گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے O اللہ فرمائے گا کہ تم بھی جنّوں اور انسانوں کی ان جماعتوں میں شامل ہو جاؤ جو تم سے پہلے دوزخ میں داخل ہو چکی ہیں، جب بھی کوئی نئی جماعت دوزخ میں داخل ہوگی اپنے سے پہلی جماعت پر لعنت کرے گی حتیٰ کہ جب سب اس میں جمع ہو جائیں گے تو عوام اپنے پیشواؤں کے بارے میں کہیں گے اے ہمارے رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا لہٰذا انہیں آگ کا عذاب زیادہ دے، اللہ فرمائیں گے تم سب ہی کے لیے زیادہ ہے لیکن تم سمجھتے نہیں ہو O اور پیشوا اپنے پیروکاروں سے کہیں گے تمہیں ہمارے مقابلے میں کوئی رعایت حاصل نہیں لہٰذا تم جو کچھ کرتے رہے ہو اس کے عذاب کا مزہ چکھو O

تفسیر

﴿۳۵﴾...... چوتھی بار بنی آدم سے خطاب کیا جارہا ہے، اے آدم کی اولاد! اگر تمہارے پاس ہمارے رسول آئیں جو ہماری آیات اور احکام تمہارے سامنے بیان کردیں تو جو کوئی گناہوں سے رُک جائے گا اور اپنی اصلاح کرلے گا اسے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی غم ہوگا۔

﴿۳۶﴾......اور جو لوگ ہماری آیات کے مقابلے میں تکبر کریں گے جیسے مشرکینِ مکّہ نے تکبر کیا، ان میں سے بعض تو ایسے تھے جو رسولِ اکرم ﷺ کے مقابلے میں اپنے آپ کو قیادت کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے اور بعض ایسے تھے جو بنو ہاشم کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان میں کوئی نبی پیدا ہو، دوسری طرف یہود کی سوچ یہ تھی کہ وہ اپنے مقابلے میں تمام عربوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے یہ سارے متکبرین دائمی عذاب کے مستحق ہیں۔

﴿۳۷﴾......اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں جو اللہ کی طرف من گھڑت بات کی نسبت کرتا ہے مثلاً وہ ایسی چیز کو حرام کہتا ہے جسے اللہ نے حرام نہیں کیا اور ایسے عمل کو واجب بتاتا ہے جسے اللہ نے واجب نہیں کیا، یا اللہ کے لیے اولاد یا شریک تجویز کرتا ہے یا اللہ کی نازل کردہ آیات کی تکذیب کرتا ہے مثلاً وہ پورے قرآن کا یا بعض آیات کا یا نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتا ہے۔

﴿ أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيبُهُم ﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں کتاب میں سے ان کا حصہ مل کر رہے گا'' کتاب سے مراد یا تو وحی ہے یعنی کتابِ الٰہی میں وعدہ اور وعید جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ انہیں دنیا اور آخرت میں ضرور ملے گا۔{۸۲}

یا کتاب سے مراد تقدیر ہے یعنی کتابِ تقدیر میں باری تعالیٰ نے انسانوں کے لیے رزق اور عمر کے جو فیصلے اور اسباب کے جو نتائج طے کر دیئے ہیں وہ ان کے سامنے ضرور ہوں گے۔{۸۳}

اور ان کے لیے جتنا رزق طے ہو چکا ہے وہ انہیں مل کر رہے گا، اس لیے کہ دنیا جزا اور سزا کی جگہ نہیں، یہ ضروری نہیں کہ کفر و شرک اور گناہوں کی وجہ سے کسی کو دنیا میں بھوکا پیاسا مار دیا جائے یا اس کی عمر میں کمی کر دی جائے، البتہ جب دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اخروی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو ڈانٹ ڈپٹ اور سزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، چنانچہ جب فرشتے مشرکوں کی روحیں قبض کرتے ہیں تو ان سے سخت لہجے میں سوال کرتے ہیں، کہاں ہیں تمہارے وہ خود ساختہ معبود اور شریک جنہیں تم نجات دہندہ اور مشکل کشا سمجھتے تھے؟ وہ شرمندہ ہو کر جواب دیتے ہیں کہ وہ آج ہمیں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے اور ہمیں ان سے نہ خیر کی توقع ہے نہ دفعِ شر کی۔

اس جواب کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے کفر کا اقرار کر لیں گے اور تسلیم کر لیں گے کہ ہم جو کچھ کرتے رہے وہ غلط تھا۔ جس غلطی کا اقرار وہ آخرت میں کریں گے، اس کے بارے میں انہیں دنیا ہی میں بتایا جا رہا ہے تاکہ وہ اس سے باز آجائیں۔

﴿۳۸﴾...... اگلے اور پچھلے، چھوٹے اور بڑے، عوام اور رہنما، مقتدی اور مقتدی غرضیکہ سارے باغیوں اور نافرمانوں کو دوزخ میں جمع کر دیا جائے گا، یہاں یہ سب ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور ان کے آپس کے تعلقات

{۸۲}وقیل الکتاب ھنا القرآن، لان عذاب الکفار مذکور فیه(تفسیر قرطبی ۱۸۲/۷)عن ابن عباس یقول: نصیبھم من الاعمال من عمل خیرا جزی به ومن عمل شرا جزی به(تفسیر ابنِ کثیر ۲۸۵/۲)

{۸۳}ای ما کتب لھم من رزق وعمر وعمل (قرطبی ۱۸۲/۷)

اور ایک دوسرے پر اعتماد جو دنیا میں تھا، ختم ہو جائے گا، سورۂ عنکبوت میں ہے:

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ {۸۴}

''پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور آپس میں لعنت کرو گے اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہوگا''

سورۃ البقرہ میں ہے:

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ {۸۵}

''جب پیشوا اپنے پیروکاروں سے بیزاری ظاہر کریں گے، وہ عذاب دیکھ لیں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے''

﴿حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا﴾ جب جہنم میں سب جمع ہو جائیں گے تو عوام اپنے لیڈروں کے بارے میں کہیں گے کہ ہماری گمراہی کا سبب یہ بنے تھے لہٰذا انہیں ہم سے زیادہ عذاب دیا جائے، جیسا کہ سورۂ احزاب میں ہے:

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۠ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا {۸۶}

''اور (عوام) کہیں گے اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور وڈیروں کی بات مانی اور انہوں نے ہمیں راہِ راست سے ہٹا دیا۔ اے ہمارے رب! انہیں دوگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت فرما''

﴿قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ﴾ ''ضعف'' کا لفظ زیادہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور دوگنا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔{۸۷}

زیادہ اور دوگنا:

پہلا معنی مراد لینے کی صورت میں مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے، جن لوگوں نے ضلال (گمراہ ہونے) اور اضلال (گمراہ کرنے) کے جرائم کا ارتکاب کیا تھا اور جو پیشوائی کے منصب پر فائز تھے ان کے بارے میں عوام کا خیال

{۸۴} عنکبوت/۲۹/۲۵

{۸۵} البقرہ/۲/۱۶۷

{۸۶} سورۂ احزاب/۶۷-۶۸

{۸۷} والضعف هو من الالفاظ المتضايفة التی يقتضی وجود احدهما وجود الآخر كالنصف والزوج (المفردات ۲۹۶)، والضعف فی الاصل زيادة غير محصورة-(تفسیر کبیر ۵/۲۳۸)

ہوگا کہ انہیں ہم سے زیادہ سزا ملنی چاہیے، اللہ فرمائیں گے کہ تابع اور متبوع دونوں کو زیادہ سزا دی جا رہی ہے لیکن یہ زیادتی ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی، اس بے سمجھی اور بے خبری میں بھی ایک حکمت ہوگی وہ یہ کہ اگر انہیں دوسروں کو زیادہ عذاب دیئے جانے کا علم ہو جاتا تو انہیں کچھ تسلی ہو جاتی۔{۸۸} جیسے دنیا میں انسان اپنے سے زیادہ پریشان حال کو دیکھ کر سکون محسوس کرتا ہے، اس لیے انہیں، ان کے حال کی خبر بھی نہیں دی جائے گی۔

اور اگر دوگنا ہی کا معنیٰ مراد لیا جائے تو اس عذاب کو یا تو دائمی ہونے کی وجہ سے دوگنا کہا گیا ہے کیونکہ وہ ہر ساعت اور ہر لحظہ بدلتا اور بڑھتا ہی رہے گا، جیسے دنیا میں کسی نئی تکلیف اور بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد انسان اپنی پہلی بیماری کو ہلکا اور آسان محسوس کرتا ہے، یہی حال آخرت میں ہوگا۔

اور یا پھر ظاہری اور باطنی اعتبار سے اسے دوگنا کہا گیا ہے، ظاہری تو ہر دیکھنے والے کو نظر آئے گا اور باطنی دوسروں کو معلوم نہ ہوگا، سورۂ ھمزہ میں دوزخ کی آگ کے بارے میں بتایا گیا ہے:

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَةِ {۸۹} ”اللہ کی آگ ہے بھڑکائی ہوئی جو دلوں پر چڑھ جائے گی“

دوزخیوں کو عذاب کی ظاہری صورتیں یعنی زقّوم کا کھانا، پیپ کا پینا، لوہے کے گرز سے پٹائی وغیرہ تو دکھائی دیں گی لیکن ان کے دلوں میں جو آگ جل رہی ہوگی اس کا علم دوسروں کو نہیں ہوگا۔

﴿۳۹﴾...... باری تعالیٰ کا جلالی جواب سُن کر پیشوا اپنے پیروکاروں سے کہیں گے کہ ہمارے مقابلے میں تمہیں کوئی رعایت حاصل نہیں ہوئی، جیسا عذاب ہمارے لیے ویسا عذاب تمہارے لیے۔ ہم بھی گمراہ تم بھی گمراہ! متعدد دوسرے مقامات پر بھی یہ مضمون آیا ہے، جب اندھی تقلید کرنے والے اپنے رؤساء اور وڈیروں کو موردِ الزام ٹھہرائیں گے تو وہ کہیں گے کہ اپنی گمراہی کی ذمہ داری ہم پر نہ ڈالو، ہم نے تو بس اتنا کیا تھا کہ تمہیں غلط راستہ دکھا دیا تھا لیکن اس راستے پر تم اپنی مرضی اور اختیار سے چلے تھے ہم نے تمہارے اوپر کسی قسم کا جبر نہیں کیا تھا، سورۂ صافات میں ہے:

{۸۸} ای لایعلم کل فریق مابفریق الآخر اذلو علم بعض من فی النار ان عذاب احد فوق عذابه لکان نوع سلوة له (قرطبی ۷/۱۸۴)

{۸۹} الھمزة/۱۰۴/۶-۷

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ {۹۰}

''وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر باہم سوال کریں گے۔ کہیں گے تم ہمارے پاس دائیں بائیں سے آتے تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ حقیقت میں تم مؤمن ہی نہیں تھے۔ اور ہمارا تمہارے اوپر کچھ زور نہیں تھا بلکہ تم خود ہی سرکش تھے۔ ہمارے ربّ کا قول ہم پر ثابت ہوگیا کہ ہم عذاب کا مزہ چکھیں گے۔ ہم نے تمہیں گمراہ کیا، ہم خود بھی گمراہ تھے۔ آج کے دن وہ سب عذاب میں برابر کے شریک ہوں گے''

حکمت وہدایت:

۱......تکبّر، حصولِ ہدایت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

۲......دنیا میں کافر اور مسلمان، فرمانبردار اور نافرمان ہر کسی کو تقدیر کے مطابق رزق اور عمر میں حصّہ ضرور ملتا ہے۔

۳......ایسی محبت اور تعلق جس کی بنیاد مادی مفادات اور کفر پر ہوگی، آخرت میں نہ تو کام آئے گا اور نہ ہی باقی رہے گا۔

۴......پیرو مرشد اور پیشوا کے انتخاب میں خوب جانچ پرکھ کر لینی چاہیے کیونکہ بعض رہنما اپنے پیروکاروں اور کارکنوں کو گمراہی کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔

دونوں فریقوں کی جزا

﴿۴۰......۴۳﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا

بیشک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا، نہ کھولے جائیں گے ان کے لئے دروازے آسمان

يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ

کے اور نہ داخل ہوں گے جنت میں یہاں تک کہ گھس جائے اونٹ سوئی کے ناکے میں اور ہم یوں بدلا دیتے ہیں گنہگاروں

مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

کو۔ ان کے واسطے دوزخ کا بچھونا ہے اور اوپر سے اوڑھنا اور ہم یوں بدلہ دیتے ہیں ظالموں کو، اور جو ایمان لائے اور کیں

{۹۰} صافات ۳۷/۲۷-۳۳

الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾

نیکیاں ہم بوجھ نہیں رکھتے کسی پر مگر اس کی طاقت کے موافق، وہی ہیں جنت میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

اور نکال لیں گے ہم جو کچھ ان کے دلوں میں خفگی تھی، بہتی ہونگی ان کے نیچے نہریں اور وہ کہیں گے شکر اللہ کا جس نے ہم کو

هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ

یہاں تک پہنچا دیا اور ہم نہ تھے راہ پانے والے اگر نہ ہدایت کرتا ہم کو اللہ، بے شک لائے تھے رسول ہمارے رب کے سچی

وَنُوْدُوْا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

بات اور آواز آئیگی کہ یہ جنت ہے وارث ہوئے تم اس کے، بدلے میں اپنے اعمال کے۔

ربط: اوپر کی آیات میں دو فریقوں کا ذکر ہو چکا، یہاں دونوں کا انجام بتایا جارہا ہے۔

تسہیل: بے شک وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے بارے میں تکبّر کا رویّہ اختیار کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہوسکیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے اور ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں ○ ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا اور ہم ظالموں کو یونہی بدلہ دیتے ہیں ○ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے (اپنی طاقت کے مطابق) نیک عمل کیے، ہم کسی بھی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف نہیں کرتے، یہی ہیں جنّت والے، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جو بھی بغض اور کینہ ہوگا، ہم اسے دور کردیں گے، ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ کہیں گے ساری حمد و ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں ہدایت کی راہ پر چلنے کی توفیق دی اور اگر اللہ توفیق نہ دیتا تو ہم اس راہ پر چل نہیں سکتے تھے، اس وقت انہیں پکار کر کہا جائے گا، تمہیں اس جنت کا وارث بنایا گیا ہے ان اعمال کے بدلہ میں جو تم کرتے رہے ○

تفسیر

﴿۴۰﴾......قرآنِ کریم بعض اوقات، مطالب و مفاہیم کی ادائیگی میں سابقہ آسمانی کتابوں کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے، ان اصطلاحات کا استعمال ''نبی اُمّی'' کی صداقت کی واضح دلیل ہے کہ مذاہبِ عالم اور ان کے لٹریچر کا مطالعہ کیے بغیر آپ کی مبارک زبان پر وہ حقائق اور اصطلاحات جاری ہوتے تھے جن سے بسا اوقات ان کتابوں کے ماننے والے بھی بے خبر ہوتے تھے۔

''آسمان کے دروازوں کا نہ کھولا جانا'' بھی بائبل کی اصطلاح ہے، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے اس کے دو مطلب بیان کیے ہیں اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں، وہ اس طرح کہ مکذبین اور متکبرین کی نہ دعائیں قبول ہوتی ہیں اور نہ ہی اعمال قبول ہوتے ہیں، ان کے مقابلے میں صالحین کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں اور اعمال بھی۔

سورۂ فاطر میں ہے:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ {۹۱}

''اس کی طرف اٹھتا ہے کلام ستھرا اور نیک عمل اس کو اٹھا لیتا ہے''

دوسرا مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد کافر کی روح کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے {۹۲} حضرت برّا ابن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وفات کے بعد جب کافر کی روح آسمان کی طرف لیجائی جانے لگتی ہے تو اس سے ایسی سخت بدبو نکلتی ہے جیسی دنیا میں مردار کی ہوتی ہے اس پر آسمان کے فرشتے اس کے لیے دروازے کھولنے سے انکار کر دیتے ہیں۔{۹۳} خلاصہ یہ کہ کفار کے اعمال اور ارواح دونوں مقبولیت اور عزت و تکریم سے محروم رہتے ہیں۔

﴿وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ﴾ ''جنّت میں داخل نہیں ہو سکیں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے''

اصطلاح میں اسے تعلیق بالمحال کہتے ہیں یعنی کسی چیز کے وجود کو امرِ محال سے مشروط کر دینا جیسے یہاں پر ان کے دخولِ جنّت کو مشروط کر دیا گیا ہے، سوئی کے ناکے میں اونٹ کے داخل ہونے کے ساتھ، ظاہر ہے اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے تو کلامِ الٰہی کے مقابلے میں تکبّر کرنے والوں کا جنت میں داخل ہونا بھی محال ہے۔

انجیل میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوا ہے، متّی میں ہے:

''اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے نکل جانا آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت

{۹۱} فاطر/۳۵/۱۰

{۹۲} قيل المراد لا يرفع لهم منها عمل صالح ولا دعاء...... وقيل المراد لا تفتح لارواحهم ابواب السماء (تفسیر ابنِ کثیر ۲/۲۸۶)

{۹۳} مسند احمد ۴/۲۸۸، ۲۹۶

میں داخل ہو' {۹۴}

﴿وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ﴾ ''ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں''

اس سے مراد وہ مجرم ہیں جو ارتکابِ جرم کو مستقل عادت اور لازمی وصف بنالیں، ان مؤمنوں کو یہ سزا نہیں دی جاتی جن سے بتقاضائے بشریت گناہ ہو جاتا ہے پھر وہ اس پر نادم ہو کر توبہ کر لیتے ہیں ایسے اہلِ ایمان کے بارے میں اللہ فرماتے ہیں:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ {۹۵}

''اللہ کے ذمہ ان لوگوں کی توبہ قبول کرنا لازم ہے جو نادانی کی بناء پر گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر بہت جلد توبہ کر لیتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے۔''

﴿۴۱﴾......اس آیت کریمہ میں بھی جس عذاب کا ذکر ہے وہ ایسے ہی ظالموں کے لیے ہے جو ظلم میں راسخ ہوں اور ایسے ظالم، کافر ہی ہو سکتے ہیں، سورۂ بقرہ میں ہے:

وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ {۹۶} ''اور کافر ہی ظالم ہیں''

﴿۴۲﴾......قرآن کا وہ مخصوص اسلوب جس کے تحت وہ وعدہ اور وعید، ثواب اور عذاب دونوں کو جمع کرتا ہے یہاں بھی نمایاں ہے...... یہاں تذکرہ ہے ان خوش نصیبوں کا جو ایمان لاتے ہیں اور انبیاء کی تعلیمات کے مطابق عملِ صالح کرتے ہیں، انبیاء کی تعلیمات میں جو چیز بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ انسانی کمزوریوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور کوئی ایسا حکم نہیں دیا گیا جو انسان کی طاقت میں نہ ہو، اسلامی شریعت میں اس پہلو کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے، خود اللہ کے نبی نے اسے آسان شریعت قرار دیا ہے۔

﴿۴۳﴾......اہلِ جنت کو جن مختلف نعمتوں سے نوازا جائے گا ان میں سے ایک نعمت یہ ہو گی کہ ان کے دل ہر قسم کے بغض اور حسد سے بالکل پاک ہوں گے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب (اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد گنہگار) مسلمان دوزخ سے نجات پا جائیں گے تو انہیں جنّت اور جہنم کے درمیان ایک

{۹۴} متّی ۱۹-۲۳-۲۴

{۹۵} النساء ۴/۱۷

{۹۶} البقرۃ ۲/۲۵۴

پُل پر روک لیا جائے گا، دنیا میں انہوں نے ایک دوسرے پر جو بھی ظلم کیے ہوں گے ان کا بدلہ یہاں دلوا دیا جائے گا یہاں تک کہ جب وہ بالکل پاک صاف ہو جائیں گے تو انہیں جنّت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی، اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے ان میں سے ہر کوئی جنّت میں اپنے مقام کو دنیا والے گھر سے بھی جلدی معلوم کر لے گا'' {۹۷}

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''اہلِ جنّت جب پُل صراط سے گذر جائیں گے تو انہیں روک لیا جائے گا حتیٰ کہ ان سے دنیا میں کی جانے والی زیادتیوں کا بدلہ لے لیا جائے گا پھر وہ جنت میں اس حال میں داخل ہوں گے کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بغض او رکینہ نہیں ہوگا'' {۹۸}

جنت میں داخل ہونے کے بعد اہلِ ایمان اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہیں گے، ہر جائز حمد وثنا کا مستحق اللہ ہے جس نے ہمیں دنیا میں قبولِ ایمان اور نیک اعمال کرنے کی توفیق دی، اگر اللہ ہمیں توفیق نہ دیتا تو ہم یہ سب کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

﴿وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ﴾ ''اس وقت انہیں پکار کر کہا جائے گا تمہیں اس جنت کا وارث بنایا گیا ہے ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے رہے ہو''

وراثت:

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اہلِ ایمان کے لیے جنت حاصل ہونے کو وراثت سے تعبیر کیا گیا ہے، وراثت میں ہوتا یہ ہے کہ کسی چیز کو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کیا جاتا ہے، {۹۹} جیسے میت سے مال، وارث کی طرف اور استاد سے علم شاگرد کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ وراثت کا یہ معنیٰ حصولِ جنّت پر کیسے صادق آتا ہے؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ وراثت کا اطلاق ایسی ملکیت پر بھی ہوتا ہے جس میں کوئی اختلاف اور تنازع کرنے والا نہ ہو اور جو کسی مشقت کے بغیر حاصل ہو جائے۔ {۱۰۰}

{۹۷} بخاری/الفتح/۵/۲۴۴۰

{۹۸} التفسیر المنیر/۸/صفحہ ۲۰۹

{۹۹} الوراثة والارث انتقال قنية اليك عن غيرك من غير عقد ولا مايجرى مجرى العقد (المفردات/۵۱۸)

{۱۰۰} وقال لكل من حصل له شيء من غير تعب قد ورث كذا (حواله مذكوره)

دوسرا جواب وہ ہے جو حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے سمجھ آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے ہر کسی کے لیے دو ٹھکانے ہیں ایک ٹھکانہ جنت میں ہے اور دوسرا ٹھکانہ جہنم میں ہے، جب کوئی (بدنصیب) مرنے کے بعد جہنم میں داخل ہو جاتا ہے تو جنت والے اس کے ٹھکانے کے وارث بن جاتے ہیں'' {۱۰۱}

نسائی وغیرہ میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، سارے جنتیوں کو ان کا دوزخ میں جو مقام ہوگا وہ دکھایا جائے گا، تو وہ کہیں گے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتے تو ہم یہاں ہوتے، تو یہ چیز ان کے لیے شکر کا باعث ہوگی اور سارے دوزخیوں کو ان کا جنت میں جو مقام ہوگا وہ دکھایا جائے گا تو وہ کہیں گے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں قبولِ ہدایت کی توفیق دے دیتا تو ہم بھی جنت میں ہوتے تو یہ بات ان کے لئے حسرت کا سبب ہوگی۔ {۱۰۲}

حکمت وہدایت:

۱......تکذیب اور تکبّر میں مبتلا انسانوں کے نہ اعمال قبول ہوتے ہیں نہ دعائیں، ان کی روحوں کو بھی آسمان میں جگہ نہیں دی جاتی۔ (۴۰)

۲......شریعت آسان ہے، جو حضرات اسے مشکل بنا کر پیش کرتے ہیں وہ نہ اسلام کے خیر خواہ ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے۔ (۴۲)

۳......دلوں کا بغض اور حسد سے پاک ہونا اہلِ جنّت کی صفات میں سے ہے۔ (۴۳)

۴......جنّت میں داخل ہونے کا استحقاق، اعمالِ صالحہ کی بناء پر ہوگا، لیکن انسان کو اعمال پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اللہ کی رحمت اور فضل کے بغیر نہ عمل کی توفیق ملتی ہے نہ عمل فائدہ دیتا ہے، صحیح مسلم میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے کسی کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کر سکتا، صحابہ نے سوال کیا، یا رسول اللہ! کیا آپ کو بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں مجھے بھی، الّا یہ کہ اللہ کی رحمت اور فضل مجھے ڈھانپ لے۔ {۱۰۳}

اس قسم کی احادیث اہلِ تقوٰی کو اپنے تقویٰ اور عمل پر اِترانے اور فخر وغرور سے بچانے کے لئے ہیں ورنہ ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عمل کو بے فائدہ سمجھ کر محض رحمت کی امید پر انسان زندگی گزار دے اور امیدِ رحمت کو بے عملی کا بہانہ بنالے۔

{۱۰۱} ابن ماجه، زهد، باب ۳۹

{۱۰۲} بحواله تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحه ۲۸۹

{۱۰۳} مسلم/۲۸۱۶

مختلف فریقوں میں گفتگو

﴿۴۴......۵۱﴾

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا

اور پکاریں گے جنت والے دوزخ والوں کو کہ ہم نے پایا جو ہم سے وعدہ کیا تھا ہمارے رب نے سچا، سو تم نے بھی پایا اپنے

وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۴ الَّذِيْنَ

رب کے وعدہ کو سچا؟ وہ کہیں گے کہ ہاں پھر پکارے گا ایک پکارنے والا ان کے بیچ میں کہ لعنت ہے اللہ کی ان ظالموں پر جو

يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝۴۵ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ

روکتے تھے اللہ کی راہ سے اور ڈھونڈتے تھے اس میں کجی اور وہ آخرت سے منکر تھے۔ اور دونوں کے بیچ میں ہو گی ایک دیوار

وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّۢا بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ

اور اعراف کے اوپر مرد ہونگے کہ پہچان لیں گے ہر ایک کو اس کی نشانی سے اور وہ پکاریں گے جنت والوں کو کہ سلامتی ہے تم

يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝۴۶ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَاۗءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا

پر وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ امیدوار ہیں۔ اور جب پھرے گی ان کی نگاہ دوزخ والوں کی طرف تو کہیں گے

تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۷ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ

اے رب ہمارے مت کر ہم کو گنہگار لوگوں کے ساتھ۔ اور پکاریں گے اعراف والے ان لوگوں کو کہ ان کو پہچانتے ہیں ان کی

قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۴۸ اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ

نشانی سے کہیں گے نہ کام آئی تمہارے جماعت تمہاری اور جو تم تکبر کیا کرتے تھے۔ اب یہ وہی ہیں کہ تم قسم کھایا کرتے تھے

اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝۴۹ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ

کہ نہ پہنچے گی ان کو اللہ کی رحمت چلے جاؤ جنت میں نہ ڈر ہے تم پر اور نہ تم غمگین ہو گے۔ اور پکاریں گے دوزخ والے جنت

النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاۗءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا

والوں کو کہ بہاؤ ہم پر تھوڑا سا پانی یا کچھ اس میں سے جو روزی تم کو دی اللہ نے، کہیں گے اللہ نے ان دونوں کو روک دیا ہے

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۰ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ

کافروں سے۔ جنہوں نے ٹھہرایا اپنا دین تماشا اور کھیل اور دھوکے میں ڈالا ان کو دنیا کی زندگی نے، سو آج ہم ان کو

نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾

بھلا دینگے جیسا انہوں نے بھلا دیا اس دن کے ملنے کو اور جیسا کہ وہ ہماری آیتوں سے منکر تھے۔

ربط: ماقبل سے مناسبت اور ربط بالکل واضح ہے، دو فریقوں کا ذکر چلا آرہا ہے، یہاں ان کے ساتھ ایک تیسرا فریق بھی شامل ہو گیا یعنی اصحابِ اعراف، ان تینوں جماعتوں میں مذکورہ بالا گفتگو قیامت کے دن ہو گی، یہ گفتگو اس طرح سنادی گئی ہے کہ قیامت کا منظر نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور یہ منظر کشی قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب ہے۔

تسہیل: اور جنت والے جہنم والوں کو پکار کر کہیں گے کہ ہم سے ہمارے پروردگار نے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اسے سچا پایا تو کیا تم نے بھی اس وعدہ کو سچا پایا جو تم سے تمہارے پروردگار نے کیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں، پھر ایک اعلان کرنے والا ان کے درمیان اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے O جو اللہ کی راہ سے روکتے، اس میں عیب اور اعتراض والی باتیں تلاش کرتے اور آخرت کا انکار کرتے تھے O اور ان کے درمیان ایک آڑ ہو گی اور اعراف پر بہت سارے لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو اس کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے، وہ اہلِ جنت کو پکار کر کہیں گے تم پر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہے، یہ لوگ جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے لیکن اس کی امید رکھتے ہوں گے O اور جب ان کی نظریں اہلِ دوزخ کی طرف پھیری جائیں گی تو وہ بول اٹھیں گے اے ہمارے پروردگار ہمیں ان ظالم لوگوں میں شامل نہ فرما دینا O اور اعراف والے پکاریں گے ایسے لوگوں کو جنہیں وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے اور ان سے کہیں گے تمہاری جماعت اور تمہارا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا تمہارے کسی کام نہ آیا O کیا یہی ہیں وہ لوگ جن کے بارے میں تم قسمیں اٹھا اٹھا کر کہتے تھے کہ ان پر اللہ اپنی رحمت نازل نہیں کرے گا؟ (ان کمزوروں کو تو حکم دے دیا گیا کہ) تم جنت میں داخل ہو جاؤ نہ تمہیں کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی کوئی غم O اور دوزخ والے جنت والوں سے درخواست کریں گے کہ ہمیں کچھ پانی یا وہ کھانا ہی عنایت کر دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے، وہ کہیں گے کہ اللہ نے یہ دو چیزیں آج ان کافروں پر حرام کر دی ہیں O جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا تھا اور جنہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا، سو آج ہم انہیں بھلا دیں گے جیسے انہوں نے آج کے دن کی پیشی کو بھلا دیا تھا اور جیسا کہ وہ ہماری آیتوں سے جان بوجھ کر انکار کرتے تھے O

تفسیر

﴿۴۴﴾...... اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کی باہمی گفتگو سے یہ استدلال مناسب نہ ہو گا کہ ان کے درمیان ویسا ہی

اتصال ہوگا جیسے دنیا میں دو بات چیت کرنے والوں کے درمیان ہوتا ہے چونکہ بظاہر قربِ مکانی ثابت ہوتا ہے اس لیے اسلاف کوتاویل کرنی پڑتی تھی مگر دورِ حاضر کی ایجادات نے مشرق اور مغرب کے فاصلوں کوختم کر دیا ہے اور ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے انسانوں کے لیے آپس میں بات چیت کرنا بلکہ تصویر اور حرکات وسکنات کا دیکھنا بھی آسان کر دیا ہے، یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آخرت میں روحانیت، مادیت پر غالب ہوگی اس لیے انسان کے لیے اپنے سے بہت دور بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھنا اور اس کی بات سننا ممکن ہوگا، آخرت کا جہان ویسے بھی ایسا جہان ہے جس کی پوری حقیقت اس دنیا میں رہتے ہوئے سمجھ نہیں آسکتی اس لیے کسی بھی ایسی نعمت یا حقیقت کا انکار جو عقل میں نہ آتی ہو بے عقلی اور نادانی کے سوا کچھ نہیں۔

اہلِ جنت کا اہلِ دوزخ سے سوال تحقیق اور تصدیق کے لیے نہیں بلکہ زجر اور توبیخ کے لیے اور دنیا میں انہوں نے تکذیب اور تکبر کا جو رویہ اختیار کیے رکھا اس پر شرمندہ کرنے کے لیے ہوگا۔{۱۰۴}

یہ زجر وتوبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ اہلِ جنت کی جانب سے بھی ہوگی اور ملائکہ کی جانب سے بھی ہوگی۔

سورۂ طور میں ہے، ملائکہ کہیں گے:

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿١٤﴾ أَفَسِحْرٌ هٰذَا أَمْ أَنتُمْ لَا تُبْصِرُونَ ﴿١٥﴾ اصْلَوْهَا فَاصْبِرُوا أَوْ لَا تَصْبِرُوا سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ {۱۰۵}

یہ ہے وہ آگ جسے تم جھٹلاتے تھے، کیا یہ جادو ہے یا تم اسے دیکھ نہیں رہے؟ تم اس میں جلو، پس تم صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے برابر ہے، تمہیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔

﴿فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ﴾ اس سوال جواب کے بعد ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، اللہ کے نافرمانوں کو قرآن میں ظالم کہا گیا ہے کیونکہ قبولِ ایمان سے انکار اور نافرمانی کی وجہ سے وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

﴿۴۵﴾...... ''صد'' اعراض اور انکار کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوسروں کو روکنے اور گمراہ کرنے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں دونوں معنی مراد لیے جاسکتے ہیں، اکثر ظالم اور سرکش اس شعر کا مصداق ہوتے ہیں۔

خود تو ڈوبے ہیں تجھے بھی لے ڈوبیں گے صنم

{۱۰۴} تبجحا بحالهم وشماتة باصحاب النار وتحسيرالهم لالمجرّد الاخبار بحالهم والاستخبار عن حال مخاطبيهم-(ابوسعود جلد ۲ صفحہ ۴۹۵)

{۱۰۵} سورۂ طور ۵۲/۱۴-۱۶

یہ ظالم اللہ کی راہ سے انسانوں کو روکتے بھی ہیں جس کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس میں اپنے خیال میں عیوب، کمزوریاں اور اعتراض کی باتیں تلاش کر کے لوگوں کو بتاتے ہیں۔ یہ آیت ان کافروں پر صادق آتی ہے جو کمزور مسلمانوں پر مشقِ ستم ڈھاتے ہیں اور زورِ بازو سے انسانوں کو ہدایت کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں۔

اس کا مصداق وہ مستشرقین اور دشمنانِ اسلام بھی ہیں جو کتاب اللہ، رسول اللہ اور اسلامی عقائد و عبادات میں عیوب اور نقائص تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں، ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اسلام کو ایسے بدنما مذہب کے طور پر پیش کریں جس میں بھلائی کی کوئی بات نہیں، اسی طرح یہ ظالم پیغمبرِ اسلام پر بھی رکیک ترین حملوں سے باز نہیں آتے۔

وہ مشرک بھی اس کا مصداق ہیں جو عقیدۂ توحید کو خالص نہیں رہنے دیتے اور کسی نہ کسی حیلے اور تاویل سے اس میں شرک کی ملاوٹ کر ہی دیتے ہیں، تحقیق کرنے پر پتا چلتا ہے کہ خود توحید کے دعویداروں نے بھی بہت سارے حاجت روا اور مشکل کُشا تجویز کر رکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ {١٠٦} ''ان کی اکثریت اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتی ہے اور شرک بھی کرتی ہے''

﴿وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ﴾ کہنا چاہیے کہ آیت کے خاتمہ میں ان ظالموں کی زیادتیوں، کج رویوں اور گمراہیوں کی اصل وجہ بتائی گئی ہے یعنی ان کا انکارِ آخرت، چونکہ وہ آخرت کے حساب اور عذاب سے نہیں ڈرتے اس لیے وہ اپنے قول و فعل میں بے خوف ہوتے ہیں، آخرت پر کامل ایمان خال خال لوگوں ہی کو نصیب ہوتا ہے، غیر مسلم قوموں میں ویسے بھی آخرت کا تصور ادھورا اور ناقص پایا جاتا ہے۔

﴿۴٦﴾...... اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان ایک رکاوٹ ہوگی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے تک نہیں پہنچ سکیں گے، اس قسم کی رکاوٹ کا ذکر سورۂ حدید میں بھی آیا ہے جو کہ مؤمنوں اور منافقوں کے درمیان کھڑی کی جائے گی۔ سورۂ حدید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ {١٠٧}

اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہلِ ایمان سے کہیں گے ''ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے روشنی حاصل کرسکیں، انہیں کہا جائے گا پیچھے چلے جاؤ اور نور تلاش کرو پھر ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی جس میں دروازہ ہوگا اس کے اندر تو رحمت ہوگی اور باہر عذاب ہوگا''۔

{١٠٦} سورة یوسف ١٢/١٠٦

{١٠٧} سورة الحدید ۵۷/١٣

اصحابِ اعراف

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان جو دیوار ہوگی اسے سورۂ حدید کی مذکورہ بالا آیت میں ''سور'' سے اور یہاں ''اعراف'' سے تعبیر کیا گیا ہے، اعراف عُرف کی جمع ہے اور عرف ہر چیز کے اوپر والے حصہ کو کہا جاتا ہے، مرغ کی کلغی اور گھوڑے کی گردن کے بالوں پر بھی ''عرف'' کا اطلاق ہوتا ہے۔{۱۰۸}

لغوی تحقیق اور روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہونے والے حصار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے، اس بالائی حصہ پر ایسے لوگ ہوں گے جو اہلِ جنّت اور اہلِ دوزخ کو اپنے اپنے مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی ان علامات کی بناء پر پہچان لیں گے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کی ہیں مثلاً سورۂ عبس میں ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾ {۱۰۹}

''اس دن کچھ چہرے چمک رہے ہوں گے، ہنستے ہوئے اور خوش وخرم اور کچھ چہروں پر غبار پڑ رہا ہوگا اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو کافر اور بدکار ہیں''۔

جہاں تک داخل ہونے کے بعد کا تعلق ہے تو اس کے بعد ویسے ہی دونوں فریقوں کے درمیان امتیاز ہو جائے گا، علامتوں کی بناء پر فرق کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔{۱۱۰}

رہا یہ سوال کہ یہ کون لوگ ہوں گے اور انہیں یہاں کیوں روکا جائے گا؟ تو اس کے جواب میں کم وبیش بارہ اقوال پیش کیے جاسکتے ہیں، ان میں سے راجح قول یہ ہے کہ یہ لوگ نہ تو ان صلحاء میں سے ہوں گے جو نیکیوں کا پلڑا بھاری ہونے کی وجہ سے ابتداء ہی سے جنت کے حقدار ہو جائیں گے اور نہ ہی ان باغیوں اور نافرمانوں میں سے ہوں گے جنہیں گناہوں کی کثرت کی وجہ سے دوزخ کا راستہ دکھا دیا جائے گا بلکہ نیکیوں اور گناہوں کے برابر ہونے کی وجہ سے یہ ابتداء میں جنّت سے محروم رہیں گے لیکن بالآخر رحمتِ باری کے نتیجے میں انہیں جنت میں جگہ دے دی جائے گی۔{۱۱۱}

{۱۰۸}جمع عرف استعیر من عرف الفرس وعرف الدیك (کشاف ۱۰۲/۲)

{۱۰۹}سورۂ عبس/۸۰/۳۸-۴۲

{۱۱۰}(تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۲۵۰) ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بعینہ ترجمہ نہیں بلکہ محض مفہوم اور خلاصہ ہے، اکثر مقامات پر ہم نے مفہوم بیان کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔(شیخوپوری)

{۱۱۱}واختلفت عبارات المفسرین فی اصحاب الاعراف من هم؟ وکلها قریبة ترجع الی معنی واحد وهوانهم قوم استوت حسناتهم وسیأتهم (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۱)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اصحاب اعراف کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں گے، ان کے گناہ انہیں جنت سے اور ان کی نیکیاں انہیں دوزخ سے دور رکھیں گی چنانچہ انہیں اس وقت تک اعراف پر روک کر رکھا جائے گا جب تک کہ ان کے بارے میں فیصلہ نہ ہو جائے۔{۱۱۲}

﴿وَنَادَىٰٓ أَصۡحَٰبُ ٱلۡجَنَّةِ﴾ اصحابِ اعراف، اہلِ جنت سے کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، دنیا میں بھی اکرام اور اظہارِ محبت کے لیے یہ کلمہ مسلمان آپس میں ملاقات کے وقت بولتے ہیں، آخرت میں بھی اس کا استعمال بار بار ہوگا۔

﴿لَمۡ يَدۡخُلُوهَا وَهُمۡ يَطۡمَعُونَ﴾ (یہ لوگ جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے لیکن اس کی اُمید رکھتے ہوں گے)

اس سے مراد یا تو اصحابِ اعراف ہیں یا اہلِ جنت ہیں۔{۱۱۳}

جس وقت اصحابِ اعراف انہیں سلام کہیں گے، اس وقت تک وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن حساب کے آسان ہونے، پل صراط سے گزر جانے اور اپنے چہروں کی چمک دمک کی وجہ سے ان کے دل میں یہ اُمید پیدا ہو جائے گی کہ ہم جنت میں داخل ہوں گے یہاں یقین کے بجائے اُمید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ حشر کا میدان ایسی جگہ ہے کہ وہاں بڑی بڑی شخصیات خوف اور اُمید کے درمیان ہوں گی، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ فرماتے تھے ''اگر قیامت کے دن اعلان کیا جائے کہ ایک شخص کے سوا باقی سب دوزخی ہیں تو مجھے اُمید ہے کہ وہ ایک شخص میں ہی ہوں گا اور اگر یہ اعلان کیا جائے کہ ایک کے سوا باقی سب جنتی ہیں تو مجھے خوف لاحق ہوگا کہ کہیں وہ ایک میں ہی نہ ہوں''{۱۱۴}

﴿۴۷﴾......اور جب ان کی نظریں اہلِ دوزخ کی جانب پھیری جائیں گی...... یہاں قابلِ لحاظ نکتہ یہ ہے کہ ''پھیرنے'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ اصحابِ اعراف دوزخیوں کی طرف رضا و رغبت سے نہیں بلکہ کراہت اور ناپسندیدگی سے دیکھیں گے۔{۱۱۵}

﴿۴۸-۴۹﴾......اللہ کے باغیوں کو اپنی افرادی قوّت اور جاہ و مال پر بڑا ناز ہوتا ہے اور وہ ایسے اللہ والوں کو نہ دنیا میں

{۱۱۲}تفسیر ابنِ کثیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۱ (اور وہ فیصلہ یہی ہوگا کہ انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے گی)

{۱۱۳}وقال ابو مجلز: هم اهل الجنة (قرطبی جلد ۷ صفحہ ۱۹۱)

{۱۱۴}تفسیر منیر/۸/۲۱۶

{۱۱۵}والتعبير عن تعلق أبصارهم بأصحاب النار بالصرف اشعار بان التعلق الاول بطريق الرغبة و الميل الثاني بخلافه (ابوسعود جلد ۲ صفحہ ۴۹۶)

کسی اعزاز کے قابل سمجھتے ہیں نہ آخرت میں، جو ظاہری کرّ وفر سے محروم ہوتے ہیں لیکن قیامت کے دن ان فقیروں کو جنت میں داخل ہونے کا حکم دیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہلِ اعراف کو ہوگا جن کے بارے میں متکبرین قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ نہ تو ان کی مغفرت ہوگی اور نہ ہی یہ رحمتِ باری کے حقدار ہیں۔{۱۱۶}

﴿۵۰-۵۱﴾...... چاروں طرف سے آگ کے شعلوں میں گھرے اور پیاس سے تڑپتے ہوئے دوزخی، جنتیوں سے التجا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی جو نعمتیں تمہیں عطا کی ہیں ان میں سے کچھ ہمیں بھی عنایت کردو، انہیں جواب دیا جائے گا کہ آج قیامت کے دن یہ نعمتیں ان کافروں کے لیے قطعاً ممنوع ہیں جنہوں نے اپنے دین کو لہو ولعب اور کھیل تماشا بنالیا تھا۔ اذان ہو یا نماز اور روزہ، کل کے کافر بھی ان کا مذاق اڑاتے تھے اور آج کے کافر بھی ان کا مذاق اڑاتے ہیں، اگر وہ سنجیدگی سے پورے دین پر غور وفکر کرتے تو ایمان سے ہرگز محروم نہ رہتے۔

اس کا دوسرا معنیٰ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے کھیل تماشے کو اپنا دین بنا رکھا ہے، اس معنی کی روشنی میں اقوامِ عالم پر نظر ڈالی جائے تو ایسی قومیں بھی ملیں گی کہ ناچ گانا اور فحش کاری ان کے دین کا حصہ ہے، اپنی پڑوسی قوم ہی کو دیکھ لیجیے جن کے معبودانِ باطلہ کی فہرست میں انسانی شرمگاہ تک داخل ہے، اور ایسی جماعتوں اور افراد کی بھی کمی نہیں جو کھیل تماشوں میں اس قدر منہمک ہیں کہ لگتا ہے یہی ان کا دین ہیں، ان کا جینا اور مرنا لھو ولعب کے لیے وقف ہے۔

ایسے لوگ بھی بے شمار ہیں جن کی ساری زندگی نفس پرستی کے اردگرد گھومتی ہے وہ یا تو ''لھو'' میں مصروف رہتے ہیں یعنی ایسے اعمال جو انسان کو اس کی ذات اور انسانیت کے لیے زیادہ اہم اور مفید کاموں سے روکنے کا سبب بنتے ہیں۔{۱۱۷}

اور یا ''لعب'' میں مشغول رہتے ہیں جن میں دین اور دنیا کے اعتبار سے کوئی معقول فائدہ نہیں ہوتا۔{۱۱۸}

﴿وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ دنیا کی ظاہری چمک دمک نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ زندگی تو بس دنیا ہی کی زندگی ہے، آخرت کا ذکر تو معاذ اللہ محض بہلاوے کے لیے ہے، پھر چونکہ قادر ومختار اللہ فوراً مواخذہ نہیں فرماتا بلکہ ڈھیل پر ڈھیل دیے چلا جاتا ہے اس لیے بھی ادیانِ باطلہ کے پیروکار اور ظلم وعصیان میں ڈوبے ہوئے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں اور اپنے آپ کو برحق سمجھنے لگتے ہیں۔

{۱۱۶} ابن کثیر/۲/۲۹۳

{۱۱۷} اللھو مایشغل الانسان عمایعنیه ویھمّه (المفردات ۴۵۵)

{۱۱۸} ولعب فلان اذا کان فعله غیر قاصد به مقصدا صحیحا (المفردات ۴۵۰)

﴿فَالْيَوْمَ نَنسٰهُمْ﴾ (آج ہم انہیں بھلا دیں گے) اللہ کی ذات سے نسیان محال ہے، اسے ذرّے ذرّے کی خبر ہے، بھول چوک کا تصور بھی ناممکن ہے، اس لیے یہاں یہ معنی مراد لیا جاتا ہے کہ:

''ہم ان کے بارے میں وہ رویّہ اختیار کریں گے جو بھولنے والے کا ہوتا ہے'' {۱۱۹}

اور یہ رویّہ اس لیے اختیار کیا جائے گا کیونکہ انہوں نے قیامت کے بارے میں یہی رویّہ اختیار کیا تھا۔ {۱۲۰}

اور وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انکار بھی ایسا کہ دل سے تو جانتے تھے مگر زبان سے اقرار کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ {۱۲۱}

حکمت وہدایت:

۱...... اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان رابطہ ممکن ہوگا اور وہ ایک دوسرے کی حالت سے باخبر بھی ہوسکیں گے۔ (۴۴)

۲...... اسلام کی تصویر بگاڑ کر پیش کرنے والے مستشرق، عقیدۂ توحید میں ملاوٹ کرنے والے مشرک اور کمزور مسلمانوں پر ستم ڈھانے والے کافر یہ سب ہدایت سے روکنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ (۴۵)

۳...... جن لوگوں کے اندر یہ چار صفات پائی جائیں وہ لعنت کے مستحق ہیں: (۱) ظلم وشرک (۲) اللہ کی راہ سے روکنا (۳) دین میں شکوک وشبہات پیدا کرنا (۴) آخرت کا انکار کرنا۔ (۴۴-۴۵)

۴...... گناہ کو ہلکا اور نیکی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ چند گناہوں کی زیادتی انسان کو ابتدائی طور پر جنت میں داخل ہونے سے روک سکتی ہے۔ (۴۶)

۵...... مؤمن کی زندگی خوف اور اُمید کے درمیان ہوتی ہے۔ (۴۶)

۶...... مال کی کثرت اور افرادی قوّت جیسے اسباب جو دنیا میں عزت اور فضل کا مدار ہوتے ہیں آخرت میں کسی کام نہیں آئیں گے۔ (۴۸)

۷...... ان غریبوں اور کمزوروں کے لیے خوشخبری ہے جو ایمان والی زندگی بسر کریں گے۔ (۴۹)

۸...... قیامت کو بھول جانیوالوں کو پانی کا ایک گھونٹ بھی میسّر نہیں ہوگا جبکہ آخرت کو یاد رکھنے والوں کو نبی کریم ﷺ اپنے دستِ مبارک سے حوضِ کوثر سے پانی پلائیں گے...... جنت کے مشروبات اس کے علاوہ ہوں گے۔ (۵۰)

{۱۱۹} نفعل بهم فعل الناسين فنترکهم فی النار (بیضاوی جلد ۳ صفحہ ۲۴)

{۱۲۰} وذهب غير واحد إلى أنّ الكاف للتعليل- (روح المعانی ۵، الجزء الثامن/۱۸۹)

{۱۲۱} الجحود نفی مافی القلب اثباته واثبات مافی القلب نفيه (المفردات ۸۸)

۹......کسی پیاسے کو پانی پلانا افضل عمل ہے، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ بہترین صدقہ کونسا ہے تو آپ نے فرمایا پانی! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اہلِ دوزخ، اہلِ جنت سے التجا کریں گے کہ ''ہمیں کچھ پانی یا وہ کھانا ہی عنایت کردو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے'' {۱۲۲}

ابوداوٗد میں ہے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ آپ کو کونسا صدقہ زیادہ پسند ہے تو آپ نے فرمایا پانی۔ {۱۲۳}

بعض تابعین کا قول ہے کہ جس کے گناہ زیادہ ہوں اسے چاہیے کہ پانی پلائے، کیونکہ بخاری کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے پیاسے کتّے کو پانی پلانے والی طوائف کے گناہ معاف کردیئے تھے، تو جو کسی مؤمن اور موحد کو پانی پلائے گا، اس کے درجات کی بلندی کے کہنے ہی کیا ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ''جو کوئی کسی مسلمان کو ایسی جگہ پانی کا ایک گھونٹ پلائے جہاں پانی میسر ہو اسے اتنا ثواب ملے گا گویا اس نے غلام کو آزاد کیا اور جس نے ایسی جگہ مسلمان کو پانی کا ایک گھونٹ پلایا جہاں پانی دستیاب نہیں تھا تو وہ ایسا ہے گویا اس نے اسے زندہ کردیا'' {۱۲۴}

۱۰......دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے، جو لوگ دنیا کی کشش میں کھو جاتے ہیں وہ آخرت کو بھول جاتے ہیں، چنانچہ آخرت میں انہیں دوزخ میں ڈال کر بھلا دیا جائے گا۔ (۵۱)

قیامت کے دن جھٹلانے والوں کا حال

﴿۵۲......۵۳﴾

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ

اور ہم نے ان لوگوں کے پاس پہنچادی ہے کتاب جس کو مفصل بیان کیا ہے ہم نے خبرداری سے، راہ دکھانے والی اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔ کیا اب اسی

اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاۗءَتْ رُسُلُ

کے منتظر ہیں کہ اس کا مضمون ظاہر ہو جائے جس دن ظاہر ہو جائے گا اس کا مضمون، کہنے لگیں گے وہ لوگ جو اس کو بھول رہے تھے پہلے سے بیشک لائے تھے

{۱۲۲} تفسیر منیر/۸/۲۲۵

{۱۲۳} ابوداؤد/۱/۲۴۳/باب فی فضل سقی الماء

{۱۲۴} ابن ماجہ/رھون، باب ۱۶

رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَاۤءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَاۤ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ

ہمارے رب کے رسول سچی بات، سواب کوئی ہماری سفارش والے ہیں تو ہماری سفارش کریں یا ہم لوٹا دیے جائیں تو ہم عمل کریں خلاف اس کے جو ہم کررہے تھے،

خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

بیشک تباہ کیا انہوں نے اپنے آپ کو اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افترا کیا کرتے تھے۔

تسہیل: اور ہم نے ان کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جسے ہم نے اپنے علمِ کامل سے خوب کھول کر بیان کر دیا ہے، یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہے جو ایمان رکھتے ہیں ٥ یہ لوگ تو صرف آخری نتیجے کا انتظار کر رہے ہیں جس دن آخری نتیجہ ان کے سامنے آئے گا تو وہ لوگ جو اسے اس سے پہلے بھولے ہوئے تھے وہ بول اٹھیں گے کہ واقعی ہمارے پروردگار کے پیغمبر سچ ہی لے کر آئے تھے سو اب کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے جو ہماری سفارش کر دے؟ یا ہمارا واپس جانا ممکن ہے تا کہ ہم جو کچھ کرتے رہے اس کے برخلاف کچھ اور کریں؟ یقیناً ان لوگوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لیا اور یہ جو جو باتیں تراشتے تھے سب گم ہو گئیں ٥

﴿تفسیر﴾

﴿۵۲﴾...... دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو فراموش کر دینے والے قیامت کے دن کوئی عذر پیش نہیں کر سکیں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے ایسی کتاب بھیجی تھی جس میں کامل اور یقینی علم کے ساتھ ہر ہر بات کھول کر بیان کر دی گئی تھی، دین و دنیا کی بھلائی کا ہر مضمون اس میں موجود تھا مگر انہوں نے مان کر ہی نہ دیا۔

﴿۵۳﴾...... یہ کفار آخری نتیجے کا انتظار کرتے رہے۔{۱۲۵}

یعنی قرآن کریم نے جو وعدے کیے ہیں اور جو وعیدیں سنائی ہیں ان کی تکمیل اور قیامت کے برپا ہونے کا انتظار، حالانکہ جب آخری نتیجہ سامنے آجائے گا تب حسرت و ندامت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا نہ ہی کوئی سفارش کے لیے آمادہ ہو گا اور نہ ہی دنیا میں واپس لوٹنے کی حسرت اور تمنا پوری ہو سکے گی۔

{۱۲۵} ای ما وعدوا به من العذاب والنکال والجنة والنار قاله مجاهد وغیر واحد (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۵)

دعوتِ انبیاء

﴿۵۴......۵۸﴾

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ

بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کیے آسمان اور زمین چھ دن میں پھر قرار پکڑا عرش پر، اڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے

يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ

پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا اور پیدا کیے سورج اور چاند اور تارے تابعدار اپنے حکم کے سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا،

الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤﴾ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ

بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔ پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے اس کو خوش نہیں آتے حد سے بڑھنے والے۔

الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ

اور مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور پکارو اس کو ڈر اور توقع سے، بیشک اللہ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام

اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ

کرنے والوں سے۔ اور وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی مینہ سے پہلے یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں

حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ

اٹھا لاتی ہیں بھاری بادلوں کو تو ہانک دیتے ہیں ہم اس بادل کو ایک شہر مردہ کی طرف، پھر ہم اتارتے ہیں اس بادل سے پانی

مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ

پھر اس سے نکالتے ہیں سب طرح کے پھل، اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تا کہ تم غور کرو۔ اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کا سبزہ نکلتا ہے

نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

اس کے رب کے حکم سے اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص، یوں پھیر پھیر کر بتلاتے ہیں ہم آیتیں حق ماننے والے لوگوں کو۔

ربط: اس سے قبل اہلِ جنّت اور اہلِ دوزخ کا ذکر کیا گیا اور کفار کی ہلاکت اور خسارے کا سبب بیان کیا گیا یعنی انبیاء کی اتباع نہ کرنا، اگلی پانچ آیات میں انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کا خلاصہ بیان کیا جارہا ہے، جس کی ابتداء ہو رہی ہے ربوبیت اور الوہیت کے بیان سے۔

تسہیل: بے شک تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ زمانوں میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر قائم ہوگیا، وہ رات سے دن کو ڈھانپ لیتا ہے، رات دن کے پیچھے تیزی سے چلی آتی ہے اور سورج، چاند اور ستارے

سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یادرکھو پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے، بڑا بابرکت ہے اللہ جو کہ رب العٰلمین ہے O اپنے رب سے مانگا کرو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا O اور حالات کی درستگی کے بعد زمین میں فساد برپا نہ کرو اور اللہ کو خوف اور اُمید سے پکارتے رہو، بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے بہت قریب ہے O وہی اللہ ہے جو بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری کے لیے ہوائیں چلاتا ہے، چنانچہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھالیتی ہیں تو ہم ان بادلوں کو کسی خشک علاقے کی طرف ہانک لے جاتے ہیں پھر اس سے بارش برسا دیتے ہیں اور اس کے ذریعے ہر قسم کے پھل پیدا کردیتے ہیں، اسی طرح ہم مُردوں کو بھی نکال کھڑا کریں گے شاید تم اس سے نصیحت حاصل کرو O اور عمدہ زمین اپنے ربّ کے حکم سے پیداوار خوب دیتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار ہی حاصل ہوتی ہے، ہم اسی طرح اپنے دلائل مختلف طریقوں سے ان لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جو شکرگزار ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۵۴﴾......رب کا معنی ہے سید، مالک، مدبّر اور مربی، ''پرودگار'' کا لفظ ''ربّ'' کا پورا مفہوم ادا نہیں کرسکتا، ''الٰہ'' معبود کو کہتے ہیں جس کی عبادت کی جاتی ہے اور جس کی طرف انسان ضرورت اور پریشانی کے وقت متوجہ ہوتا ہے، ہمارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے، ان الفاظ میں ساری کائنات آجاتی ہے۔{۱۲۶}

مشرکانہ تصورات میں آسمان خدائے اعظم اور زمین دھرتی مائی کی حیثیت رکھتی تھی چنانچہ ان کی عبادت کی جاتی تھی یہ حقیقت تو قرآن نے واشگاف کی کہ زمین اور آسمان معبود تو کیا ہوں گے اپنے آپ کو وجود میں لانے پر بھی قادر نہیں۔

﴿فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾ یوم سے مراد چوبیں گھنٹے والا نہیں کیونکہ اس وقت نہ زمین تھی نہ آسمان، نہ سورج نہ چاند، نہ دن نہ رات، بلکہ اس سے مراد مطلق زمانہ ہے۔{۱۲۷}

اہلِ عرب جب ''ایام العرب'' کہتے تھے تو اس سے مراد وہ مشہور جنگیں لی جاتی تھیں جو مختلف زمانوں میں پیش آئیں، قرآن ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا دن ہزار سال کا بھی ہوسکتا ہے اور پچاس ہزار سال کا بھی، سورۂ حج میں ہے:

{۱۲۶}ای ان خالقکم ومالککم الذی خلق الاجرام العلویه والسفلیة فی ستة اوقات (ابوسعود جلد۲ صفحه۴۹۸)

{۱۲۷}وقدیعبربه عن مدّة من الزمان ایّ مدة کانت(المفردات ۵۵۳) ای فی ستة اوقات(بیضاوی ۲۵/۳)

وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ {۱۲۸} ''تمہارے رب کا ایک دن تمہارے شمار کے حساب سے ہزار سال کا ہوتا ہے''۔

سورۂ معارج میں ہے:

فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ {۱۲۹} ''ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے''۔

استواء علی العرش

﴿ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ﴾ ان جیسے الفاظ کو متشابہات میں سے قرار دیا گیا ہے یعنی ان کے معنی تو معلوم ہیں مگر ان کی دوٹوک مراد بیان کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں، یہاں پر جو لفظِ ''استوی'' ہے اس کا معنی ہے کسی چیز کا اپنی ذات کے اعتبار سے حالتِ اعتدال پر ہونا اور جب اس کے بعد حرفِ ''علی'' آئے تو اس کا معنی ہوتا ہے کسی چیز پر چڑھنا، قائم ہونا، قرار پکڑنا اور غالب ہونا، اسی طرح ''استوی'' کا لفظ برابر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔{۱۳۰}

اور ''عرش'' تخت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، تو ان الفاظ کے معانی تو ہمیں معلوم ہیں مگر ان کی قطعی مراد بیان کرنا مشکل ہے، کیونکہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھتے ہیں یونہی اللہ تعالیٰ بھی اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا اور اس کے لیے مخلوق جیسی حرکات وسکنات ثابت کرنا لازم آئے گا۔

صحابہ کرام اور سلف صالحین ان جیسے الفاظ کی حقیقت تک پہنچنے کی نہ تو کوشش کرتے تھے اور نہ ہی انہیں سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آتی تھی، ان کا عقیدہ بہت سادہ تھا وہ یہ کہ ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی جو بھی مراد ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے:

الاستواء معلوم والکیف مجهول والسؤال عن هذا بدعة {۱۳۱} ''استواء کا لغوی معنی معلوم ہے مگر اس کی حقیقت اور کیفیت مجہول ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے''۔

امام مالک رحمہ اللہ ہی سے ایک شخص نے ''استواء'' کے بارے میں سوال کیا تو انہیں سخت رنج ہوا جس کی وجہ

{۱۲۸} الحج: آیت ۴۷

{۱۲۹} المعارج آیت ۴

{۱۳۰} المفردات ۲۵۱

{۱۳۱} قرطبی جلد ۸ صفحہ ۱۹۶

سے آپ پسینے سے شرابور ہو گئے جب رنج اور غصہ میں کچھ کمی آئی تو آپ نے سوال کرنے والے سے فرمایا ''استواء کی کیفیت ہماری عقل میں نہیں آسکتی مگر اس کے معنی سب کو معلوم ہیں، استواء پر ایمان رکھنا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم گمراہ ہو جاؤ گے پھر آپ نے اسے مجلس سے نکال دینے کا حکم دیا'' {۱۳۲}

متشابہات کی حقیقت تک رسائی کا حکم نہ ہمیں اللہ اور رسول نے دیا ہے اور نہ ہی اس کے جاننے پر ایمان اور عمل کے کسی تقاضے کا مدار ہے، ''عرش پر قائم ہونے'' کا زیادہ سے زیادہ یہ مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد باری تعالیٰ نے حکومت و تدبیر کے احکام جاری کرنے شروع کر دیئے۔ {۱۳۳}

﴿يُغْشِى الَّيْلَ﴾ وہ رات سے دن کو ڈھانپ لیتا ہے، رات اور دن دونوں ایک دوسرے کے پیچھے تیزی سے چلے آتے ہیں ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چکّی ہے جو گھوم رہی ہے، دن کے چھپنے اور رات کے نمودار ہونے میں ایک انتہائی مربوط با قاعدگی پائی جاتی ہے، زمین کا سورج سے ایک مخصوص فاصلے پر ہونا، پھر محوری گردش کا روبعمل آنا اور اسی گردش کے دوران زمین کے مختلف حصوں کا تسلسل کے ساتھ مقررہ وقفوں کے دوران سورج کے سامنے آنا اور مقررہ وقفے کے بعد سرک جانا صاف صاف نشاندہی کرتا ہے کہ دن اور رات کا یہ نظام کسی حکیم اور دانا ہستی نے تمام مراحل کو مدنظر رکھتے ہوئے قائم کیا ہے، اگر یہ نظام مربوط نہ ہوتا تو شب و روز کی آمدورفت میں وہ با قاعدگی نہ ہوتی جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ خلق کے معنی پیدا کرنا اور امر کے معنی حکم کرنا ہیں، کائنات کی ہر چیز کا پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے اور ہر چیز میں حکم بھی اسی کا چلتا ہے، طلوع و غروب سے لیکر موت و حیات تک اور فقر و غنا سے لیکر عزت اور ذلت تک اسی کا حکم چلتا ہے، سورۂ طلاق میں بھی انہی دونوں چیزوں کا ذکر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ {۱۳۴}

''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے''۔

﴿۵۵﴾......انبیاء کی دعوت میں بنیادی چیز تو ذہنوں میں اللہ کے خالق و مالک اور رب ہونے کا تصور مضبوط کرنا تھا،

{۱۳۲} روح المعانی ۵، الجزء الثامن/ ۲۰۰

{۱۳۳} یذکر الاستواء علی العرش والمراد نفاذ القدرة وجریان المشیة (تفسیر کبیر/ ۵/ ۲۷۰)

{۱۳۴} الطلاق/ ۱۲

جب بندوں کا اپنے بندہ نواز کے ساتھ تعلق درست ہوجاتا ہے تو وہ انہیں حکم دیتے کہ اپنے رب سے مانگا کرو، مانگنے سے یہ تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا ہے، اللہ سے مانگنا عبادت کی روح ہے، دعا میں دو چیزوں کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، تضرّع اور آہستگی، تضرّع، ضرع سے مشتق ہے، ''ضرع البهم'' کا معنی ہے چوپائے کے بچے کا اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لے لینا، اظہارِ ذلت کا معنی بھی اس میں پایا جاتا ہے۔{۱۳۵}

اگر ان لغوی معانی کو ملحوظ رکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی عبادت اور دعا میں اظہارِ ذلّت کے ساتھ طلب کی وہ کیفیت ہونی چاہیے جو دودھ پیتے بچے کے اندر ہوتی ہے۔

تضرّع کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ دعا آہستہ کی جائے، بلاوجہ آواز بلند کرنے اور چیخنے چلاّنے میں ریا اور دکھاوے کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہ حکم صرف دعا کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دوسرے اذکار اور وظائف کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ بلاضرورت آواز بلند نہ کی جائے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، کچھ لوگ بلند آواز میں تکبیر کہنے لگے، اس پر آپ نے فرمایا:

يـاايها الناس اربعوا على أنفسكم فانكم لاتـدعون أصمّ ولاغائب، انكم تدعون سميعا قريبا وهو معكم{۱۳۶}

''اے لوگو! اپنی جانوں پر ترس کھاؤ، تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے بلکہ تم ایسی ذات کو پکار رہے ہو جو سننے والا اور قریب ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے''

سلف کی عادت

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علانیہ اور جہراً دعا کرنے میں اور آہستہ آہستہ پست آواز سے دعا کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے، سلف صالحین کی عادت یہ تھی کہ ذکر و دعا میں بڑا مجاہدہ کرتے اور اکثر اوقات مشغول رہتے تھے مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا بلکہ ان کی دعائیں ان کے اور ان کے ربّ کے درمیان راز رہتی تھیں، ان میں سے بہت سارے حضرات پورا قرآن حفظ کرتے اور تلاوت کرتے رہتے تھے مگر کسی دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی اور بہت سے حضرات بڑا علمِ دین حاصل کرتے مگر لوگوں پر جتلاتے نہ پھرتے تھے، بہت سے حضرات راتوں کو اپنے

{۱۳۵}وضرع البهم تناول ضرع امه وقيل منه ضرع الرجل ضراعة ضعف وذل فهو ضارع وضرع وتضرع اظهر الضراعة(المفردات ۲۹۵)

{۱۳۶}صحیح بخاری/الفتح ۱۳/۳۸۶/۷

گھروں میں طویل طویل نمازیں ادا کرتے مگر آنے والوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی اور فرمایا کہ ہم نے ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ تمام عبادات جن کو وہ پوشیدہ کر کے ادا کر سکتے تھے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ اس کو ظاہر کر کے ادا کرتے ہوں، ان کی آوازیں، دعاؤں میں نہایت پست ہوتی تھیں۔{۱۳۷}

''ابنِ جریج نے فرمایا کہ دعاء میں آواز بلند کرنا اور شور کرنا مکروہ ہے۔{۱۳۸}

امام ابوبکر جصّاص حنفی رحمہ اللہ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ دعا کا آہستہ مانگنا بہ نسبت اظہار کے افضل ہے، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے ایسا ہی منقول ہے اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ختم پر جو آمین کہی جاتی ہے اس کو آہستہ کہنا افضل ہے کیونکہ آمین بھی ایک دعا ہے۔

نماز کے بعد دُعا

ہمارے زمانہ کے ائمہ مساجد کو اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرماویں کہ قرآن وسنّت کی اس تلقین اور بزرگانِ سلف کی ہدایات کو یکسر چھوڑ بیٹھے، ہر نماز کے بعد دعا کی ایک مصنوعی سی کاروائی ہوتی ہے، بلند آواز سے کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں جو آدابِ دعا کے خلاف ہونے کے علاوہ ان نمازیوں کی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں جو مسبوق ہونے کی وجہ سے امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز پوری کر رہے ہوتے ہیں، غلبۂ رسوم نے اس کی برائی اور مفاسد کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے کسی خاص موقع پر خاص دعا پوری جماعت سے کرانا مقصود ہو تو ایسے موقع پر ایک آدمی کسی قدر آواز سے دعا کے الفاظ کہے اور دوسرے آمین کہیں اس کا مضائقہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دوسروں کی نماز وعبادت میں خلل کا موجب نہ بنیں اور ایسا کرنے کی عادت نہ ڈالیں کہ عوام یہ سمجھنے لگیں کہ دعا کرنے کا طریقہ یہی ہے جیسا کہ آج کل عام طور سے ہو رہا ہے۔

یہ بیان اپنی حاجات کے لیے دعا مانگنے کا تھا، اگر دعاء کے معنیٰ اس جگہ ذکر وعبادت کے لیے جاویں تو اس میں بھی علماء سلف کی تحقیق یہی ہے کہ ذکرِ سرّ، ذکرِ جہر سے افضل ہے، اور صوفیائے کرام میں مشائخِ چشتیہ جو مبتدی کو ذکرِ جہر کی تلقین فرماتے ہیں وہ اس شخص کے حال کی مناسبت سے بطور علاج کے ہے تاکہ جہر کے ذریعہ کسل اور غفلت

{۱۳۷} تفسیر ابنِ کثیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۷

{۱۳۸} روح المعانی ۵، الجزء الثامن/ ۲۰۷

دور ہو جائے، اور قلب میں ذکر اللہ کے ساتھ ایک لگاؤ پیدا ہو جائے ورنہ فی نفسہٖ ذکر میں جہر کرنا ان کے یہاں بھی مطلوب نہیں، گو جائز ہے اور جواز اس کا بھی حدیث سے ثابت ہے بشرطیکہ اس میں ریاء و نمود نہ ہو۔ امام احمد بن حنبل، ابن حبان، بیہقی وغیرہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خیر الذکر الخفی وخیر الرزق مایکفی۔{۱۳۹} ''یعنی بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو انسان کے لئے کافی ہو جائے''۔

ہاں خاص خاص حالات اور اوقات میں جہر ہی مطلوب اور افضل ہے، ان اوقات و حالات کی تفصیل رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے واضح فرما دی ہے مثلاً اذان و اقامت کا بلند آواز سے کہنا، جہری نمازوں میں بلند آواز سے تلاوت کرنا، تکبیراتِ نماز، تکبیراتِ تشریق، حج میں تلبیہ بلند آواز سے کہنا وغیرہ، اسی لیے فقہاء رحمہم اللہ نے فیصلہ اس باب میں یہ فرمایا کہ جن خاص حالات اور مقامات میں رسولِ کریم ﷺ نے قولاً یا عملاً جہر کرنے کی تلقین فرمائی ہے وہاں تو جہر ہی کرنا چاہیے، اس کے علاوہ دوسرے حالات و مقامات میں ذکرِ خفی اولیٰ و انفع ہے۔{۱۴۰}

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ دوسرے معاملات میں حد سے تجاوز کرنے کو پسند نہیں کرتا یونہی دعا میں بھی حد سے بڑھ جانے کو پسند نہیں کرتا، حد سے بڑھ جانے کی کئی صورتیں ہیں جن میں سے بدترین یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کے غیر کو بھی شریک کر لیا جائے جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾{۱۴۱} ''اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو، نہ فرشتے کو، نہ نبی اور ولی کو'' کیونکہ دعا عبادت بلکہ عبادت کا مغز ہے۔

ترمذی میں ہے: ''الدعاء هو العبادة''{۱۴۲}

ترمذی ہی کی دوسری روایت میں ہے: ''الدعاء مخ العبادة''{۱۴۳}

اسی طرح دعا میں سجع بندی اور تکلف کرنا یا حرام اور ناجائز چیز کا سوال کرنا اور ایسی چیزیں مانگنا جو شرعاً اور عقلاً

{۱۳۹} مسند احمد/۱/باب ۱۷۲-۱۷۸

{۱۴۰} معارف القرآن جلد ۳ صفحہ ۵۷۷-۵۷۹

{۱۴۱} الجنّ/۱۸

{۱۴۲} ترمذی فی تفسیر/سورہ ۲، ابواب الدعوات/جلد ۲/صفحہ ۱۷۵

{۱۴۳} ترمذی، ابواب الدعوات/باب ۴۰

محال ہیں یہ ساری صورتیں بھی حد سے تجاوز کرنے کی ہیں، جو لوگ بنی اسرائیل کی طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر دشمن کے مقابلے میں فتح یا خوشحالی کی دعا کرتے ہیں وہ بھی حد سے تجاوز کرنے والوں میں شامل ہیں۔

بگاڑ اور درستگی

﴿۵۶﴾......اس دنیا کا بگاڑ اور درستگی انسان کے بگاڑ اور درستگی پر موقوف ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی مصلح اور پیغمبر بھیجے، انہوں نے انسان ہی کی فکری، عملی اور اخلاقی اصلاح و تربیت پر اپنی ساری صلاحیتیں لگائیں، انسان کی اور پورے عالم کی اصلاح ہوتی ہے عقیدۂ توحید پر عمل کرنے سے، نظامِ عدل قائم کرنے سے اور اللہ کی عبادت و اطاعت سے، اگر اللہ کے سوا کچھ اور خدا بنا لیے جائیں، نظامِ عدل کی جگہ ظلم و ستم کو شعار بنا لیا جائے اور عبادت و اطاعت کے بجائے بغاوت اور معصیت کا راستہ اختیار کر لیا جائے تو دنیا میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔

ابو بکر بن عیاش رحمہ اللہ سے زیر بحث آیتِ کریمہ کے حوالے سے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا ''جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو دنیا میں بھیجا اس وقت ہر طرف اور ہر شعبہ میں فساد ہی فساد تھا پھر آپ کی تعلیمات کی برکت سے اصلاح ہو گئی تو اب جو شخص ان تعلیمات کے خلاف چلنے کی دعوت دے گا وہ زمین میں فساد کرنے والا شمار ہوگا''

فساد تو ہر حال میں قبیح چیز ہے مگر اصلاح کے بعد فساد قبیح ترین ہے۔

تقریباً تین سو سال پہلے جب سے صنعتی ترقی کا آغاز ہوا ہے، کوئلہ، لوہا، پتھر، پانی، ہوا، پیٹرول اور گیس ہر چیز پر محنت ہو رہی ہے مگر انسان پر محنت نہیں ہو رہی، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مادی ترقی تو خوب ہو رہی ہے مگر اخلاقی اور روحانی ترقی کا سفر رک گیا ہے اس لیے ہر طرف فساد ہی فساد ہے، امن، عدل اور صلاح کہیں بھی نہیں ہے۔

﴿وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ گزشتہ آیت میں دعا کا حکم تھا، درمیان میں فساد پھیلانے سے منع کیا گیا اب دوبارہ دعا کا حکم دیا جا رہا ہے، گویا بتا دیا گیا کہ جو اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کا محتاج نہیں سمجھتا اور عجز و انکساری اور خوف والی کیفیات کے ساتھ اللہ کو نہیں پکارتا وہ فساد کی راہ پر چل رہا ہے، اصل بات یہ ہے کہ ہر انسان خواہ امیر ہو یا غریب محتاج ہے۔ وہ جب تک اس دنیا میں ہے ضرورتیں، بیماریاں، پریشانیاں اور مشکلات اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، ہر ضرورت سے پاک اور غنی صرف اللہ کی ذات ہے لہٰذا دعا کرتے ہوئے ایک طرف تو اپنے فقر اور بندگی کا احساس ہونا چاہیے دوسری طرف اللہ کے قادر اور رحمٰن و رحیم ہونے کا یقین بھی ہونا چاہیے جس کے قبضۂ قدرت میں زمین و آسمان کے

خزانے اور سارے وسائل واسباب ہیں وہ جسے چاہے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم رکھتا ہے، جب انسان اس شعور اوریقین کے ساتھ دعا کرتا ہے تو اس کے دل میں امید کا چراغ روشن ہوتا ہے اور وہ ناامیدی کی تاریکیوں سے نکل آتا ہے، مؤمن کی عبادت اور دعا میں دونوں کیفیتیں ہوتی ہیں امید بھی اور خوف بھی۔

احسان کیا ہے؟

﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾{۱۴۴} ''بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے بہت قریب ہے''

احسان کا ایک معنی ہے کسی کے ساتھ بھلائی کرنا اور اس کا دوسرا معنی ہے کسی کام کو اچھے طریقے سے کرنا۔{۱۴۵}

احسان ہر چیز میں مطلوب ہے عبادت اور دعا میں بھی اور دین اور دنیا کے تمام معاملات میں بھی، حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیٔ فاذا قتلتم فاحسنوا القتلۃ و اذا ذبحتم فاحسنوا الذبح، ولیحدّ احدکم شفرتہ ولیرح ذبیحتہ{۱۴۶}

''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں احسان فرض کیا ہے پس جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے کرو اور جب تم ذبح کرو تو اچھے طریقے سے کرو، تمہیں چھری تیز کر لینی چاہیے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچانا چاہیے''۔

دشمن کے ساتھ قتال کی نوبت آئے تو قتال کا حق ادا کیا جائے ضرب لگانے اور حملہ کرنے میں کمزوری نہ دکھائی جائے، دشمن کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگے کہ جن لوگوں سے مجھے واسطہ پیش آیا ہے وہ حربی امور میں مہارت رکھتے ہیں اور پوری تیاری کر کے آئے ہیں، دشمن کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارنا کہ اسے زیادہ تکلیف کا احساس نہ ہو یہ بھی احسان کا ایک حصّہ ہے۔

جس پر احسان ہوا ہے تو احسان کا بدلہ ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اس لیے کہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسٰنُ{۱۴۷} ''احسان کا بدلہ صرف احسان ہی ہے''

{۱۴۴}سورۃ الاعراف ۷/۵۶

{۱۴۵}والاحسان یقال علیٰ وجھین احدھا الانعام علی الغیر یقال احسن الی فلان والثانی احسان فی فعلہ وذلك اذا اعلم علماحسنا اوعمل عملاحسنا(المفردات ۱۱۹)

{۱۴۶}مسلم فی الصید،باب۵۷، ابوداؤد/ اضاحی /باب ۱۱، ترمذی /دیات، باب ۱۴

{۱۴۷}الرحمن/۵۵/۶۰

لیکن خود محسن کو اپنے احسان کی جزاء کی انسانوں سے امید نہیں رکھنی چاہیے ورنہ احسان نہیں رہے گا، تجارت بن جائے گی، آج اہلِ مغرب نے جو نظامِ اخلاق متعارف کرایا ہے اس میں ایسے کسی عمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس میں کوئی مادی فائدہ نہ ہو، ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت نفسانی لذت اور قومی اور مادی فوائد کو حاصل ہے، اگر یہ فوائد شر اور فساد، جنگ اور قتال، تخریب اور بگاڑ، ہلاکت اور بربادی میں زیادہ ہوں تو وہ انہی چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں اور اگر صلح اور امن، تعمیر اور آبادی کا کوئی کام کرتے بھی ہیں تو اس سے بھی ان کا مقصد مادی مفاد ہی ہوتا ہے، دنیا میں جہاں کہیں جنگ ہو رہی ہے، اس جنگ میں کسی نہ کسی انداز میں امریکہ اور مغربی طاقتوں کا ہاتھ دکھائی دے گا، اور کسی بھی ملک میں تعلیم، صحت، خاندانی منصوبہ بندی، دفاع اور تعمیرات کے شعبے میں ان کی دلچسپی ہوگی تو وہ اپنے ملک، قوم اور شیطانی سیاست کے مفاد کی وجہ سے ہوگی، حتّٰی کہ قحط، سیلاب، زلزلہ اور دیگر قدرتی آفات کا شکار قوموں کو وہ قرض دیتے بھی ہیں تو اس میں بھی ان کے مفادات پوشیدہ ہوتے ہیں۔

اسلام نے جس احسان کا حکم دیا ہے اس میں انسانوں سے کوئی معاوضہ مطلوب نہیں ہوتا، محض اللہ کی رضا پیشِ نظر ہوتی ہے۔

﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ”بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے بہت قریب ہے“

جو لوگ احسان کی کیفیت سے عبادت کرتے ہیں، اپنی تجارت وصنعت میں بھی حسن اور دیانت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اللہ کے بندوں کے ساتھ بھی احسان کرتے ہیں، اللہ بھی ان کے ساتھ احسان کرتا ہے اور یہی مفہوم ہے اللہ کی رحمت کے قریب ہونے کا، اس مفہوم کی تائید ابوداؤد کی حدیث سے بھی ہوتی ہے، آقا ﷺ نے فرمایا:

الراحمون یرحمهم الرحمن تبارک وتعالیٰ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء.{۱۴۸}	”رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، تم ان پر رحم کرو جو زمین میں ہیں، تم پر وہ رحم کرے گا جو آسمانوں میں ہے“

اللہ کی عمومی رحمت تو سب کے لیے ہے لیکن اس کی خصوصی رحمت صرف محسنوں کے لیے ہے، اسی سورت میں آگے آرہا ہے:

{۱۴۸} ابوداؤد/کتاب الادب، باب ۵۸، ترمذی/کتاب البر، باب ۱۶

وَرَحۡمَتِي وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٖۚ فَسَأَكۡتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ {۱۴۹} ''میری رحمت تو ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے مگر میں اسے ان لوگوں کے لیے تو ضرور ہی لازم کردوں گا جو خوف خدا رکھتے ہیں''

﴿۵۷﴾...... ہواؤں کا چلنا اور بارش کا برسنا بھی اللہ کی رحمت کی دلیل ہے۔

ہوا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ نباتات اور حیوانات کی زندگی ہوا پر موقوف ہے، اگر ہوا نہ ہو تو پلک جھپکنے میں سارے انسانوں اور حیوانوں کو زہریلی گیسیں ہلاک کردیں۔

بادلوں کے بننے، مختلف سمتوں میں حرکت کرنے، برسنے اور بکھرنے میں بھی ہواؤں کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل ہے، اسی لیے قرآن نے ہواؤں کو خوشخبری دینے والی قرار دیا ہے، سمندر کی سطح پر موجود پانی مستقل طور پر بخارات بن کر آسمان کی طرف اٹھتا رہتا ہے، ان بخارات سے بادل بنتے ہیں، ہوا ان بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھاتی ہے پھر جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے لے جاتی ہے، بارش برستی ہے تو مردہ زمین زندہ ہوجاتی ہے، ماہرین تسلیم کرتے ہیں کہ دریاؤں سے بخارات بن کر اڑنے والے بارش کے قطرے جو بادلوں میں بدل جاتے ہیں، ایسے مخصوص اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں جو مردہ زمین کو زندگی عطا کرتے ہیں یہ قطرے قدرتی کھاد سے معمور ہوتے ہیں، ایک اندازے کے مطابق ہر سال زمین کی سطح پر آسمان سے ۱۵۰ ملین ٹن کھاد گرتی ہے۔

﴿فَأَخۡرَجۡنَا بِهِۦ مِن كُلِّ ٱلثَّمَرَٰتِۚ﴾ ''پھر ہم اس کے ذریعے ہر قسم کا پھل پیدا کردیتے ہیں''

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر قسم کی زمین میں ہر قسم کے پھل پیدا ہوجاتے ہیں، اگلی آیت میں یہ مضمون صراحتہً آرہا ہے۔

﴿كَذَٰلِكَ نُخۡرِجُ ٱلۡمَوۡتَىٰ﴾ جیسے ہم مردہ زمین سے مختلف قسم کی نباتات پیدا کرسکتے ہیں یونہی ہم مردہ انسانوں کو بھی پیدا کرسکتے ہیں، زمین، فصل کٹ چکنے کے بعد ہر سال، چھ مہینے بعد ''مردہ'' ہوجاتی ہے مگر جیسے ہی بارش ہوتی ہے اور اس میں بیج بکھیر دیئے جاتے ہیں تو وہ ''زندہ'' ہوجاتی ہے، ایک ننھے بیج کے اندر ایک پوری دنیا بند ہوتی ہے جو بتدریج سامنے آجاتی ہے۔

بارش سے نہ صرف نباتات پیدا ہوتی ہے بلکہ دیکھا گیا ہے کہ بے شمار قسم کے کیڑے مکوڑے بھی خودبخود پیدا ہوجاتے ہیں، یونہی انسان بھی خودبخود پیدا ہوجائے گا اوّل تو اس کے لیے کسی جرثومہ اور بیج کی ضرورت ہی نہیں، اگر

{۱۴۹} الاعراف/۷/۱۵۶

بالفرض ضرورت کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ویبلی کل شیء من الانسان الا عظم الذنب فیه یرکب الخلق. {۱۵۰}

''سوائے ریڑھ کی ہڈی کے، انسان کی ہر چیز بوسیدہ ہو جاتی ہے اسی سے مخلوق کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا''

اگر چہ بہت ساری سائنسی تحقیقات نے انسان کی دوسری زندگی کا سمجھنا آسان کر دیا ہے لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں ''حیات بعد الموت'' کا عقیدہ ثابت کرنے کے لیے سائنس کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہمارے لیے یہی حجّت کافی ہے کہ قرآن اس زندگی کو ثابت کرتا ہے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے، سورۂ یٰس میں ہے:

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ {۱۵۱}

''انسان کہتا ہے کہ ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ آپ جواب دیجیے کہ انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے''

سورۂ قیامہ میں ہے:

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ {۱۵۲}

''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کریں گے؟ ہاں ضرور کریں گے ہم تو قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں''

﴿۵۸﴾......سابقہ آیت میں حیات بعد الموت کے لیے اس مردہ زمین کی مثال ذکر کی گئی جو بارش سے زندہ ہو جاتی ہے، زیرِ نظر آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ پیداوار کے اعتبار سے زمین کے مختلف ٹکڑوں میں فرق ہوتا ہے یونہی انسانوں کی طبیعت، مزاج، استعداد اور سوجھ بوجھ میں بڑا فرق ہوتا ہے، جیسے ہر زمین میں گندم، مکئی، باجرہ، سیب، انگور، بادام، آم اور آڑو وغیرہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی یونہی ہر انسان کے اندر قبولِ ایمان اور اعلیٰ اخلاق وصفات سے متصف ہونے کی استعداد نہیں ہوتی بلکہ صلاحیتوں اور طبائع کے اعتبار سے جتنا فرق انسانوں میں ہے اتنا فرق نہ زمین کے قطعات میں ہے نہ حیوانات میں۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مثال مؤمن اور کافر کے لیے بیان فرمائی ہے۔{۱۵۳}

{۱۵۰} بخاری فی التفسیر/سورۃ ۳۹، مسلم/ کتاب الفتن، باب ۱۴۱، مسند حمد/۲، ۴۹۹

{۱۵۱} سورۃ یٰسٓ/۳۶/۷۸

{۱۵۲} القیامۃ/۷۵/۳

{۱۵۳} عن ابن عباس فی الآیۃ: ھذا مثل ضربه اللہ للمؤمن والکافر (ابنِ کثیر ۲/۲۹۹

بارش کے نتائج

اللہ کی رحمت عمدہ اور شور دونوں قسم کی زمین پر برستی ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہوتا ہے، اچھی زمین جس میں نشوونما کی صلاحیت ہوتی ہے اس سے اناج اور پھل پھول حاصل ہوتے ہیں اور بنجر اور کھاری زمین سے اوّل تو پیداوار حاصل ہوتی نہیں، اگر ہوتی بھی ہے تو بہت کم مقدار میں یا خراب ہوتی ہے، قرآن کی صورت میں برسنے والی بارش کا بھی یہی حال ہے اس سے ہر شخص یکساں استفادہ نہیں کرسکتا بلکہ استعداد اور صلاحیت کے اعتبار سے فائدہ اٹھاتا ہے، یہی حقیقت ایک حدیث میں واضح کی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم وہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے آسمان سے زمین پر بارش ہوتی ہے تو جو ٹکڑا زرخیز ہوتا ہے وہ پانی کو قبول کرلیتا ہے اور خوب سبزہ اور نباتات اُگاتا ہے، کوئی ٹکڑا ایسا ہوتا ہے (جس میں کوئی چیز پیدا تو نہیں ہوتی البتہ وہ) پانی کو روک لیتا ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں، پیتے بھی ہیں اور کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں اور کوئی ٹکڑا ایسا ہوتا ہے جو چٹیل ہوتا ہے، نہ پانی اس میں ٹھہرتا ہے اور نہ ہی وہاں سبزہ اُگتا ہے یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو دین کی سمجھ حاصل کرتے ہیں اور انہیں اس علم سے فائدہ ہوتا ہے جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے پس وہ سیکھتے اور سکھاتے ہیں، اور ان لوگوں کی جو اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے اور اس ہدایت کو قبول نہیں کرتے جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے'' {۱۵۴}

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے دو قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور تیسری قسم کا ذکر نہیں کیا وہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے، پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو علم سے خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں، دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو منکر ہیں، تیسری قسم جس کا آپ نے ذکر نہیں فرمایا وہ لوگ ہیں جن کے علم سے دوسرے مستفید ہوتے ہیں مگر خود انہیں اپنے علم سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا جیسا کہ بے عمل علماء ہوتے ہیں۔

﴿كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ﴾ یہ آیات جو ہمارے علم اور حکمت پر دلالت کرتی ہیں ہم ایسے لوگوں کے لیے ادل بدل کر بیان کرتے ہیں جو ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔

حکمت وہدایت:

۱......مظاہرِ فطرت، عبادت کے لائق نہیں بلکہ اللہ کی عاجز مخلوق ہیں۔(۵۴)

۲......متشابہات پر اجمالی ایمان کافی ہے اگرچہ ان کی تفصیلی حقیقت سمجھ میں نہ آئے۔(۵۴)

{۱۵۴} بخاری فی العلم باب ۲۰، مسند احمد/۴/۳۹۹، مسلم فی الفضائل/باب ۱۵

۳......بہترین ذکر وہ ہے جس میں دو صفات پائی جائیں ''تضرّع اور آہستگی'' (۵۵)

۴......بلاوجہ چیخ چیخ کر، آواز بنا سنوار کر اور سجع بندی کے ساتھ دعا کرنا جائز نہیں۔(۵۵)

۵......اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر محض رسم کے طور پر دعائیہ کلمات کا دہرا دینا آدابِ دعا کے خلاف ہے۔(۵۵)

۶......اصلاح کے بعد فساد پیدا کرنا بدترین جرم ہے اور عالم میں فساد پیدا ہوتا ہے اللہ کی نافرمانی اور کفر و شرک سے۔(۵۶)

۷......ہر عبادت اور دعا خوف اور اُمید کی کیفیات کے ساتھ کرنی چاہیے۔(۵۶)

بعض سلف سے منقول ہے کہ جوانی میں خوف کا غلبہ بہتر ہے اور بڑھاپے میں اُمید کا غلبہ بہتر ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ خوف کا لفظ ناز، عُجب اور پندار کی تردید میں ہے اور آرزو کی تاکید مایوسی کے مقابلہ میں ہے۔

۸......احسان، دین اور دنیا دونوں میں مطلوب ہے۔(۵۶)

۹......جو بھی احسان کیا جائے، اللہ کی طرف سے اس کا بدلہ ضرور ملتا ہے۔(۵۶)

۱۰......بادل اور بارش، نباتات کی روئیدگی اور مردہ زمین کی زرخیزی میں اللہ کی قدرت کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔(۵۷)

۱۱......استعداد، طبیعت، مزاج اور کیفیات کے اعتبار سے انسانوں میں بے حد تفاوت پایا جاتا ہے۔(۵۸)

قصۂ نوح علیہ السلام

﴿۵۹......۶۴﴾

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ

بیشک بھیجا ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف پس اس نے کہا اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، میں خوف کرتا ہوں

عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ

تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے۔ بولے سردار اس کی قوم کے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح بہکا ہوا۔ بولا اے میری قوم! میں ہرگز بہکا نہیں

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ

لیکن میں بھیجا ہوا ہوں جہان کے پروردگار کا۔ پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تم کو اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے

لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٢﴾ أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ

وہ باتیں جوتم نہیں جانتے۔کیاتم کوتعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جوتم ہی میں سے ہے

لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَأَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ

تا کہ وہ تم کوڈرائے اورتا کہ تم بچواورتا کہ تم پررحم ہو؟۔ پھرانہوں نے اس کوجھٹلایا پھرہم نے بچالیااس کواوران کوجواس کے ساتھ کشتی تھے

وَأَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿٦٤﴾

میں اورغرق کردیاان کوجوجھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو،بیشک وہ لوگ تھے اندھے۔

ربط: سورۂ اعراف کی ابتداء میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر تھا یہاں سے دوسرے انبیاء کا تذکرہ شروع ہورہا ہے، ابتداء حضرت نوح علیہ السلام سے ہورہی ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے جس رسول کو بھیجا گیا وہ آپ ہی تھے،اسی لیے آپ کو آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ویسے قریب کا ربط بھی ان آیات میں پایا جاتا ہے اس لیے کہ آیت ۵۸ میں بتایا گیا کہ وحیِ الٰہی قبول کرنے کے اعتبار سے انسانوں میں بے حد اختلاف پایا جاتا ہے اور یہاں قومِ نوح کی صورت میں اس کا ثبوت پیش کر دیا گیا۔

تسہیل: ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی بھی تمہارا معبود ہونے کے لائق نہیں، مجھے تمہارے لیے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے ○ نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے کہا ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم واضح گمراہی مین مبتلا ہو ○ آپ نے فرمایا میں ذرہ بھی گمراہی کا شکار نہیں ہوا، میں تو جہانوں کے ربّ کا پیغمبر ہوں ○ میں تمہیں اپنے ربّ کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ○ کیا تمہیں اس پر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ تمہارے پاس، تمہارے ربّ کی طرف سے ایک آدمی کے ذریعے نصیحت آئی جو تمہاری ہی جنس سے ہے تا کہ وہ تمہیں خبردار کرے اور تم متقی بن جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے ○ چنانچہ انہوں نے اسے جھٹلا دیا تو ہم نے اسے اور جو اس کے ساتھ کشتی میں سوار تھے، سب کو بچالیا اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا انہیں غرق کر دیا، بلاشبہ وہ اندھے لوگ تھے ○

تفسیر

﴿۵۹﴾......حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے صاحبِ عزیمت پیغمبروں میں سے تھے، قرآنِ کریم میں ۴۳ جگہ ان کا اجمالی اور تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کی ولادت کے درمیان ۱۰۵۶ سال کا فاصلہ

بتایا جاتا ہے،توریت کی کتابِ تکوین میں باب ۵ سے باب ۹ تک حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ ہے اس میں آپ کی خوبیوں کا بھی ذکر ہے اور عیوب اور کمزوریوں کا بھی حتیٰ کہ معاذاللہ آپ کی شراب نوشی کا بھی ذکر ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی تشریف آوری سے قبل آپ کی قوم خالص عقیدۂ توحید اور وحیِ الٰہی کی روشنی سے محروم ہو چکی تھی اور بُت پرستی ان کا شعار بن چکا تھا۔آپ نے انہیں اکیلے اللہ کی عبادت کی دعوت دی، ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس کے سوا کوئی بھی نہیں جو عبادت کے لائق ہو۔

﴿اِنِّیٓ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ﴾ ان الفاظ میں بظاہر شرک کی صورت میں وعید کا بیان ہے لیکن ضمناً قیامت کا بیان ہے جو کہ توحید و رسالت کے بعد ایمان کے ارکان میں سے تیسرا رُکن ہے۔بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ نے ان الفاظ میں سیلاب اور طوفان سے ڈرایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ غرقابی کی دعا آپ نے اس وقت فرمائی جب قوم کے ایمان سے آپ مایوس ہو گئے اور آپ کو بتا دیا گیا کہ جنہوں نے ایمان قبول کرنا تھا کر لیا اور ان کے سوا کوئی اور ایمان قبول نہیں کرے گا۔

﴿۶۰﴾......قوم کے وڈیرے اور سردار جو اپنے آپ کو عقل و فہم کے اعتبار سے بھی سب سے ممتاز سمجھتے تھے اور ''ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر'' جیسے بتوں کی عبادت پر جمے بیٹھے تھے انہوں نے آپ سے کہا کہ تمہارا ان معبودوں کی مخالفت کرنا صریح گمراہی ہے کیونکہ ان کے واسطہ کے بغیر معبودِ حقیقی تک رسائی ناممکن ہے۔

﴿۶۱﴾......آپ نے فرمایا میں گمراہ نہیں بلکہ تمہیں گمراہی کے اندھیرے سے نکالنے کے لیے آیا ہوں، مجھے اللہ نے ہدایت میں تمہارا امام بنا کر بھیجا ہے اور جسے امام بنایا گیا ہو وہ گمراہ کیسے ہو سکتا ہے۔

﴿۶۲﴾......اس آیتِ کریمہ میں مقصدِ رسالت، پیغمبر کی خیر خواہی اور اللہ کی صفات اور وحی کے اس علم کا ذکر ہے جو نبی کے پاس ہوتا ہے مگر بندوں کے پاس نہیں ہوتا۔

﴿۶۳﴾...... نبی کی بشریت ایسی چیز تھی جو متعدد قوموں کے ایمان سے محروم ہونے کا سبب بنی، وہ کہتے تھے یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شخص ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازار میں چلتا پھرتا ہے وہ نبوت کے منصب پر فائز ہو جائے، اپنی حماقت کی وجہ سے وہ یہ نہ جان سکے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے وہ انسانوں میں سے جسے چاہے منتخب کر لے اور اس کے سینے میں اپنا علم ڈال دے......نبوت اور بشریت کے تضاد کا اشکال سب سے پہلے قومِ نوح کو پیش آیا۔

﴿۶۴﴾...... چنانچہ انہوں نے اللہ کے نبی کو جھٹلا دیا، آپ انہیں مسلسل ساڑھے نو سو سال سمجھاتے رہے مگر انہوں نے

سمجھ کرنہ دیا، امراء اور رؤساء تکذیب میں پیش پیش تھے جو کہ جھٹلانے کے ساتھ ان کمزوروں، ناداروں اور مظلوموں کا مذاق بھی اڑاتے تھے جنہوں نے ایمان قبول کرلیا تھا، بعض اوقات مطالبہ کرتے تھے کہ نچلی سوسائٹی کے ان افراد کو آپ اپنی مجلس سے اٹھادیں تبھی ہم آپ کی بات سنیں گے کیونکہ ان کی ہم نشینی ہمارے لیے ذلت کا باعث ہے، جب قوم کا انکار اور تکبر حد سے بڑھ گیا تو سیلاب کی صورت میں ان پر اللہ کا عذاب آیا جس میں وہ غرق ہوکر رہ گئے، البتہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی اتباع کرنے والوں کو کشتی میں بٹھا کر غرق ہونے سے بچالیا گیا۔ ''کشتی'' کے لفظ سے دھوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ چھوٹی موٹی ناؤ ہوگی جس میں چند افراد سما گئے ہوں گے حالانکہ وہ خاصا بڑا جہاز تھا جس کی پیمائش توریت میں حسبِ ذیل دی گئی ہے:

''اس کی لمبائی 300 ہاتھ اور اس کی چوڑائی 500 ہاتھ اور اس کی اونچائی 30 ہاتھ کی'' تکوین ۶:۱۵

ایک ہاتھ اگر کم از کم ڈیڑھ فٹ کا ہی فرض کیا جائے تو جہاز ۴۵۰ فٹ لمبا، ۷۵ فٹ چوڑا اور ۴۵ فٹ اونچا تھا اور اگر ہاتھ دوفٹ کے مساوی سمجھا جائے تو جہاز اس سے بھی بڑا ہوگا۔

حکمت وہدایت:

۱...... نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے گزشتہ انبیاء کے واقعات کا ٹھیک ٹھیک بیان ہونا آپ کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔

۲...... ہر نبی کی دعوت کی ابتداء عقیدۂ توحید سے ہوتی تھی۔

۳...... ایمان کے بنیادی ارکان تین ہیں: توحید، رسالت اور آخرت۔

۴...... سردار اور وڈیرے حق کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

۵...... دلوں کا اندھا ہونا آنکھوں کے اندھا ہونے سے زیادہ خطرناک ہے۔
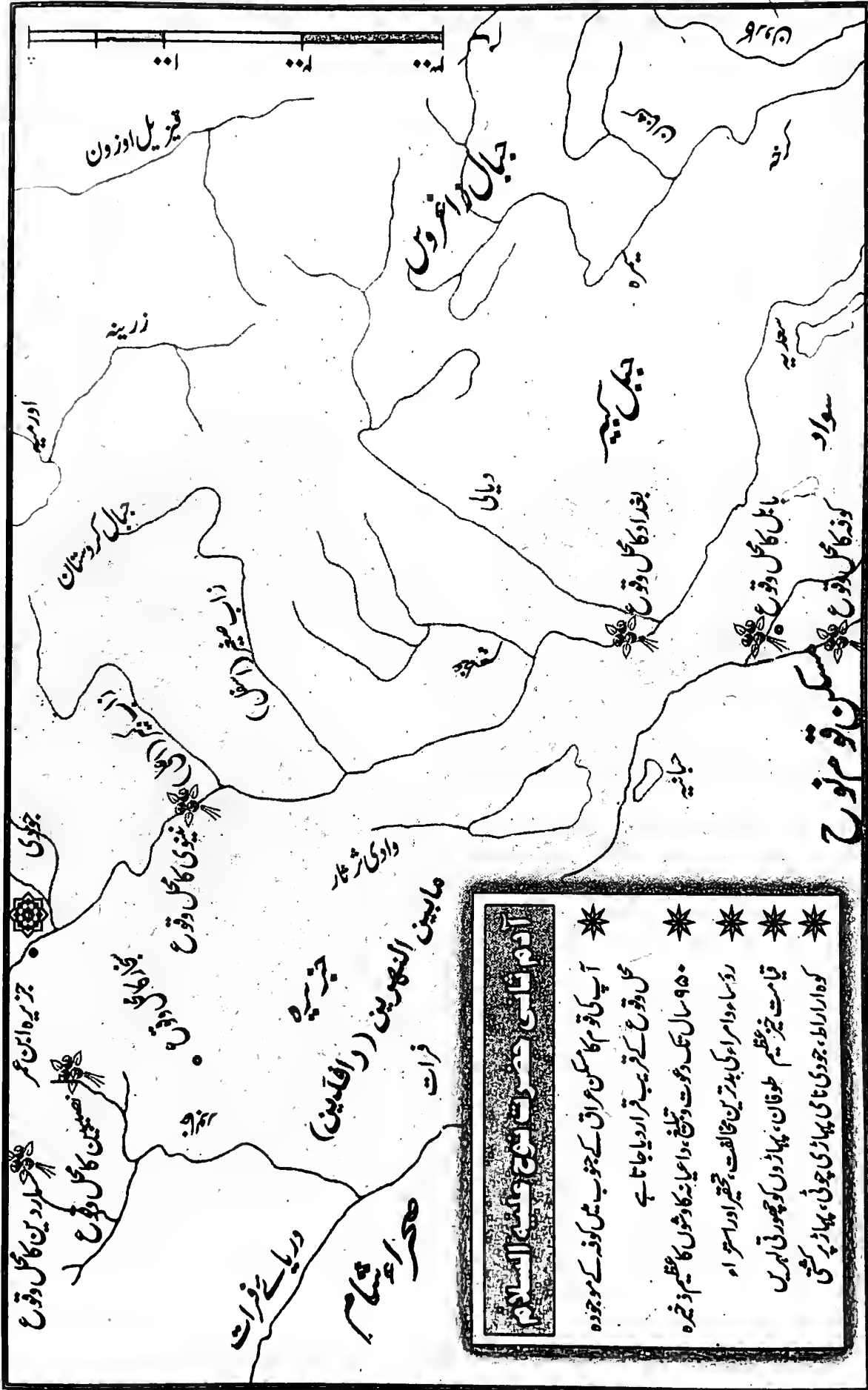
بشکریہ اطلس القرآن اردو

قصہ قوم عاد

(۶۵......۷۲)

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾

اور قوم عاد کی طرف بھیجا ان کے بھائی ہود کو، بولا اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا کیا تم

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ

ڈرتے نہیں؟۔ بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں ہم تو دیکھتے ہیں تجھ کو عقل نہیں اور ہم تو تجھ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔

مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٧﴾

بولا اے میری قوم! میں کچھ بے عقل نہیں لیکن میں بھیجا ہوا ہوں پروردگار عالم کا۔ پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے

أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾ أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ

اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اطمینان کے لائق۔ کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے

عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ

ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تا کہ تم کو ڈرائے؟ اور یاد کرو جب تم کو سردار کر دیا پیچھے قوم نوح کے

فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ

اور زیادہ کر دیا تمہارے بدن کا پھیلاؤ، سو یاد کرو اللہ کے احسان تا کہ تمہارا بھلا ہو۔ بولے کیا تو اس واسطے ہمارے پاس

اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ۖ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ

آیا کہ ہم بندگی کریں اللہ اکیلے کی اور چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے؟ پس تو لے آ ہمارے پاس جس چیز

الصَّادِقِينَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۖ أَتُجَادِلُونَنِي

سے تو ہم کو ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے۔ کہا تم پر واقع ہو چکا ہے تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غصہ، کیوں جھگڑتے ہو

فِي أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ فَانتَظِرُوا

مجھ سے ان ناموں پر کہ رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی

إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٧١﴾ فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا

سند، سو منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ پھر ہم نے بچا لیا اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے اور جڑ کاٹی

دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾

ان کی جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو اور نہیں مانتے تھے۔

تسہیل: اور قومِ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو نبی بنا کر بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود بننے کے لائق نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں؟ O ان کی قوم کے کافر سردار بولے ہم تجھے بیوقوف سمجھتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ تم جھوٹے ہو O آپ نے فرمایا اے میری قوم! میں ہرگز بیوقوف نہیں بلکہ میں تو سارے جہانوں کے ربّ کا رسول ہوں O میں تمہیں اپنے ربّ کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہارا سچا خیر خواہ ہوں O کیا تمہیں اس پر تعجب ہوتا ہے کہ تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت تم ہی میں سے ایک آدمی کے ذریعے آئی ہے تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے؟ اور وہ وقت یاد کرو جب تمہیں اللہ نے قومِ نوح کے بعد آباد کیا اور جسمانی حیثیت سے تمہیں خوب قد آور بنایا پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ O وہ کہنے لگے ''کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم بس ایک اللہ ہی کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے؟ سو اگر تم سچے ہو تو جس عذاب کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو وہ لے آؤ O حضرت ہود علیہ السلام نے کہا اب تم پر تمہارے ربّ کا عذاب اور غضب نازل ہو کر رہے گا، کیا تم مجھ سے ایسے ناموں کے بارے میں بحث مباحثہ کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے آباء نے رکھ لیے ہیں؟ اللہ نے تو ان پر کوئی دلیل نہیں اتاری، سو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں O پھر ہم نے اپنے فضل سے ہود اور اس کے ساتھیوں کو بچالیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے O

﴿تفسیر﴾

﴿۶۵﴾......قومِ عاد کا ذکر نو سورتوں میں ہوا ہے، عاد عرب کے ایک قدیم قبیلہ کا نام ہے، سورۂ نجم میں انہیں عادِ اولیٰ کہا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ عرب کی قدیم قوم بنوسام اور عادِ اولیٰ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، عاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار قبل حضرت مسیح علیہ السلام مانا جاتا ہے، عاد کا مرکزی مقام ارضِ احقاف ہے یہ حضرموت کے شمال میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے مشرق میں عمان ہے اور شمال میں ربع الخالی، مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ ان کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصّہ حضرموت اور یمن میں خلیج فارس کے سواحل سے حدودِ عراق تک وسیع تھی اور یمن ان کا دارالحکومت تھا۔

عاد بُت پرست تھے اور اپنے پیشرو قومِ نوح کی طرح صنم پرستی اور صنم تراشی میں ماہر تھے، تاریخِ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ان کے معبودانِ باطلہ بھی قوم نوح کی طرح ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہی تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک اثر منقول ہے، اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام صمود اور ایک کا نام ھتار تھا۔ قومِ عاد کو اپنی جسمانی قوّت وصولت اور مملکت کی سطوت وجبروت پر بڑا ناز تھا نوبت یہاں تک پہنچی کہ معبودِ حقیقی کو بھلا بیٹھے اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود مان کر ہر قسم کے شیطانی اعمال بے خوف وخطر کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک برگزیدہ انسان کو مبعوث فرمایا۔ حضرت ہود، عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرد تھے، سرخ وسپید رنگ اور وجیہ تھے، ان کی داڑھی بڑی تھی۔ {۱۵۵}

دوسرے انبیاء کی طرح حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو سب سے پہلے خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی۔

عبادت کا اطلاق انتہا درجہ کی عاجزی اور انکساری ظاہر کرنے پر ہوتا ہے لہٰذا عبادت کی مستحق وہی ذات ہوسکتی ہے جس کے فضل وانعام کی کوئی حد نہ ہو۔ {۱۵۶}

اور وہ ذات جس کے فضل واحسان اور کمالات کی کوئی حد نہیں وہ اللہ کے سوا کوئی نہیں، لہٰذا عبادت صرف اسی کی جائز ہے، اسی کو توحید کہتے ہیں، ویسے اہلِ علم نے توحید کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

توحید کی قسمیں

۱...... **توحیدِ ربوبیت** ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین وآسمان کا خالق، موت اور حیات کا مالک صرف اللہ کو تسلیم کیا جائے، توحید کے اس درجے کا اقرار نبی کریم ﷺ کے زمانے کے کفّار اور مشرکین بھی کرتے تھے، سورۂ یونس میں ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ {۱۵۷}

”آپ ان سے پوچھیے کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یا وہ کون ہے جو سماعت اور بصارت کا مالک ہے اور کون ہے جو مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے؟ اور کون ہے جو کائنات کا انتظام چلا رہا ہے؟ وہ بول اٹھیں گے کہ ”اللہ“ پھر پوچھیے کہ تم اس سے ڈرتے کیوں نہیں؟“

{۱۵۵} تلخیص از قصص القرآن ۱/۱۰۲-۱۰۵

{۱۵۶} المفردات/۳۱۹

{۱۵۷} سورۂ یونس ۱۰/۳۱

۲......**توحیدِ الوہیّت**......اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندے کی ہر قولی، بدنی، مالی اور قلبی عبادت صرف اللہ کے لیے ہو، مثلاً رکوع اور سجدہ، نذر اور نیاز، صدقہ اور قربانی، دعا اور التجا، خوف اور اُمید وغیرہ......توحید کا یہ وہ درجہ ہے جس میں قدیم اور جدید مشرکین کا اختلاف رہا ہے۔

۳......**توحیدِ اسماء وصفات**......جس کا مفہوم یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے جو جو صفت اپنے لیے ثابت کی ہے اسے ثابت کیا جائے اور جس جس چیز کی نفی کی ہے اس کی اللہ سے نفی کی جائے اور اللہ کی جتنی بھی صفات ہیں خواہ علم وسمع ہو یا بصر اور قدرت یا دوسری صفات، ان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے بلاشبہ وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اور صفات میں بھی یکتا ہے۔

چونکہ توحید، دین کی اصل اور بنیاد ہے اس لیے ہر نبی نے سب سے زیادہ اسی پر زور دیا، حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو اسی کی دعوت دی، قوم کے سرداروں نے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے تکبر اور طعنہ زنی کا راستہ اختیار کیا۔

حکمت وہدایت:

۱......وطن، قوم اور خاندان کے اشتراک کی بناء پر بھی اخوت ہوتی ہے اس بناء پر کافر کو بھی بھائی کہا جاسکتا ہے (۶۵) لیکن اللہ کے ہاں صرف ایمانی اخوت کا اعتبار ہے، دنیا کے سارے انسانوں کی تقسیم کافر اور مؤمن ہونے کے لحاظ سے ہے نہ کہ عربی اور عجمی، گورا اور کالا، امیر اور غریب ہونے کے لحاظ سے۔

۲......اللہ کا دستور یہ رہا ہے کہ قوم کا رسول انہی میں سے بھیجا جاتا ہے تاکہ ان کی بات سمجھ سکے اور اپنی بات انہیں سمجھا سکے، حتیٰ کہ جب ساری انسانیت کو ایک ہی مرکز پر جمع کرنے کا فیصلہ ہوا تو عالمِ انسانی کے لیے خاتم النبیین ﷺ کو رسول بنا کر بھیج دیا گیا اور مشرق سے مغرب تک اور پہلی صدی ھجری سے لیکر آخری صدی تک سارے انسانوں کی مذہبی کتاب کی زبان بھی ایک ہی متعین کردی گئی۔

۳......دین کا شعور اور دین سے وابستگی رکھنے والوں کو بیوقوف سمجھنے اور کہنے کا طریقہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے...... قومِ عاد کے نزدیک اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں تھی کہ ایک شخص آباء واجداد کے دین کو چھوڑ کر نئے دین کا داعی بن جائے۔(۶۶)

۴......پیغمبر اللہ کا انتخاب ہوتا ہے اور اللہ ایسے شخص کو منصب رسالت کے لیے منتخب نہیں کرسکتا جس میں ذرہ برابر بھی

حماقت ہو۔(۶۷)

۵......شفقت اور خیر خواہی پیغمبر اور نائبینِ پیغمبر کے خمیر میں داخل ہوتی ہے۔(۶۸)

۶......قوت و جسامت میں زیادتی بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے لہٰذا دنیاوی نعمتوں کو حقیر سمجھنا تشدد ہے، زہد و تقویٰ نہیں ہے۔(۶۹)

قومِ عاد کے افراد عام طور پر بڑے تنومند، قد آور اور قوی ہیکل تھے اور انہیں اپنی قوت و جسامت پر بڑا ناز تھا، سورہ حم السجدہ میں ہے:

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ {۱۵۸}

''قوم عاد نے زمین پر ناحق تکبّر کیا اور کہنے لگے ''ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟'' کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے وہ یقیناً ان سے زیادہ طاقتور ہے اور وہ ہماری آیات کا جان بوجھ کر انکار کرتے رہے''

سورہ حاقّہ میں قومِ عاد پر اللہ کا عذاب نازل ہونے کا ذکر ہے اور اس سے ان کے قد کاٹھ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ {۱۵۹}

''رہے عاد تو وہ سناٹے کی تیز آندھی سے ہلاک کیے گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اس آندھی کو مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن مسلط کیے رکھا آپ ہوتے تو دیکھتے کہ وہاں لوگ چت گرے ہوئے تھے جیسے وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں، کیا آپ ان میں سے کسی کو بھی بچا دیکھتے ہیں؟''

۷......اللہ کی نعمتیں یاد رکھنے سے شکر کی توفیق ہوتی ہے اور شکر کرنے والے کامیاب ہوتے ہیں۔(۶۹)

۸......جاہل اقوام اور افراد کا اپنے باطل اعمال پر آباء و اجداد کی رسموں سے استدلال کرنا، سنّتِ قدیمہ ہے۔(۷۰)

۹......بات بات پر اللہ کے عذاب کا مطالبہ کافروں کا طریقہ ہے۔(۷۰)

۱۰......مشرکوں کے معبود حقیقت سے خالی محض نام ہوتے ہیں (۷۱)

ظاہر ہے لکڑی، پتھر اور لوہے کی بنائی ہوئی مورتی کو معبود کہنے سے وہ معبود نہیں بن جاتی اور نہ ہی اسے نفع اور نقصان، زندگی اور موت کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے (آج کل علم و عمل سے خالی شخصیات کو جو بڑے بڑے القاب دے دیئے جاتے ہیں تو وہ بھی بس نام ہی ہوتے ہیں ان کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہوتی)۔

{۱۵۸} حم السجدۃ/۴۱/۱۵

{۱۵۹} الحاقۃ/۶۹/۷

بشکریہ اطلس القرآن اردو

قصۂ قوم ثمود

﴿۷۳.....۷۹﴾

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ

اور ثمود کی طرف بھیجا ان کے بھائی صالح کو بولا اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا تم کو پہنچ چکی

جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ

ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے یہ اونٹنی اللہ کی ہے تمہارے لئے نشانی، سو اس کو چھوڑ دو کہ کھائے اللہ کی زمین میں اور

فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٣﴾ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ

اس کو ہاتھ نہ لگاؤ بری طرح پھر تم کو پکڑے گا عذاب دردناک۔ اور یاد کرو جبکہ تم کو سردار کر دیا عاد کے پیچھے اور ٹھکانہ دیا تم کو

خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُورًا

زمین میں کہ بناتے ہو نرم زمین میں محل اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر، سو یاد کرو احسان اللہ کے اور مت مچاتے پھرو زمین

وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٧٤﴾

میں فساد۔ کہنے لگے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں غریب لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان لا چکے تھے

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ

کیا تم کو یقین ہے کہ صالح کو بھیجا ہے اس کے رب نے، بولے ہم کو تو جو وہ لے کر آیا اس پر یقین ہے۔

أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٧٥﴾

کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو یقین ہے ہم اس کو نہیں مانتے۔ پھر انہوں نے

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿٧٦﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ

کاٹ ڈالا اونٹنی کو اور پھر گئے اپنے رب کے حکم سے اور بولے اے صالح لے آ ہم پر

وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ

جس سے تو ہم کو ڈراتا تھا اگر تو رسول ہے۔ پس آ پکڑا ان کو زلزلہ نے

الْمُرْسَلِينَ ﴿٧٧﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ

پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھر میں اوندھے پڑے۔ پھر صالح الٹا پھرا ان سے اور بولا اے میری قوم!

وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کا اور خیرخواہی کی تمہاری لیکن تم کو محبت نہیں خیر خواہوں سے۔

تسہیل: اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو نبوت دے کر بھیجا، صالح نے کہا اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے پاس تمہارے ربّ کی جانب سے میری صداقت پر ایک واضح دلیل آ چکی ہے، یہ اللہ کی اُونٹنی ہے جو تمہارے حق میں ایک نشانی ہے، اسے چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں کھاتی پھرے، اسے تکلیف پہنچانے کے ارادے سے ہاتھ بھی نہ لگانا ورنہ تمہارے اوپر دردناک عذاب آ سکتا ہے O اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے تمہیں قومِ عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمہیں زمین پر ٹھکانا دیا، تم نرم اور ہموار زمین پر محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بنا لیتے ہو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین پر فساد مت پھیلاؤ O ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے ایمان لانے والے غریب لوگوں سے پوچھا ”کیا تمہیں یقین ہے کہ صالح اپنے ربّ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں؟“ انہوں نے جواب دیا کہ بے شک ہم اس پیغام پر یقین رکھتے ہیں جو انہیں دے کر بھیجا گیا ہے O وہ متکبر لوگ کہنے لگے ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس کی سچائی پر تم یقین رکھتے ہو O پھر انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے ربّ کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے اے صالح اگر آپ واقعی رسولوں میں سے ہیں تو وہ عذاب لے آیئے جس سے آپ ہمیں ڈراتے رہتے ہیں O پس انہیں زلزلے نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے O تب صالح علیہ السلام یہ کہتے ہوئے ان سے منہ موڑ کر چلے گئے کہ اے میری قوم! میں نے تمہیں اپنے ربّ کا پیغام پہنچا دیا تھا اور میں تمہارا خیر خواہ تھا لیکن تم خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے O

﴿تفسیر﴾

قومِ ثمود...... اجمالی تعارف

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کو اس لیے ثمود کہا جاتا ہے کہ ان کے نسب نامہ کا جدِ اعلیٰ ثمود ہے اور اسی کی جانب یہ قبیلہ یا قوم منسوب ہے، قومِ ثمود بھی سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو عادِ اولیٰ کی ہلاکت کے وقت حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ بچ گئے تھے اور انہی کی نسل کو عادِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

قومِ ثمود کی آبادیاں حجر میں تھیں، حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب ان کا

مقامِ سکونت ہے اور آج کل ''فج الناقۃ'' کے نام سے مشہور ہے، ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں۔

حجر کا یہ مقام جو حِجرِ ثمود کہلاتا ہے، شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبہ اس کے سامنے پڑتی ہے اور جس طرح عاد کو عادِ ارم کہا گیا ہے (حتّٰی کہ قرآن عزیز نے تو ارم کو ان کی مستقل صفت ہی بنا دیا) اسی طرح ان کی ہلاکت کے بعد ان کو ثمودِ ارم یا عادِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

ثمود کا زمانہ یقینی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہے۔

ثمود اپنے پیشروؤں کی طرح بُت پرست تھے وہ خدائے واحد کے علاوہ بہت سے معبودانِ باطلہ کے پرستار اور شرک میں مبتلا تھے اس لیے ان کی اصلاح اور احقاقِ حق کے لیے ان ہی کے قبیلہ میں سے حضرت صالح کو رسول بنا کر بھیجا گیا، رفاہیت اور عیش پرستی میں ڈوبی ہوئی قوم نے کبر وعناد کا رویہ اختیار کیا اور خدا کے نشان (معجزہ) کا مطالبہ کیا، اونٹنی کی شکل میں یہ معجزہ ان کے سامنے پیش کر دیا گیا، ساتھ ہی انہیں بتا دیا گیا کہ اگر تم نے اس اونٹنی کو ایذاء پہنچائی تو پھر یہی تمہاری ہلاکت کا نشان ہوگی، بدقسمت قومِ ثمود اسے زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی، اور انھوں نے اسے ہلاک کر دیا، اللہ کے نبی نے انہیں تین دن کے بعد عذاب کی خبر دی، تین دن کے بعد رات کے وقت ''ایک ہیبت ناک آواز'' نے ہر شخص کو اس حالت میں ہلاک کر دیا جس حالت میں وہ تھا۔{۱۶۰}

﴿۷۳﴾......حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو وہی دعوت دی جو تمام انبیاء میں مشترک ہے یعنی کسی کو شریک کیے بغیر خدائے واحد کی عبادت کی دعوت، جب قوم نے معجزہ دیکھے بغیر قبولِ ایمان سے انکار کر دیا تو آپ نے ایک کھلا ہوا معجزہ بھی پیش کر دیا۔ معجزہ نبی کا اپنا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر کسی نبی کو معجزہ نہ بھی دیا جاتا تب بھی پیغمبر کی زندگی اور کتابِ ہدایت کی موجودگی کی بناء پر ایمان لانا ضروری ہوتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عوام کی اکثریت دلائل سے زیادہ ایسی چیزوں سے جلد متأثر ہوتی ہے جو عقل کو حیران اور دماغ کو مغلوب کر کے نبی کی صداقت کو ثابت کر دیں اس لیے بعض انبیاء کو معجزات دیئے گئے، حضرت صالح علیہ السلام کو اونٹنی کا معجزہ عطا کیا گیا جو حیرت انگیز طریقے سے پیدا ہوئی، اس معجزہ کی فرمائش خود آپ کی قوم نے کی تھی۔

{۱۶۰} تلخیص از قصص القرآن (جلد اوّل، دیکھئے مضمون بعنوان حضرت صالح علیہ السلام صفحہ ۱۲۲)

''انگریز مترجمِ قرآن سیل نے فرنگی سیاحوں کے مشاہدات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جس پہاڑ سے وہ اونٹنی بطور خارقِ عادت برآمد ہوئی تھی اس میں اب تک ایک شگاف ۶۰ فٹ کا موجود ہے اور جزیرہ نمائے سینا میں جبلِ موسیٰ کے قریب ''ناقۃ النبی'' کا نقشِ قدم آج بھی زیارت گاہِ خلائق ہے'' {۱۶۱}

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ ''ناقۃ اللہ'' (اللہ کی اونٹنی) کو ''ارض اللہ'' (اللہ کی زمین) میں چل پھر کر کھانے پینے دو اور اسے کسی قسم کی ایذاء نہ پہنچانا، نہ جسمانی اعتبار سے نہ کھانے پینے کے اعتبار سے۔

اونٹنی کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہوئے اسے ''ناقۃ اللہ'' قرار دینا تعظیم کی بناء پر ہے۔{۱۶۲} ویسے بھی اس کی پیدائش خلافِ عادت ہوئی تھی اور اس کا مالک کوئی نہیں تھا اس لیے آپ نے اسے ''ناقۃ اللہ'' فرمایا۔

﴿۷۴﴾......تمدّن، ترقّی، خوشحالی اور قوت وطاقت میں قومِ ثمود کو قومِ عاد کا جانشین بنایا گیا، عادیوں کی طرح ثمودی بھی تعمیرات کے فن میں بہت ماہر تھے، کہا جاتا ہے کہ وہ سردیاں اپنے پہاڑی قلعوں میں گزارتے تھے اور باقی موسموں میں کھیتی باڑی اور کام کاج کے لیے باہر رہتے تھے۔

﴿فَاذْكُرُوٓا۟ ءَالَآءَ ٱللَّهِ﴾ ثمودیوں کی پرشکوہ عمارات، مضبوط قلعوں اور فنِ تعمیر کی مہارت کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں شمار کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ دنیوی علوم وفنون میں کمال کا شمار اللہ کی نعمتوں میں ہوتا ہے اس آیت سے اہلِ علم نے بڑے بڑے محلات کی تعمیر کے جائز ہونے پر استدلال کیا ہے۔{۱۶۳}

یہ دوسری بات ہے کہ ان پیچھے پڑ جانا پسندیدہ نہیں کیونکہ یہ چیزیں انسان کو غفلت میں ڈال دینے والی ہیں۔

﴿۷۵﴾......متکبّر اور خودسر سرداروں نے ان ایمان والوں سے پوچھا جنہیں وہ حقیر اور کمزور سمجھتے تھے کہ تمہیں صالح کے نبی ہونے کا یقین ہے؟ بظاہر یہ سوال استہزاء پر مبنی تھا۔{۱۶۴}

اس سوال کا سیدھا سا جواب تو یہ تھا کہ ہاں ہمیں ان کے نبی ہونے کا یقین ہے لیکن انہوں نے جواب یہ دیا کہ ''بے شک ہم اس پیغام پر یقین رکھتے ہیں جو انہیں دے کر بھیجا گیا ہے''۔

{۱۶۱} تفسیر ماجدی ۱۸۲/۲

{۱۶۲} واضیفت الناقۃ الی اللہ عزّوجل علی جھۃ اضافۃ الخلق الی الخالق وفیہ معنی التشریف والتخصیص۔(قرطبی ۲۱۳/۷)

{۱۶۳} استدلّ بھذہ الآیۃ من اجاز جواز البناء الرفیع کالقصور ونحوھا۔(قرطبی/۷/۲۱۳)

{۱۶۴} للاستھزاء لانھم یعلمون انھم عالمون بذلک۔(روح المعانی/۵/۲۴۴)

علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ مؤمنوں نے بڑا بلیغ جواب دیا جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ہمارے نزدیک حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت ورسالت ایسی بدیہی اور یقینی ہے کہ اس کے بارے کیے گئے سوال کا جواب دینے کی ضرورت بھی ہم محسوس نہیں کرتے، صالح علیہ السلام کی صداقت کا یقین ہم پر ایسا غالب ہے کہ ہم اس پیغام پر بھی یقین رکھتے ہیں جو آپ لے کر آئے۔{۱۶۵}

﴿۷۶﴾......قوم نے بھی جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم صالح کی نبوت کا انکار کرتے ہیں بلکہ یہ کہا کہ نبوت ورسالت سمیت جن چیزوں پر تم ایمان رکھتے ہو ہم ان کا انکار کرتے ہیں۔

﴿۷۷﴾......''انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا'' احادیث میں مار ڈالنے کی تفصیل بھی آئی ہے وہ یہ کہ قوم کی دو حسین وجمیل عورتوں نے یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص اس اونٹنی کو قتل کر دے گا ہم اور ہماری لڑکیوں میں سے جسے چاہے وہ اس کی ہو جائے گی، قوم کے دو شہوت پرست نوجوانوں ''مصدع اور قذار'' کو اس اعلان نے دیوانہ سا بنا دیا، جس راستے سے اونٹنی گزرتی تھی وہ اس راستے میں چٹان کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئے، جب اونٹنی سامنے آئی تو مصدع نے تیر کا وار کیا اور قذار نے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ کر اسے قتل کر دیا۔{۱۶۶}

﴿۷۸﴾......''پس انہیں زلزلہ نے آ پکڑا'' یہاں ''رجفة'' کا لفظ ہے جبکہ سورۂ ہود میں ''صیحة'' کا لفظ آیا ہے۔{۱۶۷}

''رجفة'' کا معنی ہے حرکت اور اضطراب، اور ''صیحة'' چیخ اور چنگھاڑ کے معنی میں آتا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ زوردار چیخ حضرت جبریل علیہ السلام کی تھی جس سے زمین کانپ اٹھی۔{۱۶۸} جبکہ دوسرے مفسرین کی رائے یہ ہے کہ رجفة ایک زلزلہ تھا جو نیچے سے آیا اور صیحة آسمانی چنگھاڑ تھی جو اوپر سے آئی جس سے ساری آبادی نیست ونابود ہو کر رہ گئی۔

قومِ ثمود کا زلزلہ تو اس زمانے کا واقعہ ہے جب تاریخ کو محفوظ کرنے کا عمل شروع نہیں ہوا تھا اس لیے ہمیں

{۱۶۵} کانهم قالوا: العلم بارساله وبما ارسل به مالا کلام فیه ولا شبهة تدخله لوضوحه وانارته، وانما الکلام فی وجوب الایمان به فنخبرکم انابه مومنون۔(کشاف ۱۲۶/۲)

{۱۶۶} تفسیر ابنِ کثیر ۳۰۶/۲

{۱۶۷} سورۂ ہود ۶۷

{۱۶۸} الصیحة التی زلزلت لها الارض واضطربوا لها۔(کشاف ۱۲۶/۲)

تفصیلات کا علم نہیں لیکن خود ہمارے زمانے میں بھی کئی زلزلے آچکے ہیں جنہیں دیکھ کر بطورِ عذاب آنے والے زلزلوں کی شدّت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، 2005ء میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں جو زلزلہ آیا اس کی تباہ کاری ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، ہزاروں مکانات زمین بوس ہوگئے، سینکڑوں عمارتیں زمین میں دھنس گئیں، پہاڑوں میں دراڑیں پڑگئیں، زمین کا سینہ شق ہوگیا، بہتے چشمے خشک ہوگئے، پورے پورے خاندان آناً فاناً ختم ہوگئے۔ وہاں کے مقامی باشندوں نے بتایا کہ حرکت کرتی اور سرکتی ہوئی زمین کو دیکھ کر ہماری زبان پر بے ساختہ سورۂ زلزال کی یہ آیتِ کریمہ جاری ہوگئی "وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا" انسان زمین کی کیفیت دیکھ کر کہے گا اسے کیا ہوگیا ہے؟{۱۶۹}

﴿۷۹﴾......صالح علیہ السلام نے تباہ شدہ کھنڈرات پر حسرت بھری نظر ڈالی اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کہ "اے میری قوم! میں تمہارا خیر خواہ تھا لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے"

"یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب ساری قوم عذاب سے ہلاک ہوچکی تو اب ان کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ اس سے لوگوں کو عبرت ہو اور یہ خطاب ایسا ہی ہے جیسے رسولِ کریم ﷺ نے غزوۂ بدر میں مرے ہوئے قریشی مشرکین کو خطاب کر کے کچھ کلمات ارشاد فرمائے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا یہ فرمانا نزولِ عذاب اور ہلاکتِ قوم سے پہلے ہوا ہو اگرچہ بیان میں اس کو مؤخر کر کیا ہے"{۱۷۰}

حکمت وہدایت:

۱......تمام انبیاء کی دعوت ایک تھی یعنی اللہ پر ایمان اور غیر اللہ کی عبادت کا انکار۔(۷۳)

۲......منہ مانگا معجزہ دیکھنے کے بعد اگر کوئی قوم ایمان نہ لائے تو اس کی ہلاکت یقینی ہوجاتی ہے۔(۷۳)

۳......اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھنا ضروری ہے، ایسا کرنے سے شکر کی توفیق ہوتی ہے اور شکر عبادت وطاعت ہے۔(۷۴)

۴......زمین کا امن تہ وبالا کرتے ہوئے فساد پھیلانا اور شرک اور گناہوں کا ارتکاب ازحد قابلِ مذمت عمل ہے۔(۷۴)

۵......انبیاء کرام علیہم السلام کی اتباع کرنے والے زیادہ تر غریب اور کمزور افراد ہوتے ہیں اس لیے کہ انہیں نہ تو اپنے عہدہ ومنصب کی حفاظت کی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی وہ لذتوں اور شہوات میں منہمک ہوتے ہیں۔(۷۵)

{۱۶۹} الزلزال/۹۹/۳

{۱۷۰} معارف القرآن ۳/۶۱۳

بشکریہ اطلس القرآن اردو
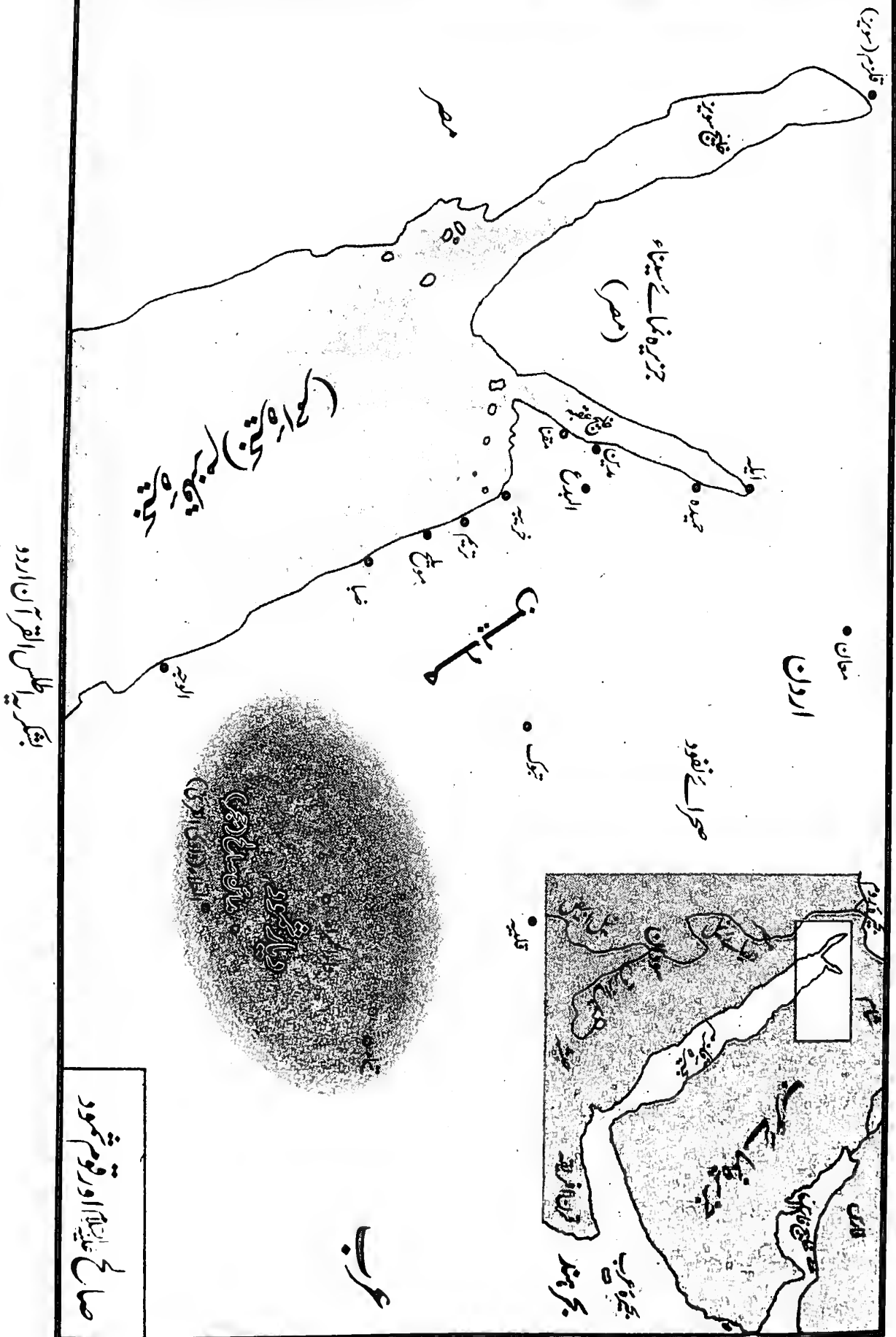
۶.....مومنوں کو حقیر سمجھنا اہلِ کفر وفسق کا شعار ہے۔ (۷۵)

۷.....افراد کے گناہ تو معاف ہو جاتے ہیں لیکن اگر پوری قوم سرکشی پر آمادہ ہو جائے تو اس پر اللہ کا عذاب نازل ہو کر رہتا ہے۔ (۷۸)

۸..... جب لوگ نصیحت کی بات اور نصیحت کرنے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں تو جان لینا چاہیے کہ ان کی ہلاکت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ (۷۹)

قصۂ لوط علیہ السلام

﴿۸۰.....۸۴﴾

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۰﴾

اور بھیجا لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے پہلے نہیں کیا اس کو کسی نے جہان میں؟

اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ‌ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ﴿۸۱﴾

تم تو دوڑتے ہو مردوں پر شہوت کے مارے عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے۔ اور کچھ

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ‌ۚ اِنَّهُمۡ

جواب نہ دیا اس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ نکالو ان کو اپنے شہر سے یہ لوگ بہت ہی پاک رہنا چاہتے ہیں۔

اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمۡطَرۡنَا

پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو مگر اس کی عورت کہ رہ گئی وہاں کے رہنے والوں میں۔ اور برسایا ہم نے ان

عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا‌ ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۸۴﴾

کے اوپر مینہ یعنی پتھروں کا پھر دیکھ کیا ہوا انجام گنہگاروں کا۔

تسہیل: اور ہم نے لوط کو بھی پیغام دے کر بھیجا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا ''تم بے حیائی کا ایسا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا جہاں والوں میں سے کسی نے نہیں کیا تھا'' O تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو، حقیقت یہ ہے کہ تم حد سے تجاوز کر جانے والے لوگ ہو O ان کی قوم کو اس کے سوا کوئی جواب نہ سوجھا کہ انہوں نے کہا ''انہیں اپنی بستی سے نکال دو، یہ بڑے پاک صاف بنے پھرتے ہیں'' O چنانچہ ہم نے لوط اور اس کے متعلقین کو بچالیا سوائے ان کی بیوی کے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ گئی O ہم نے ان پر پتھروں کی بارش برسائی سو دیکھ لیجیے کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا O

حضرتِ لوط علیہ السلام اور قومِ لوط

حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادرزادہ ہیں ان کے والد کا نام ہاران تھا، حضرت لوط علیہ السلام کا بچپن حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے زیرِ سایہ گزرا اور ان کی نشو ونما حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی آغوشِ تربیت کی مرہونِ منت تھی، اسی لیے وہ اور حضرت سارہ 'ملّتِ ابراہیمی' کے پہلے مسلم اور "السابقون الاوّلون" میں داخل ہیں۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ {۱۷۱} "پس ایمان لایا لوط ابراہیم کے دین پر اور کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی جانب"

یہ اور ان کی بی بی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور جب حضرت ابراہیم مصر میں تھے تو اس وقت بھی یہ ہم سفر تھے۔

باہمی مشورہ کے بعد حضرت لوط علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے شرقِ اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے گئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر سے دوبارہ فلسطین واپس چلے گئے۔

اردن کی وہ جانب جہاں آج بحرِ میّت یا بحرِ لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں۔ اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصّہ جو اَب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے، سدوم و عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں، یہ مقام شروع سے سمندر نہیں تھا بلکہ جب قومِ لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کو الٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا اسی لیے اس کا نام بحرِ میّت اور بحرِ لوط ہے۔ {۱۷۲}

یہ صحیح ہو یا غلط بہر حال یہ مسئلہ حقیقت رکھتا ہے کہ اسی بحرِ میّت کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قومِ لوط کے عذاب سے موسوم ہے اور گزشتہ دو سال کی اثری تحقیق نے بحرِ میّت کے ساحل پر لوط علیہ السلام کی بستیوں کے بعض تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اس علم و یقین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان ساڑھے چودہ سو سال قبل قرآنِ عزیز نے کر دیا تھا۔ {۱۷۳}

{۱۷۱} العنکبوت/۲۹/۲۶

{۱۷۲} بستانی ۹/۵۳۷ بحوالہ قصص القرآن ۱/۲۵۷

{۱۷۳} قصص ۱/۲۵۷

﴿تفسیر﴾

﴿۸۰﴾......اوپر جو قصّے گزرے ہیں ان میں سے ہر قصہ میں قوم کی طرف ان کے ''بھائی'' کو بھیجنے کا ذکر تھا مگر یہاں بھائی کے رشتے کا ذکر نہیں اس لیے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بعثت اپنی برادری یا وطن والوں کی جانب نہیں بلکہ ایک دوسری قوم کی جانب ہوئی تھی اس لیے یہاں طرزِ بیان بدل دیا گیا ہے، سدوم کے رہنے والے ظلم، بے حیائی، لوٹ کھسوٹ اور بداخلاقی جیسی بیماریوں میں مبتلا تھے جن میں سے سب سے قبیح اور نمایاں بیماری اغلام بازی تھی، فطرت کے مسخ ہوجانے کی وجہ سے ان کی نظر میں یہ گندا عمل ایسا پرکشش ہوگیا تھا کہ انہیں لطف ونشاط حاصل ہوتا تھا تو بس اسی میں حاصل ہوتا تھا اور قضاءِ شھوت کا جو فطری اور طبعی طریقہ اللہ نے رکھا ہے اس کی طرف انہیں رغبت ہی نہ ہوتی تھی۔

دنیا میں جہاں کہیں مغربی تہذیب اور سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات ہیں وہاں میڈیا کے ذریعے اس غیر طبعی فعل کو طبعی فعل باور کرانے کی کوششیں زوروں پر ہیں اور ان کوششوں کے واضح نتائج بھی سامنے آرہے ہیں، وقتی طور پر شیطانی خیالات سے متأثر ہونا تو ایک طرف رہا اب تو زندگی بھر کے لیے مرد کی مرد سے شادی کو قانونی تحفظ دیا جارہا ہے، اسلامی ممالک میں انفرادی طور پر تو یہ بیماری پھیل ہی چکی ہے، اب اجتماعی طور پر ہم جنس پرستی کو عام کرنے کے لیے کتابوں، رسالوں، ریڈیو اور ٹی وی کا سہارا لیا جارہا ہے۔

﴿مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ قرآن نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ عمل سدومیوں سے پہلے دنیا کی کسی قوم میں بھی نہیں تھا، تمام باخبر مؤرخین اپنے آپ کو اس دعویٰ کی تصدیق پر مجبور پاتے ہیں کیونکہ قومِ لوط علیہ السلام سے قبل تاریخ سے اس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

قوم لوط علیہ السلام کا اس قبیح عمل میں مبتلا ہونا تو جرم تھا ہی، اس سے بھی بڑا جرم یہ تھا کہ وہ اس شیطانی عمل کے موجد تھے، حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص کسی گندے عمل کی بنیاد رکھتا اور اس کا آغاز کرتا ہے اسے ان لوگوں کے گناہ میں سے ضرور حصہ ملے گا جو قیامت تک اس کا ارتکاب کریں گے، اس کے برعکس جو کوئی نیکی کا راستہ کھولتا ہے وہ اس راستے پر چلنے والوں کے اجر وثواب میں شریک ہوتا ہے، صحیح مسلم کی ایک روایت کے آخر میں ہے:

من سنّ فی الإسلام سنّة حسنة فله اجرها واجرمن عمل بها من بعد من غیران ینقص من اجورهم شیأً ومن سنّ فی الاسلام سنّة سیّئة کان علیه وزرها ووزرمن عمل بها من بعده من غیران ینقص من اوزارهم شیء.{۱۷۴}

''جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا بھی اجر ملے گا اور ان کا اجر بھی ملے گا جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے جبکہ خود ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی اور جو شخص اسلام میں کسی غلط کام کی بنیاد رکھے گا اس پر اس کا بھی وبال ہوگا اور ان لوگوں کے گناہ میں بھی وہ شریک ہوگا جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے جبکہ خود ان کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہوگی''

﴿۸۱﴾......اللہ نے انسانوں اور حیوانوں کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے، نر کا مادہ کی طرف جو میلان ہوتا ہے اس میں جہاں شھوت کی آگ کو ٹھنڈا کرنا پیشِ نظر ہوتا ہے وہیں بقاءِ نسل بھی ایک اہم مقصد ہوتا ہے، پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کی ازدواجی زندگی کا جائزہ لینے سے بھی یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھونسلے، سوراخ اور غار اس طرح بناتے ہیں کہ وہاں ان کی نسل کا تحفظ ہو۔ اسی لیے وہ افزائشِ نسل کی خاطر جنسی عمل سرانجام دیتے ہیں اور ہم جنس پرستی سے دور رہتے ہیں۔

﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ﴾ انسان کا توبہ اور ندامت کے بغیر بار بار بلکہ مستقل اس گندے عمل میں مبتلا ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی فطرت مسخ ہوگئی ہے اور وہ انسانی اور شرعی حدود سے تجاوز کر چکا ہے،

سورۂ شعراء میں ہے ﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ﴾ ''بلکہ تم حد سے تجاوز کرنے والے ہو''{۱۷۵}

سورۂ نمل میں ہے ﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾ ''بلکہ تم جاہل لوگ ہو''{۱۷۶}

اس جہالت اور اسراف کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نظر سے وہ نقصانات اوجھل ہوگئے جو نسلِ انسانی، اس کی صحت اور اخلاق پر مرتّب ہونے والے تھے۔

آج پوری دنیا ایڈز کے خطرے سے دوچار ہے، اگر اس بیماری پر قابو نہ پایا گیا تو کروڑوں ہلاکتوں کا اندیشہ ہے، ایڈز کی بیماری کے جہاں اور اسباب ہیں وہیں سدومیّت، زنا اور ختنہ نہ کروانا بھی ہے،{۱۷۷} جو لوگ یہ سب کچھ

{۱۷۴} صحیح مسلم/کتاب العلم/باب ۱۵، النسائی/ کتاب الزکاۃ/۶۴

{۱۷۵} الشعرآء/۲۶/۱۶۶

{۱۷۶} النمل/۲۷/۵۵

{۱۷۷} جولائی 2007ء میں جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں آسٹریلیا میں ایڈز کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس ہو رہی ہے جس میں 130 ممالک کے پانچ ہزار مندوبین شریک ہیں، ان تمام مندوبین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اگر ختنہ کروایا جائے تو ایڈز کی بیماری پر 60% فیصد قابو پایا جاسکتا ہے۔

جانتے ہوئے بھی اس عمل سے باز نہ آئیں انہیں جاہل، مسرف اور حد سے تجاوز کرنے والے نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟

﴿۸۲﴾......گندگی میں ڈوبی ہوئی قوم کے پاس نہ تو کوئی حجت اور دلیل تھی جو وہ پیش کرتی اور نہ ہی انہوں نے ندامت اور شرمندگی محسوس کی بلکہ ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' کے مصداق وہ کہنے لگے کہ لوط اور اس کے متعلقین کو اپنے شہر سے نکال دو۔

سورۂ عنکبوت میں اسی واقعہ کے ضمن میں ہے:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ {۱۷۸} ''لوط کی قوم کا جواب بس یہ تھا کہ اگر تم سچوں میں سے ہو تو ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ''

سوال ہوتا ہے کہ بظاہر سورۂ اعراف اور سورۂ عنکبوت کے جواب میں تعارض ہے لیکن حقیقت میں دونوں جوابوں میں کوئی تعارض نہیں اس لیے کہ حضرت لوط علیہ السلام انہیں کثرت سے سمجھاتے رہتے تھے، قوم انہیں کبھی ایک جواب دیتی تھی اور کبھی دوسرا جواب دیتی تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک جواب دیا ہو اور کچھ لوگوں نے دوسرا جواب دیا ہو، ویسے بھی قصص کے بیان کرنے میں قرآن کا اسلوب وہ نہیں ہے جو تاریخ کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا ہوتا ہے نہ تو وہ جزئیات بیان کرتا ہے اور نہ ہی وہ ترتیب کا بہت زیادہ اہتمام کرتا ہے، جو واقعات قرآن کریم نے بیان کیے ہیں وہ یکجا بیان نہیں کیے بلکہ متفرق طور پر بیان کیے ہیں اور ہر جگہ ان کا نیا پہلو بیان کیا ہے، اس انداز کو قرآن ''تصریفِ آیات'' کا نام دیتا ہے یعنی ایک ہی مضمون کو پھیر پھیر کر نئے انداز سے بیان کرنا، مختلف سورتوں میں کسی بھی واقعہ کے مختلف اجزاء کو جمع کرنے ہی سے پورا واقعہ سمجھ میں آتا ہے، اس تصریف میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اس میں پوشیدہ حکمتیں اور عبرتیں خوب اچھی طرح سمجھ آجاتی ہیں، قاریٔ قرآن کی نظروں کے سامنے وہ واقعہ بار بار آتا ہے جس کی وجہ سے وہ خبردار رہتا ہے اور جدّتِ اسلوب کی وجہ سے اکتاہٹ کا شکار بھی نہیں ہوتا۔

﴿اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾ سدومیوں کی طرف سے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے متعلقین کو ''پاک صاف'' کہا جانا ان کی عفت و عصمت اور کمال کی تعریف کی بنا پر نہیں تھا بلکہ تمسخر کے طور پر تھا۔{۱۷۹}

{۱۷۸} العنکبوت/۲۹/۲۹

{۱۷۹} سخرية بهم وبتطهرهم من الفواحش والفتخارا بما كانوا فيه من القذارة۔(کشاف/۲/۱۱۹)

فسق وفجور کے درجات

جیسے کمال اور فضائل کے مختلف درجات ہوتے ہیں اسی طرح فسق وفجور کے بھی مختلف درجات ہیں، ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ فاسق وفاجر انسان کو اپنی کمزوری اور بدکاری کا احساس ہو اور وہ اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا ہو اور سب سے بدترین درجہ یہ ہے کہ وہ گناہ کا ارتکاب بار بار کرے حتیٰ کہ اس کے دل سے برائی کا شعور ہی ختم ہو جائے، پھر وہ علانیہ کرنے لگے، علانیہ کرنے میں فخر محسوس کرے اور اس سے بچنے والوں کا مذاق اڑائے، انہیں دقیانوس، جنگلی، دیہاتی اور تاریک خیال جیسے القاب سے نوازے، پستی کا یہی وہ درجہ تھا جس میں سدومی اتر چکے تھے...... اللہ کی قسم! مغربی دنیا کی فحاشی اور عریانیت دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ سدومی دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں، یہ لوگ اپنی مادر پدر آزاد تہذیب ہی کو ''روشن خیال تہذیب'' سمجھتے ہیں، پوری دنیا کو اسی کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اور اس سے بچنے والوں کے بارے میں کہتے ہیں ''انہیں اپنے ملک سے نکال دو، یہ بڑے پاک صاف بنے پھرتے ہیں''۔

﴿۸۳﴾...... حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے ایسے اہلِ بیت جنہوں نے ایمان قبول کر لیا تھا انہیں بچا لیا گیا اور ان کی نافرمان بیوی سمیت حد سے تجاوز کر جانے والی قوم کو ہلاک کر دیا گیا۔

﴿۸۴﴾...... سرکش قوم کی بستی کو اٹھا کر نیچے پٹخ دیا گیا اور ان کے اوپر پتھروں کی بارش برسائی گئی...... یہاں صرف بارش برسانے کا ذکر ہے جبکہ سورۂ ھود میں زمین کو تہ وبالا کرنے کا بھی ذکر ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ {۱۸۰}

''سو جب ہمارا حکم آ پہنچا، ہم نے اس زمین کے بلند کو اس کا پست بنا دیا اور ہم نے اس پر کھنگر کے پتھر تہ بہ تہ برسا دیے''

توریت میں قومِ لوط پر اللہ کا عذاب نازل ہونے کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

''اور جس وقت ضُغر میں داخل ہوا سورج کی روشنی زمین پر پھیلی تب خداوند نے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ خداوند کی طرف سے آسمان پر سے برسائی اور اس نے ان شہروں کو اور اُس سارے میدان کو اور ان شہروں کے سب رہنے والوں کو اور سب کچھ جو زمین سے اُگا تھا نیست کر دیا'' {۱۸۱}

{۱۸۰} سورۃ ھود ۱۱/۸۳

{۱۸۱} پیدائش ۱۹:۲۳-۲۵

حکمت وہدایت:

لواطت کبیرہ گناہوں میں سے ہے، قرآن کریم کے علاوہ حدیث میں بھی اس جرم کی شدید مذمّت کی گئی ہے، اس کے کرنے والے پر رسول اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان اخوف مأأخاف علی امتّی عمل قوم لوط.{۱۸۲} ''مجھے اپنی امت کے بارے میں قومِ لوط والے عمل کا سب سے زیادہ اندیشہ ہے''

لواطت کا گناہ ایک تو ایسے ماحول میں زیادہ ہوتا ہے جہاں عورتوں سے فائدہ اٹھانا مشکل ہو یا تو عورتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے یا نکاح کو مشکل تر بنا دینے کی وجہ سے، دوسرے اس حیوانی معاشرہ میں یہ گناہ عام ہو جاتا ہے جہاں انسان خدا کے بجائے اپنے نفس اور شیطان کا بندہ بن جائے، ایسے شھوت پرست معاشرہ میں مرد، مردوں کے ساتھ اور عورتیں، عورتوں کے ساتھ شھوت کی آگ بجھاتی ہیں۔قومِ لوط کے قصہ میں علماء نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ لواطت کے جرم میں صرف مرد مبتلا تھے تو عوتوں کو سزا کیوں دی گئی؟ اور یہ کہ خواتین اپنے حق کی پامالی کے باوجود خاموش کیوں رہیں؟ اور پھر خود ہی اس کا جواب بھی دیا ہے کہ آج کی شھوت پرست سوسائٹیوں کی طرح سدومیوں کی عورتیں بھی ہم جنس پرستی میں مبتلا تھیں اور انہیں مردوں کی چنداں پرواہ نہیں تھی، اس لیے جب عذاب آیا تو جنس کے امتیاز کے بغیر سب پر آیا۔{۱۸۳}

اس بات پر تو تمام اہلِ حق کا اتفاق ہے کہ فاعل اور مفعول دونوں کو ایسی سخت سزا دینی چاہیے کہ دیکھنے والے عبرت حاصل کریں البتہ سزا کی تعیین کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

۱......امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ لوطی کو کسی اونچی جگہ سے نیچے گرائے جانے کے بعد اس پر پتھروں کی بارش کی جائے۔{۱۸۴}

۲......شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے اور غیر شادی شدہ کو کوڑے لگائے جائیں۔{۱۸۵}

۳......اسے جلا دیا جائے۔{۱۸۶}

{۱۸۲} ترمذی/حدود/باب ۲۴، زھد/باب ۲۱، مسند احمد/۱/باب ۴۴

{۱۸۳} وظاھر الآیۃ أنّہ امطر علیھم کلھم۔ (روح المعانی ۵، الجزء الثامن/۲۵۵)

{۱۸۴} تفسیر ابنِ کثیر ۲/۳۱۰

{۱۸۵} قرطبی ۷/۲۱۸

{۱۸۶} فاجتمع رأی اصحاب رسول اللہ ﷺ ان یحرق بالنار۔(قرطبی ۷/۲۱۸)

قصہ شعیب علیہ السلام

﴿۸۵......۹۳﴾

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ

اور مدین کی طرف بھیجا ان کے بھائی شعیب کو بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، تمہارے

قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ

پاس پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے سو پوری کرو ماپ اور تول اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت

أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن

خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان والے ہو۔ اور مت بیٹھو راستوں پر کہ ڈراؤ

كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿۸۵﴾ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ

اور روکو اللہ کے راستہ سے اس کو جو کہ ایمان لائے اس پر، اور ڈھونڈو اس میں عیب، اور یاد کرو جبکہ تھے تم بہت تھوڑے پھر تم

مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ

کو بڑھا دیا اور دیکھو کیا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا۔ اور اگر تم میں سے ایک فرقہ ایمان لایا اس پر جو میرے ہاتھ

وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۸۶﴾ وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا

بھیجا گیا اور ایک فرقہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو جب تک اللہ فیصلہ کرے درمیان ہمارے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے

بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ

والا ہے۔ بولے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں ہم ضرور نکال دیں گے اے شعیب تجھ کو اور ان کو جو کہ ایمان لائے تیرے

وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿۸۷﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ

ساتھ اپنے شہر سے یا یہ کہ تم لوٹ آؤ ہمارے دین میں بولا کیا ہم بیزار ہوں تو بھی؟ بیشک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر

يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ﴿۸۸﴾

جھوٹا اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ اس سے اور ہمارا کام نہیں کہ لوٹ آئیں اس

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُم بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللَّهُ مِنْهَا ۚ وَمَا يَكُونُ لَنَا أَن نَّعُودَ

میں مگر یہ کہ چاہے اللہ رب ہمارا، گھیرے ہوئے ہے ہمارا پروردگار سب چیزوں کو اپنے علم میں، اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا،

فِيهَآ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ رَبُّنَا ۚ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى ٱللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا ٱفْتَحْ بَيْنَنَا

اے ہمارے رب فیصلہ کر ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور بولے

وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِٱلْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ ٱلْفَٰتِحِينَ ﴿٨٩﴾ وَقَالَ ٱلْمَلَأُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِن قَوْمِهِۦ لَئِنِ

سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں اگر پیروی کرو گے تم شعیب کی تو تم بیشک خراب ہو گے۔ پھر آ پکڑا ان کو زلزلہ نے پس صبح کو

ٱتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَٰسِرُونَ ﴿٩٠﴾ فَأَخَذَتْهُمُ ٱلرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا۟ فِى دَارِهِمْ جَٰثِمِينَ ﴿٩١﴾

رہ گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔ جنھوں نے جھٹلایا شعیب کو گویا کبھی بسے ہی نہ تھے وہاں جنھوں نے

ٱلَّذِينَ كَذَّبُوا۟ شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا۟ فِيهَا ۚ ٱلَّذِينَ كَذَّبُوا۟ شُعَيْبًا كَانُوا۟ هُمُ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٩٢﴾

جھٹلایا شعیب کو وہی ہوئے خراب۔ پھر الٹا پھر ان لوگوں سے اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا

فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَٰقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّى وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۖ فَكَيْفَ ءَاسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَٰفِرِينَ ﴿٩٣﴾

تم کو پیغام اپنے رب کے اور خیر خواہی کر چکا تمہاری، اب کیا افسوس کروں کافروں پر۔

تسہیل: اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے میری صداقت کی واضح دلیل آ چکی ہے پس تم ناپ اور تول پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور اصلاح ہو جانے کے بعد ملک میں فساد نہ پھیلایا کرو، یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم تصدیق کرو○ اور تم راستوں میں اس غرض سے نہ بیٹھا کرو کہ ان لوگوں کو دھمکیاں دو اور اللہ کی راہ سے روکو جو اس پر ایمان لا چکے اور اس میں کجی تلاش کرو، اور اس وقت کو یاد کرو جب تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا اور دیکھو تو سہی کہ فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا○ اور اگر تم میں سے ایک گروہ اس پیغام پر ایمان لا چکا جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے اور دوسرا گروہ ایمان نہیں لایا تو ذرا انتظار کر لو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے○ ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا اے شعیب! ہم تمہیں اور ان سب کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے الّا یہ کہ تم ہمارے مذہب میں واپس آ جاؤ، شعیب نے جواب دیا کہ کیا ہم تمہارے مذہب میں آ جائیں اگرچہ ہم اس سے بیزار ہی ہوں؟○ ہم تو اللہ پر جھوٹ بولنے والے شمار ہوں گے اگر ہم تمہارے مذہب میں واپس آ جائیں، بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو اس سے بچا لیا، اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لیے تمہارے مذہب میں آنا ممکن ہی نہیں سوائے اس کے کہ اللہ کی یہی مشیت ہو جو کہ ہمارا ربّ ہے، ہمارے ربّ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، ہم اللہ پر ہی بھروسہ رکھتے

ہیں، اے ہمارے پروردگار! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان دوٹوک فیصلہ فرمادے اور تو ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے O اور ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کروگے تو تباہ ہوجاؤ گے O پھر انہیں زلزلے نے آ پکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے O جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا ان کی حالت ایسی ہوگئی کہ گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ تباہ ہوکر رہے O اس وقت شعیب یہ کہتے ہوئے ان سے منہ پھیر کر چلے گئے کہ اے میری قوم! میں نے تمہیں اپنے ربّ کے احکام پہنچادیئے تھے اور میں تمہاری خیرخواہی کرتا رہا تو اب میں کافر قوم پر کیونکر غم کروں O

قصّہ شعیب علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت مدین یا مدیان میں ہوئی تھی، مدین کسی مقام کا نام نہیں بلکہ قبیلہ کا نام ہے، یہ قبیلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کی نسل سے تھا جو ان کی تیسری بیوی قطورا سے پیدا ہوا اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خاندان بنی قطورا کہلاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مدین کا قبیلہ بحرِ قلزم کے مشرقی کنارہ اور عرب کے مغرب شمال میں ایسی جگہ آباد تھا جو شام کے متصل حجاز کا آخری حصّہ کہا جاسکتا ہے اور حجاز والوں کو شام، فلسطین بلکہ مصر تک جانے میں اس کے کھنڈر راہ میں پڑتے تھے اور جو تبوک کے بالمقابل واقع تھا۔

مفسرین اس بارے میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحابِ ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ دونوں جدا جدا قبیلے ہیں، مدین متمدّن اور شہری قبیلہ تھا اور ''اصحابِ ایکہ'' دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں آباد تھا اس لیے اس کو ''بن والا'' یا ''جنگل والا'' کہا گیا۔

دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں، ان میں سے حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ کا یہ خیال ہے کہ یہاں ''ایکہ'' نام کا ایک درخت تھا جس کی پرستش ہوتی تھی لہٰذا اس کی نسبت سے ''مدین'' کو ''اصحابِ ایکہ'' کہا گیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم میں دوسری بہت سی خرابیوں کے علاوہ درجِ ذیل برائیاں خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی تھیں۔

شرک اور بُت پرستی، خرید و فروخت اور ناپ تول میں کمی بیشی اور تمام معاملات میں دھوکہ، فراڈ، کھوٹ اور ڈاکہ زنی۔

حضرت شعیب علیہ السلام بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے، شیریں کلامی، حسنِ خطابت، طرزِ بیان اور طلاقتِ لسانی میں بہت نمایاں امتیاز رکھتے تھے، اسی لیے مفسرین ان کو خطیب الانبیاء کے لقب سے یاد کرتے ہیں، آپ نے قوم کو نرم وگرم ہر طریقہ سے سمجھایا مگر چند کمزوروں اور غریبوں کے علاوہ کسی پر کوئی اثر نہ ہوا، جب مسلسل فہمائش اور صداقت کے واضح دلائل دیکھ لینے کے باوجود ان پر کوئی اثر نہ ہوا تو ان پر زلزلہ اور آگ کی بارش کی صورت میں عذاب آیا۔ عین اس وقت جب وہ اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے تو یکا یک ایک ہولناک زلزلہ آیا اور ابھی یہ ہولنا کی ختم نہ ہوئی تھی کہ اوپر سے آگ برسنے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ صبح کو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کل کے سرکش اور مغرور گھٹنوں کے بل اوندھے جھلسے ہوئے پڑے ہیں۔{۱۸۷}

﴿تفسیر﴾

﴿۸۵﴾...... حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو سب سے پہلے توحید کی دعوت دی اس لیے کہ توحید، دین کا رُکنِ اعظم ہے، ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ میری صداقت پر تمہارے پاس واضح دلیل آ چکی ہے، ''واضح دلیل'' سے مراد وہ معجزات ہیں جو ان کے ہاتھوں ظاہر ہوئے۔{۱۸۸}

گذشتہ قوموں کا عام وطیرہ تھا کہ وہ عجائبات اور خلافِ عادت امور دیکھے بغیر ایمان قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے۔

اس کے بعد آپ نے انہیں ناپ تول پورا رکھنے کا حکم دیا اس لیے کہ آپ کی قوم میں یہ عیب عام تھا کہ وہ جب لوگوں سے کوئی چیز خریدتے تھے تو اپنا حق پورا پورا وصول کرتے تھے اور جب کسی کو کوئی چیز بیچتے تھے تو پورا حق ادا نہیں کرتے تھے، خرید و فروخت کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی وہ بددیانتی اور ہیرا پھیری کرتے تھے اسی لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے پہلے انہیں ناپ تول پورا رکھنے کا حکم دیا اس کے بعد ''وَلَا تَبْخَسُوا'' فرما کر ہر طرح کے حقوق میں کمی کوتاہی سے منع فرمایا تا کہ اس میں حقوق میں کتر بیونت کی ساری صورتیں آ جائیں، چنانچہ اس میں وہ حکمران بھی آ گئے جو مکمل اطاعت چاہتے ہیں مگر عوام کے حقوق ادا نہیں کرتے، وہ ملازمین بھی آ گئے جو پوری تنخواہ وصول کرتے ہیں مگر ڈیوٹی پوری نہیں کرتے، وہ دکاندار بھی آ گئے جو دام وصول کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے مگر سودا دیتے وقت ڈنڈی مارتے ہیں، یونہی چوری چکاری اور رشوت خوری اور کسی بھی ناجائز طریقے سے مال ہتھیانے کی

{۱۸۷} تلخیص از قصص القرآن۔(۳۴۱-۳۵۱)

{۱۸۸} معجزة شاهدة بصحة نبوّتي۔(کشاف ۱۲۰/۲)

ساری صورتیں اس میں آ گئیں۔{۱۸۹}

﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ ’’اور اصلاح ہو جانے کے بعد ملک میں فساد نہ پھیلایا کرو‘‘ ظلم وستم کو رواج دینا، انسانوں کے حقوق ناجائز طریقے سے دبا لینا، کسی کی عزت وآبرو پر دھبّہ لگانا، بے حیائی کو فروغ دے کر اخلاق تباہ کرنا یہ سب فساد پھیلانے کی صورتیں ہیں اور اس کے مقابلے میں عقائد واعمال کی اصلاح، نفوس کا تزکیہ، نظامِ عدل کا قیام اور ایسے وسائل اور ایجادات کا فروغ جن سے انسانی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں یہ سب اصلاح کی شکلیں ہیں۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ یہ جو کچھ اوپر ذکر ہوا۔{۱۹۰} یعنی ایک اللہ کی عبادت، ناپ تول کا پورا کرنا اور فساد پھیلانے سے بچ کر رہنا یہ سب کچھ دین اور دنیا کے اعتبار سے تمہارے لیے بہتر ہے بشرطیکہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہو، اس لیے کہ ایمان، شریعت کی اتباع اور عمل پر آمادہ کرتا ہے اگر چہ کوئی حکم خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بظاہر اس کا کوئی مادی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔

﴿۸۶﴾......حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو جن باتوں سے منع فرمایا ان میں سے تین اس آیتِ کریمہ میں مذکور ہیں:

۱......ان کا راستوں پر بیٹھنا تا کہ دور دراز سے آنے والوں کو ڈرا دھمکا کر آپ کا پیغام سننے سے روک سکیں۔

۲......جو ایمان لا چکے تھے انہیں پریشان کرنا اور ستانا تا کہ وہ سچائی کے راستے سے ہٹ جائیں۔

۳......دین وشریعت کو تنقید کا نشانہ بنانا اور شکوک وشبہات پیدا کرنا تا کہ لوگ بدظن ہو جائیں۔

﴿۸۷﴾......آپ نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم میں سے بعض اس دعوت پر ایمان لا چکے جو میں اللہ کی طرف سے لے کر آیا ہوں اور بعض ایمان نہیں لائے تو تم صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان عملی طور پر فیصلہ فرمادے......صبر کرنے کا حکم ایمان والوں کے لیے وعدہ تھا اور کافروں کے لیے وعید۔{۱۹۱}

بندوں کے درمیان اللہ جو فیصلہ فرماتے ہیں اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

{۱۸۹} ویدخل فیہ المنع من الغصب والسرقۃ، وأخذ الرشوۃ، وقطع الطریق وانتزاع الاموال بطریق الحیل۔(تفسیر کبیر ۵/۳۱۴)

{۱۹۰} وھو اشارۃ الی ھذہ الخمسۃ۔(تفسیر کبیر ۵/۳۱۵)

{۱۹۱} فھو وعد للمؤمنین ووعید للکافرین۔(بیضاوی ۲/۴۰)

۱.....شرعی فیصلہ جو وحی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

۲.....عملی فیصلہ، جس کی صورت عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ ان میں سے جو بندے حق پر ہوتے ہیں اور دنیا میں عدل اور اصلاح کے لیے کوشش کرتے ہیں، انہیں غلبہ عطا کیا جاتا ہے اور ان کی مخالفت کرنے والے بالآخر اللہ کے غضب کا نشانہ بنتے ہیں۔

﴿۸۸﴾.....دلیل کے میدان میں شکست کھانے کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے سردار اور متکبر جور و جفا اور جلاوطنی کی دھمکیوں پر اتر آئے، ہمیشہ یونہی ہوتا رہا کہ اللہ کے نبیوں کی مخالفت کی تحریک کا آغاز قوم کے وڈیروں اور مراعات یافتہ طبقے نے کیا، عوام میں سے بعض نے خوشی سے ان کا ساتھ دیا اور بعض ان کے دباؤ کی وجہ سے اس تحریک میں شامل ہو گئے۔

﴿اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا﴾ اس کے دو معنیٰ ہیں ایک معنیٰ تو یہ ہے کہ مخالفین نے کہا ہم اس وقت تک تمہیں پریشان کرتے رہیں گے جب تک کہ تم ہمارے مشرکانہ مذہب میں شامل نہ ہو جاؤ۔{۱۹۲}

دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ "جب تک تم ہمارے دین میں دوبارہ واپس نہیں آجاتے"{۱۹۳}

اس دوسرے معنی پر اشکال ہوتا ہے کہ اللہ کا کوئی نبی نبوّت ملنے سے پہلے بھی شرک نہیں کرتا جبکہ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ پہلے آپ معاذ اللہ مشرکوں کے ساتھ تھے اسی لیے تو انہوں نے آپ سے اور آپ کے ساتھیوں سے کہا کہ پرانے دین میں واپس آجاؤ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے کبھی بھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ ہی حقوق العباد سلب کرنے میں اپنی قوم کا ساتھ دیا لیکن چونکہ آپ نبوّت ملنے سے پہلے دل میں کُڑھنے کے باوجود علانیہ مخالفت اور روک ٹوک نہیں کرتے تھے اس لیے آپ کی مشرک قوم نے آپ کو بھی اپنا ساتھی سمجھا{۱۹۴} ویسے بھی آپ پر ایمان لانے والے تو بہر حال پہلے کافر تھے ہی۔

﴿قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ﴾ قوم کا خیال تھا کہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے ساتھی جلاوطنی کی دھمکی سے گھبرا جائیں گے، اس لیے کہ اُس زمانے میں جلاوطنی ایک انتہائی اذیت ناک سزا تھی آج کی گلوبل ولیج میں تبدیل

{۱۹۲} ای لتصیرنّ الی ملتنا۔(قرطبی ۷/۲۲۳)

{۱۹۳} ای لتعودن الینا کما کنتم من قبل۔(حوالہ مذکورہ)

{۱۹۴} ان شعیبا فی اوّل امرہ کان یخفی دینہ ومذہبہ فتوھموا انہ کان علی دین قومہ۔(کبیر ۵/۳۱۶)

ہوتی دنیا میں اس کی اذیت کا پوری طرح تصور بھی ناممکن ہے، مگر عصبیت اور رسوم پرستی میں مبتلا قوم کے خیال کے برعکس حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم تمہارے عقائد، معاملات اور اخلاق سے بیزار ہیں اس لیے جاہلی ملّت میں ہمارا شامل ہونا ناممکن ہے۔

﴿۸۹﴾......حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اب جبکہ اللہ نے بذریعہ وحی ''صراطِ مستقیم'' کی نشاندہی فرمادی ہے اور تمہاری جہالتیں اور حماقتیں ہم پر واضح فرمادی ہیں، اس کے باوجود اگر ہم تمہاری ملّت اور معاشرت قبول کرلیں تو یہ یقیناً باری تعالیٰ پر افتراء ہوگا۔

﴿اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا﴾ ''سوائے اس کے کہ اللہ کی یہی مشیت ہو جو کہ ہمارا ربّ ہے'' انبیاء، اولیاء اور دیگر اکابر اللہ کے جتنے قریب ہوتے ہیں اتنا ہی اس کی تقدیر، مشیت اور قدرت کے سامنے اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہماری چاہت اور ارادے اللہ کے فیصلے کے سامنے کچھ بھی نہیں۔{۱۹۵}

اللہ کے نبی نے پہلے تو دوٹوک انداز میں بتادیا کہ ہم کسی صورت بھی کفر اختیار نہیں کرسکتے کیونکہ اس کا باطل ہونا ہمارے اوپر پوری طرح کھل چکا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سامنے اپنی کمزوری اور بے بسی کا اقرار کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر اللہ ہمیں گمراہ کرنے کا فیصلہ فرمالے تو ہم اس کے فیصلے کو رد نہیں کرسکتے، اس لیے کہ ہمارے دل اس کے ہاتھ میں ہیں وہ جدھر چاہے انہیں پھیر سکتا ہے۔

﴿وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَىۡءٍ عِلۡمًا﴾ ''ہمارے ربّ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے'' لہٰذا تمہیں یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ ہمارا رب ہمیں اپنے فضل و کرم سے گمراہی سے نجات دینے کے بعد دوبارہ گمراہ کردے گا کیونکہ اس نے ہمیں تمہارے خلاف حجت بنایا ہے اور یقیناً وہ اپنی حجت کو خود ہی باطل نہیں کرے گا۔

﴿عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡنَا﴾ ہمارا توکل اور بھروسہ صرف اللہ پر ہے ہم اسی سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں ایمان پر ثابت قدمی عطا فرمائے گا، توکلِ صحیح کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام لازم کیے ہیں ان پر عمل کیا جائے اور جو بھی ممکن اور جائز اسباب ہیں ان کے اختیار کرنے میں دریغ نہ کیا جائے۔

وہ اعرابی جس نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ کیا میں اللہ کے توکل پر اونٹنی کو کھلا چھوڑ سکتا ہوں؟ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا:

اعقلها وتوکّل.{۱۹۶} ''پہلے اس اونٹنی کو باندھو پھر توکل کرو''

{۱۹۵} قال الواحدی ولم تزل الانبیاء والاکابر یخافون العاقبة وانقلاب الامر۔(کبیر۵/۳۱۷)

{۱۹۶} ترمذی کتاب القیامة/۲۴۳۱

﴿ربنا افتح﴾ ''اے ہمارے رب فیصلہ فرما دے'' ربّ کا فیصلہ قول وفعل دونوں سے بھی ہوسکتا ہے اوران میں سے کسی ایک سے بھی، ربّ کا قول بذریعہ وحی نازل ہوتا ہے اور اس کا فعل اہلِ حق کی نصرت اور اہلِ باطل کی ہلاکت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔{۱۹۷}

﴿۹۰﴾......کافر سرداروں نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم نے شعیب کی ملّت کو اپنے آباء کی ملّت پر ترجیح دی اور کاروبار میں من چاہی چھوڑ کر ایمان وتقوٰی کے اصولوں پر عمل کیا تو یہ یقینی خسارہ ہوگا......قومی اور وطنی تعصب کا شکار ہونے والی قوموں اور حرام طریقوں سے دولت اکٹھی کرنے والے افراد کی نظر میں ایسا کرنا واقعی سراسر خسارے کا سودا ہے۔

﴿۹۱﴾......نافرمانوں پر زلزلہ کی صورت میں عذاب آیا جس کے نتیجے میں وہ گھروں میں اوندھے منہ گرے پڑے رہ گئے۔

﴿۹۲﴾......ان کی بستیوں اور گھروں کی حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی رہا ہی نہیں، کہاں تو ان کی دھمکیاں تھیں کہ ہم ایمان والوں کو یہاں سے نکال کر رہیں گے اور کہاں فطرت کا یہ انتقام کہ ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔

وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی اتباع کرنے والوں کو خسارے میں بتاتے تھے جبکہ انجام سے ثابت ہوا کہ وہ خود خسارے میں تھے۔

﴿۹۳﴾......ہلاک شدہ قوم پر نظرِ عبرت ڈال کر یہ کہتے ہوئے حضرت شعیب علیہ السلام وہاں سے چلے گئے کہ اے میری قوم! میرے ربّ نے عقائد ومواعظ اور احکام وآداب کے حوالے سے مجھے جو بھی پیغام دیئے تھے میں نے وہ سارے کے سارے بلاکم وکاست تم تک پہنچادیئے اور میں تمہارا خیر خواہ تھا تو اب میں کافر قوم پر کیوں کر غم کروں؟ غم تو اسے ہونا چاہیے جس نے اپنی حد تک کوشش میں کوتاہی کی ہو جبکہ میں نے اس حوالے سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔

حکمت وہدایت:

۱......عقیدے کے باب میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت ایک ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد توحید اور اطاعت پر ہے۔(۸۵)

{۱۹۷} ای احکم بیننا وبین قومنا وانصرنا علیھم۔(تفسیر ابنِ کثیر ۲/۳۱۱)

۲......ناپ تول میں ڈنڈی مارنا اور بندوں کے حقوق میں کمی کرنا حرام ہے......علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معاصر فضلاء کی تعظیم میں کوتاہی، خیانت، چوری اور رشوت کا لین دین اسی میں آ جاتا ہے۔(۸۵)

۳......یوں تو کسی بھی جگہ گناہوں کے ذریعے فساد پھیلانا حرام ہے مگر ایسے ملک اور زمین میں خاص طور پر حرام ہے جس کی اسلام کے ذریعے اصلاح ہو چکی ہو۔(۸۵)

۴......چوری، ڈکیتی، مسافروں کو ڈرانا دھمکانا اور مسلمانوں پر بھاری بھرکم ٹیکس لگانا حرام ہے۔(۸۶)

۵......اللہ کے دین پر عمل کرنے سے کسی بھی طرح روکنا اور اس میں شکوک وشبہات پیدا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔(۸۶)

۶......اس چیز کو ''سنّتِ بشریہ'' میں سے شمار کیا جا سکتا ہے کہ ظالم اور متکبّر اوّلاً دلائل اور باتوں کے ذریعے حق کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب وہ اس میدان میں شکست کھا جائیں تو قوت وطاقت سے حق اور اہلِ حق کو دبانے اور انہیں باطل قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔(۸۸)

۷......مومن کو چاہیے کہ وہ مستقبل کے حوالے سے جو بھی عزم کرے خواہ وہ کتنا نیک ہی کیوں نہ ہو، انشاء اللہ ضرور کہے۔(۸۹)

۸......انبیاء کرام علیہم السلام باوجودیکہ انسانیت کے سب سے بلند مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں اپنے بارے میں بے خوف نہیں ہوتے، انہیں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ہم سے کوئی غلطی نہ ہو جائے جیسے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو جواب دیا کہ ہم شرکیہ ملّت میں شامل نہیں ہو سکتے لیکن اگر ہمارا ربّ چاہے تو ایسا ہو سکتا ہے۔

موحّدِ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو دعا سورہ ابراہیم میں مذکور ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

﴿وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ﴾{۱۹۸}

''مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی عبادت سے بچائے رکھنا''

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا میں یہ الفاظ بھی ہیں:

تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ{۱۹۹} ''اے اللہ میرا خاتمہ اسلام پر فرمانا اور مجھے نیک لوگوں میں شامل فرمانا''

{۱۹۸} ابراہیم/۱۴/۳۵

{۱۹۹} سورۃ یوسف ۱۲/۱۰۱

بشکریہ اطلس القرآن اردو

ہمارے آقا ﷺ اللہ سے مانگا کرتے تھے:

یامقلب القلوب و الابصار ثبت قلبی علی دینک.{۲۰۰} ''اے دلوں اور نگاہوں کو بدلنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھنا''

۹......اہلِ حق کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ حق کو پہچان لینے کے بعد اسے چھوڑ دیں اور اس کے بدلے باطل پر راضی ہو جائیں۔(۸۹)

۱۰......جس کے دل میں جتنا زیادہ ایمان راسخ ہوگا اسے اسی قدر کفر و شرک سے نفرت ہوگی۔(۸۹)

ایمان والے کو کفر کی نجاست سے آلودہ ہونا ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے دہکتی ہوئی آگ میں چھلانگ لگانا۔

۱۱......اہلِ حق پر لازم ہے کہ وہ دشمن کی دھمکیوں کے جواب میں اللہ پر توکل کریں۔(۸۹)

۱۲......حق اور باطل کی کشمکش میں اللہ تعالیٰ سے اہلِ حق کی فتح اور غلبہ کی دعا کرنا انبیاء کی سنت ہے۔(۸۹)

۱۳......دنیا پرستوں کی نظر میں من چاہی چھوڑ کر اسلامی اصولوں کے مطابق کاروبار کرنا خسارہ ہی خسارہ ہے۔(۹۰)

۱۴......صبر اور ثابت قدمی کے نتیجے میں جلد یا بدیر اللہ کی نصرت ضرور آتی ہے۔(۹۱)

۱۵......ظلم، سرکشی اور لوٹ کھسوٹ کا انجام ہلاکت اور خسارے کے سوا کچھ نہیں۔(۹۱)

۱۶......جو لوگ فہمائش کے باوجود ظلم اور فساد سے باز نہ آئیں ان کی ہلاکت پر غم نہیں ہوتا۔(۹۳)

۱۷......ظالموں کو ان کی ہلاکت کے بعد بھی ڈانٹ ڈپٹ جائز ہے جیسے حضرت شعیب اور حضرت صالح علیہما السلام نے فرمائی اور جیسے ہمارے آقا ﷺ نے بدر کے مشرک مقتولوں کے بارے میں فرمائی۔(۹۳)

سنّتِ الٰہیہ اور ترغیب و ترہیب

﴿۹۴......۱۰۰﴾

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِىٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾

اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی کہ نہ پکڑا ہو ہم نے وہاں کے لوگوں کو سختی اور تکلیف میں، تاکہ وہ گڑگڑائیں، پھر

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ

بدل دی ہم نے برائی کی جگہ بھلائی یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ پہنچتی رہی ہے ہمارے باپ دادوں کو بھی تکلیف

{۲۰۰} ترمذی/۲/۳۶/باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن

فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ

اور خوشی، پھر پکڑا ہم نے ان کو نا گہاں اور ان کو خبر نہ تھی۔ اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو ہم کھول

بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

دیتے ان پر نعمتیں آسمان اور زمین سے لیکن جھٹلایا انہوں نے پس پکڑا ہم نے ان کو ان کے اعمال کے بدلے۔ اب کیا بے ڈر ہیں

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ اَوَاَمِنَ اَهْلُ

بستیوں والے اس بات سے کہ آپہنچے ان پر آفت ہماری راتوں رات جب سوتے ہوں؟ یا بے ڈر ہیں بستیوں والے اس بات سے کہ

الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ

آپہنچے ان پر عذاب ہمارا دن چڑھے جب کھیلتے ہوں؟ کیا بے ڈر ہو گئے اللہ کے داؤ سے؟ سو بے ڈر نہیں ہوتے اللہ کے داؤ سے

اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ

مگر خرابی میں پڑنے والے۔ کیا نہیں ظاہر ہوا ان لوگوں پر جو وارث ہوئے زمین کے وہاں کے لوگوں کے ہلاک ہونے کے بعد کہ

لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝

اگر ہم چاہیں تو ان کو پکڑ لیں ان کے گناہوں پر؟ اور ہم نے مہر کر دی ہے ان کے دلوں پر سو وہ نہیں سنتے۔

ربط: گزشتہ آیات میں جو مضمون مسلسل بیان ہوا ہے وہ مختلف نافرمان قوموں اور ان پر آنے والے عذاب کا تھا، یہاں پہلی دو آیتوں میں بتایا جا رہا ہے کہ ہلاکت اور عذاب کا سلسلہ صرف انہی قوموں کے ساتھ خاص نہیں تھا بلکہ انبیاء کو جھٹلانے والی تمام قوموں کے بارے میں سنتِ الٰہیہ یہی رہی ہے کہ پہلے انہیں مصائب و آلام میں بتلا کیا گیا پھر خوشحالی اور فراوانی عطا کر دی گئی اس کے باوجود وہ کفر و شرک پر قائم رہے تو ان پر اچانک اللہ کا عذاب آ گیا، اس کے بعد اگلی آیات میں ایمان کی ترغیب ہے اور کفر و شرک پر قائم رہنے سے ترہیب ہے۔

تسہیل: اور ہم نے جب بھی کسی بستی میں نبی بھیجا جسے جھٹلایا گیا تو ہم نے وہاں کے رہنے والوں کو شدت اور تکلیف میں مبتلا کر دیا تا کہ وہ عاجزی اختیار کرتے ہوئے ایمان لے آئیں ○ اس کے بعد ہم نے ان کی بدحالی کو خوشحالی میں بدل دیا چنانچہ وہ خوب ترقی کر گئے اور کہنے لگے کہ اچھے اور برے دن تو ہمارے آباء واجداد پر بھی آتے رہے ہیں پھر ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں اس کا گمان بھی نہ تھا ○ اور اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن وہ تو مسلسل جھٹلاتے ہی رہے چنانچہ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ہم نے انہیں اپنے عذاب کی گرفت میں لے لیا ○ کیا یہ بستیوں والے اس سے بے خوف ہو گئے

ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آ پڑے جبکہ وہ سو رہے ہوں؟O کیا یہ بستیوں والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آ پڑے جبکہ وہ کھیل کود میں لگے ہوں؟O کیا یہ لوگ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں؟ حالانکہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو خسارہ اٹھانے والے ہوںO وہ لوگ جو ان بستیوں کی تباہی کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں کیا ان پر یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں مصیبت میں مبتلا کر دیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیں پھر وہ نصیحت کی کوئی بات سن ہی نہ سکیں؟O

﴿تفسیر﴾

﴿۹۴﴾...... یہ سنتِ الٰہیہ ہی ہے کہ جب کسی قوم کے پاس اللہ کے نبی پیغام لے کر آئے اور قوم نے انہیں جھٹلا دیا تو انہیں عذاب دینے میں جلدی نہیں کی گئی بلکہ انہیں مہلت دی گئی اور انہیں مختلف احوال اور آزمائشوں میں ڈالا گیا تاکہ وہ راہِ راست پر آ جائیں، ایسا بھی ہوا کہ انہیں مصیبتوں، پریشانیوں، بیماریوں اور حوادث نے گھر لیا، {۲۰۱} چاہیے تو یہ تھا کہ ان حالات میں وہ اللہ کے سامنے گڑگڑاتے، توبہ کرتے اور اپنی زندگی کے رنگ ڈھنگ بدل لیتے جیسا کہ اہلِ ایمان کرتے ہیں، وہ جب کسی تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں تو فوراً اللہ کی طرف رجوع اور استغفار کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ مصیبت اللہ کی جانب سے ہے اور وہی اسے دور کر سکتا ہے چنانچہ یہ رجوع اور استغفار مؤمن کے لیے تزکیہ اور تطہیر اور بلندیٔ درجات کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ جبکہ کافر اور منافق ان مصائب سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا، نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

لایزال البلآء بالمؤمن حتی یخرج نقیا من ذنوبه و المنافق مثله کمثل الحمار لایدری فیما ربطه أهله ولافیم ارسلوه.{۲۰۲}	”مؤمن مصیبت میں مبتلا رہتا ہے حتیٰ کہ گناہوں سے پاک ہو کر نکلتا ہے اور منافق کی مثال گدھے کی سی ہے جو جانتا ہی نہیں کہ اسے باندھا کیوں گیا تھا اور چھوڑا کیوں گیا ہے۔“

جن کے سینے نورِ ایمان سے منور ہوتے ہیں انہیں اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت دکھائی دیتی ہے خواہ وہ

{۲۰۱} بالبأسآء ای بالبؤس والفقر، والضراء بالضر والمرض، وبذلك فسرهما ابن مسعود۔(روح المعانی ۶/۱۴)

{۲۰۲} بحواله ابن کثیر/۲/۲۱۲

صحت ہو یا بیماری، فقر ہو یا غنا، خوشی ہو یا غمی، چنانچہ بیماری اور پریشانی بھی انہیں اللہ کے قریب کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

﴿۹۵﴾...... جب وہ بدحالی اور پریشانیوں کے ہجوم میں ہونے کے باوجود راہِ راست پر نہ آئے تو ان کی بدحالی کو خوشحالی میں، فقر کو غنا میں اور تنگی کو آسانی میں تبدیل کر دیا گیا، اموال کے ساتھ ان کی اولاد میں بھی خوب ترقی ہوئی اس لیے کہ عام طور پر فارغ البالی کثرتِ اولاد کا سبب بنتی ہے۔ (یہ عجیب بات ہے کہ آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے، غریبوں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں جبکہ خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر عمل کرنے کی وجہ سے مالداروں کے بچے محدود ہوتے ہیں، مسلسل پروپیگنڈا سے ان کے ذہنوں میں بٹھا دیا گیا ہے کہ ''بچے دو ہی اچھے'') دنیا پرستی کی وجہ سے یہ بات تو ان کے ذہن میں آئی ہی نہیں کہ بدحالی اور خوشحالی دونوں اللہ کی طرف سے آزمائش ہیں بلکہ یہ کہ انہوں نے اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ اچھے اور برے حالات ہمارے آباءواجداد پر بھی آتے رہے ہیں، ہم پر بھی آرہے ہیں ان حالات کا کوئی تعلق ہمارے اخلاق واعمال اور رویے سے نہیں ہے حالانکہ باری تعالیٰ کی سنت اور دستور یہ ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ {۲۰۳}

''اللہ کا دستور یہ ہے کہ وہ جب کسی قوم کو نعمت سے نوازتے ہیں تو اس وقت تک ان سے واپس نہیں لیتے جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدلتی''

وہ سچے مؤمن جو اللہ تعالیٰ کے اس دستور کو جانتے ہیں ان کے لیے حوادث اور مصائب تربیت کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، وہ اس قسم کے مواقع پر اپنی زندگی اور روز و شب کا خوب تنقیدی جائزہ لیتے ہیں، اپنی کمزوریوں کی اصلاح اور اعتراف کرتے ہیں اور زندگی کا آغاز نئے سرے سے کرتے ہیں، یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اپنی اجتماعی کمزوریوں اور غلطیوں کی نشاندہی، تنقید، تجزیہ اور اعتراف کا کام غیر مسلموں میں تو کسی حد تک دکھائی دیتا ہے مگر مسلمانوں بالخصوص ان کے مقتدر اور بااثر طبقے میں یہ بالکل ختم ہو چکا ہے، کسی بھی تنقید کرنے والے کو غدّار، گستاخ اور بے ادب کہہ کر خاموش کرا دیا جاتا ہے۔

﴿فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً﴾ جن لوگوں کو مصائب میں صبر اور توبہ اور خوشحالی میں شکر کی توفیق نہ ہوئی بلکہ وہ فتنہ وفساد میں مزید ترقی کرتے گئے انہیں اس حال میں عذاب نے آ گھیرا کہ انہیں خبر ہی نہ ہوئی، یہی مضمون سورۃ الانعام میں بھی بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

{۲۰۳} انفال ۵۳/۸

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ {۲۰۴}

''پھر جب وہ اس نصیحت کو بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر خوشحالی کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان نعمتوں پر اترانے لگے جو انہیں دی گئی تھیں تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا پھر وہ ہر چیز سے مایوس ہو کر رہ گئے''

دینی اور دنیاوی برکات

﴿۹۶﴾...... جھٹلانے والوں کے بارے میں سنتِ الٰہیہ ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ایک اور سنت کا بیان ہے وہ یہ کہ اگر بستیوں اور شہروں والے ایمان لے آتے اور جن کاموں سے اللہ نے منع فرمایا ہے ان سے باز آ جاتے تو ان پر آسمان سے بھی رحمت کی بارش برستی اور زمین بھی ان کے لیے مختلف غلّہ جات اور پھل اگاتی اور معدنیات اور خزانے اُگل دیتی۔{۲۰۵}

یہ بھی کہا گیا ہے کہ آسمانی برکتوں سے مراد دعاؤں کی قبولیت اور ایمانی اور روحانی برکات ہیں۔{۲۰۶}

گویا ایمان اور تقوٰی کے نتیجے میں انہیں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی سعادت حاصل ہوتی، وہ روحانی اعتبار سے بھی تکمیل تک پہنچ جاتے اور جسمانی اور مادی اعتبار سے بھی ان کے اندر کوئی نقص باقی نہیں رہ جاتا۔ قرآنِ کریم کی بعض دوسری آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں آسمانی تعلیمات کی اتباع کے نتیجے میں دنیا اور آخرت کی سعادت اور کامیابی انسان کا مقدّر بنتی ہے، سورۂ طٰہٰ میں ہے:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى {۲۰۷}

''پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو کوئی میری ہدایت کی اتباع کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی تکلیف اٹھائے گا اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا تو اس کی زندگی تلخ ہو جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے''

مادی سہولیات اور رزق کی فراوانی کافروں کو بھی حاصل ہوتی ہے اور ایمان والوں کو بھی حاصل ہوتی ہے،

{۲۰۴} سورۂ انعام ۶/۴۴

{۲۰۵} برکات السماء بالمطر وبرکات الارض بالنبات والثمار وکثرة المواشی والانعام وحصول الامن والسلامة۔(تفسیر کبیر ۵/۳۲۲)

{۲۰۶} وقیل البرکات السماویة اجابة الدعاء۔(روح المعانی ۵/۱۷)

{۲۰۷} سورۂ طٰہٰ ۲۰/۱۲۴

کافروں کو یہ چیزیں ابتلاء کے طور پر دی جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے ان کے اندر کبر وغرور پیدا ہو جاتا ہے جبکہ اہلِ ایمان کو اللہ کی نعمت کے طور پر عطا کی جاتی ہیں اور انہیں شکر و اطاعت کی توفیق ملتی ہے۔

﴿۹۷﴾......(کیا یہ بستیوں والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں؟) یہ سوال انکار کے طور پر ہے، یعنی انہیں بے خوف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ عقلمند انسان کبھی بھی بے خوف نہیں ہوتا، وہ ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں غفلت کی نیند سوتے ہوئے اللہ کا عذاب نہ آ جائے۔

﴿۹۸﴾......اسی طرح اسے یہ بھی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دن کے وقت جب وہ کھیل کود میں مصروف ہو اسے عذابِ الٰہی اپنی گرفت میں نہ لے لے۔

﴿۹۹﴾......''مکر'' کا اطلاق مخفی تدبیر پر ہوتا ہے۔{۲۰۸} اردو میں مکر کا لفظ سازش، چالاکی اور دھوکہ دہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جبکہ عربی میں ایسا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی ہر تدبیر حکمت، مصلحت اور اس کی سنت پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ تو انسان ہے جو اپنی جہالت کی وجہ سے دھوکے کا شکار ہو جاتا ہے حکمران اپنے اقتدار، مالدار اپنی دولت، عالم اپنے علم اور عابد اپنی عبادت کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتا ہے یوں وہ خسارے میں پڑ جاتا ہے جب عالم اور عابد اللہ کی تدبیر سے غافل ہونے کی وجہ سے خسارے میں پڑ سکتا ہے تو اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو گناہوں میں غرق ہونے کے باوجود اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہوتا ہے۔

﴿۱۰۰﴾......کیا وہ لوگ جو گزشتہ قوموں کی ہلاکت کے بعد زمین کے وارث ہوئے ان پر یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ ان کے ساتھ بھی ہمارا معاملہ وہی ہوگا جو پہلی قوموں کے ساتھ ہوا، کافروں اور نافرمانوں کو عذاب دینے میں اللہ کی سنت ایک ہی ہے اور اللہ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں آ سکتی، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں اور فلاں قوم کو اللہ نے حکم عدولی کی وجہ سے سزا دی مگر ہمیں سزا کے بجائے انعامات سے نوازے گا وہ سخت غلطی پر ہیں۔

﴿لَوْ نَشَآءُ﴾ اگر ہم چاہیں تو ان کے برے اعمال کی وجہ سے انہیں ہلاک کر دیں اور اگر ہلاک نہ کریں تو ان کے دلوں پر مہر لگا دیں پھر وہ سن ہی نہ سکیں، یہاں فہم و تدبر کے ساتھ سننے کی نفی ہے ہر سماع کی نفی نہیں ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......موجودہ اقوام کو سمجھانے کے لیے گزشتہ قوموں میں سنّتِ الٰہیہ کا بیان ہے اور سنّتِ الٰہیہ کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔

۲......مصیبت اور راحت، بیماری اور صحت، فقر اور غنا ہر چیز اور ہر حالت میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔ ان کیفیات

{۲۰۸} المکر صرف الغیر عمایقصده بحیلة (المفردات ۴۷۱)

اور حالات کو بے فائدہ سمجھنا اور ان سے سبق حاصل نہ کرنا کافروں اور منافقوں کا شیوہ ہے۔

۳......مؤمن کو چاہیے کہ تکلیف اور پریشانی میں اللہ کی طرف رجوع اور استغفار کرے اس لیے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، سورۂ تغابن میں ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ {۲۰۹}

''جو بھی مصیبت آتی ہے وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے''

اور وہ مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر دور بھی نہیں ہو سکتی۔ سورۂ انعام میں ہے:

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ﴾ {۲۱۰}

''اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اسے اللہ کے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا''

اور عین ممکن ہے کہ انسان پر وہ مصیبت اس کے گناہوں کی وجہ سے آئی ہو، سورۂ نساء میں ہے:

﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ {۲۱۱}

''تمہیں جو کوئی بھلائی حاصل ہوتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور جو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ تمہارے اپنے اعمال کی بدولت ہے''

استغفار ایک ایسا وظیفہ ہے جس کی وجہ سے عذاب ٹل جاتا ہے، قحط سالی دور ہو جاتی ہے، بیماریوں سے شفا ملتی ہے اور رزق میں برکت ہوتی ہے۔

۴......اگر نعمت کے بعد شکر اور مصیبت کے بعد صبر کی توفیق ملے تو یہ حالت قابلِ تعریف ہے اور اگر نعمت کے بعد غفلت اور غرور اور مصیبت کے بعد شکوہ وشکایت اور انکار کی صورت ہو تو یہ حالت مذموم اور قابلِ اصلاح ہے۔

۵......وہ قوم جو تنگی اور خوشحالی، مصیبت اور راحت ہر حال میں کفر اور انکار پر قائم رہے اس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔

۶......وہ اللہ جس کے کرم اور رحمت کی کوئی حد نہیں وہ اپنے بندوں کو آسمان اور زمین کی برکتوں کی پیشکش کرتا ہے اور

{۲۰۹} سورۂ تغابن ۶۴/۱۱

{۲۱۰} الأنعام ۶/۱۷

{۲۱۱} النساء ۴/۷۹

ان سے صرف دو چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے یعنی ایمان اور تقوی۔(۹۶)

۷......وحیِ الٰہی کی اتباع سے مادی اور روحانی دونوں قسم کی برکات حاصل ہوتی ہیں۔(۹۶)

۸......غفلت حرام ہے اور بیدار اور چوکنا رہنا واجب ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ غفلت میں شیطان کا داؤ چل جائے۔

۹......اللہ کی تدبیر اور گرفت سے بےخوف ہونا حرام ہے۔(۹۹)

۱۰......جو قوم اللہ کی پکڑ سے بےخوف ہو جائے اسے ہلاکت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔(۹)

۱۱......ان گناہوں، غلطیوں اور کمزوریوں سے بچنا واجب ہے جن کی وجہ سے پہلی قوموں پر اللہ کا عذاب آیا۔(۱۰۰)

واقعات سے عبرت

﴿۱۰۱......۱۰۲﴾

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا

یہ بستیاں ہیں کہ سناتے ہیں ہم تجھ کو ان کے کچھ حالات اور بیشک ان کے پاس پہنچ چکے ان کے رسول نشانیاں لے کر پھر

كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا

ہرگز نہ ہوا کہ ایمان لائیں اس بات پر جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے، یوں مہر کر دیتا ہے اللہ کافروں کے دل پر۔ اور نہ پایا ان کے

وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

اکثر لوگوں میں ہم نے عہد کا نباہ اور اکثر ان میں پائے نافرمان۔

تسہیل: یہ بستیاں جن کے واقعات ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لیکر آئے لیکن جن حقیقتوں کو وہ ان کے آنے سے پہلے جھٹلا چکے تھے، ان پر ایمان لانا انہوں نے مناسب نہ سمجھا، اللہ تعالیٰ یونہی کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیا کرتا ہے ○ ہم نے ان میں سے اکثر کو عہد کی پاسداری کرنے والا نہیں پایا بلکہ ان میں سے اکثر کو فاسق ہی پایا○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۰۱﴾......گزشتہ آیات میں جن پانچ قوموں یعنی قومِ نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کے واقعات بیان کیے گئے ان کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ اے محمد ﷺ! ان کے واقعات میں آپ کے لیے تسلی اور آپ کی قوم

کے لیے عبرت ونصیحت کا سامان ہے۔

دنیا کی بے شمار تباہ شدہ اقوام میں سے صرف ان پانچ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف انہیں مادی نعمتیں عطا کی گئیں دوسری طرف انہیں مہلت بھی خوب ملی، ان نعمتوں اور مہلت کو وہ اپنے حق پر ہونے کی دلیل سمجھنے لگے، یہی کمزوری قریش میں بھی پائی جاتی تھی، کعبہ کی خدمت اور نسبت کی وجہ سے انہیں عزت ووجاہت بھی حاصل تھی اور ثروت وغنا بھی، کفروشرک کے باوجود انہیں مہلت بھی خوب ملی چنانچہ وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھنے لگے۔

تخصیص کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بستیاں حدودِ عرب میں تھیں اور اہلِ مکّہ ان کے انجام سے خوب باخبر تھے اور ان کے واقعات نئی نسل کو سناتے رہتے تھے۔

قریش کے کردار کے ساتھ حددرجہ مشابہت کی وجہ سے یہ پانچ قصّے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصّہ سے الگ بیان کیے گئے ہیں کیونکہ ان کی قوم ان پر ایمان لے آئی تھی البتہ فرعون اور اس کی جماعت نے جھٹلایا تھا جس کے نتیجے میں انہیں غرق کردیا گیا۔

ان قوموں پر عذاب آنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے انبیاء کی صداقت کے واضح دلائل دیکھ لینے کے باوجود ان ابدی حقیقتوں پر ایمان لانا مناسب نہ سمجھا جنہیں وہ ان کی تشریف آوری سے قبل یا ان کی دعوت کی ابتداء میں جھٹلا چکے تھے، جھٹلانے کے بعد وہ زندگی کے اختتام تک انکار پر جمے رہے۔

﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ﴾ جیسے جھوٹ پر اصرار کرنے والی ان قوموں کے دلوں پر مہر لگائی گئی یونہی ان جیسے دوسرے کافروں کے دلوں پر مہر لگادی جاتی ہے۔

﴿۱۰۲﴾......گزشتہ امتوں میں سے اکثر وعدے کی پاسداری کرنے والی نہیں تھیں اور اس سے مرادعہدِ فطرت بھی ہوسکتا ہے جو ہر انسان سے تخلیق کے وقت لیا گیا تھا، اس سے عہدِ شریعت بھی مرادلیا جاسکتا ہے، جس کی پابندی ہر ایمان قبول کرنے والے پر لازم ہوتی ہے۔{۲۱۲} اور اس سے مراد وہ عہد بھی ہوسکتا ہے جو انسان ایک دوسرے سے کرتے ہیں گویا اس میں ہر قسم کا عہد آگیا خواہ وہ اللہ کے ساتھ ہو یا بندوں کے ساتھ ہو۔

فطرتِ سلیمہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان عقیدۂ توحید پر قائم رہے لیکن بسااوقات اپنے ماحول اور والدین وغیرہ سے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ اس عقیدے سے ہٹ جاتا ہے، صحیحین میں ہے:

{۲۱۲} قال ابن عباس يريد الوفاء بالعهد الذى عاهدهم الله وهم فى صلب آدم...... والثانى قال ابن مسعود العهدهنا الايمان۔(تفسیر کبیر ۳۲۴/۵)

(کل مولود یولد علی الفطرة فأبواه یهوّدانه أوینصّرانه أویمجّسانه)

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں'' {۲۱۳}

حکمت وہدایت:

۱......نبی امّی ﷺ کی مبارک زبان سے گزشتہ اقوام کے واقعات ٹھیک ٹھیک بیان ہونا آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔(۱۰۱)

۲......صرف معجزات کا دیکھ لینا قبولِ ایمان کے لیے کافی نہیں، اللہ کی مشیت بھی ضروری ہے۔(۱۰۱)

۳......کفر، نفاق، شر، فساد اور اس پر اصرار کی وجہ سے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔(۱۰۱)

۴......بدعہدی اصل میں کافروں کا شیوہ ہے۔(۱۰۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ

﴿۱۰۳......۱۱۶﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۖ فَانظُرْ كَيْفَ

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس پس کفر کیا انہوں نے ان کے

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٠٣﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠٤﴾

مقابلہ میں سو دیکھ کیا انجام ہوا مفسدوں کا؟ اور کہا موسیٰ نے اے فرعون! میں رسول ہوں پروردگار عالم کا۔ قائم ہوں اس بات

حَقِيقٌ عَلَىٰ أَن لَّا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي

پر کہ نہ کہوں اللہ کی طرف سے مگر جو سچ ہے، لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی سو بھیج دے میرے ساتھ بنی

إِسْرَائِيلَ ﴿١٠٥﴾ قَالَ إِن كُنتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٠٦﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ

اسرائیل کو۔ بولا اگر تو آیا ہے کوئی نشانی لے کر تو لا اس کو اگر تو سچا ہے۔ تب ڈال دیا اس نے اپنا عصا تو اسی وقت ہو گیا اژدہا

فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿١٠٧﴾ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٠٨﴾ قَالَ الْمَلَأُ مِن

صریح۔ اور نکالا اپنا ہاتھ تو اسی وقت وہ سفید نظر آنے لگا دیکھنے والوں کو۔ بولے سردار فرعون کی قوم کے یہ تو کوئی بڑا واقف

{۲۱۳} بخاری/۱/صفحہ ۱۸۵، باب ماقیل فی اولاد المشرکین/ مسلم/ کتاب القدر/۲/صفحہ ۳۳۶

قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيۡمٌ ۙ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيۡدُ اَنۡ يُّخۡرِجَكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِكُمۡ ۚ فَمَاذَا تَاۡمُرُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

جادوگر ہے۔نکالنا چاہتا ہے تم کو تمہارے ملک سے اب تمہاری کیا صلاح ہے؟بولے ڈھیل دے اس کو اور

قَالُوۡۤا اَرۡجِهۡ وَاَخَاهُ وَاَرۡسِلۡ فِى الۡمَدَآٮِٕنِ حٰشِرِيۡنَۙ ﴿۱۱۱﴾ يَاۡتُوۡكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيۡمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ

اس کے بھائی کواور بھیج پرگنوں میں جمع کرنے والوں کو۔کہ جمع کر لائیں تیرے پاس جو ہو کامل جادوگر۔

السَّحَرَةُ فِرۡعَوۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ لَـنَا لَاَجۡرًا اِنۡ كُنَّا نَحۡنُ الۡغٰلِبِيۡنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمۡ وَاِنَّكُمۡ لَمِنَ

اور آئے جادوگر فرعون کے پاس، بولے ہمارے لئے کچھ مزدوری ہے اگر ہم غالب ہوئے۔

الۡمُقَرَّبِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوۡا يٰمُوۡسٰۤى اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِىَ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِيۡنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلۡقُوۡا ۚ

بولا ہاں اور بیشک تم مقرب ہوجاؤ گے۔بولے اے موسیٰ! یا تو تو ڈال اور یا ہم ڈالتے ہیں۔کہا ڈالو،

فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا سَحَرُوۡۤا اَعۡيُنَ النَّاسِ وَاسۡتَرۡهَبُوۡهُمۡ وَجَآءُوۡ بِسِحۡرٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۱۶﴾

پھر جب انہوں نے ڈالا باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کواور ان کوڈرادیا اور لائے بڑا جادو۔

تسہیل: ان انبیاء کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنے معجزات دے کرفرعون اوراس کے سرداروں کے پاس بھیجا مگرانہوں نے ان معجزات کے بارے میں غلط رویّہ اختیار کیا پھر دیکھو فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوا؟○ اور موسیٰ نے کہا اے فرعون! میں یقیناً جہانوں کے پروردگار کی جانب سے رسول بن کر آیا ہوں○ میں اس پر قائم ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے متعلق صرف وہی بات کہوں جو سچی ہو، میں تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے واضح دلائل لے کر آیا ہوں لہٰذا بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دو○ فرعون بولا اگر تم کوئی نشانی لیکر آئے ہو تو اسے پیش کرو اگر تم اپنے دعویٰ میں واقعی سچے ہو○ چنانچہ موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو وہ فوراً واضح اژدہا بن گیا○ اور اپنا ہاتھ گریبان سے باہر نکالا تو وہ دیکھنے والوں کو چمکتا ہوا دکھائی دیا○ قومِ فرعون کے سرداروں نے یہ منظر دیکھا تو بول اٹھے کہ یہ شخص تو بڑا ماہر جادوگر ہے○ اس کا ارادہ یہ ہے کہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے اب بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟○ سرداروں نے کہا کہ اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دے دو اور ملک بھر میں ہرکارے بھیج دو○ جو ہر ماہر جادوگر کو تمہارے پاس لے آئیں○ چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آ گئے اور اس سے کہنے لگے کہ اگر ہم غالب آ گئے تو ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا؟○ فرعون بولا ضرور ملے گا اور اہم بات یہ کہ تم میرے مقربین میں شامل ہو جاؤ گے○ (جب ساحر میدان میں آئے تو) بولے اے موسیٰ! کیا آپ پہلے لاٹھی ڈالیں گے یا ہم پہلے ڈالیں؟○ آپ نے فرمایا تم ہی پہلے ڈالو پھر جب انہوں نے اپنی رسیاں پھینک دیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان پر ہیبت طاری کر دی اور انہوں نے بڑا زبردست جادو کر دکھایا○

چند جھلکیاں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں ایک سو تیس بار سے زیادہ آیا ہے، ابتداء سے انتہا تک ان کی زندگی عجائب سے عبارت ہے، محض چند جھلکیاں پیشِ خدمت ہیں۔

ان کی ولادت اس وقت ہوئی جب قبطی بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرتے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے، والدہ نے صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں ڈال دیا وہاں سے زوجۂ فرعون حضرت آسیہ نے اٹھالیا اور آپ کی پرورش آپ کی والدہ کی گود میں مگر فرعون کے محل میں اور اس کے خرچ پر ہوئی، جوان ہوئے تو ایک مصری کے قتل کی وجہ سے آپ کو مصر سے مدین جانا پڑا، یہاں دس سال تک بکریاں چرائیں پھر آپ کی شادی حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے ہوگئی، اہلیہ کو ساتھ لیے جنگل میں سفر کر رہے تھے، اندھیرا بھی تھا اور سخت سردی بھی، آگ کے حصول کے لیے نکلے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت سے نواز دیا، آپ کے بھائی حضرت ھارون علیہ السلام کو بھی آپ کی دعا سے نبوت عطا کردی گئی، انہیں ساتھ لے کر آپ فرعون کے دربار میں جا پہنچے اور ظالم بادشاہ بلکہ خدائی کے دعویدار کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا فریضہ ادا کیا، فرعون کے مطالبہ پر عصا اور یدِ بیضاء کا معجزہ دکھایا عصا اور یدِ بیضاء کے علاوہ بھی آپ کے ہاتھوں کئی معجزات ظاہر ہوئے جن کا ذکر سورۂ اعراف، اسراء، طٰہٰ، نمل، قصص، زخرف، قمر اور نازعات میں آیا ہے۔

آپ بنو اسرائیل کو لیکر مصر سے نکلے تو فرعون نے بہت بڑے لشکر کے ساتھ آپ کا تعاقب کیا، آپ کو ساتھیوں سمیت بچالیا گیا جبکہ فرعون اور اس کے لشکریوں کو بحرِ احمر میں غرق کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمانی تعلیمات عطا کرنے کے لیے طور پر بلایا آپ کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل نے سامری کی باتوں میں آ کر بچھڑے کی پرستش شروع کردی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ارضِ مقدس میں داخل ہونے کے لیے کہا، انہوں نے حجت بازی کی چنانچہ انہیں چالیس سال تک وادیٔ تیہ میں سرگرداں ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا، آپ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل جہاد کے لیے آمادہ ہوئے اور انہوں نے حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں بیت المقدس فتح کر لیا۔

﴿تفسیر﴾

﴿۱۰۳﴾...... اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کے بعد ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے واضح دلائل اور معجزات دے کر فرعون کی طرف بھیجا جو ان کی صداقت پر

دلالت کرتے تھے لیکن اس نے کبروعناد کی بناء پر ان کے تسلیم کرنے سے انکار کردیا، فرعون کے پاس بے پناہ مادی وسائل اور ظاہری قوت وطاقت تھی، لیکن یہ وسائل اسے انجامِ بد سے نہ بچاسکے، اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے حامیوں کے خلاف کئی صورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدد کی، سب سے پہلے تو ان کے مایۂ ناز جادوگروں کو برسرِ عام شکست کا سامنا کرنا پڑا دوسرے نمبر پر مختلف قسم کے عذاب ان پر نازل ہوئے اور آخر میں فرعون کو اس کے لاؤلشکر اور کرّوفر سمیت دریا میں غرق کردیا گیا۔

﴿۱۰۴......۱۰۸﴾......حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ''ربّ العالمین'' کا رسول ہوں، اگلی آیت میں فرمایا کہ ''میں تمہارے ربّ کی طرف سے واضح دلیل لیکر آیا ہوں'' ان دونوں آیات میں آپ نے عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت بیان فرمادیا نیز فرعون جو کہ ربوبیت کا دعویدار تھا، اس پر واضح کردیا کہ اس کا اور سارے جہانوں کا ربّ صرف اللہ ہے، اس کے سوا کوئی ربّ نہیں۔

فرعون نے معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا جس کے جواب میں آپ نے عصا اور ید بیضاء کا معجزہ پیش کیا، عصا اژدہا بن گیا اور آپ کا ہاتھ ایسا چمکتا ہوا سامنے آیا کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔

اسرائیلی روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ اس اژدہا کو دیکھ کر لوگ بھاگے اور ایک دوسرے کے اوپر گر پڑے حتیٰ کہ ان میں سے پچیس ہزار آدمی کچل کر ہلاک ہوگئے۔{۲۱۴}

مگر ان روایات کی نہ تو سند صحیح ہے اور نہ ہی عقل اور نقل کے اعتبار سے ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

﴿۱۰۹......۱۱۲﴾......فرعون بڑا شاطر انسان تھا اس نے محسوس کیا کہ لوگ معجزات دیکھنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متاثر ہوسکتے ہیں اس لیے اس نے فوراً آپ کو ماہر جادوگر قرار دے دیا جو مصریوں کو ان کے ملک سے نکال کر وہاں قابض ہونا چاہتا ہے یوں اس نے ان کے قومی اور وطنی تعصّب کو ہوا دینا چاہی، درباری اس کی باتوں میں آگئے، ان کے اندر اتنی جرأت ہی کہاں تھی کہ وہ اس سے اختلاف کرسکتے، انہوں نے مشورہ دیا کہ مختلف شہروں میں ہرکارے بھیج کر تجربہ کار جادوگروں کو اکٹھا کرلیا جائے جو موسیٰ کا مقابلہ کرسکیں۔

﴿۱۱۳......۱۱۴﴾......ساحروں نے فرعون کے دربار میں حاضر ہونے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ غالب آجانے کی صورت میں ہمیں کچھ معاوضہ بھی ملے گا یا نہیں؟ فرعون نے جواب دیا کہ معاوضہ تو ملنا ہی ہے، سب سے بڑا انعام جو تمہیں ملے گا وہ یہ کہ تمہارا شمار میرے مقرّبین میں سے ہوگا۔

{۲۱۴} تفسیر ابن کثیر ۲/۲۱۶

﴿۱۱۵﴾......ساحروں کو اپنے کمالِ فن پر اتنا گھمنڈ تھا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیشکش کی کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو آپ اپنی لاٹھی کا کرشمہ دکھائیں ورنہ پھر ہم دکھاتے ہیں۔

﴿۱۱۶﴾......حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خداداد بصیرت کی بناء پر جواب دیا کہ پہلے تم اپنا شعبدہ دکھاؤ مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ عوام کے سامنے آجائے تاکہ اس کا توڑ کرنا اور دیکھنے والوں کے سامنے اس کے دھوکہ اور فریب ہونے کو ظاہر کرنا آسان ہو جائے۔

جب جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں میدان میں ڈالیں تو پورا میدان انتہائی ہیبتناک منظر پیش کرنے لگا، یوں لگ رہا تھا جیسے ہر طرف چھوٹے بڑے سانپ دوڑ رہے ہوں، اس منظر نے نہ صرف عوام کو مبہوت کر کے رکھ دیا بلکہ خود اللہ کا نبی اپنے دل میں خوف سا محسوس کرنے لگا، سورۂ طٰہٰ میں ہے:

فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ﴿٦٦﴾ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ ﴿٦٨﴾ وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ {۲۱۵}

"اب تو موسیٰ علیہ السلام کو خیال ہوا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے دوڑ رہی ہیں، پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا، ہم نے کہا ڈرو نہیں یقیناً تم ہی غالب رہو گے اور تمہارے دائیں ہاتھ میں جو چیز ہے اسے ڈال دو وہ ان کے ڈھونگ کو نگل جائے گی، جو ڈھونگ انہوں نے رچایا ہے وہ جادوگر کا کرتب ہے اور جادوگر کہیں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

حکمت وہدایت:

۱......خدائی کے جھوٹے دعویدار حکمران، اس کے متموّل حاشیہ نشینوں اور اس کی جاہل قوم نے جب حسّی اور مادی معجزات دیکھنے کے باوجود ایمان قبول نہ کیا تو انہیں ہلاک کر دیا گیا......اس قسم کی قومیں ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتی ہیں۔(۱۰۳)

۲......طاغوتی طاقتوں کی غلامی میں جکڑی ہوئی قوم کی آزادی کا مطالبہ کرنا منصب نبوت کے خلاف نہیں بلکہ اس کا عین تقاضا ہے۔(۱۰۵)

{۲۱۵} طٰہٰ ۲۰/۶۶، ۶۹

۳......بادشاہوں کے درباری، سرمایہ دار اور لیڈر قسم کے لوگ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں......قرآن ان لوگوں کے لیے ''ملأ''{۲۱۶} اور ''مترفین'' کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے...... حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کرنے والے بھی یہی لوگ تھے۔(۱۰۹)

۴......جھوٹ بولنا اور اہلِ حق کے حق کو باطل کی صورت میں ظاہر کرنا بیشتر دنیاوی لیڈروں کا شیوہ رہا ہے، مصری لیڈروں نے بھی یہی شیوہ اختیار کیا اور اپنی قوم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں باور کرایا کہ یہ جادوگر ہے جو تمہارے ملک پر قابض ہونا چاہتا ہے۔(۱۱۰)

۵......فرعون ایک طرف ربوبیت کا دعویدار تھا دوسری طرف قوم کے بڑوں سے مشورے کا طلبگار تھا جبکہ سچا ربّ کسی کے مشورہ کا محتاج نہیں ہوتا۔(۱۱۰)

۶......اسلام میں جادو کا سیکھنا اور سکھانا حرام ہے، ایسا کرنے والوں کو سزا دی جائے گی، سزا کے بارے میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہاں تک منقول ہے کہ ساحر کو قتل کیا جائے۔{۲۱۷}

۷......عام طور پر انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزہ کا تعلق اس فن سے ہوتا ہے جس فن میں اس زمانے کے لوگوں کو کمال اور مہارت کا دعوٰی ہوتا ہے، مصر میں جادو کا بڑا چرچا تھا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسا معجزہ دیا گیا جس نے جادوگروں کا پول کھول کر رکھ دیا۔

۸......یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو جادو جیسے حرام عمل کا حکم کیسے دیا؟ اس لیے کہ اس کا مقصد احقاقِ حق تھا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا مقصود اس اجازت سے خود اجازت نہیں بلکہ ان کو ان کے کفر کے ابطال اور اپنے معجزہ کے اثبات کا ذریعہ بنانا تھا، ایسی ہی مصلحت سے بعض اوقات شیوخ، ایسے کام کی اجازت دے دیتے ہیں جس کا ظاہر معصیت ہوتا ہے مگر اخیر میں اس میں کوئی دینی مصلحت ہوتی ہے اور وہی مصلحت ان کو مقصود ہوتی ہے۔{۲۱۸}

۹......خوارق یعنی خلافِ عادت امور اور شعبدہ بازیوں سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے یہ اہلِ باطل سے بھی صادر ہوسکتے ہیں، ہندو جوگی ایسے ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ بڑوں بڑوں کی عقل ماؤف ہوجاتی ہے۔

{۲۱۶} الملاء جماعة یجتمعون علی رای فیملئون العیون رواء ومنظرا۔(المفردات/۴۷۳)

{۲۱۷} احکام القرآن للجصّاص ۱/۵۱

{۲۱۸} بیان القرآن ۴/۳۳

بشکریہ اطلس القرآن اردو

۱۰......کچھ دیر کے لیے شعبدہ بازی سے متاثر ہو جانا روحانی اور ایمانی کمال کے منافی نہیں......حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی وقتی طور پر خوفزدہ ہو گئے تھے۔

۱۱......حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جادوگروں کا باطل ہونا ثابت کر دیا لیکن یہ ضروری نہیں کہ سارے اہلِ ایمان ایسے امور کے ابطال پر قادر ہوں۔

۱۲......سحر اور معجزہ میں ایک نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ معجزہ نبوت کے دعویدار کے ہاتھوں ظاہر ہوتا ہے جبکہ سحر کسی فاسق وفاجر کے ہاتھوں ظاہر ہوتا ہے۔

۱۳......قرآن نے ساحروں کے کرتب کے سلسلہ میں تبدیلی حقیقت کا دعوٰی نہیں کیا یہ دعوٰی توریت نے کیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ جدید محققین قرآنی بیان کی تائید کر رہے ہیں۔ {۲۱۹}

ساحروں کا ایمان اور فرعون کی دھمکی

۱۱۷......۱۲۶

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ

اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کو کہ ڈال دے اپنا عصا سو وہ جبھی لگا نگلنے جو سانگ انہوں نے بنایا تھا۔ پس ظاہر ہو گیا حق اور غلط

بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ

ہو گیا جو کچھ انہوں نے کیا تھا۔ پس ہار گئے اس جگہ اور لوٹ گئے ذلیل ہو کر۔ اور گر پڑے جادوگر سجدہ میں۔ بولے ہم ایمان

سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ

لائے پروردگار عالم پر۔ جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا۔ بولا فرعون کیا تم ایمان لے آئے اس پر میری اجازت سے پہلے؟ یہ

بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ

تو مکر ہے جو بنایا تم سب نے اس شہر میں تاکہ نکال دو اس شہر سے اس کے رہنے والوں کو، سو اب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ میں

تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

ضرور کاٹوں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں پھر سولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو۔ وہ بولے ہم کو تو اپنے رب کی

{۲۱۹} تفسیر ماجدی ۲/۲۰۴

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ

طرف لوٹ کر جانا ہی ہے۔ اور تجھ کو ہم سے یہی دشمنی ہے کہ مان لیا ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو جب وہ ہم تک پہنچیں،

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

اے ہمارے رب! دہانے کھول دے ہم پر صبر کے اور ہم کو مار مسلمان۔

تسہیل: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو، یہ عصا ان کی شعبدہ بازی کو فوراً نگل جائے گا ○ سو حق کا حق ہونا ظاہر ہو گیا اور جو حرکتیں مخالفین کر رہے تھے ان کا باطل ہونا واضح ہو گیا ○ فرعونی سب کے سامنے مغلوب ہو گئے اور وہ ذلیل ہو کر واپس لوٹے ○ ساحر سجدے میں گر پڑے ○ اور پکار اٹھے ہم سارے جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے ○ وہی جو کہ موسیٰ اور ھارون کا پروردگار ہے ○ فرعون نے کہا کیا تم میری اجازت کے بغیر ایمان لے آئے ہو؟ یہ تمہاری ایک سازش ہے جس کے ذریعے تم اس شہر کے رہنے والوں کو یہاں سے نکال دینا چاہتے ہو، اس گٹھ جوڑ پر میں تمہیں جو سزا دینے والا ہوں تمہیں اس کا ابھی پتہ چل جائے گا ○ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ کر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا ○ انہوں نے جواب دیا کہ ہم مر کر اپنے ربّ ہی کے پاس جائیں گے ○ اور تم آخر ہمیں کس جرم کی سزا دے رہے ہو، سوائے اس کے کہ ہم نے جب اپنے پروردگار کی نشانیوں کو دیکھا تو ہم ان پر ایمان لے آئے؟ اے ہمارے ربّ ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں حالتِ اسلام ہی میں موت دینا ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۱۷﴾ ...... اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر ڈالا تو اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شعبدہ بازی کا خاتمہ کر دیا...... کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی لاٹھیوں میں جو کہ اندر سے کھوکھلی تھیں پارہ بھرا ہوا تھا جب انہیں تپتے ہوئے فرش پر ڈالا گیا تو وہ حرکت کرنے لگیں، دور سے دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہوا کہ سانپ ہیں جو اچھل رہے ہیں۔ {۲۲۰}

عام طور پر جادوگروں کے کرتب ہاتھ کی صفائی، شعبدہ بازی اور ایسی خفیہ تدبیروں کے استعمال پر مشتمل ہوتے ہیں جو عام لوگوں کی نظر سے اوجھل ہوتی ہیں۔

{۲۲۰} بما یتخیل من التمویہ الذی جری مجری الشعوذۃ وخفۃ الیہ۔ (قرطبی ۷/ ۲۳۰)

حیرت ہوتی ہے ان مفسرین پر جو بہرصورت یہ ثابت کر دینا چاہتے ہیں کہ لاٹھیاں اور رسّیاں واقعی اور حقیقی سانپ بن گئی تھیں، حالانکہ قرآنِ کریم سے یہ مضمون ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

﴿۱۱۸......۱۲۲﴾......ساحروں کی شعبدہ بازی کا پول کھلنے کی دیر تھی کہ گردوغبار چھٹ گیا اور حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح ہو گیا، وہ سارے لوگ جو اللہ کے نبی کو برسرِ عام مغلوب دیکھنا چاہتے تھے خود مغلوب اور ذلیل ہو کر رہ گئے، باقی رہے جادوگر جو کہ اپنے مقابل کی صورت وسیرت اور طرزِ گفتگو سے پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے وہ اتنی تیزی سے سجدے میں گرے کہ لگتا تھا وہ گرے نہیں گرائے گئے ہیں {۲۲۱} انہوں نے برسرِ عام رب العٰلمین پر ایمان لانے کا اعلان کر دیا۔

اوّل تو ربوبیت کے دعویدار کے منہ پر طمانچہ کے لیے ''ربّ العٰلمین'' کے الفاظ ہی کافی تھے۔ لیکن ساحرانِ مصر نے ''موسیٰ اور ھارون کا ربّ'' کہہ کر ہر قسم کا شبہ دور کر دیا اور بتا دیا کہ ہم فرعون کے دعویٰ کا کفر کرتے ہیں اور ارض وسماء کے ربّ پر ایمان لاتے ہیں۔

﴿۱۲۳﴾......فرعون پہلے ہی سے اپنی ذلت آمیز شکست پر برافروختہ تھا، ساحروں کے قبولِ ایمان نے جلتی پر تیل کا کام کیا لیکن سخت غیظ وغضب میں بھی اس کا شیطانی ذہن کام کرتا رہا اور اس نے اپنی قوم کے دل میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے ساحروں سے خطاب کرتے ہوئے دو باتیں کہیں، پہلی بات تو یہ کہی کہ تمہارا ایمان قبول کرنا موسیٰ کے معجزہ کی قوت کی بناء پر نہیں بلکہ اس کیساتھ تمہارے خفیہ گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے گویا یہ حقیقی مقابلہ نہیں تھا بلکہ نورا کشتی تھا، دوسری بات یہ کہی کہ تمہارا اصل ہدف مصر کے حقیقی باشندوں کو یہاں سے نکال باہر کرنا اور یہاں پر اپنا قبضہ جمانا ہے......اپنی اس مغالطہ آمیز گفتگو کے ذریعے اس نے اپنی ہزیمت پر پردہ ڈالنے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب مصریوں کے میلان کو روکنے کی کوشش کی۔

﴿۱۲۴﴾......فرعون کو اپنا خدائی دعویٰ اور حکومت دونوں خطرے میں دکھائی دے رہے تھے اس لیے اس نے صرف پُرفریب گفتگو پر اکتفاء نہ کیا بلکہ سولی کی سزا کی دھمکی دی۔

امام ابنِ عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ سولی اور الٹی جانب کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا قدیم زمانے سے انسانوں میں چلی آ رہی ہے انہوں نے اسے کسی قدیم شریعت سے لیا ہو گا پھر اس میں اپنی جانب سے تحریف کر لی، اسلام نے اسے پوری طرح واضح کیا اور صرف ڈاکوؤں کے لیے اسے باقی رکھا، جن کا وجود پُرامن

{۲۲۱} فکان احدادفعهم وألقاهم أوان اللہ تعالیٰ ألهمهم ذلك وحملهم عليه۔(روح المعانی ۳۹/۶)

شہریوں کے مال وجان کے لیے خطرہ بن جائے۔'' {۲۲۲}

جدید محققین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ''سولی کی سزا قدیم قوموں خصوصاً قدیم مصریوں میں عام تھی۔ {۲۲۳}

﴿۱۲۵﴾......ساحر، جن کے دل کی گہرائی میں ایمان اُتر چکا تھا، فرعون کی دھمکی سے ذرا بھی نہ گھبرائے، انہوں نے جواب دیا کہ ہم موت سے نہیں ڈرتے کیونکہ ہمیں بالآخر اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، ہمیں امید ہے کہ وہ ایمان کی خاطر دی گئی قربانی کا صلہ ضرور دے گا اور ہم نے آج تک جتنے بھی گناہ کیے ہیں معاف کردے گا، سورۂ شعراء میں ہے:

قَالُوْا لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۚ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ {۲۲۴}

''انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں ہے ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں، چونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لائے ہیں اس لیے ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے سارے گناہ معاف کردے گا''

سورۂ طٰہٰ میں ہے:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا {۲۲۵}

''انہوں نے جواب دیا کہ جو واضح دلائل ہمارے سامنے آچکے ہیں ان دلائل پر اور اس اللہ پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہم تمہیں ترجیح نہیں دے سکتے، تم جو کچھ کرسکتے ہو کرلو، تمہارا حکم صرف اس دنیا ہی میں چل سکتا ہے''

﴿۱۲۶﴾......ایمان کے سوا ہمارا کوئی جرم نہیں اور ایمان جرم نہیں بلکہ سب سے بڑا نیک عمل ہے لہٰذا ہم کسی طور بھی ایمان سے رجوع نہیں کرسکتے، پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے صبر اور ثابت قدمی کی دعا کی تاکہ مصائب میں ان کے قدم ڈگمگا نہ جائیں۔

اس دعا میں انہوں نے جو الفاظ استعمال کیے وہ عربی محاورہ کے مطابق اور مفہوم کے اعتبار سے بڑے پُراثر ہیں

{۲۲۲} احکام القرآن ۲/۷۷۹

{۲۲۳} تفسیر ماجدی بحوالہ انسائیکلوپیڈیا، برٹانیکا جلد ۶ صفحہ ۷۹۳ تیرھواں ایڈیشن۔

{۲۲۴} الشعراء/۲۶/۵۰-۵۱

{۲۲۵} طٰہٰ/۲۰/۷۲

یعنی ''ہم پر صبر انڈیل دے'' جیسے اگر کسی پر پانی کے مشکیزے ڈال دیئے جائیں تو وہ پانی سے تر بتر ہو جاتا ہے یونہی ہمیں اتنا صبر عطا فرما کہ دل و دماغ سمیت ہمارے جسم کے ہر رگ و ریشہ میں صبر داخل ہو جائے۔{۲۲۶}

حکمت وہدایت:

۱......اگر اہلِ حق واقعی حق پر ہوں تو حق اور باطل کی کشمکش میں ہمیشہ اہلِ حق ہی غالب رہتے ہیں۔

۲......ساحر، شعبدہ باز اور جھوٹے وقتی طور پر تو کسی کو متأثر کر سکتے ہیں لیکن انہیں دائمی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

۳......حقیقی علم، ایمان اور ہدایت کا سبب بنتا ہے......ساحروں کو جب علم حاصل ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ سحر نہیں بلکہ معجزہ ہے تو انہیں ایمان کی توفیق حاصل ہو گئی۔

۴......یہ بھی قضاو قدر کا عجیب معاملہ ہے کہ ساحر صبح کے وقت کافر تھے اور اس دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے نہ صرف مسلمان ہو گئے بلکہ شہادت کے مرتبہ پر بھی فائز ہو گئے۔

۵......ظالم حکمرانوں کا ابتداء ہی سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ اپنی ذاتی فاسد اغراض کو ''عوامی مفاد'' اور ''سیاسی اور ملکی اغراض'' کے پردے میں چھپا کر پیش کرتے ہیں۔(۱۲۳)

۶......ایسے لوگ جن کے دل کفر و شرک اور گناہوں سے سیاہ ہو چکے ہوں وہ نہ جھوٹ سے بچتے ہیں اور نہ ہی اللہ کے نیک بندوں پر تہمت لگانے سے باز رہتے ہیں۔(۱۲۴)

۷......جو معنی ''اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ'' کا ہے وہی معنی ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' کا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصیبت کے وقت اس قسم کے کلمات کا کہنا اہلِ حق کا پرانا دستور ہے۔(۱۲۵)

۸......مصائب و آلام میں ایمان پر ثابت قدمی کی دعا کرنی چاہیے۔(۱۲۶)

۹......جو باطنی اور روحانی طاقت ایمان سے حاصل ہوتی ہے وہ کسی بھی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ صاحبِ ایمان کے لیے خدائی کے دعویداروں کے سامنے ڈٹ جانا اور موت کا سامنا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔(۱۲۷)

۱۰......ہر مسلمان کو خاتمہ بالایمان کی تمنا اور دعا کرنی چاہیے کہ یہ مؤمن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

{۲۲۶} ای أفض علینا صبرا یغمرنا کما یفرغ الماء اوصب علینا مایطھرنا من الآثام۔(روح المعانی ۶/۴۲)

دشمنوں کی تدابیر اور موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت

﴿۱۲۷......۱۲۹﴾

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ

اور بولے سردار قوم فرعون کے، کیوں چھوڑتا ہے تو موسیٰ کو اور اس کی قوم کو کہ ادھم مچائیں ملک میں، اور موقوف کر دے تجھ کو

وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور تیرے بتوں کو، بولا اب ہم مار ڈالیں گے ان کے بیٹوں کو اور زندہ رکھیں گے ان کی عورتوں کو اور ہم ان پر زور آور

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ یُوْرِثُهَا مَنْ

ہیں۔ موسیٰ نے کہا اپنی قوم سے، مدد مانگو اللہ سے اور صبر کرو بیشک زمین ہے اللہ کی، اس کا وارث کر دے جس کو وہ چاہے

یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْۤا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَمِنْۢ

اپنے بندوں میں اور آخر میں بھلائی ہے ڈرنے والوں کے لئے۔ وہ بولے ہم پر تکلیفیں رہیں تیرے آنے سے پہلے اور

بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ

تیرے آنے کے بعد، کہا نزدیک ہے کہ رب تمہارا ہلاک کر دے تمہارے دشمن کو اور خلیفہ کر دے تم کو ملک میں

فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

پھر دیکھے تم کیسے کام کرتے ہو۔

تسہیل: قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یونہی چھوڑے رکھیں گے تا کہ وہ ملک میں فتنہ وفساد پھیلاتے رہیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑے رکھیں؟ فرعون بولا نہیں ایسا نہیں ہوگا بلکہ ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیں گے اور ہمیں ان پر ہر طرح سے غلبہ حاصل ہے ○ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگتے رہو اور صبر کرو، یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا مالک بنادے، بالآخر کامیابی انہی کو ملتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں ○ اسرائیلی کہنے لگے اے موسیٰ! ہم تمہارے آنے سے پہلے بھی مصائب کا شکار تھے اور تمہارے آنے کے بعد بھی ہمارا یہی حال رہا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں ملک کا حاکم بنادے گا پھر وہ تمہارا طرزِ عمل دیکھے گا○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۲۷﴾......قومِ فرعون کے وڈیروں نے فرعون کو برانگیختہ کرتے ہوئے کہا کہ کیا تم موسیٰ اور اس کی قوم کو کھلی چھٹی دے دو گے کہ وہ جو چاہیں کرتے پھریں، لوگوں کو اپنے ربّ کی عبادت کی دعوت دیں، انہیں اپنے دین میں داخل کر کے اپنی قیادت میں جمع کرلیں اور تجھ سے اور تیرے معبودوں سے بغاوت کا اعلان کردیں؟

کسی کو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ فرعون جو کہ خود معبود بنا بیٹھا تھا کیا اس کا بھی کوئی معبود تھا؟ اس لیے کہ مصری تاریخ اور اس کے کھنڈرات کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ مصری بہت ساری دیویوں اور دیوتاؤں کی عبادت کرتے تھے جن میں سے ایک سورج دیوتا بھی تھا جس کا نام ان کی زبان میں ''رع'' تھا، فرعون کے لقب میں بھی اسے شامل کیا گیا ہے، فرعون اپنے آپ کو اسی دیوتا کا اوتار اور بیٹا قرار دیتا تھا، دوسرے مشرک مذہبوں کی طرح مصر کے دینِ شرک میں بھی چھوٹے بڑے ہر قسم کے دیوتا موجود تھے۔{۲۲۷}

فرعون نے خوشامدی درباریوں کو جواب دیا کہ ہم اسرائیلیوں کو کھلی چھٹی تو کیا دیں گے تم دیکھو گے کہ میں نے اسرائیلی بچوں کو جس طرح موسیٰ کی ولادت سے قبل قتل کرنے کا حکم دیا تھا اب وہ حکم دوبارہ جاری کروں گا۔

دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ فرعون نے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی قتل کرنے کا ارادہ کرلیا تھا، مگر چونکہ اللہ کے ہاں آپ کی زندگی کے دن باقی تھے اس لیے وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

سورۂ غافر میں ہے:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ {۲۲۸}

''فرعون نے کہا مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور اسے چاہیے کہ اپنے رب کو پکارے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ تمہارا دین نہ بدل ڈالے یا زمین میں فساد برپا نہ کردے''

﴿۱۲۸﴾......اسرائیلیوں نے قتل و غارت گری کی دھمکی سُنی تو گھبرا گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں صبر و دعا کی تلقین کی اور فرمایا کہ یہ زمین{۲۲۹} فرعون کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے

{۲۲۷} ومن المعلوم من التاریخ المستمد من العدیات المستخرجة من أرض مصرانه کان للمصریین ألهة کثیرة منها الشمس۔(المنار ۶۸/۹)

{۲۲۸} غافر ۲۶/۴۰

{۲۲۹} ای ارض مصراوالارض مطلقا وهی داخلة فیها دخولا اولیا۔(روح المعانی ۴۵/۶)

اس کا مالک بنا دیتا ہے اور یہ کہ یوں تو قوموں، جماعتوں اور افراد کے درمیان اتار چڑھاؤ کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن بالآخر کامیابی انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور ان شرائط کو پورا کرتے ہیں جو زمین کی وراثت کے لیے سنتِ الٰہیہ میں مقرر کی گئی ہیں یعنی قومی اتحاد، عدل کا قیام، مشکلات میں ثابت قدمی، انسانیت کی فلاح و بہبود کا پروگرام اور اللہ سے مدد!

﴿۱۲۹﴾...... بنی اسرائیل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تقریر کا ذرہ بھی اثر نہ ہوا، انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اے موسیٰ! ظاہری اعتبار سے ہمیں تمہاری نبوت اور اتباع سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا، ہم کل بھی مشکلات کا شکار تھے اور آج بھی وہی صورتحال ہے۔{۲۳۰}

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے اللہ کے فضل سے امید ہے کہ وہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں حکومت و خلافت عطا فرما دے گا پھر وہ دیکھے گا کہ ''تمہارا طرزِ عمل کیسا ہے'' آخری جملہ میں آپ نے بتا دیا کہ تمہیں بھی حکومت محض انبیاء کے خاندان سے تعلق اور دعوٰی توحید کی بنیاد پر نہیں ملے گی بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ تم اس کے حقوق بھی ادا کرتے ہو یا نہیں۔

حکمت و ہدایت:

۱...... بادشاہوں اور رؤساء کے لیے بُرے مشیر انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں...... فرعون کے مشیروں نے بھی اسے طیش دلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی۔(۱۲۷)

۲...... صبر اور تقوٰی سے انسانوں پر اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے اور کمالات کا دروازہ کھلتا ہے۔(۱۲۸)

۳...... حکومت و اقتدار تکوینی مصلحتوں کی بناء پر حاصل ہوتا ہے لہٰذا اس کی بناء پر حکمرانوں کی عنداللہ مقبولیت کا فیصلہ کرنا درست نہیں۔(۱۲۹)

۴...... مؤمن کو عارضی حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ انجام پر نظر رکھنی چاہیے اور حسنِ انجام، اللہ سے ڈرنے والوں ہی کا ہوتا ہے۔(۱۲۸)

۵...... مؤمنوں کا غالب اور کافروں کا مغلوب ہونا عظیم نعمت ہے لہٰذا بلا عذر و مجبوری کافروں کے ماتحت رہنا مناسب نہیں۔(۱۲۹)

۶...... انسان کا اصل امتحان اقتدار اور اختیار ملنے کے بعد ہوتا ہے۔(۱۳۰)

{۲۳۰} تم نے فرعون کے اور اس کے درباریوں کے آگے ہمارا کام بگاڑ دیا ہے اور ان کے ہاتھ میں تلوار دی ہے کہ ہم کو قتل کریں۔(بائبل سفر خروج باب ۵ صفحہ ۷۰)

آلِ فرعون پر مختلف دنیوی عذاب

﴿۱۳۰......۱۳۳﴾

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾

اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور میووں کے نقصان میں تاکہ وہ نصیحت مانیں۔ پھر جب پہنچی ان کو بھلائی کہنے

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ

لگے یہ ہے ہمارے لائق اور اگر پہنچی برائی تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی اور اس کے ساتھ والوں کی، سن لو ان کی شومی تو اللہ کے

مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوْا مَهْمَا

پاس ہے، پر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اس کی وجہ سے جادو کرے، سو

تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ

ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے۔ پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان اور ٹڈی اور چچڑی اور مینڈک اور خون، بہت سی نشانیاں

الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا

جدی جدی پھر بھی تکبر کرتے رہے اور تھے وہ لوگ گنہگار۔

وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

تسہیل: اور ہم نے فرعون والوں کو قحط سالی اور پھلوں کی کم پیداوار کی صورت میں سزا دی تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ○ جب انہیں خوشحالی نصیب ہو جاتی تو کہتے یہ تو ہمارے لیے ہونی ہی چاہیے اور اگر انہیں بدحالی پیش آ جاتی تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے، یاد رکھو! ان کی نحوست تو بس اللہ ہی کے پاس ہے لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں ○ اور وہ کہتے ہیں کہ تم کیسی ہی نشانیاں لا کر ہمیں مسحور کرنا چاہو تب بھی ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ○ پھر ہم نے ان پر طوفانی ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کا عذاب مسلط کر دیا یہ سب واضح نشانیاں تھیں مگر وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ تھے ہی مجرم ○

تفسیر

﴿۱۳۰﴾...... جب فرعونی حکومت کی طرف سے اسرائیلیوں پر سختی بڑھتی ہی چلی گئی تو اللہ تعالیٰ نے قومِ فرعون کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا کر دیا جن میں سے دو کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یعنی قحط سالی اور پھلوں کی پیداوار میں کمی، یہ

ابتلاء صرف فرعون کے مخصوص متعلقین تک محدود نہ رہی بلکہ اس کی ساری قوم اس میں مبتلا ہوئی کیونکہ فرعون نے جور و جفا کا جو نظام مسلّط کر رکھا تھا اس میں قوم بھی اس کی مددگار تھی، اسے یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس ظالمانہ نظام کے خلاف آواز اٹھاتی اور فرعون کا دست و بازو بننے سے انکار کر دیتی۔ {۲۳۱}

﴿لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ﴾ اس ابتلاء کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کی قوت اور اقتدار کے سامنے فرعونیوں کو اپنے اور اپنے خود ساختہ معبودوں کے ضعف اور عجز کا احساس ہو اور وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوں اس لیے کہ جس کے دل میں ایمان کی رمق بھی ہو اس کا دل مصیبت میں نرم ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کے سامنے جھک جاتا ہے۔

﴿۱۳۱﴾...... چونکہ فرعونیوں کے ذہن میں اپنی عظمت اور بڑائی کا خیال راسخ ہو چکا تھا اس لیے وہ ہر نعمت کو اپنا استحقاق اور اپنی خوش تدبیری کا نتیجہ سمجھتے تھے {۲۳۲} اور اگر انہیں کسی مصیبت، بیماری حادثہ اور قحط سالی کا سامنا کرنا پڑتا تو اسے اپنے ظلم و ستم اور بداعمالیوں کا نتیجہ سمجھنے کے بجائے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے۔

﴿أَلَا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللَّهِ﴾ {۲۳۳} اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک طے شدہ نظام ہے جس کے مطابق خوشحالی اور بدحالی رونما ہوتی ہے، اس نے ہر حکم کے لیے کوئی نہ کوئی سبب تجویز کر رکھا ہے عام طور پر اس کے پائے جانے سے مسبب اور نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، انسان پر اگر کوئی آفت آئے تو اسے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ شاید یہ میرے کسی گناہ اور غلطی کا نتیجہ ہو، لیکن زیادہ تر لوگ اپنے اوپر آنے والی آفات کے اسباب باہر تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اپنا محاسبہ کرنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوتی ہے، یہی حال فرعونیوں کا تھا۔

﴿۱۳۲﴾......ضد اور عناد کی بناء پر قومِ فرعون نے طے کر لیا تھا کہ خوشحالی ہو یا بدحالی، موسیٰ علیہ السلام جو بھی معجزہ دکھا دیں ہم ایمان قبول نہیں کریں گے، یہی ذہنیت جاہلینِ عرب کی تھی اور یہی سوچ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے جاہلینِ فرنگ کی ہے۔

﴿۱۳۳﴾...... جب مصری ضد اور عناد، تکبر اور سرکشی میں آخری حد تک پہنچ گئے تو ان پر مختلف قسم کے عذاب بھیجے گئے، سورۂ اسراء میں ہے:

{۲۳۱} وهم مؤاخذون بظلمه وطغيانه لان قوته المالية والجندية منهم (المنار ۹/۷۴)

{۲۳۲} اى انا مستحقوها بيمين الذات (روح المعانى ۶/۴۸)

{۲۳۳} اى ليس شؤمهم الا عندالله اى من قبله وحكمه كماقال ابن عباس (حوالۂ مذکورہ)

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسٰى تِسۡعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ {۲۳۴} ''اور ہم نے موسیٰ کو بالکل واضح نو نشانیاں عطا فرمائیں''

ان میں سے دو کا ذکر پہلے ہو چکا اور پانچ اس آیت میں مذکور ہیں، توراۃ میں بھی ان سب کا ذکر آیا ہے مگر ترتیب اور تعداد میں فرق ہے۔{۲۳۵}

﴿الطُّوفَانَ﴾ لغت میں طوفان کا اطلاق ہر ایسے حادثہ اور آفت پر ہوتا ہے جو انسان کو ہر طرف سے گھیر لے،{۲۳۶} اس کا زیادہ استعمال پانی کے طوفان میں ہوتا ہے خواہ وہ آسمان سے برسے یا زمین سے بہ پڑے، توراۃ میں ''آتشیں ژالہ باری'' کا ذکر آیا ہے، ہوسکتا ہے طوفان سے مراد یہی ہو{۲۳۷} ہمارے مفسرین نے کثرتِ موت، طاعون اور تباہ کن بارش وغیرہ کو طوفان کا مصداق بتایا ہے۔{۲۳۸}

﴿الجَرَادَ﴾ ایسا ٹڈی دَل آیا جو لہلہاتے کھیتوں، سرسبز باغات اور پودوں کو صاف کر گیا، مصریوں کی زراعت تباہ ہو کر رہ گئی جبکہ زرعی ملک ہونے کی وجہ سے ان کی معیشت کا مدار ہی زراعت پر تھا۔

﴿القُمَّلَ﴾ سرسبز کھیتی کو ٹڈی دل نے تباہ کر دیا جو کچھ باقی بچا اسے گھن لگ گیا۔

بعض نے ''القُمَّلَ'' کا معنی جوں کیا ہے، خون چوسنے والے یہ گندے کیڑے مصریوں کے جسموں اور کپڑوں سے لپٹ گئے، جس سے ان کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔

﴿الضَّفَادِعَ﴾ مصر کی نہریں مینڈکوں سے لبالب بھر گئیں، نہروں سے نکل کر وہ گھروں، خوابگاہوں، برتنوں اور سامانِ خوردونوش میں پھیل گئے، ان کی اچھل کود سے کوئی جگہ بھی محفوظ نہ رہی اور مصریوں کا جینا حرام ہو گیا۔

﴿الدَّمَ﴾ کیا دریائے نیل اور کیا دوسرے دریا اور نہریں، سب کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا، مصری صاف شفاف پانی کو ترس گئے۔

حکمت وہدایت:

۱......بعض اوقات انسان پر آزمائش اس لیے آتی ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کرے اور نافرمانی سے باز آجائے۔(۱۳۰)

{۲۳۴} الاسراء/۱۷/۱۰۱

{۲۳۵} تفصیل کے لیے دیکھیے، سفرِ خروج باب ۷ سے باب ۱۲ تک۔

{۲۳۶} کل حادثة تحیط به الانسان۔(المفردات ۳۱۲)

{۲۳۷} سفر خروج باب ۹

{۲۳۸} تفسیر ابنِ کثیر ۲/۳۲۱

۲......اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو عالمِ اسباب بنایا ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے مطابق ان اسباب سے نتائج ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

۳...... نحوست اور بدفالی کا نظریہ زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہے۔ دورِ جاہلیت میں اگر کوئی شخص کوئی کام کرنا چاہتا تو گھونسلے میں بیٹھے ہوئے پرندے کو پتھر مار کر اڑا دیتا، اگر وہ پرندہ دائیں جانب اڑتا تو اسے اپنے لیے نیک فالی سمجھتے، ایسے پرندے کو وہ ''سانح'' کہتے تھے اور اگر وہ بائیں جانب اڑتا تو اسے منحوس سمجھتے، اس پرندے کو ''بارح'' کا نام دیتے تھے۔ اسلام نے آکر ان جاہلانہ نظریات کی نفی کردی اور انہیں شرک قرار دیا۔

۴......کفر، معاصی اور بداخلاقی کا ایک بڑا سبب جہالت بھی ہے......اس لیے نحوست کا دعویٰ کرنے والوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ ''ان میں سے اکثر نہیں جانتے'' (۱۳۱)

۵......جن کے مقدّر میں ایمان نہ ہو اور وہ ضد اور عناد پر اُڑ جائیں، انہیں بڑے سے بڑا معجزہ بھی متاثر نہیں کرسکتا۔ (۱۳۲)

بدعہدی اور ہلاکت

﴿۱۳۴......۱۳۶﴾

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ

اور جب پڑتا ان پر کوئی عذاب تو کہتے اے موسیٰ! دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے جیسا کہ اس نے بتلا رکھا ہے تجھ کو، اگر تو نے

عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ

دور کردیا ہم سے یہ عذاب تو بیشک ہم ایمان لے آئیں گے تجھ پر اور جانے دیں گے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ پھر جب ہم نے اٹھالیا

الرِّجْزَ إِلَىٰٓ أَجَلٍ هُمْ بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنٰهُمْ فِي

ان سے عذاب ایک مدت تک کہ ان کو اس مدت تک پہنچنا تھا، اسی وقت عہد توڑ ڈالتے۔ پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے سو ڈبو دیا ہم نے ان کو

الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غٰفِلِينَ ﴿۱۳۶﴾

دریا میں اس وجہ سے کہ انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان سے تغافل کرتے تھے۔

تسہیل: اور جب ان پر کوئی عذاب آپڑتا تو کہتے اے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے ربّ سے دعا کر دیجیے جس کا اس نے آپ سے وعدہ کر رکھا ہے، اگر آپ ہم سے اس عذاب کو ہٹا دیں تو ہم آپ کے کہنے سے ضرور ایمان لے آئیں گے

اور بنی اسرائیل کو آزاد کر کے آپ کے ساتھ بھیج دیں گے ○ پھر جب ہم ان سے اس عذاب کو ایک خاص وقت تک کہ جس تک اسے پہنچنا تھا ہٹا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے ○ پھر ہم نے انہیں یوں سزا دی کہ انہیں دریا میں غرق کر دیا اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل غفلت میں پڑے ہوئے تھے ○

تفسیر

{۱۳۴}...... اور جب بھی مذکورہ عذابوں میں سے کوئی عذاب فرعونیوں پر آتا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے نبوت و رسالت اور عزت و محبت کے اس عہد {۲۳۹} کی بناء پر دعا کریں جو اس نے آپ کو عطا کر رکھا ہے کہ وہ ہمیں اس مصیبت اور پریشانی سے نجات دیدے جس میں ہم مبتلا ہیں، اگر ایسا ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی آزاد کر دیں گے، یہی مضمون الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ توریت کی متعدد آیات میں بھی آیا ہے، سفرِ خروج میں ہے:

”تب فرعون نے موسیٰ اور ھارون کو بلوایا اور انہیں کہا کہ اس دفعہ میں نے گناہ کیا ہے، خداوند عادل ہے، میں اور میری قوم گنہگار ہیں، خداوند سے شفاعت کرو (کہ بس) آگے کو اس طرح نہ گرجے اور اولے نہ گریں، تب میں تمہیں جانے دوں گا اور تم اس سے آگے یہاں نہیں رہنے کے“ {۲۴۰}

{۱۳۵}...... جب ان سے ایک مخصوص مدّت کے لیے عذاب ہٹایا جاتا تو وہ دوبارہ عہد شکنی کرنے لگتے، ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ طوفان، ٹڈی دل، مینڈک اور خون وغیرہ کا عذاب ہفتہ بھر ان پر مسلط رہا، پھر ان کی التجاؤں، آہ و زاری اور وعدوں کے بعد ان سے اٹھا لیا گیا، جب وہ بدعہدی کرتے تو دوسرا عذاب انہیں آ لیتا {۲۴۱} دوسری روایت میں ہفتہ کے بجائے مہینے بھر کا ذکر ہے۔ فرعونیوں کی عہد شکنی اور سرکشی کا مضمون توریت میں بھی بار بار آیا ہے مثلاً:

”جب فرعون نے دیکھا کہ مہلت ملی تو اُس نے اپنا دل سخت کیا اور جیسا خداوند نے کہا تھا اُن کی نہ سُنی“ {۲۴۲}

{۲۳۹} ای بعهده سبحانه عندك وهو النبوّة......او حال من الضمير فيه يعني ادع الله تعالىٰ متوسلا بما عهدعندك۔ (روح المعانی ۵۴/۲)

{۲۴۰} خروج ۹: ۲۷-۲۸

{۲۴۱} التفسیر المنیر ۶۹/۹

{۲۴۲} خروج ۸-۱۰

جس مخصوص مدّت تک بنی اسرائیل کو مہلت دینے کا ذکر ہے اس سے مراد وہ مدّت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں غرق کرنے کے لیے متعین فرما رکھی تھی۔{۲۴۳}

﴿۱۳۶﴾...... بالآخر وہ مخصوص گھڑی آ پہنچی جو انہیں ہلاک کرنے کے لیے طے ہو چکی تھی چنانچہ تکذیب اور غفلت کے جرم کی پاداش میں انہیں دریا میں غرق کر دیا گیا۔

﴿فَانْتَقَمْنَا﴾ یہاں اگرچہ انتقام کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر لغت میں یہ لفظ ہمیشہ بدلہ لینے کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ سزا اور نعمت سلب کر لینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔{۲۴۴} اور یہاں یہی معنی اختیار کیا گیا ہے۔

حکمت وہدایت:

۱...... انسان کا ضعف آسمانی مصیبت اور پریشانی کے وقت ظاہر ہوتا ہے، اس کی اکڑ خوں نکل جاتی ہے اور وہ اللہ کے سامنے گڑگڑانے لگتا ہے مگر جونہی اسے پریشانی سے نجات ملتی ہے وہ دوبارہ شرک اور معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔(۱۳۴-۱۳۵)

۲...... دنیا اور آخرت میں عذاب کے نمایاں اسباب دو ہیں: تکذیب اور غفلت، تکذیب کا مفہوم یہ ہے کہ نہ تو اللہ کی آیات پر ایمان لائے اور نہ ہی ان کے تقاضوں پر عمل کرے، اور غفلت کا مفہوم ہے قصداً اعراض کرنا، یعنی وہ اللہ کی آیات کو اس لائق ہی نہیں سمجھتے کہ ان میں تدبّر کیا جائے اور ان سے فائدہ حاصل کیا جائے۔(۱۳۶)

۳...... دنیا کی بعض مصیبتیں اور ابتلائیں گناہوں کی وجہ سے بھی انسان پر آتی ہیں۔(۱۳۶)

اللہ کے انعامات اور بنی اسرائیل کا انکار

﴿۱۳۷......۱۴۱﴾

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا

اور وارث کر دیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کے مشرق اور مغرب کا کہ جس میں برکت رکھی ہے ہم

{۲۴۳} يعنى اجلهم الذى ضرب لهم فى التغريق-(قرطبى ۷/ ۲۴۱)

{۲۴۴} والنقمة العقوبة (المفردات/۵۰۴) الانتقام فى اللغة سلب النعمة بالعذاب (تفسیر کبیر جلد ۵/صفحہ ۳۴۸)

فِيهَا ۚ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ

نے۔اور پورا ہو گیا نیکی کا وعدہ تیرے رب کا بنی اسرائیل پر بسبب ان کے صبر کرنے کے اور خراب کر دیا ہم نے جو کچھ

يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ﴿١٣٧﴾ وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ

بنایا تھا فرعون اور اس کی قوم نے اور جو اونچا کر کے چھایا تھا۔اور پار اتار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے،تو پہنچے ایک قوم

فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ

پر جو پوجنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کے، کہنے لگے اے موسیٰ! بنا دے ہماری عبادت کیلئے بھی ایک بت جیسے ان کے

آلِهَةٌ ۚ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿١٣٨﴾ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا

بت ہیں کہا تم لوگ تو جہل کرتے ہو۔یہ لوگ،تباہ ہونے والی ہے وہ چیز جس میں وہ لگے ہوئے ہیں اور غلط ہے جو وہ

يَعْمَلُونَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِيكُمْ إِلَٰهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَإِذْ أَنجَيْنَاكُم

کر رہے ہیں۔کہا کیا اللہ کے سوا ڈھونڈوں تمہارے واسطے کوئی اور معبود حالانکہ اس نے تم کو بڑائی دی تمام جہان پر۔اور وہ

مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۖ يُقَتِّلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ

وقت یاد کرو جب نجات دی ہم نے تم کو فرعون والوں سے کہ دیتے تھے تم کو برا عذاب کہ مار ڈالتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور

نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿١٤١﴾

جیتا رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں احسان ہے تمہارے رب کا بڑا۔

تسہیل: اور جن لوگوں کو کمزور سمجھ لیا گیا تھا ہم نے انہیں اس سرزمین کے مشرق اور مغرب کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے ظاہری اور باطنی برکتیں رکھی تھیں، اور آپ کے ربّ کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو کر رہا اور فرعون اور اس کی قوم کے بنائے گئے سارے منصوبوں اور کھڑی کی گئی عمارتوں کو ہم نے ملیامیٹ کر کے رکھ دیا ○ اور ہم نے بنی اسرائیل کو بحفاظت دریا سے پار اتار دیا، وہاں ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کی عبادت میں مصروف تھی، انہیں دیکھ کر یہ کہنے لگے ہمارے لیے بھی کوئی ایسا ہی معبود مقرر کر دیجیے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے فرمایا کہ واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے ○ یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں یہ تباہ ہو کر رہے گا اور ان کا یہ کام بالکل بے بنیاد ہے ○ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو تمہارا معبود تجویز کر دوں حالانکہ اس نے تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت دے رکھی ہے؟ ○ اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں کے ظلم وستم سے نجات دلائی تھی جنہوں نے تمہیں سخت عذاب میں ڈال رکھا تھا وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سخت آزمائش تھی ○

﴿۱۳۷﴾......بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر آئے تھے، یہاں ان کی نسل میں خوب اضافہ ہوا، حضرت یوسف علیہ السلام سے زرخیز زمینیں الاٹ کروائیں، وہ خاصی عزّت اور خوشحالی کی زندگی گزار رہے تھے پھر اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ذلت اور غلامی کا طوق انہوں نے اپنے گلے میں ڈال لیا، صدیوں کی غلامی نے انہیں نہ صرف عملی طور پر ناکارہ کردیا بلکہ وہ دماغی اور اخلاقی طور پر تباہ ہوکر رہ گئے تھے، جناب کلیم اللہ کی محنت سے وہ ایمان کے جھنڈے تلے جمع ہوئے، آپ انہیں مصر سے نکال کر لے گئے، بالآخر انہی لوگوں کو مبارک سرزمین کا مالک بنادیا گیا جنہیں کمزور، ناکارہ اور بے عمل سمجھا جاتا تھا۔

مبارک سرزمین

''مبارک سرزمین'' سے عام مفسرین نے شام اور فلسطین کی سرزمین مراد لی ہے{۲۴۵} اس لیے کہ متعدد دوسری آیات میں بھی اسے ''مبارک'' قرار دیا گیا ہے:

سورۂ انبیاء میں ہے:

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ{۲۴۶}

''اور ہم نے ابراہیم اور لوط کو اس زمین کی طرف نجات دی جسے ہم نے جہانوں کے لیے بابرکت بنایا ہے''

سورۂ اسراء میں ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ{۲۴۷}

''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے اردگرد ہم نے برکت رکھی ہے''

دوسرا قول ''مبارک سرزمین'' کے بارے میں یہ ہے کہ اس سے ملکِ مصر مراد ہے۔{۲۴۸}

اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مصر اور فلسطین دونوں مراد ہیں، جن حضرات نے دوسرا اور تیسرا قول اختیار کیا ہے ان کا استدلال درجِ ذیل آیت سے ہے۔

سورۂ شعراء میں ہے:

{۲۴۵} تفسیر ابنِ کثیر ۲/ ۳۲۴، روح المعانی ۶/ ۵۷

{۲۴۶} الانبیاء/ ۲۱/ ۷۱

{۲۴۷} الاسراء/ ۱۷/ ۱

{۲۴۸} والارض ھی الشام ومصر ومشارقھا مغاربھا جھات الشرق والغرب بھا۔(قرطبی ۷/ ۲۴۱)

فَأَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ۖ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ {۲۴۹}

''ہم نے فرعونیوں کو باغات، چشموں، خزانوں اور اچھے اچھے مقامات سے نکال باہر کیا، اسی طرح ہوا، اور ہم نے ان تمام چیزوں کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا''

اسی طرح سورۂ دخان میں ہے:

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۖ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ {۲۵۰}

''کتنے ہی باغات، چشمے، کھیتیاں اور عمدہ عمدہ مقامات تھے جو وہ چھوڑ کر چلے گئے اور ہم نے ان سب کا وارث دوسری قوم کو بنا دیا''

ان تینوں اقوال میں پہلا قول زیادہ راجح ہے، جہاں تک سورۂ شعراء اور سورۂ دخان کا تعلق ہے تو فرعونیوں کو شام اور فلسطین سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے ان کا غلبہ ختم کر دیا گیا کیونکہ دوسرے استعماری حکمرانوں کی طرح مصر کے فرعون گرد و پیش کے ممالک کو بھی اپنے ماتحت رکھتے تھے تاکہ کوئی بھی ان کے مقابلے میں اٹھ نہ سکے۔

ویسے تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ قومِ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کا ایک گروہ واپس آ کر مصر پر قابض ہو گیا تھا۔{۲۵۱}

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ﴾ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دشمن کو ہلاک کرنے اور انہیں حکومت و خلافت دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ ان کے صبر و تقویٰ کی وجہ سے پورا ہو کر رہا۔

یہاں ایک سوال ذہن میں کھٹکتا ہے، وہ یہ کہ بنی اسرائیل کا حال تو یہ تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد بھی فرعون کے ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رہا تو وہ پکار اٹھے۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا {۲۵۲}

''انہوں نے کہا تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصائب کا شکار تھے اور تمہارے آنے کے بعد بھی ہمارا یہی حال رہا''

جب فرعون نے ان کا تعاقب کیا تو انہوں نے کہا:

{۲۴۹} الشعراء ۵۷-۵۹

{۲۵۰} دخان ۲۴/ ۲۸

{۲۵۱} المنار ۹/ ۸۴

{۲۵۲} الاعراف/ ۷/ ۱۲۹

﴿اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ﴾ ''اے موسیٰ ہم تو پکڑے گئے'' {۲۵۳}

وہ دریا سے پار اترے اور انہوں نے کسی قوم کو بُت پرستی میں مبتلا دیکھا تو فوراً درخواست کر دی:

قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ {۲۵۴} ''اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی معبود بنا دے جیسے ان کے معبود ہیں''

صحرائے سینا میں انہیں من اور سلوٰی کی صورت میں مشقت کے بغیر کھانا ملنے لگا تو انہوں نے شکوہ کیا:

لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ {۲۵۵} ''ہم ایک قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے''

انہیں ارضِ مقدسہ میں داخل ہونے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے منہ پھاڑ کر کہا:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ {۲۵۶} ''تم اور تمہارا رب جاؤ اور جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں''

ایک سوال

جس قوم کی بے صبری کا یہ عالم تھا اسے صابر ہونے کی سند کیسے دے دی گئی؟

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع نور اللہ مرقدہ نے اس سوال کا جواب یوں دیا ہے:

''اول تو ان کا صبر بمقابلہ فرعونی ایذاؤں کے اور ایمان پر ثابت قدم رہنا مسلسل ثابت ہے اگر ایک دفعہ لفظِ شکایت نکل بھی گیا تو اس پر نظر نہیں کی گئی، دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ قول بطور شکایت نہ ہو بلکہ بطور اظہارِ رنج وغم کے ہو''

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا جواب اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب بنی اسرائیل مصر میں تھے، اور اس وقت انہوں نے واقعی بے مثال صبر کا مظاہرہ کیا، ان کے بچوں کو قتل کیا گیا اور خود انہیں سخت ایذائیں دی گئیں اس کے باوجود وہ ایمان پر قائم رہے اور انہوں نے اپنی تہذیب کو مصری تہذیب میں گم نہیں ہونے دیا۔

مصر سے نکلنے کے بعد جس قسم کی سرکشی اور نافرمانی کے اقوال ان کی طرف منسوب ہیں ممکن ہے وہ ان میں سے بعض نے کہے ہوں، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب انہوں نے فرعونی ایذاؤں کے مقابلے میں صبر کیا تو آزادی کی صورت انہیں اس کا صلہ بھی ملا اور جب انہوں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا تو کبھی رزق سے محرومی، کبھی وادیِ تیہ کی

{۲۵۳} الشعراء/۲۶/۶۱

{۲۵۴} الاعراف/۷/۱۳۸

{۲۵۵} البقرۃ/۲/۶۱

{۲۵۶} المائدہ/۵/۲۴

سرگردانی اور کبھی ذلّت کی صورت میں انہیں سزا بھی دی گئی۔

﴿وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ﴾ بنی اسرائیل پر ظلم وستم کے لیے فرعون اور اس کی قوم مختلف منصوبے بناتے اور بلڈنگیں کھڑی کرتے رہتے تھے، ان منصوبوں میں ان کی جادو پر مبنی شعبدہ بازی، سیاسی چالیں اور سیمنٹ اور گارے سے کھڑی کی گئی عمارتیں اور ٹاور سب شامل ہیں، اس ٹاور کا ذکر تو قرآن میں بھی ہے جو فرعون کے حکم سے ھامان نے بنایا تھا تاکہ اس پر چڑھ کر وہ بزعم خویش "موسیٰ کے معبود" کو دیکھ سکے۔{۲۵۷}

﴿۱۳۸﴾...... جب بنی اسرائیل نے بحرِ احمر کو عبور کرنے کے بعد جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھا تو انہوں نے وہاں ایک قوم کو بت پرستی میں مبتلا دیکھا، قرآن نے وضاحت نہیں کی کہ یہ کونسی قوم تھی کیونکہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، مفسرین نے اپنے طور پر تعیین کی کوشش کی ہے مگر ان کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کو بھی حتمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔{۲۵۸}

بُت پرست قوم کو دیکھتے ہی انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کردی کہ ہمیں بھی کوئی حسّی اور مادی معبود بنادیجیے جس کی ہم عبادت کرسکیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقیدۂ توحید پوری طرح ان کے دل میں نہیں اترا تھا اور ان کے خیال میں اللہ کی عبادت کے لیے کسی کو واسطہ بنانا توحید کے خلاف نہیں تھا حالانکہ ساری ہی شریعتوں میں اللہ تک پہنچنے کے لیے کسی بت وغیرہ کو وسیلہ بنانا کفر رہا ہے خواہ اسے مستقل معبود سمجھا جائے یا معبودِ حقیقی کے تقرّب کا ذریعہ سمجھا جائے۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ خود نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بھی پیش آیا تھا، جس کی تفصیل حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے، وہ بتاتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حنین کی طرف نکلے، ہمارا گزر بیری کے درخت کے پاس سے ہوا، جس سے برکت حاصل کرنے کے لیے کفار اپنا اسلحہ اس کے ساتھ لٹکایا کرتے تھے اور تعظیماً اس کے اردگرد بیٹھے رہا کرتے تھے اور اسے وہ "ذاتِ انواط" کہا کرتے تھے، میں نے عرض کیا یارسول اللہ! جیسے کفار کا "ذاتِ انواط" ہے ہمارے لیے بھی کوئی ذاتِ انواط مقرر فرمادیجیے، آپ نے فرمایا: اللہ اکبر! کیا تم وہی بات کہنا چاہتے ہو جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ "ہمارے لیے بھی کوئی معبود متعین کردیجیے جیسے ان کے معبود

{۲۵۷} تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ غافر ۳۶-۳۷

{۲۵۸} قال قتادہ: کان اولئك القوم من لخم وكانوا نزولا بالرقة وقيل كانت اصنامهم تماثيل بقرولهذا اخرج لهم السامری عجلا۔(قرطبی ۲۴۲/۷)

ہیں'' تم اپنے سے پہلے لوگوں کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتے ہو؟{۲۵۹}

﴿قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں جاہلِ مطلق قرار دیا کیونکہ اللہ کے نبی کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارنے اور قدم قدم پر اللہ کی غیبی نصرت کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود یہ موٹی سی حقیقت بھی ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ معبود سازی نبی کے اختیار میں نہیں ہے اور ربّ کی عبادت میں کسی کو بھی واسطہ بنانا عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔

﴿۱۳۹﴾......آپ نے انہیں سمجھایا کہ ان بت پرستوں کا انجام ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں اور ان کا یہ عمل بھی سراسر باطل ہے۔

﴿۱۴۰﴾......حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ ''کیا تم اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود تلاش کرتے ہو؟'' بلکہ یہ فرمایا کہ ''کیا میں تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود تلاش کروں؟'' {۲۶۰}

اوّل تو اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود بنانا ہی جہالت ہے خواہ یہ بنانے والا عالم ہو یا جاہل، پھر معبود تلاش کرنے اور بنانے کی درخواست کی جارہی ہے اللہ کے نبی سے جس کے دنیا میں آنے کا مقصد ہی باطل معبودوں سے ہٹا کر معبودِ حقیقی سے بندوں کے تعلق کو مضبوط کرنا ہوتا ہے اور تیسری بات یہ کہ یہ درخواست وہ لوگ کر رہے ہیں جنہیں عقیدۂ توحید اور سلسلۂ نبوت و رسالت کے ذریعے اپنے زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے اور جو قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت کے مناظر اور انعامات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

﴿۱۴۱﴾......اس کے انعامات میں سے بہت بڑا انعام یہ تھا کہ انہیں فرعون کے انسانیت سوز مظالم سے نجات دی گئی......کم از کم اس قوم کو اللہ کا شکر ادا کرنے اور عقیدۂ توحید میں پختگی دکھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے جسے مصیبت کے بعد راحت اور سخت آزمائش کے بعد نعمت عطا کی گئی ہو۔

حکمت وہدایت:

۱......مشکلات میں صبر سے اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔(۱۳۷)

۲......وہ لوگ جو بتوں، قبروں، درگاہوں اور غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں ان کی جہالت میں کوئی شک نہیں اگر چہ وہ آسمانی مذہب کے پیروکار ہی کیوں نہ ہوں۔(۱۳۸)

۳......اہلِ باطل کے ساتھ دنیوی عادات میں بھی مشابہت اختیار کرنا مذموم ہے چہ جائیکہ عبادت کے طور طریقوں میں

{۲۵۹} مسند احمد/۵/۲۱۵

{۲۶۰} والمعنى أغير المستحق للعبادة أطلب لكم معبودا۔(روح المعانی ۶/۶۳)

ان کی مشابہت کی جائے۔(۱۳۸)

۴......کسی کج فکری، گمراہی اور غلطی کی نشاندہی ایسے مؤثر انداز میں کرنی چاہیے کہ دل میں اس کی قباحت اتر جائے......

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے مطالبہ کے جواب میں چار باتیں فرمائیں:

1......اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کی تلاش جہالت ہے۔

2......معبودانِ باطلہ ہلاکت اور تباہی کا سبب بنتے ہیں۔

3......غیر اللہ کی پرستش کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے نہ آخرت میں۔

4......جس پر اللہ کے انعامات کی بارش ہو رہی ہو اس کا کسی دوسرے آستانے کو تلاش کرنا از حد باعثِ تعجب ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مناجات اور تورات کا نزول

﴿۱۴۲......۱۴۵﴾

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ

اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ان کو اور دس سے، پس پوری ہوگئی مدت تیرے رب کی چالیس راتیں

لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ

اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا خلیفہ رہ میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور مت چلنا مفسدوں کی

سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ

راہ۔اور جب پہنچا موسیٰ ہمارے وعدہ پر اور کلام کیا اس سے اس کے رب نے، بولا اے میرے رب! تو مجھ کو دکھا کہ میں تجھ

اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ

کو دیکھوں فرمایا تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھے گا لیکن تو دیکھتا رہ پہاڑ کی طرف، اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تو مجھ کو دیکھ لے گا پھر جب تجلی

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ

کی اس کے رب نے پہاڑ کی طرف کردیا اس کو ڈھا کر برابر اور گر پڑا موسیٰ بے ہوش ہو کر، پھر جب ہوش میں آیا بولا تیری

تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ

ذات پاک ہے میں نے توبہ کی تیری طرف اور میں سب سے پہلے یقین لایا۔فرمایا اے موسیٰ! میں نے تجھ کو امتیاز دیا لوگوں

بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ

سے اپنے پیغام بھیجنے کا اور اپنے کلام کرنے کا سو لے جو میں نے تجھ کو دیا اور شاکر رہ۔ اور لکھ دی ہم نے اس کو تختیوں پر ہر قسم

مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا

کی نصیحت اور تفصیل ہر چیز کی سو پکڑ لے ان کو زور سے اور حکم کر اپنی قوم کو کہ پکڑے رہیں اس کی بہتر باتیں،

بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۱۴۵﴾

عنقریب میں تم کو دکھلاؤں گا گھر نافرمانوں کا۔

تسہیل: اور ہم نے موسیٰ سے وعدہ کیا کہ تیس راتوں کے اختتام پر اس سے کلام کریں گے، پھر ان میں دس راتوں کا اضافہ کر دیا، یوں تیرے ربّ کا طے شدہ وقت یعنی چالیس راتیں پوری ہو گئیں اور موسیٰ علیہ السلام نے طور کی طرف آتے ہوئے اپنے بھائی ھارون علیہ السلام سے کہا کہ تم میری قوم میں جانشین کے طور پر رہو، ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہنا اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کی روش سے بچ کر رہنا ○ اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کردہ وقت پر آ گئے اور انہیں اپنے ربّ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہو گیا تو انہوں نے درخواست کی کہ اے میرے ربّ! یہ سعادت عطا فرما دیجیے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ سکوں، اللہ نے فرمایا تم مجھے کسی صورت نہیں دیکھ سکتے لیکن تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم بھی دیکھ سکو گے پھر جب اس کے ربّ نے پہاڑ پر تجلّی فرمائی تو تجلّی نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے، جب وہ ہوش میں آئے تو بولے تو پاک ہے میں تجھ سے معذرت کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے اس پر ایمان لاتا ہوں ○ اللہ نے فرمایا اے موسیٰ! میں نے تجھے پیغمبری اور ہم کلامی کا شرف عطا کر کے دوسرے لوگوں سے ممتاز کیا ہے، لہٰذا میں نے تمہیں جو کچھ عطا کیا ہے اسے لے لو اور شکر گزار بن کر رہو ○ اور ہم نے تورات کی تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر ضروری چیز کی تفصیل لکھ دی ہے، پس خود بھی ان پر مضبوطی سے عمل کرو اور اپنی قوم کو بھی اس کے بہترین احکام پر عمل کرنے کی ترغیب دو میں عنقریب تمہیں نافرمانوں کا انجام دکھا دوں گا ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۴۲﴾...... حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت تو اسی وقت مل گئی تھی جب آپ مدین سے مصر واپس آ رہے تھے مگر تفصیلی احکام اس وقت عطا نہیں کیے گئے کیونکہ ایک ایسی قوم جو غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھی اس کے لیے ان پر عمل کرنا ممکن

نہیں تھا، اگر ہم اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تفصیلی ہدایات اس وقت تک نہیں دی گئیں جب تک انہیں مدینہ منورہ کی صورت میں ایک آزاد مرکز میسّر نہیں آ گیا، نماز جیسی اہم ترین عبادت بھی مسلمان مکّہ مکرمہ میں چھپ کر پڑھا کرتے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کا چلّہ

جب بنی اسرائیل مصری حکومت کی غلامی سے آزاد ہو گئے تو اب ایک پورا نظامِ شریعت دینے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر طلب کیا گیا، یہاں آپ کو ذیقعدہ کا پورا مہینہ روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، جب آپ تیس روزے رکھ چکے تو ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں بھی روزوں کا حکم دیا گیا۔{۲۶۱}

بعض روایات میں ہے کہ دس ذوالحجہ کو آپ کا ''چلّہ'' پورا ہوا اور اسی دن آپ کو ہم کلامی کا شرف عطا ہوا، حسنِ اتفاق سے یہی وہ دن تھا جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے نعمت دین مکمل کرتے ہوئے اعلان فرمایا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾{۲۶۲}

توریت میں بھی اس چلّے کا ذکر ملتا ہے، سفرِ خروج میں ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے فرمایا کہ پہاڑ پر چڑھ کر میرے پاس آ اور وہاں ٹھہر جب تک کہ میں تجھ کو پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام نہ دوں جو میں نے ان کی تعلیم کے لیے لکھے ہیں O تب موسیٰ اور اس کا خادم یوشع اٹھے اور موسیٰ خدا کے پہاڑ پر چڑھ گیا O اور اس نے بزرگوں سے کہا کہ تم ہمارے لیے یہاں بیٹھو جب تک کہ ہم تمہارے پاس واپس نہ آئیں اور دیکھو ھارون اور حور تمہارے ساتھ ہیں اگر کسی کا کچھ معاملہ ہو تو ان کے پاس لے جاؤ O اور جب موسیٰ پہاڑ پر چڑھا تو بادل نے پہاڑ کو چھپا لیا O اور خداوند کا جلال کوہِ سینا پر اترا اور بادل نے اس کو چھ دن چھپایا اور ساتویں دن اس نے بادل کے اندر سے موسیٰ کو بلایا O اور خداوند کے جلال کا نظارہ پہاڑ کی چوٹی پر بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے بھسم کرنے والی آگ کی مانند تھا O تب موسیٰ بادل کے اندر گیا اور پہاڑ پر چڑھا اور موسیٰ پہاڑ پر چالیس دن اور چالیس رات رہا O{۲۶۳}

{۲۶۱} روح المعانی ۶/۶۵

{۲۶۲} المائدہ/۵/۳

{۲۶۳} بائبل باب سفرِ خروج آیت ۱۲-۱۸

یہاں ایک سوال اٹھایا گیا وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے چالیس راتوں کے اعتکاف کا فیصلہ فرمالیا تھا تو شروع میں چالیس راتوں کے اعتکاف کا حکم کیوں نہ دے دیا گیا، پہلے تیس اور بعد میں دس کا اضافہ کر کے چالیس کرنے میں کیا حکمت تھی؟ اس سوال کے جواب میں مفسرین نے مختلف حکمتیں بیان کی ہیں مگر ظاہر ہے ان میں سے کسی کو بھی نص کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کے احکام میں جو بھی حکمتیں بیان کی جاتی ہیں انہیں احتمال ہی کا درجہ دیا جاسکتا ہے، ہم یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ بس یہی حکمت ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر تھی اس کے سوا کوئی دوسری حکمت نہیں تھی، یہ بھی ممکن ہے کہ وہی حکمت ہو جو ہم نے بیان کی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی دوسری حکمت ہو جس کا علم اللہ نے ہمیں نہیں دیا، ادب کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم اپنی بات پر اصرار ہرگز نہ کریں۔

تفسیر روح البیان میں ہے کہ اس میں ایک حکمت تدریج اور آہستگی ہے کہ کوئی کام کسی کے ذمہ لگایا جائے تو اوّل ہی زیادہ مقدار کام کی اس پر نہ ڈالی جائے تاکہ وہ آسانی سے برداشت کرے پھر مزید کام دیا جائے۔

اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس طرز میں حکام اور اولوالامر کو اس کی تعلیم دینا ہے کہ اگر کسی کو کوئی کام ایک معین وقت میں پورا کرنے کا حکم دیا جائے اور اس معین میعاد میں وہ پورا نہ کر سکے تو اس کو مزید مہلت دی جائے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں پیش آیا کہ تیس راتیں پوری کرنے کے بعد جس کیفیت کا حاصل ہونا مطلوب تھا وہ پوری نہ ہوئی اس لیے مزید دس راتوں کا اضافہ کیا گیا۔{۲۶۴}

حضرت ھارون علیہ السلام کی جانشینی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طُور کی طرف روانہ ہوتے وقت اپنے بڑے بھائی حضرت ھارون علیہ السلام کو اپنی عدم موجودگی میں جانشین مقرر کیا اور انہیں قوم کے حالات پر نظر رکھنے اور ان کے دینی معاملات کی اصلاح کی تلقین فرمائی۔

حضرت ھارون علیہ السلام کو خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر نبوت عطا کی گئی تھی اور ان کا وزیر مقرر کیا گیا تھا، سورۂ طٰہٰ میں ہے انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی:

﴿وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝﴾ {۲۶۵}

"اور میرے گھر والوں میں سے میرا ایک معاون مقرر کر دے (یعنی) ہارون کو کہ میرے بھائی ہیں۔ میری قوت

{۲۶۴} مزید تفصیل کے لیے معارف القرآن جلد ۴ صفحہ ۵۷ کا مطالعہ کیا جائے۔

{۲۶۵} طٰہٰ/۲۰/۲۹-۳۳

کوان کے ذریعے مضبوط کردے۔اوران کو میرے (اس) کام میں شریک کردے‘‘

حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف نبی ہی نہیں تھے قوم کے رئیس بھی تھے اور اسی حیثیت سے انہوں نے حضرت ہارون کو اپنا جانشیں مقرر کیا تھا، یہ جانشینی اسی طرح کی تھی جیسے ہمارے آقا ﷺ جب کبھی چند روز کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو کبھی حضرت علی کرم اللہ وجھہ، کبھی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور کبھی کسی دوسرے صحابی کو اپنا جانشین مقرر فرمادیتے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے حضرت علی کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا تو انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جارہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

أما ترضى أن تكون منّى بمنزلة هارون من موسىٰ؟{۲۲۶}

’’کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میرے مقابلہ میں تمہاری وہی حیثیت ہو جو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ھارون علیہ السلام کی حیثیت تھی؟‘‘

اس حدیث سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے حقدار تھے اور دوسرے صحابہ نے ان سے یہ حق غصب کرلیا تھا۔

یہ بحث بہت طویل ہے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جاچکی ہیں ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے البتہ یہ امر بالکل واضح ہے کہ مذکورہ بالا روایت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر استدلال کرنا بالکل صحیح نہیں ہے کیونکہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ حضرت ھارون کا انتقال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا، علاوہ ازیں مختلف مواقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرے صحابہ کو بھی رسول کریم ﷺ نے اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔

﴿۱۴۳﴾...... جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ وقت پر طور پر پہنچ گئے اور انہیں ہم کلامی کا شرف حاصل ہوگیا تو ان کے دل میں رؤیتِ باری تعالیٰ کا شوق پیدا ہوگیا، انہوں نے درخواست کرڈالی کہ ہمکلامی کے ساتھ مجھے یہ فضیلت بھی عطا کردی جائے، جواب دیا گیا کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے تمہارے موجودہ حواس اس کی قوّتِ برداشت نہیں رکھتے اور معاملہ صرف تمہارے تک محدود نہیں اس کائنات کی کوئی مخلوق بھی نورِ ازل کی تجلّی کا تحمل نہیں کرسکتی۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ’’اللہ کا حجاب نور ہے اگر اس حجاب

{۲۲۶} بخاری/۲/صفحہ ۵۲۶، مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

کو ہٹا دیا جائے تو اس کے چہرے کے انوار وہاں تک اس کی مخلوق کو جلا ڈالیں جہاں تک اس کی نظر پہنچے'' (یعنی سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے)۔{۲۶۷}

﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ﴾ جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے، یوں انہیں سمجھا دیا گیا کہ جب قوت واستحکام کے باوجود طور اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکا تو آپ تجلی کو کیسے برداشت کر سکیں گے؟

﴿فَلَمَّآ اَفَاقَ﴾ جب ہوش میں آئے تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور عظمت بیان کرتے ہوئے رؤیت کا سوال کرنے سے توبہ کی۔{۲۶۸}

اور فرمایا کہ ''میں سب سے پہلے ایمان لاتا ہوں'' اس کا مطلب ہے کہ میں سب سے پہلے اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ آپ کی مخلوق میں سے کوئی بھی قیامت تک آپ کو دیکھ نہیں سکتا۔{۲۶۹}

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے توبہ کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا تھا اس لیے کہ توبہ کا لفظ مطلق رجوع کے معنی میں آتا ہے۔

اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اللہ کے جو مقرّب بندے ہوتے ہیں وہ ذرا سی غیر مناسب بات کو بھی بہت بڑا گناہ سمجھ کر توبہ استغفار میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

﴿۱۴۴﴾...... تنبیہ کے بعد تسکینِ قلب کے لیے فرمایا گیا کہ اے موسیٰ! ہم نے تمہیں نبوت ورسالت کے ساتھ ہم کلامی کا شرف بھی عطا کیا ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کیجیے۔

﴿۱۴۵﴾...... جو تختیاں انہیں عطا کی گئیں ان میں عقیدہ اور آداب کے اصول، حکمت وہدایت کی باتیں اور ضروری احکام ومسائل درج تھے، دینی معاملات سے تعلق رکھنے والی کوئی بھی اہم بات درج ہونے سے نہیں رہ گئی تھی۔ ''من کل شئ'' کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دنیا جہاں کی ساری چیزیں چاہے وہ متعلق ہوں یا غیر متعلق ان تختیوں میں آ گئی تھیں بلکہ وہ احکام ومسائل مراد ہیں جو دین سے تعلق رکھتے تھے۔{۲۷۰}

{۲۶۷} صحیح مسلم فی کتاب الایمان ۱/۹۹

{۲۶۸} من سوال رویۃ فی الدنیا۔(تفسیر کبیر ۵/۳۵۹)

{۲۶۹} تفسیر ابنِ کثیر ۲/۳۲۷

{۲۷۰} ای مما یحتاجون الیہ من امور دینھم۔(ابی سعود ۳/۲۷)

﴿فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ﴾ خود بھی عزیمت اور پختگی کے ساتھ اس پر عمل کریں اور اپنی قوم کو بھی اس کے اچھے احکام پر عمل کرنے کی دعوت دیں...... ظاہر ہے کہ کتابِ الٰہی کے سارے ہی احکام اچھے تھے {۲۷۱} یہ ایسے ہی ہے جیسے سورۂ زمر میں ہے:

وَاتَّبِعُوٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ {۲۷۲} ''اور ان اچھے احکام کی اتباع کرو جو تمہارے ربّ کی طرف سے تم پر نازل کیے گئے ہیں''

﴿سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ ''میں تمہیں عنقریب نافرمانوں کا انجام دکھادوں گا''

اس سے مراد قبطیوں اور فرعونیوں کے شہر، محلّے، مکانات اور کارخانے بھی لیے جاسکتے ہیں اور عاد وثمود جیسی تباہ شدہ اقوام کے کھنڈرات بھی مراد لیے جاسکتے ہیں جہاں سے بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے کے بعد گزرنا تھا۔{۲۷۳}

حکمت وہدایت:

۱......وعدے اور وقت کی پابندی کرنا ایسا عمل ہے جو شارع کو بہت محبوب اور اللہ کے نیک بندوں کی صفات میں سے ہے۔ (۱۴۲)

۲......اہلِ سنّت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی ازلی، قدیم اور ذاتی صفت ہے، جیسے خود باری تعالیٰ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے یونہی اس کی صفات بھی مخلوق کی صفات کی مشابہت سے پاک ہیں، اس کی ساری صفات خواہ وہ علم وحیات اور سمع وبصر ہوں یا قدرت اور کلام، اس کی اپنی شان کے مطابق ہیں انہیں انسانی صفات پر قیاس کرنا صحیح نہیں، نہ وہ اعضاء کا محتاج ہے نہ حرف اور آواز کا اور نہ ہی جہت اور زمان ومکاں کا۔

۳......اہم معاملات میں کسی بااعتماد انسان کو اپنا خلیفہ بنا دینا مستحب ہے۔ (۱۴۲)

۴......صوفیہ کے ہاں جو چلّہ مشہور ہے تو اس کے لیے وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں اور چلّے کی برکات تو ایسی ہیں کہ ہر کوئی ان کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔

۵......اس عالمِ ناسوت میں مادی آنکھوں سے باری تعالیٰ کو دیکھنا ناممکن ہے البتہ آخرت میں صلحاء کو اس کے دیدار کا

{۲۷۱} المعنی یاخذوا بحسنھا و کلھا حسن۔(روح المعانی ۸۸/۶)

{۲۷۲} الزمر ۵۵/۳۹

{۲۷۳} ابن کثیر ۲۲۸/۲

شرف عطا کیا جائے گا، سورۂ قیامہ میں ہے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ {۲۷۴}

''اس دن بہت سے چہرے بارونق ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے''

سورۂ یونس میں ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ {۲۷۵}

''جو لوگ نیکی کرتے رہے ان کے لیے تو بھلائی ہے اور اس کے علاوہ بھی''

اس آیت کریمہ میں ''زِيَادَةٌ'' سے رؤیتِ باری تعالیٰ مراد لی گئی ہے۔ {۲۷۶}

علاوہ ازیں متعدد صحیح احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ جنت کو اس عظیم نعمت سے نوازا جائے گا مثلاً ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''جب جنت والے جنت میں داخل ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے کیا تمہیں کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے؟ وہ کہیں گے کہ کیا آپ نے ہمارے چہرے روشن نہیں فرمائے؟ کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں فرمایا اور دوزخ سے نجات نہیں دی؟ پھر پردہ اٹھا دیا جائے گا اور انہیں شرفِ دیدار عطا فرمایا جائے گا وہ محسوس کریں گے کہ اب تک انہیں اس سے زیادہ محبوب نعمت عطا ہی نہیں کی گئی'' {۲۷۷}

متکبّرین کی محرومی

﴿۱۴۶......۱۴۷﴾

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ

میں پھیردوں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق اور اگر دیکھ لیں ساری نشانیاں،

اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ

ایمان نہ لائیں ان پر اور اگر دیکھیں رستہ ہدایت کا تو نہ ٹھہرائیں اس کو راہ اور اگر دیکھیں رستہ گمراہی کا

{۲۷۴} القیمۃ/۷۵/۲۲-۲۳

{۲۷۵} یونس/۱۰/۲۶

{۲۷۶} ان المراد منها رؤية الله سبحانه وتعالى (کبیر ۲۴۰/۶)

{۲۷۷} صحیح مسلم کتاب الایمان ۴۴۷ (اسی مضمون کی روایت صحیح بخاری کتاب التفسیر اور جامع ترمذی باب الجنۃ میں بھی مذکور ہے)

الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِينَ

تو اس کو ٹھہرالیں راہ ، یہ اس لئے کہ انہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور رہے ان سے بے خبر۔

كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا

اور جنہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو برباد ہوئیں ان کی محنتیں وہی بدلہ پائیں گے

كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۷﴾

جو کچھ عمل کرتے تھے۔

ربط: پہلے فرعون اور اس کی قوم کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ تکبّر کی وجہ سے تباہی سے دوچار ہوئے، یہاں بتایا جارہا ہے کہ ہر متکبر کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ تکبر کی وجہ سے ایمان سے محروم رہتا ہے اور اس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

تسہیل: میں ایسے لوگوں کو اپنی آیات کے استفادہ سے محروم ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا انہیں کوئی حق حاصل نہیں، ان کا یہ حال ہے کہ وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود ایمان نہیں لاتے اور اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اسے اختیار نہیں کرتے البتہ گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے اپنا طریقہ بنالیتے ہیں، یہ محرومی اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلایا اور وہ ان کی حقیقت سے غافل رہے O اور یہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں اور قیامت کی پیشی کو جھٹلایا ان کے سارے کام غارت ہوگئے، انہیں اس کی سزا دی جائے گی جو کچھ یہ کرتے رہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۴۶﴾......اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ وہ تکبر کرنے والوں کو اپنی آیات سے برگشتہ کردیتا ہے بسااوقات وہ حق کو پہچان لینے کے باوجود محض تکبر کی بناء پر اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا {۲۷۸} ''اور انہوں نے انکار کیا حالانکہ ان کے دل یقین کرچکے تھے، صرف ظلم اور تکبر کی بناء پر''

متکبر انسان سے حق کے استفادہ کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، وہ کتابی اور آفاقی ہر قسم کی آیات دیکھ لینے کے باوجود قبولِ ایمان کے لیے تیار نہیں ہوتا البتہ گمراہی اور سرکشی کی راہ پر چلنے کے لیے وہ ہروقت تیار رہتا ہے۔

﴿بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ سوال ہوتا ہے کہ تکبر تو ہوتا ہی ناحق ہے، اس کے ساتھ ''ناحق'' کی قید لگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

{۲۷۸} سورة نمل ۱۴/۲۸

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ حق کے مقابلے میں انہوں نے تکبر کا جو رویہ اختیار کر رکھا تھا وہ خود ان کے اپنے معیار کے اعتبار سے بھی قطعاً ناجائز اور بے محل تھا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ''بِغَيْرِ الْحَقِّ'' کا اضافہ ان کے تکبر کی قباحت بیان کرنے اور تاکید کے لیے کیا گیا ہے{۲۷۹} کیونکہ اگر وہ کسی متکبر کے مقابلے میں تکبر کرتے تو اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی مگر وہ تو تکبر کرتے تھے انبیاء کرام علیہم السلام کے مقابلے میں جو کہ سراپا تواضع اور انسانوں کے خیر خواہ ہوتے ہیں، ویسے بھی تکبّر کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، حدیث قدسی میں ہے:

الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی واحدا منهما قذفته فی النّار{۲۸۰}

''تکبر میری چادر اور عظمت میری خصوصیت ہے، جو کوئی انہیں مجھ سے لینے کی کوشش کرے گا میں اسے دوزخ میں ڈال دوں گا''

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ ایمان سے یہ محرومی اس لیے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرۃً کفر پر پیدا کیا ہے اور نہ ہی انہیں کفر و شرک پر مجبور کیا گیا بلکہ انہوں نے جان بوجھ کر سچائی کا راستہ چھوڑ کر اپنی خواہشات اور شھوات کی اتباع کی، انہیں دل و دماغ، کان اور آنکھیں غرضیکہ علم و ہدایت کے سارے ذرائع عطا کیے گئے تھے مگر انہوں نے استعمال ہی نہ کیے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ {۲۸۱}

''اور ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جنات اور انسان پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں مگر یہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں یہی لوگ تو غافل ہیں''

{۲۷۹} زیادة تشنیع التکبر بذکر ماھو صفة لازمة له (التحریر والتنویر ۱۰۵/۹) (وقیل المراد انّهم یتکبّرون علی من لایتکبّر کالانبیاء علیهم السلام لانه الذی یکون بغیر حق واما التکبّر علی المتکبر فهو بحق۔ (روح المعانی ۹۱/۶)

{۲۸۰} مسلم/ ۲۶۲۰/ ابن ماجه/ ۴۱۷۴

{۲۸۱} الاعراف/۷/۱۷۹

حکمت وہدایت:

۱......تکبر ایسا غلیظ ترین عامل ہے جو آیاتِ الٰہیہ سے استفادہ سے محروم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔(۱۴۶)

۲......اللہ کی آیات کو جھٹلانا اور ان سے غفلت اختیار کرنا ہر شر اور گمراہی، ظلم اور فساد کا سبب ہے۔(۱۴۶)

۳......قبولیتِ اعمال کے لیے ایمان بنیادی شرط ہے۔

بچھڑے کو معبود بنانے کا قصہ

﴿۱۴۸......۱۵۱﴾

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا

اور بنالیا موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیور سے بچھڑا، ایک بدن کہ اس میں گائے کی آواز تھی کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا

يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ

کہ وہ ان سے بات بھی نہیں کرتا اور نہیں بتلاتا رستہ معبود بنالیا اس کو اور وہ تھے ظالم۔اور جب پچھتائے اور سمجھے کہ ہم بیشک

وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ

گمراہ ہوگئے تو کہنے لگے اگر نہ رحم کرے ہم پر ہمارا رب اور نہ بخشے ہم کو تو بیشک ہم تباہ ہونگے۔اور جب لوٹ آیا موسیٰ اپنی

الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ

قوم میں غصہ میں بھرا ہوا افسوس ناک، بولا کیا بری نیابت کی تم نے میری میرے بعد، کیوں جلدی کی تم نے اپنے رب کے

مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ

حکم سے؟ اور ڈال دیں وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا لگا کھینچنے اس کو اپنی طرف، وہ بولا اے میری ماں کے جنے لوگوں

اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۫ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ

نے مجھ کو کمزور سمجھا اور قریب تھے کہ مجھ کو مار ڈالیں سو مت ہنسا مجھ پر دشمنوں کو اور نہ ملا مجھ کو گنہگار لوگوں میں۔بولا اے

مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

میرے رب! معاف کر مجھ کو اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

ربط: گزشتہ سے پیوستہ آیات میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان ہو رہا تھا یہ آیات اس کا تتمہ ہیں۔

تسہیل: موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد ان کی قوم نے اپنے زیورات سے ایک بچھڑے کا پتلا بنالیا جس سے بیل کی آواز نکلتی تھی کیا؛ انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ نہ تو ان سے کوئی بات کرتا ہے اور نہ ہی انہیں راستہ دکھا سکتا ہے، اس کے باوجود انہوں نے اسے معبود کا درجہ دے دیا اور وہ تھے ہی بڑے بے ڈھنگے لوگ O جب وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوئے اور انہیں گمراہی میں مبتلا ہو جانے کا احساس ہوا تو کہنے لگے اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں معاف نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے O اور جب موسیٰ علیہ السلام غصّے اور رنج سے بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو ان سے فرمایا تم نے میرے بعد بہت بری حرکت کی ہے، تمہیں کیا جلدی تھی کہ تم نے اپنے رب کے حکم کا بھی انتظار نہ کیا اور جلدی سے توریت کی تختیاں ایک طرف رکھ کر اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے، ہارون علیہ السلام نے کہا اے میری ماں کے بیٹے! ان لوگوں نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالتے لہٰذا تم دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دو اور مجھے ان ظالم لوگوں میں شمار نہ کرو O موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی اے میرے ربّ! مجھے اور میرے بھائی کو معاف فرما دیجیے اور ہمیں اپنی خصوصی رحمت میں داخل فرما لیجیے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں O

تفسیر

﴿۱۴۸﴾...... بچھڑے کو معبود بنانے کا قصہ جو کہ یہاں اجمالاً مذکور ہے، سورۂ طٰہٰ میں قدرے تفصیل کے ساتھ آیا ہے، مختلف آیات اور روایات کو ملانے سے جو قصہ سامنے آتا ہے وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے تیس روز میں واپسی کا وعدہ کر کے طور پر تشریف لے گئے وہاں جا کر یہ مدت تیس کی بجائے چالیس دن ہو گئی اس تاخیر سے سامری نے فائدہ اٹھایا جو بظاہر مسلمان تھا مگر اس کے دل میں کفر و شرک کی نجاست بھری ہوئی تھی، اس نے بنی اسرائیل سے سونے کے زیورات لے کر انہیں بھٹی میں ڈال کر گلا دیا اور اس سے گائے کے بچے کا بے جان جسم تیار کر دیا، اس کی بناوٹ میں اس نے ایسی مہارت کا ثبوت دیا کہ اس سے "بھائیں بھائیں" کی آواز نکلتی تھی، بنی اسرائیل کے لیے اس گوسالہ کی حیثیت عجوبے سے کم نہ تھی، سالہا سال تک مصریوں کی صحبت سے گوسالہ کی محبت ویسے بھی ان کے خون میں رچ بس چکی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ سامری جیسے چرب زبان اور منافق انسان کی باتوں میں آ کر انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔

بعض مفسرین نے یہاں پر یہ بحث بھی چھیڑی ہے کہ اس بچھڑے میں حرکت بھی تھی یا نہیں، نفی اور اثبات دونوں

قسم کے اقوال ہیں بہت مناسب بات کہی ہے اس مقام پر علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے، وہ فرماتے ہیں: ﴿ولیست هذه المسألة من المهمات﴾ ''یہ بحث اہم مسائل میں سے نہیں ہے'' {۲۸۲}

﴿مِنْ حُلِیِّهِمْ﴾ بنی اسرائیل نے مصر سے نکلنے سے پہلے مصریوں سے زیورات مستعار لے لیے تھے، {۲۸۳} توریت میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔

''اور انہوں نے مصریوں سے روپیہ کے جوشن اور سونے کے برتن اور کپڑے عاریت لئے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ انہوں نے انہیں عاریت دی'' {۲۸۴}

مصریوں کی ہلاکت کے بعد یہ زیورات اسرائیلیوں کے پاس رہ گئے اور انہی کی ملکیت بن گئے یہی وہ زیورات تھے جو بچھڑا بنانے کے کام آئے۔

﴿اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ﴾ {۲۸۵} معبودِ حقیقی کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے بعض بندوں سے بلاواسطہ کلام کرتا ہے جیسے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور بعض بندوں سے بالواسطہ کلام کرتا ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے منتخب انبیاء پر وحی نازل کرتا ہے جس میں تمام انسانوں کے لیے بنیادی تعلیمات ہوتی ہیں علاوہ ازیں وہ قدم قدم پر ہدایت اور رہنمائی کرتا ہے اس کی ہدایت ہی سے نفوس کا تزکیہ ہوتا ہے اور دینی اور دنیوی مصلحتیں حاصل ہوتی ہیں۔

﴿اِتَّخَذُوْهُ﴾ گوسالے کو معبود بنانا کسی عقلی یا نقلی دلیل پر مبنی نہیں تھا بلکہ محض مصریوں کی اندھی تقلید اور بت پرستوں کی نقالی میں انہوں نے یہ بے ڈھنگا قدم اٹھایا تھا۔

﴿۱۴۹﴾...... سامری کی چرب زبانی اور بت پرستوں کی صحبت کے اثرات کی وجہ سے اسرائیلی گوسالہ پرستی جیسے عظیم جرم کا ارتکاب تو کر بیٹھے مگر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ سے انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے توبہ کی اور اپنے فعل پر ندامت کا اظہار کیا...... بظاہر سلسلہ وار مضمون کا تقاضا یہ تھا کہ آیت ۱۴۹ کو آیت ۱۵۰ کے بعد رکھا جاتا لیکن قرآن کریم بعض اوقات واقعات کی تاریخی ترتیب کو توڑ کر مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کر دیتا ہے

{۲۸۲} روح المعانی ۹۴/۶

{۲۸۳} ابی سعود ۳۱/۳

{۲۸۴} خروج ۱۲-۳۵-۳۶

{۲۸۵} بین ان المعبود یجب أن یتّصف بالکلام۔ (قرطبی ۲۵۲/۷)

تا کہ اس کا مطالعہ واقعات سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہ کیا جائے بلکہ نتائج اور عبرتوں پر نظر رکھی جائے بعض مفسرین نے اس تقدیم وتاخیر میں کچھ اور حکمتیں بھی لکھی ہیں۔{۲۸۶}

﴿۱۵۰﴾......اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر ہی قوم کی گمراہی کی اطلاع دے دی تھی سورۂ طٰہٰ میں ہے:

﴿قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ﴾{۲۸۷}

آپ واپس آئے تو شدید رنج اور غصہ کی حالت میں تھے......رنج اور غصہ طبعی اور بشری جذبات میں سے ہیں اور اللہ کے نبی ان جذبات سے ماوراء نہیں ہوتے ویسے بھی آپ کا یہ غصہ محض اللہ کے لیے تھا، آپ نے فرمایا تم لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنا کر بہت بری جانشینی کی ہے جبکہ میں توحید کی اہمیت تم پر واضح کر چکا تھا اور تمہیں شرک اور بت پرستی کے انجامِ بد سے ڈرا چکا تھا۔

﴿اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّكُمۡ﴾ تم نے جلد بازی سے کام لیا اور تورات کے آنے کا بھی انتظار نہ کیا، تم میں سے بعض نے سامری کی اس افواہ پر یقین کر لیا کہ موسیٰ اب واپس آنے کے نہیں وہ انتقال کر چکے ہیں۔{۲۸۸}

﴿وَاَلۡقَى الۡاَلۡوَاحَ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت پر ویسے بھی جلال غالب تھا اور یہاں تو معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ غصے کا آنا ایمانی حمیت کا تقاضا تھا، آپ کے مقابلے میں حضرت ھارون علیہ السلام کی طبیعت میں نرمی تھی، آپ نے محسوس کیا کہ قوم کو گوسالہ پرستی سے روکنے میں ھارون نے وہ کچھ نہیں کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا اس لیے آپ نے اتنی تیزی سے تورات کی تختیاں ایک طرف رکھیں{۲۸۹} کہ دیکھنے والے سمجھے، رکھی نہیں بلکہ پھینکی ہیں جبکہ اللہ کے نبی سے کتاب اللہ کی اس بے ادبی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ''پھینکنے'' اور ''توڑنے'' کے الفاظ توریت میں ہیں قرآن میں نہیں ہیں۔

''اور یوں ہوا کہ جب وہ لشکر گاہ کے پاس آیا اور بچھڑا اور ناچ راگ دیکھا تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے تختے اپنے ہاتھ سے پھینک دیئے اور پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالے''{۲۹۰}

{۲۸۶} نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور ۱۱۴/۳

{۲۸۷} طٰہٰ ۸۵/۲۰

{۲۸۸} کشاف ۵۷۸/۱

{۲۸۹} ای وضعھا علی الارض کالطارح لھا۔(روح المعانی ۹۸/۶)

{۲۹۰} خروج ۱۹/۳۲

گوسالہ پرستی دیکھنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جس غم اور غصے سے دوچار ہوئے اس کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿یرحم الله موسیٰ، لیس المعاین کالخبر، أخبره ربّه عزّوجلّ أنّ قومه فتنوا بعده، فلم یلق الالواح، فلمار آهم وعاینهم ألقی الألواح﴾{۲۹۱}

''اللہ موسیٰ پر رحم کرے، مشاہدہ اور خبر برابر نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ نے قوم کی گمراہی کی خبر تو انہیں طور پر ہی دے دی تھی مگر وہاں انہوں نے تختیاں ہاتھ سے نہ رکھیں، مگر جب انہیں اپنی آنکھوں سے شرک میں مبتلا دیکھا تو برداشت نہ کر سکے اور توریت کی تختیاں رکھ دیں''

توریت کی تختیاں ہاتھ سے رکھنے کے بعد اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے غضبناک لہجے میں سوال کیا:

﴿يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ﴾{۲۹۲}

بھائی کی داڑھی اور سر پر ہاتھ کا رکھنا توہین و تذلیل کے لیے نہیں تھا بلکہ اہلِ عرب کی عادت کے موافق اکرام اور تعظیم کے طور پر تھا۔ لیکن حضرت ہارون نے ایسا کرنے سے منع کیا تاکہ بنی اسرائیل اسے اہانت پر محمول نہ کر لیں۔ اگر ہم اسے اظہارِ غضب کا حصہ سمجھیں تو بھی یہ منصبِ نبوت کے خلاف نہیں اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں شرک جیسے سنگین جرم کے ارتکاب کی صورت میں یا تو حضرت ہارون کو بزورِ بازو روکنا چاہیے تھا اور یا پھر ان کے پیچھے پیچھے کوہِ طور پر چلے آنا چاہیے تھا۔

﴿قَالَ ابْنَ اُمَّ﴾ حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے تئیں بہتری کی کوشش کی لیکن میرے وعظ و نصیحت کا ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا بلکہ جب میں نے زیادہ روک ٹوک کی تو یہ میرے قتل کے در پے ہو گئے تھے۔

قرآن حضرت ہارون علیہ السلام کو معصوم اور موحد ثابت کرتا ہے جبکہ توریت سونے کے زیورات سے بچھڑا بنانے اور اسرائیلیوں کے سامنے اسے معبود کے طور پر پیش کرنے کا ذمہ دار حضرت ہارون کو ثابت کرتی ہے۔{۲۹۳}

﴿۱۵۱﴾...... اس اعتذار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دل مطمئن ہو گیا اور انہوں نے اپنے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے دعا

{۲۹۱}{الترمذی، تفسیر سورۃ ۷/۱۱، مسند احمد ۱/۱۱/۲۱۱}

{۲۹۲}{طٰہٰ ۲۰/۹۲}

{۲۹۳}{بائبل سفر خروج باب ۳۲}

کی اور اپنے بھائی کے لیے بھی۔

حکمت وہدایت:

۱......صحبت اور مناظر سے انسان ضرور متاثر ہوتا ہے...... بنی اسرائیل مشرک مصریوں کی صحبت اور دورانِ سفر بت پرست قوم کے اسلوبِ عبادت سے متاثر ہوکر خود بھی گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوگئے، اسی لیے علماء لہوولہب کے آلات اور رقص وسرود اور فحاشی پر مشتمل پروگراموں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں، ان پروگراموں کے جواثرات نئی نسل پر مرتب ہورہے ہیں وہ کسی بھی باخبر انسان سے مخفی نہیں۔ (۱۴۸)

۲......غباوت اور فکری جمود ایک آفت ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات بالکل بدیہی باتوں سے انسان چشم پوشی اختیار کرلیتا ہے۔ (۱۴۸)

۳......جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ خیر کا فیصلہ فرمالیتے ہیں تو اسے گناہ کے بعد توبہ اور استغفار کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔ (۱۴۹)

۴......غصہ انسانی فطرت کا حصہ ہے لہٰذا اسے علمی اور عملی کمال کے منافی سمجھنا غلط ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اہلِ کمال غصے سے مغلوب ہوکر نہ ایسی بات کہتے ہیں اور نہ ایسی حرکت کرتے ہیں جس میں کوئی خوبی اور بھلائی نہ ہو۔ (۱۵۰)

۵......معذرت پیش کرنا اور معذرت قبول کرنا انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے۔ (۱۵۰)

۶......اللہ کے نبی عالم الغیب نہیں ہوتے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حقیقت کا علم تب ہوا جب حضرت ھارون نے وضاحت فرمائی۔

توبہ اور ہدایت ورحمت

﴿۱۵۲......۱۵۴﴾

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ

البتہ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا ان کو پہنچے گا غضب ان کے رب کا اور ذلت دنیا کی زندگی میں اور یہی سزا دیتے ہیں ہم

نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا

بہتان باندھنے والوں کو۔ اور جنہوں نے کئے برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد اور ایمان لائے تو بیشک تیرا رب توبہ کے

لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَ

پیچھے البتہ بخشنے والا مہربان ہے۔اور جب تھم گیا موسیٰ کا غصہ تو اس نے اٹھالیا تختیوں کو اور جو ان میں لکھا ہوا تھا اس میں

رَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿۱۵۴﴾

ہدایت اور رحمت تھی ان کے واسطے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

تسہیل: جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا انہیں اپنے ربّ کے غضب اور دنیا کی زندگی میں ذلت کا ضرور سامنا کرنا پڑے گا اور ہم جھوٹ گھڑنے والوں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں O اور جو لوگ برے کام کر بیٹھیں پھر اس کے بعد توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں تو تمہارا ربّ توبہ کے بعد معاف کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے O اور جب موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو انہوں نے ان تختیوں کو اٹھالیا اور اس نسخہ میں اپنے ربّ سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت کے مضامین تھے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۵۲﴾......جن لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بچھڑے کو معبود بنا کر اس کی پرستش شروع کردی تھی انہیں اللہ کے غضب اور دنیا میں ذلّت کا سامنا کرنا پڑا۔

ان میں سے جس کسی نے گوسالہ پرستی جیسے جرم کا ارتکاب کیا تھا اسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا چنانچہ ذرا سی دیر میں کشتوں کے پشتے لگ گئے اور ستر ہزار افراد کی گردنیں اڑادی گئیں، قتل کی اس سزا کے علاوہ انہیں ذلّت کی سزا بھی ملی، کوئی شخص بھی انہیں کلمۂ خیر سے یاد نہیں کرتا تھا، ان میں سے جو زندہ بچ گئے یعنی سامری اور اس کے ساتھی ان کے بارے میں ارشاد ہوا کہ انہیں اچھوت بنادیا جائے کوئی بھی ان کے قریب نہ جائے، نہ انہیں ہاتھ لگائے نہ انکا ہاتھ اپنے جسم سے لگنے دے، سورۂ طٰہٰ میں ہے:

﴿فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ﴾{۲۹۴}

''جا! دنیا میں تیری یہی سزا ہے کہ تو کہتا رہے کہ مجھے نہ چھونا''

﴿وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ﴾ یہ سزا صرف بنی اسرائیل کے چند بگڑے ہوئے لوگوں کے ساتھ خاص نہ تھی بلکہ قیامت تک جو شخص بھی دین میں افتراء کرے گا اور جھوٹی باتیں گھڑ کر ان کی نسبت اللہ کی طرف کرے گا اسے یہی سزا

{۲۹۴}(طٰہٰ/۹۷)

دی جائے گی۔

دیکھا جائے تو اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے زمانے کے یہود کو بھی تنبیہ ہے اس لیے کہ کذب وافتراء میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، وہ ان بشارتوں کا انکار کرتے تھے جو ان کی کتابوں میں نبی آخرالزمان ﷺ کے بارے میں مذکور تھیں اور کہتے تھے کہ اللہ نے ہم سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ آخری نبی تمہاری نسل سے ہوگا اگر کوئی سوال کرے کہ وہ تو گوسالہ پرستی میں مبتلا نہیں تھے پھر ان کی طرف اس کی نسبت کیسے کردی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نسبت ایسے ہی ہے جیسے ان کی طرف انبیاء کے قتل کی نسبت کی گئی ہے حالانکہ انہوں نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا تھا، اصل میں اپنے آباء واجداد کے غلط عمل کو درست قرار دینے والا بھی اس عمل میں شریک شمار ہوتا ہے۔

اس گروہ کے لیے جس غضب اور ذلّت کا ذکر یہاں کیا گیا ہے اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے:

﴿ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ﴾{۲۹۵}

﴿۱۵۳﴾...... یہ قرآن کا خاص اسلوب ہے کہ وہ ایک ضد کے بعد دوسری ضد کا ذکر کرتا ہے، پہلے ان کا ذکر ہوا جو کفر اور معصیت پر اصرار کی وجہ سے غضب اور ذلّت کے مستحق ٹھہرے اور اب ان کا ذکر کیا جا رہا ہے جنہیں کفر وشرک اور دوسرے معاصی سے توبہ کی توفیق مل گئی، انہوں نے ایمان قبول کرلیا، گناہوں سے باز آگئے اور سچائی کے راستے پر جمے رہے تو ان کے گناہ معاف کردیے جائیں گے اور دخولِ جنّت کی صورت میں وہ اللہ کی رحمت کے حقدار ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو کسی عورت سے زنا کرے پھر اس سے شادی کرلے تو انہوں نے جواب میں بار بار یہی آیت پڑھی۔{۲۹۶}

﴿۱۵۴﴾......قوم کی جلد بازی، وعدے کی خلاف ورزی اور گوسالہ پرستی دیکھ کر حضرت موسٰی علیہ السلام کو غصہ خوب آیا اور یہ سوچ کر کہ شاید بھائی نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوتاہی کی ہے اس کا اظہار بھائی پر خوب کیا مگر جب حقیقت سامنے آئی تو غصہ ٹھنڈا بھی فوراً ہو گیا اور توریت کی وہ تختیاں جو ایک طرف رکھ دی تھیں فوراً اٹھالیں۔..... قرآن نے تختیاں اٹھانے کا ذکر کیا ہے شکستہ ٹکڑوں کا نہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تختیاں سالم تھیں ٹوٹ نہیں گئی تھیں۔{۲۹۷}

حکمت وہدایت:

۱......افتراء کرنے والوں کو بالآخر غضب اور ذلّت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔(۱۵۲)

{۲۹۵}(البقرۃ/۲/۶۱)

{۲۹۶}(التفسیر المنیر/۹/۱۰۷)

{۲۹۷}(وظاهر هذا يدل على ان شيأ منها لم ينكسر ولم يبطل)(التفسير كبير/۱۵/۳۷۳)

۲......اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جتنی بھی وعیدیں سنائی ہیں وہ صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو توبہ نہیں کرتے۔(۱۵۳)

۳......اللہ تعالیٰ کی کتاب میں نور، ہدایت اور رحمت جو کچھ بھی ہے اس سے صرف وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جن کے دل میں خوف خدا ہے۔(۱۵۴)

انتخاب، دعا اور نبی امّی کی صفات

﴿۱۵۵......۱۵۷﴾

وَاخْتَارَ مُوسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ

اور چن لئے موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر مرد ہمارے وعدہ کے وقت پر لانے کو پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑا تو بولا اے رب

اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ

میرے اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ہلاک کر دیتا ان کو اور مجھ کو کیا ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا ہماری قوم کے احمقوں نے؟ یہ

تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ

سب تیری آزمائش ہے بچلا دے اس میں جس کو تو چاہے اور سیدھا رکھے جس کو چاہے تو ہی ہے ہمارا تھامنے والا سو بخش

لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ

دے ہم کو اور رحمت کر ہم پر اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔ اور لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور آخرت میں

مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

ہم نے رجوع کیا تیری طرف فرمایا میرا عذاب ڈالتا ہوں میں اس کو جس پر چاہوں اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو سو اس

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ

کو لکھ دوں گا ان کے لئے جو ڈر رکھتے ہیں اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو پیروی

يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ

کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امّی ہے کہ جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں، وہ حکم کرتا ہے ان کو

عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ

نیک کام کا اور منع کرتا ہے برے کام سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک

وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ اٰمَنُوا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَ

چیزیں اور اتارتا ہے ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت کی

اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

اور اس کی مدد کی اور تابع ہوئے اس نور کے جو اس کے ساتھ اترا ہے وہی لوگ پہنچے اپنی مراد کو۔

تسہیل: اور موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے متعین کردہ وقت پر لانے کے لیے اپنی قوم سے ستر افراد کا انتخاب کیا پھر جب انہیں زلزلہ نے آلیا تو موسیٰ نے عرض کیا اے میرے ربّ! اگر آپ چاہتے تو مجھے اور ان کو اس سے پہلے ہی ہلاک کردیتے، کیا آپ ہمارے چند احمقوں کی حرکت کی وجہ سے ہم سب کو ہلاک کردیں گے؟ مجھے یقین ہے کہ یہ واقعہ آپ کی طرف سے محض ایک امتحان ہے، اس کے ذریعے آپ جسے چاہیں گمراہ کرسکتے ہیں اور جسے چاہیں ہدایت دے سکتے ہیں، آپ ہمارے حقیقی سرپرست ہیں لہٰذا ہماری مغفرت فرمادیجیے اور ہمارے حال پر رحم فرمایئے اور آپ ہی بہترین معاف کرنے والے ہیں O اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دیجیے اور آخرت میں بھی، کیونکہ ہم تو ہر حال میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا میں سزا تو صرف اسی کو دیتا ہوں جسے چاہتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے بالخصوص ان لوگوں کے لیے تو میں اپنی رحمت ضرور لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں O جو لوگ ایسے رسول کی اطاعت کرتے ہیں جو نبی امّی ہیں، ان کا ذکر وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ انہیں نیک کاموں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہراتے ہیں اور گندی چیزوں کو حرام فرماتے ہیں اور ان بندشوں اور زنجیروں سے انہیں آزاد کرتے ہیں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، جو لوگ اس عظیم پیغمبر پر ایمان لاتے، ان کی حمایت اور مدد کرتے اور اس نور کی اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا ہے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۵۵﴾...... ان منتخب ستر افراد کی کوہِ طور پر حاضری کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:

(ا) یہ حاضری بچھڑے کو معبود بنانے سے پہلے ہوئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہم کلامی کا شرف حاصل ہونے کے بعد تورات لیکر واپس جائیں تو قوم کو ان کی صداقت کا یقین آ جائے۔

(ب) یہ منتخب ستر افراد بچھڑے کو معبود بنائے جانے کے واقعہ کے بعد اپنی قوم کی طرف سے معذرت کے لیے حاضر ہوئے تھے۔

(ج) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر گئے تو ان لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے اور یہ لوگ آپ کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، نزولِ توات کے فوراً بعد یہ لوگ بھی اداءِ شکر کے لیے طور پر گئے۔

(د) تورات ملنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر افراد کو منتخب کر کے طور پر لے گئے تھے تاکہ انہیں اللہ کے ساتھ آپ کی مناجات کا یقین آ جائے انہوں نے جب کلامِ ربانی سُنا تو مچل گئے اور کہنے لگے کہ ہم اس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک کہ ہم براہِ راست دیدار نہ کرلیں، اس گستاخانہ مطالبہ کی پاداش میں انہیں زلزلے نے آلیا۔ زلزلے کی گڑگڑاہٹ ایسی ہیبتناک تھی کہ وہ سب بے ہوش ہوگئے {۲۹۸} ان کی حالت ایسی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمجھا یہ مر ہی جائیں گے۔

بہت سے مفسرین نے ان کے مرجانے کا قول اختیار کیا ہے۔{۲۹۹}

﴿قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ﴾ عرض کیا اے باری تعالیٰ اگر آپ چاہتے تو طور پر آنے سے پہلے ہی انہیں اور خود مجھے بھی موت دے سکتے تھے اب اگر اس حالت میں واپس گیا تو قوم مجھے طعنہ دے گی کہ تم نے ہمارے بہترین افراد کو لے جا کر مروا دیا، سوال کرنے کی حماقت تو چند افراد نے کی تھی آپ کی شان سے بعید ہے کہ آپ اس حماقت کی سزا سب کو دے دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استفہام اعتراض کے طور پر نہیں تھا بلکہ 'استعظام' کے طور پر تھا۔

﴿اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ﴾ یہ آپ کی طرف سے ایک آزمائش تھی کہ آپ نے مجھ سے کلام کیا جسے انہوں نے سُن کر رؤیت کا مطالبہ کر دیا اور آپ نے اس گستاخی کی پاداش میں انہیں ہلاک کر دیا، ظاہر ہے سارے اختیارات آپ کے پاس ہیں، وہی ہوتا ہے جو آپ چاہتے ہیں، ان آزمائشوں کے ذریعے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہ کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چاہت کا نظام معاذ اللہ ظلم اور زیادتی پر مبنی نہیں ہے بلکہ انسانوں کی طبیعت اور اعمال کی بناء پر ہدایت اور گمراہی کے فیصلے ہوتے ہیں، جو لوگ محبت، معرفت اور طلب سے خالی ہوتے ہیں وہ آزمائش میں گمراہ

{۲۹۸} قیل غشی علیھم ثم افاقوا (روح المعانی ۱۰۹/۶)

{۲۹۹} انھم ماتوا یوما ولیلۃ/ قرطبی/ ۲۶۰/۷

ہو جاتے ہیں اور جن کے سینے نورِ ایمان سے روشن ہوتے ہیں ان کے درجات ایسی آزمائشوں میں اور زیادہ بلند ہو جاتے ہیں۔

﴿أَنتَ وَلِيُّنَا﴾ صرف آپ ہی ہمارے کارساز ہیں، آپ کے سوا کوئی نہیں جس پر ہمیں بھروسہ ہو لہٰذا جو کچھ ہو چکا اس پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دیجیے اور آئندہ کے لیے ہماری حفاظت فرمائیے۔{۳۰۰}

﴿۱۵۶﴾......اس دنیا میں بھی ہمارے لیے بھلائی کا فیصلہ فرما دیجیے{۳۰۱}اور آخرت میں بھی......نیک اولاد، صحت اور عافیت، کشادہ مکان، رزقِ حلال کی فراوانی اور توفیقِ عمل وغیرہ دنیا کی بھلائیوں میں شامل ہیں اور مغفرت، اللہ کی رضا، دوزخ سے بچاؤ اور دخولِ جنت آخرت کی بھلائیوں میں سے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں مسلمانوں کو یہی دعا ان الفاظ میں سکھائی گئی ہے:

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً﴾{۳۰۲}

"اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما"

﴿إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ﴾ ہم آپ کے سامنے توبہ اور رجوع کے ساتھ حاضر ہو رہے ہیں اور توبہ کرنے والوں کے بارے میں آپ کا قانون اور فیصلہ یہی ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت کی سعادت عطا فرماتے ہیں۔

﴿قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ﴾ اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا عذاب تو صرف ان مجرموں اور سرکشوں پر نازل ہوتا ہے جنہیں میں سزا دینا چاہتا ہوں لیکن میری رحمت جہانوں میں سے ہر کسی کے لیے عام ہے۔

رحمت، اللہ تعالیٰ کی قدیم اور ازلی صفت ہے جس کی بناء پر کائنات کا سارا انتظام چل رہا ہے جبکہ عذاب اس کی صفت نہیں بلکہ اس کا فعل ہے جس کا تعلق عدل کے ساتھ ہے، اگر اس کی رحمت عام نہ ہوتی تو کافروں اور خطاکاروں میں سے کوئی بھی روئے زمین پر زندہ نہ رہتا، سورۂ فاطر میں ہے:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ﴾{۳۰۳}

"اور اگر اللہ انسانوں سے ان کی کرتوتوں کی بنا پر مواخذہ کرتا تو زمین کی پشت پر کسی جاندار کو بھی زندہ نہ رہنے دیتا"

{۳۰۰}والرحمۃ اذا قرنت مع المغفرۃ یراد بہا ان لا یوقعہ فی مثلہ فی المستقبل (ابن کثیر/۲/۳/۳۴۴)

{۳۰۱}ای اوجب لنا والکتابۃ تذکر بمعنی الایجاب (کبیر/۵/۸/۳۷۸)

{۳۰۲}البقرۃ/۲/۲۰۱

{۳۰۳}فاطر/۳۵/۴۵

﴿فَسَاَكْتُبُهَا﴾ میری رحمت کے مستحق وہ لوگ ہیں جن کے اندر یہ تین صفات پائی جاتی ہیں:

(۱) **تقویٰ**...... وہ کفر و شرک اور ہر قسم کے گناہوں سے بچتے ہیں۔

(۲) **ایتاءِ زکوٰۃ**...... وہ فرض زکوٰۃ دیتے ہیں جس کی ادائیگی سے ان کے نفوس کا تزکیہ ہوجاتا ہے اور ان کے دل حبِّ مال جیسی خطرناک بیماری سے پاک ہوجاتے ہیں تمام عبادات میں سے یہاں زکوٰۃ کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اس لیے کہ مال کی محبت کا فتنہ سب فتنوں سے زیادہ خطرناک ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایسے لوگ کثرت سے دکھائی دیتے ہیں جو دوسری عبادات کا اہتمام تو کرتے ہیں مگر زکوٰۃ پوری ادا نہیں کرتے۔

(۳) **ایمان**...... وہ جوان ساری آیات پر ایمان رکھتے ہیں، جو ہماری توحید اور ہمارے رسولوں کی سچائی پر دلالت کرتی ہیں، ایمان کا دعویٰ تو یہود و نصاریٰ بھی کرتے ہیں مگر اللہ کے ہاں صرف ایمانِ صحیح کا اعتبار ہے، ان تخیلات اور نظریات کا اعتبار نہیں جنہیں جاہلوں نے از خود ایمان کا نام دے رکھا ہے۔

﴿۱۵۷﴾...... جن لوگوں کے اندر یہ تین صفات پائی جاتی ہیں وہی حقیقت میں اللہ کے اس عظیم الشان پیغمبر کی اتباع کرنے والے ہیں جس کی صفات تورات اور انجیل میں مذکور ہیں، ان میں سے سات صفات یہاں بھی ذکر کی گئی ہیں:

(۱)...... پہلی صفت آپ کی یہ ہے کہ آپ اُمّی تھے، اُمّی ہونے کے دو معنی ہیں یا تو یہ منسوب ہے ام القریٰ کی طرف یعنی مکّہ کے رہنے والے اور یا پھر اس کا معنی ہے ''ان پڑھ'' ہونا۔{۳۰۴} اہلِ کتاب عربوں کو ''اُمّی'' کہا کرتے تھے۔

سورۂ آلِ عمران میں ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾{۳۰۵}

''وہ کہتے ہیں کہ ''ان پڑھوں'' کے بارے میں ہم سے مواخذہ نہیں ہوگا''۔

سورۂ جمعہ میں اللہ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾{۳۰۶}

''(اللہ) وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے رسول بھیجا''

{۳۰۴} ای الذی لایکتب ولا یقرأ (روح المعانی/۹/۷۱)

{۳۰۵} آل عمران/۳/۷۵

{۳۰۶} الجمعة/۶۲/۲

اُمّی اوران پڑھ ہونا ہمارے آقا ﷺ کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے اس لیے کہ اُمّی ہونے کے باوجود آپ کی زبان سے ایسے علوم ظاہر ہوئے جن پرعمل کرنے سے عقائد وعبادات، اخلاق اور معاملات، حکومت وسیاست، معیشت اور معاشرت میں پائی جانے والی ساری خرابیوں کی اصلاح ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب بھی آپ پرنازل ہوئی۔

بشارات

(۲)......آپ کی دوسری صفت یہ ہے کہ آپ کا تذکرہ اور علامات تورات اورانجیل میں مذکور ہیں اس موضوع پر یوں تو دسیوں علماء نے لکھا ہے اوروہ تمام بشارات جمع کی ہیں جو نبی اُمّی ﷺ کے بارے میں تورات اورانجیل میں آئی ہیں لیکن اس موضوع پر سب سے مستند کتاب ''اظہارالحق'' ہے جس کے مصنف مولانا رحمت اللہ کیرانوی نوراللہ مرقدہ ہیں، اس کتاب کوتحقیق اورتشریح کے بعد ''بائبل سےقرآن تک'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے، ہم یہاں چند بشارات کے ذکر پراکتفا کرتے ہیں۔

سفرتثنیہ میں ہے ''تو خداوند نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے اچھا کہا میں ان کے بھائیوں کے درمیان سے تیری طرح ایک نبی برپا کردوں گا اوراپنا کلام اسکے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس کوحکم دوں گا وہ ان سے کہے گا اور جوانسان میرے کلام کو، جووہ میرے نام سے کہے گا، نہ مانے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا اور جو نبی یہ گستاخی کرے کہ کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جو میں نے اسے حکم نہیں دیا، یاوہ میرے معبودوں کے نام سے نبوت کرے تو وہ نبی ضرورقتل کیا جائے اگرتو اپنے دل میں کہے کہ کیسے معلوم ہوکہ یہ بات خداوند نے نہیں کہی تو اگروہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہےاوراس کا کلام پورانہ ہواورواقع نہ ہوتو وہ کلام خداوند نے اس کونہیں فرمایا بلکہ اس نبی نے گستاخی سے وہ بات کہی ہے تم ایسے سے نہ ڈرنا'' {۳۰۷}

اگرچہ ان آیات میں مذکور بشارت کو یہودی علماء حضرت یوشع علیہ السلام اور پروٹسٹنٹ علماء حضرت عیسیٰ علیہ السلام پرمنطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مولانا کیرانوی رحمہ اللہ نے دس ٹھوس دلائل کی بنیاد پراس کا مصداق حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو ثابت کیا ہے۔

اسی کتاب کے باب ۳۲ میں ہے:

''انہوں نے غیر معبود سے مجھے غیرت دلائی، اپنے باطل بتوں کے باعث مجھے غصہ چڑھایا سو میں بھی غیرقوم

{۳۰۷} سفرتثنیہ شرح باب ۱۸ آیت ۱۷ سے ۲۲

سے انہیں غیرت دلاؤں گا اور نادان قوم کے باعث انہیں غصہ چڑھاؤنگا" {۳۰۸}

اس میں نادان قوم سے مراد عرب ہیں کیونکہ یہ لوگ انتہائی گمراہ اور جاہل تھے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ بنی اسرائیل نے اپنے باطل معبودوں کی عبادت کی بناء پر مجھ کو غیر پر برانگیختہ کیا ہے اس لیے میں بھی ایسے لوگوں کو منتخب اور مقبول بنا کر ان کو غیرت دلاؤں گا، جو ان کی نگاہ میں سخت حقیر و ذلیل ہیں چنانچہ اللہ نے اپنا یہ وعدہ اس طرح پورا فرمایا کہ اہلِ عرب میں سے حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا۔

کتابِ استثناء کے عربی ترجمہ کے باب ۳۳ میں ہے:

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا، وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا، اور ہزاروں قدسیوں میں سے آیا، اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی"

خداوند کے سینا سے آنے کا مطلب ہے، خدا کا موسیٰ کو توریت عطا فرمانا اور کوہِ شعیر سے طلوع ہونے کا مطلب خدا کا عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا فرمانا، کوہِ فاران سے جلوہ گر ہونے سے اللہ کے قرآن نازل کرنے کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ فاران مکہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۰ سے معلوم ہوتا ہے۔

کتابِ پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰ میں ہے:

"اور اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی دیکھ میں اسے برکت دونگا اور اسے برومند کرونگا اور اسے بہت بڑھاؤنگا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤنگا"۔

اس میں ایک "بڑی قوم" کا لفظ محمد ﷺ کی جانب اشارہ کر رہا ہے اس لئے کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں کوئی شخص حضور کے سوا موجود نہیں ہے کہ جو بڑی قوم والا ہو۔

کتابِ پیدائش باب ۴۹ آیت ۱۰ ترجمہ عربی ۱۷۲۲ء، ۱۸۳۱ء، ۱۸۴۴ء میں یوں ہے کہ یہوداہ سے سلطنت نہیں چھوٹے گی اور نہ اس کی نسل سے حکومت کا عطا موقوف ہوگا جب تک شیلوہ نہ آئے اور قومیں اس کی مطیع ہوں گی"

لفظِ شیلوہ کے معنی میں اہلِ کتاب کا بڑا شدید اختلاف ہے مگر یہ بات اس آیت سے واضح طور پر ثابت ہو رہی ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بعد محمد ﷺ تشریف لائیں گے۔

انجیل یوحنا کے باب ۱۴ آیت ۱۵ میں ہے کہ:

"اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کرونگا تو وہ تمہیں دوسرا

{۳۰۸} سفر تثنیہ شرع باب ۳۲، آیت ۲۱

فارقلیط بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے"۔

انجیل عبرانی زبان میں نازل ہوئی اس کا ترجمہ یونانی زبان میں کیا گیا تو اہلِ کتاب نے اپنی عادت کے مطابق ناموں کا بھی ترجمہ کر دیا، یونانی زبان میں اصل لفظ "پیر کلوطوس" ہے جس کے معنیٰ محمد اور احمد کے معنیٰ کے قریب ہیں، "پیر کلوطوس" کو معرّب کر کے "فارقلیط" بنا دیا گیا، عیسائیت کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں "فارقلیط" کی آمد کا شدّت سے انتظار رہا، حتّٰی کہ بعض عیسائیوں نے اپنے بارے میں "فارقلیط" ہونے کا دعویٰ بھی کر ڈالا، جیسے مسلمانوں میں بعض لوگ "مھدی" ہونے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔

ایک صاحبِ علم حیدر علی قریشی مرحوم نے "سیف المسلمین" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی اس کے صفحہ ۶۳ تا ۶۴ پر انہوں نے لکھا ہے کہ "پادری ارشگان ارمنی نے کتاب یسعیاہ کا ترجمہ ارمنی زبان میں ۱۶۶۶ء میں کیا تھا جو ۱۷۳۳ء میں مطبع انٹون پورٹوی میں چھپا ہے اس ترجمہ کے باب ۴۲ میں یہ فقرہ موجود ہے کہ خدا کی پاکی بیان کرو، نئے سرے سے اس کی بادشاہت کا اثر اس کی پشت پر ظاہر ہوا اس کا نام "احمد" ہے، یہ ترجمہ ارمنیوں کے پاس اب بھی موجود ہے، اس میں آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں"۔

اگر یہ ترجمہ ہمیں نہ ملے تو یقین کر لیں کہ نئے ایڈیشن میں تبدیلی کر دی گئی ہو گی کیونکہ بائبل کے مختلف نسخوں میں اس قسم کی تبدیلیوں اور حذف و اضافہ کے واقعات عام ہیں۔

(۳-۴)...... ہمارے آقا ﷺ کی تیسری اور چوتھی صفت جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ معروف یعنی نیکی کا حکم دیتے اور منکر یعنی برائی سے منع فرماتے ہیں "معروف" اس کام کو کہتے ہیں جسے عقلِ سلیم اچھا سمجھے، پاک دل اس میں راحت محسوس کرے، وہ فطرت کے موافق ہو اور اس کے بارے میں شریعت کا حکم بھی آیا ہو اور جو کام اس کے برعکس ہو اسے منکر کہتے ہیں، حضور اکرم ﷺ کی پوری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ آپ ہمیشہ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع فرماتے رہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم سنو کہ اللہ تعالیٰ "یاایھا الذین آمنوا" کے الفاظ سے خطاب فرما رہے ہیں تو اسے توجہ سے سنو کیونکہ اس کے بعد یا تو کسی خیر کا حکم دیا گیا ہو گا یا کسی شر سے منع کیا گیا ہو گا، سب سے بڑا معروف توحید اور سب سے بڑا منکر شرک ہے اور کون نہیں جانتا کہ دیگر انبیاء کی طرح رسولِ اکرم ﷺ بھی توحید کے سب سے بڑے داعی اور شرک کی تردید کرنے والے تھے۔

(٦-٥)......آپ کی پانچویں اور چھٹی علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام قرار دیں گے۔آپ سے پہلے لوگوں نے کئی حلال چیزوں کو حرام اور حرام اشیاء کو حلال ٹھہرا رکھا تھا اور کچھ پاکیزہ چیزیں ایسی تھیں جو یہودیوں کے جرائم کی پاداش میں ان پر حرام کردی گئی تھیں سورۃ النساء میں ہے:

''یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں حرام کردیں جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں'' {٣٠٩}

حضور اکرم ﷺ کے ذریعہ حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دیا گیا۔آپ نے مردار، خنزیر، بہنے والے خون اور ان اموال کو حرام ٹھہرایا جو سود، رشوت، غصب اور خیانت جیسے ناجائز طریقوں سے حاصل کیے جائیں اور ایسے تمام جانور جنہیں بتوں کے نام مخصوص کیے جانے کی وجہ سے حرام سمجھ لیا جاتا تھا، ان جانوروں اور ساری پاکیزہ چیزوں کو آپ نے حلال بتایا۔

(٧)......اور ان بندشوں اور زنجیروں سے انہیں آزاد کرتے ہیں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے...... یہودی ہوں یا عیسائی، انہوں نے اللہ کی رضا کے حصول کو انتہائی مشکل بنا دیا تھا، ان کے خیال میں کوئی شخص سچا مؤمن نہیں بن سکتا تھا جب تک کہ ان کی خودساختہ شریعت پر عمل نہ کرے، ان میں سے کوئی روحانی ترقی کے لیے رہبانیت اختیار کرتے ہوئے جنگلوں اور غاروں میں ٹھکانہ بنالیتا، کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوتا تو ٹاٹ کا لباس پہنتا اور ہاتھوں کو گردن سے باندھ لیتا، کوئی اپنی گردن میں زنجیر ڈال کر اسے ستون سے باندھ دیتا تاکہ زیادہ سے زیادہ عبادت کرسکے۔{٣١٠}

نبی کریم ﷺ نے ان تمام بندشوں اور زنجیروں سے انسانیت کو آزاد فرمادیا جن بندشوں اور زنجیروں میں دنیا بھر کے راہبوں، ربیوں، پنڈتوں اور پروہتوں نے انسانیت کو جکڑ رکھا تھا، آپ نے فرمایا:

"بعثت بالحنيفيّة السّمحة" {٣١١} ''مجھے سیدھی سادھی اور نرم احکام کی حامل شریعت دے کر مبعوث کیا گیا ہے''

جب آپ نے حضرت معاذ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا:

"بشّرا ولا تنفرا ويسّرا ولا تعسرا وتطاوعا ولا تختلفا" {٣١٢}

{٣٠٩} النساء/٤/١٦٠

{٣١٠} کشاف ٢/١٥٧

{٣١١} مسند احمد ٥/٢٦٦

{٣١٢} بخاری/جلد ا/ کتاب الجہاد ١٦٤، مغازی/٦٠، مسلم، جہاد/٥

''اچھی خبر سناؤ اور نفرت پیدا نہ کرو، آسانی کرو اور سختی نہ کرو اور موافقت پیدا کرو اور اختلاف سے بچو''

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ﴾ آیت کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ نجات کے لیے صرف اللہ کے نبی پر ایمان لانا کافی نہیں بلکہ آپ کا ساتھ دینا، عزت وتعظیم کرنا اور قرآن کی اتباع بھی ضروری ہے۔

حکمت وہدایت:

۱...... ہر وہ عمل جو شارع کی رضا کے خلاف ہو اسے حماقت کہا جائے گا اور اس کا کرنے والا یقیناً بے وقوف ہوگا (۱۵۵)

۲...... ہدایت اور گمراہی بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انسانوں کے دل بھی اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اس لیے بندے کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت دینے اور گمراہی سے بچانے کی دعا کرے۔ (۱۵۵)

۳...... جب انسان سے گناہ ہو جائے تو اس پر توبہ کرنا واجب ہے، توبہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے، مستحب یہ ہے کہ دو رکعت پڑھ کر خشوع خضوع سے توبہ کی جائے۔

۴...... اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کا سوال کرنا چاہیے۔ (۱۵۶)

۵...... یوں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت پوری کائنات پر سایہ فگن ہے مگر اس کی رحمت کے حقیقی مستحق وہ لوگ ہیں جن کے اندر تین صفات پائی جائیں، تقویٰ، زکوٰۃ کی ادائیگی اور ایمانِ کامل۔

۶...... ہمارے حضور ﷺ کا اُمّی ہونے کے باوجود کمی بیشی کے بغیر اللہ کی کتاب بندوں تک پہنچانا اور اس کے علوم ومعارف بیان کرنا مستقل معجزہ تھا۔ (۱۵۷)

۷...... امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نبوت کے فرائض میں شامل ہے، امت میں سے جو فرد یہ عظیم عمل کرتا ہے وہ حقیقت میں کارِ نبوت سرانجام دیتا ہے۔ (۱۵۷)

۸...... نبی کریم ﷺ کی تعظیم، تائید، اطاعت اور اس کتاب کی اتباع واجب ہے جو آپ لے کر آئے۔ (۱۵۷)

نبوت کی عمومیّت

﴿۱۵۸﴾

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

تو کہہ! اے لوگو میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف جس کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں کسی کی بندگی نہیں

وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ

اس کے سوا وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس بھیجے ہوئے نبی امّی پر جو کہ یقین رکھتا ہے

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

اللہ پر اور اس کے سب کلاموں پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ۔

ربط: یہ بتانے کے بعد کہ ''نبی امّی'' کی صفات اور علامات تورات اور انجیل میں بھی مذکور ہیں، بتایا جارہا ہے کہ آپ کی نبوت کسی قوم اور قبیلے تک محدود نہ تھی بلکہ سارے انسانوں کے لیے تھی آپ کی نبوت کی عمومیت ہی کی وجہ سے یہ اہتمام کیا گیا کہ گزشتہ انبیاء نے آپ کی آمد کے متعلق پیشگوئیاں فرمائیں۔

تسہیل: آپ فرمادیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندگی اور موت کا نظام اسی کے ہاتھ میں ہے، سو تم اللہ پر اور اس کے امّی نبی اور رسول پر ایمان لاؤ جو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے ارشادات پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پاجاؤ O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۵۸﴾.....حضورِ اکرم ﷺ کو حکم دیا جارہا ہے کہ عرب وعجم سے خطاب کر کے فرمادیں کہ مجھے تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کی نبوت صرف اہلِ عرب کے لیے تھی وہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں کیونکہ آپ کی نبوت کے عرب وعجم اور جن وبشر سب کے لیے عام ہونے کا مضمون قرآن مجید کی متعدد آیات میں مذکور ہے، سورۂ سبا میں ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ﴾ {۳۱۳}

''اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا ہے''

سورۂ انبیاء میں ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ {۳۱۴}

''اور ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''

{۳۱۳} سبا ۳۴/۲۸

{۳۱۴} الانبیاء ۲۱/۱۰۷

سورۃ الانعام میں ہے:

﴿وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ {۳۱۵}

''اور میری طرف یہ قرآن بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تا کہ میں اس کے ذریعہ تمہیں اوران سب کو خبردار کروں جن تک یہ پہنچ سکے''

اس مضمون کی تائید متعدد صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے مثلاً وہ حدیث جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

قال رسول اللہ ﷺ أعطیت خمسا لّم یعطھن احد من الانبیاء قبلی. نصرت بالرعب مسیرة شھر، وجعلت لی الارض مسجدا وطھورا فأیّما رجل من أمتی أدرکته الصلاة فلیصلّ وأحلّت لی الغنائم ولم تحلّ لأحد قبلی وأعطیت الشفاعة، وکان النبیّ یبعث إلی قومه خاصّة وبعثت إلی النّاس عآمّة. {۳۱۶}

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں میرا دشمن ایک ماہ کی مسافت پر ہو تو اس پر رعب طاری ہو جاتا ہے، میرے لیے ساری زمین مسجد اور پاکیزہ بنادی گئی ہے، میری امت کا ہر فرد جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے، میرے لیے مالِ غنیمت کو حلال کر دیا گیا ہے جبکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں تھا۔ مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔ پہلے نبی صرف اپنی قوم کی ہدایت کے لیے آتے تھے جبکہ مجھے سارے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

اس حدیث میں جس شفاعت کا ذکر ہے اس سے مراد شفاعتِ عظمٰی ہے جو آپ سارے انسانوں کے لیے فرمائیں گے ورنہ انفرادی شفاعت کا اعزاز بعض دوسرے صلحاء، شہداء اور حفّاظ وغیرہ کو بھی عطا کیا جائے گا۔

﴿الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ﴾ رسالت کے بعد توحید کا مضمون ہے، توحید کی دو قسمیں ہیں، توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت یعنی زمین آسمان اور ساری مخلوق کا مالک اور خالق بھی ایک اللہ ہے اور عبادت کا مستحق بھی صرف وہی ہے، یہ دونوں قسمیں یہاں مذکور ہیں، اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ زندگی اور موت کا نظام اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے گویا ان مختصر کلمات میں دین کے تینوں بنیادی ارکان یعنی توحید، رسالت اور بعث بعد الموت بیان ہو گئے ہیں۔

{۳۱۵} الانعام/۶/۱۹

{۳۱۶} بخاری/۱/صفحہ ۶۲/ کتاب الصّلوۃ، باب جعلت لی الارض مسجدًا وطھورًا۔

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ﴾ اب سارے انسانوں کو اللہ کی توحید اور نبی کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے کیونکہ اس کے بغیر اب کسی کو ہدایت نہیں مل سکتی، ہدایت کے اس دروازے کے علاوہ ہدایت کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی گئی ہیں۔

حکمت و ہدایت:

۱......حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سارے انسانوں اور جہانوں کے لیے نبی بن کر آئے تھے آپ کی نبوت کسی قوم، علاقے اور وقت میں محدود نہ تھی جبکہ آپ سے پہلے جتنے بھی رسول آئے وہ کسی ایک قوم کی طرف آئے کیونکہ اس وقت کے حالات اسی کا تقاضا کرتے تھے، اسلام سے پہلے جتنے بھی مذاہب اور نبی آئے وہ سب کے سب قومی مذہب اور قومی نبی تھے مگر اسلام ساری نوعِ انسان کا مذہب اور ہمارے آقا ﷺ ساری نسلِ انسانی کے نبی ہیں۔

حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نبوّت

دیگر انبیاء کی نبوت کے محدود ہونے کے بارے میں ہمیں بحث کی ضرورت نہیں البتہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں وضاحت ضروری ہے کیونکہ بعض حضرات ان کی نبوت اور کتاب کو ساری انسانیت کے لیے عام سمجھتے ہیں۔

کتاب خروج باب سوم میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''میں نے اپنے لوگوں کی تکلیف، جو مصر میں ہیں یقیناً دیکھی، اور ان کی فریاد جو خراج کے محصلوں کی سختی کے سبب سے ہے سنی اور میں ان کے دکھوں کو جانتا ہوں (۷) اور میں نازل ہوا ہوں کہ انہیں مصریوں کے ہاتھ سے چھڑاؤں اور اس زمین سے نکال کر اچھی زمین میں جہاں دودھ اور شہد موج مارتا ہے، کنعانیوں اور حتّیوں، اموریوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کی جگہ میں لاؤں اب دیکھ بنی اسرائیل کی فریاد مجھ تک آئی اور میں نے وہ ظلم جو مصری ان پر کرتے ہیں، دیکھا ہے اب تو جا، میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو، جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔ (۱۰)

مندرجہ بالا فقرات (۷، ۸، ۹، ۱۰) موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے مقصد و مدّعا کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام کا عمل بھی اسی کی تائید میں ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کی رہائی اور ان کو وعدہ کی زمین کی جانب لے جانے کے سوا دیگر اقوام عالم سے کچھ سروکار نہیں رکھا۔

کتابِ استثناء (موسیٰ کی پانچویں اور آخری کتاب) میں ہے ''موسیٰ نے ہم کو ایک شریعت عطا فرمائی جو کہ یعقوب کی جماعت کی میراث ہو۔{۳۱۷}

اس فقرہ نے شریعتِ تورات کا خاص اسرائیلیوں کے لیے ہی ہونا ظاہر کر دیا۔ اگر یہ فقرہ نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ کوئی مدّعی کہہ سکتا کہ شریعتِ تورات سب دنیا کے لیے ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام تک جس قدر انبیائے بنی اسرائیل ہوئے وہ سب اسرائیلیوں ہی کے لیے آتے رہے۔

اب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہم کو صراحۃً ظاہر کر دینا ہے کہ ان کی نبوت کن لوگوں کے لیے تھی۔

الف...... انجیل متّی کا باب ۱۵ پڑھنا ضروری ہے، جس میں ایک کنعانی عورت کا قصہ موجود ہے، یہ عورت اسرائیلی ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس اس لیے آئی ہے کہ حضور اپنی معجزانہ طاقت سے اس کی بیمار بیٹی کو چنگا کر دیں۔ مسیح علیہ السلام نے فرمایا ''میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا'' (۱۵/۲۴)

''پر وہ آئی اور اسے سجدہ کر کے کہا، اے خداوند میری مدد کر'' (۱۵/۲۶)

مسیح علیہ السلام نے جواب دیا ''مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لیکر کتوں کو پھینک دیں (۱۵/۲۶)

اس تمام واقعے پر ٹھنڈے دل سے اور پوری سمجھ سے تامل کرنا چاہیے کہ مسیح علیہ السلام نے صاف لفظوں میں فرما دیا کہ وہ بنی اسرائیل کے سوا اور کسی قوم کے پاس نہیں بھیجے گئے۔ انہوں نے صاف طور پر بنی اسرائیل کو فرزند سے اور دیگر اقوام کو کتوں سے تشبیہ دی اور دیگر اقوام کا اپنی برکات سے محروم ہونا اور محروم کرنا اس دلیل سے واضح کر دیا کہ لڑکوں کی روٹی کتوں کو نہیں دی جایا کرتی۔

انجیل متّی میں ذکر ہے کہ جب مسیح علیہ السلام نے اپنے بارہ شاگردوں کو تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا تو یوں کہا ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا'' (۱۰/۵)

اس سے ظاہر ہے کہ غیر اقوام میں تبلیغ کی قطعاً ممانعت فرمائی گئی اور اسرائیلیوں میں سے بھی سامریوں کے پاس جانے سے روکا گیا۔

یہ اسناد اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام کی نبوت اور ان کے بارہ شاگردوں کے فرضِ تبلیغ کا رقبہ صرف اسرائیلیوں کے اندر اندر محدود تھا۔{۳۱۸}

{۳۱۷} باب ۳۲۔ درس ۴

{۳۱۸} رحمۃ للعٰلمین جلد ۳ صفحہ ۹۴-۹۵

۲......ہدایت کے ہر طلبگار پر لازم ہے کہ وہ شرعی معاملات میں حضور اکرم ﷺ کی اتباع کرے البتہ صنعت وزراعت وغیرہ سے تعلق رکھنے والے تجربات اور عادی امور میں آپ کی اتباع ضروری نہیں، اسی لیے آپ نے ایک موقع پر صحابہ سے فرمایا:

"أنتم أعلم بأمور دنياكم" {۳۱۹} "دنیا کے معاملات کو تم ہی زیادہ جانتے ہو"

غزوہ بدر کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے اسلامی لشکر کے پڑاؤ کے لیے ایک مقام کو منتخب فرمایا تو حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یہاں آپ اللہ کے حکم سے اترے ہیں یا اپنی رائے اور جنگی تدبیر کی بناء پر؟ آپ نے جواب دیا یہاں اترنا وحی کی وجہ سے نہیں ذاتی اجتہاد اور رائے سے ہے، تو انہوں نے ادب سے عرض کیا کہ میرے خیال میں اس سے بہتر مقام دوسرا ہے، آپ نے ان کی تجویز کو پسند فرمایا اور لشکرِ اسلام کو حضرت حباب کے تجویز کردہ مقام پر اترنے کا حکم دیا۔{۳۲۰}

قومِ یہود کے مختلف احوال

﴿۱۵۹......۱۶۶﴾

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٩﴾ وَقَطَّعْنَاهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ

اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ہے جو راہ بتلاتے ہیں حق کی اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں۔اور جدا جدا کر دیے ہم

أَسْبَاطًا أُمَمًا ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ

نے ان کو بارہ دادوں کی اولاد بڑی بڑی جماعتیں، اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو جب پانی مانگا اس سے اس کی قوم نے کہ مار

الْحَجَرَ ۖ فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا

اپنی لاٹھی اس پتھر پر تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے، پہچان لیا ہر قبیلہ نے اپنا گھاٹ اور سایہ کیا ہم نے ان پر ابر کا اور اتارا

عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا

ہم نے ان پر من اور سلویٰ، کھاؤ ستھری چیزیں جو ہم نے روزی دی تم کو اور انہوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا لیکن اپنا ہی نقصان

رَزَقْنَاكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١٦٠﴾ وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ

کرتے رہے۔اور جب حکم ہوا ان کو کہ بسو اس شہر میں اور کھاؤ اس میں جہاں سے چاہو اور کہو ہم کو بخش دے اور داخل ہو

{۳۱۹} بخاری ۱۵۳۰

{۳۲۰} سیرۃ ابن ھشام ۲/۲۳۲

اسْكُنُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا

دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے تو بخش دیں گے ہم تمہاری خطائیں البتہ زیادہ دیں گے ہم نیکی کرنے والوں کو۔ سو بدل ڈالا

الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ

ظالموں نے ان میں سے دوسرا لفظ اس کے سوا جو ان سے کہہ دیا گیا تھا پھر بھیجا ہم نے ان پر عذاب آسمان سے بسبب ان

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا

کی شرارت کے۔ اور پوچھ ان سے حال اس بستی کا جو تھی دریا کے کنارے جب حد سے بڑھنے لگے ہفتہ کے حکم میں، جب

مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ۧ وَسْـَٔـلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ

آنے لگیں ان کے پاس مچھلیاں ہفتہ کے دن پانی کے اوپر اور جس دن ہفتہ نہ ہو تو نہ آتی تھیں، اس طرح ہم نے

حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ

ان کو آزمایا اس لئے کہ وہ نافرمان تھے۔ اور جب بولا ان میں سے ایک فرقہ کیوں نصیحت کرتے ہو ان لوگوں کو

شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

جن کو اللہ چاہتا ہے کہ ہلاک کرے یا ان کو عذاب دے سخت؟ وہ بولے الزام اتارنے کی غرض سے

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَۨا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ

تمہارے رب کے آگے اور اس لئے کہ شاید وہ ڈریں۔ پھر جب وہ بھول گئے

قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ

اس کو جو ان کو سمجھایا تھا تو نجات دی ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے برے کام سے اور پکڑا

عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَىِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا

گنہگاروں کو برے عذاب میں بسبب ان کی نافرمانی کے۔ پھر جب بڑھنے لگے

عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے حکم کیا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل۔

ربط: یہود کو حضرت محمد ﷺ کی اتباع کا حکم دینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ ان میں مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں، اکثر سرکش اور نافرمان ہیں البتہ کچھ ایسے بھی ہیں جو ہر حال میں حق اور سچ کا ساتھ دیتے ہیں۔

تسہیل: اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں اور اسی کے مطابق

انصاف کرتے ہیں○ اور ہم نے بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں کو بارہ جماعتوں میں تقسیم کردیا، اور جب موسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو، یوں اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ہر خاندان نے اپنے پانی پینے کے مقام کو معلوم کرلیا، اس کے علاوہ ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کردیا اور کھانے کے لیے من سلوٰی اتار دیا اور ان سے کہا کہ ہم نے تمہیں جو پاکیزہ چیزیں دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ ان نعمتوں کا شکر ادا نہ کرکے انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرتے رہے○ اور جب ان سے کہا گیا کہ فلاں بستی میں جا کر آباد ہوجاؤ اور جہاں سے دل چاہے کھاؤ البتہ ایک تو توبہ کرتے ہوئے جاؤ اور دوسرے شہر کے دروازے سے عاجزی سے جھکے ہوئے گزرنا، ایسا کرنے کی صورت میں ہم تمہارے گناہ معاف کردیں گے اور احسان کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے○ مگر ان میں سے جو ظالم تھے انہوں نے وہ بات ہی بدل ڈالی جس کا حکم انہیں دیا گیا تھا چنانچہ ہم نے بھی ان کے ظلم اور نافرمانی کی وجہ سے ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا○ اور ان سے اس بستی والوں کا حال بھی دریافت کیجیے جو سمندر کے کنارے آباد تھے، ان کا جرم یہ تھا کہ وہ ہفتے کے دن کے بارے میں اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے، صورت یہ بنی کہ ہفتے کے دن تو مچھلیاں پانی پر خوب ظاہر ہوتیں جبکہ باقی دنوں میں غائب ہوجاتی تھیں، ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ہم نے انہیں اس طرح کی آزمائشوں میں ڈال رکھا تھا○ اور جب ان میں سے خاموشی اختیار کرنے والی جماعت نے روک ٹوک کرنے والوں سے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ تباہ کرنے والا ہے یا شدید سزا دینے والا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہمارا سمجھانا بجھانا ایک تو تمہارے رب کے سامنے عذر پیش کرنے کے لیے ہے اور دوسرے اس لیے کہ شاید یہ تقویٰ اختیار کرلیں○ پھر جب انہوں نے فراموش کردیا اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے ان کو تو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور ظلم کرنے والوں کو ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے سخت عذاب میں پکڑ لیا○ پھر جب وہ ہمارے منع کرنے کے باوجود سرکشی پر اڑے رہے تو ہم نے ان سے کہہ دیا کہ ذلیل وخوار بندر بن جاؤ○

تفسیر

﴿۱۵۹﴾...... حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو انسانوں کو حق کا راستہ دکھاتے ہیں اور جب بھی فیصلہ کرتے ہیں تو عدل کا فیصلہ کرتے ہیں، ایسے لوگ خود رسالت مآب ﷺ کے زمانے میں بھی موجود

تھے، سورۂ آل عمران میں ہے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا {۳۲۱}

''اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ مال و دولت کا انبار بھی ان کے پاس بطور امانت رکھوا دیں تو وہ آپ کو لوٹا دیں گے اور ان میں ایسے بھی ہیں جن کے پاس اگر آپ ایک دینار بھی رکھوائیں تو وہ اس وقت تک واپس نہیں دیں گے جب تک کہ آپ ان کے سر پر کھڑے نہ رہیں''

سارے اہلِ کتاب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا جائز نہیں ان میں ایسے بھی تھے جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت محمد ﷺ پر بھی ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ {۳۲۲}

''اہلِ کتاب میں ایسے افراد بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو ان کی طرف نازل کی گئی، اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے''

اس آیتِ کریمہ میں ان اہلِ کتاب کی بھی تعریف ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یا آپ کے دنیا سے جانے کے بعد آپ پر ایمان لائے، اسی طرح ان اہلِ کتاب کی بھی تعریف ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یا آپ کے بعد حق و صداقت پر قائم رہے۔

﴿۱۶۰﴾...... بنی اسرائیل کو بارہ قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا، ہر گروہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتوں میں سے کسی ایک کی شاخ تھا، توریت میں ہے:

''یہ سب بنی اسرائیل کے بارہ فرقے ہیں جو ان کے باپ نے انہیں کہہ کے برکت دی'' {۳۲۳}

جب پیاس سے پریشان ہو کر انہوں نے وادیِ سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی مانگا تو انہوں نے پتھر پر اپنا عصا مارا جس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے،، یہ لوگ لاکھوں کی تعداد میں تھے، تورات کہتی ہے کہ صرف ان مردوں

{۳۲۱} آل عمران/۳/۷۵

{۳۲۲} آل عمران/۳/۱۹۹

{۳۲۳} پیدائش ۲۸/۴۱

کی تعداد، جو جنگ کی صلاحیت رکھتے تھے، چھ لاکھ تین ہزار پانچ سو پچاس تھی،{۳۲۴} تو اگر عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بھی شامل کیا جائے تو یہ تعداد بہت زیادہ ہو جائے گی، چنانچہ ہجوم اور نزاع سے بچنے کے لیے ہر قبیلے کے لیے الگ الگ چشمہ مقرر کر دیا گیا۔

وادیٔ تیہ میں نہ شجر تھا نہ کوئی مکان، چنانچہ سورج کی تپش سے بچانے کے لیے بادل کے سائے کا انتظام کیا گیا، جب بھوک نے انہیں ستایا تو من اور سلوٰی یعنی ترنجبین اور بٹیران کے لیے وافر مقدار میں بھیج دیئے گئے۔

﴿وماظلمونا﴾ ہر طرح کی نعمتیں میسر آنے کے باوجود وہ سرکشی سے باز نہ آئے لیکن ان کا یہ رویہ خود اپنے ساتھ ظلم کے مترادف تھا، اپنے رب پر ظلم نہ تھا اس لیے کہ انسانوں کے گناہوں اور ظلم و زیادتی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

﴿۱۶۱......۱۶۲﴾......ان دونوں آیات کی تفسیر جلد اوّل صفحہ ۹۴ پر گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔

﴿۱۶۳﴾......حضور اکرم ﷺ سے خطاب ہے کہ آپ اپنے زمانے کے یہودیوں سے ان کے آباء و اجداد کی اس نافرمانی کے بارے میں سوال کیجیے جس کا ارتکاب انہوں نے ہفتے کے دن میں کیا تھا، کیونکہ اگلے اور پچھلے بنی اسرائیل ایک ہی امت ہیں چونکہ پچھلے اپنے سے اگلوں کی نافرمانیوں پر راضی اور خوش تھے اس لیے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا جائز ہے۔ وہ لوگ بحرِ احمر کے کنارے ایلۃ نام کی بستی میں رہتے تھے، انہوں نے اللہ کے نبی سے خود درخواست کی کہ ان کے لئے ہفتے میں ایک دن آرام اور عبادت کیلئے مقرر کیا جائے اور اس میں وہ اجتماعی طور پر معاشی سرگرمیوں کا سلسلہ روک دیں۔ چنانچہ ان کے لیے ہفتے کا دن مقرر کر دیا گیا اور وہ بھی اتنی شدت کے ساتھ کہ جو کوئی اس کی مخالفت کرے اس کی سزا قتل مقرر کی گئی، توریت میں ہے:

''پس سبت کو مانو اس لئے کہ وہ تمہارے لئے مقدس بھی ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے......پس جو کوئی روزِ سبت کو کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے'' {۳۲۵}

پھر انہیں ایک آزمائش میں ڈال دیا گیا، ان کی اخلاقی تربیت کے لیے اس قسم کی آزمائشیں ضروری تھیں، راہِ حق میں آزمائشوں پر استقامت ہی سے ارادے کی پختگی اور ضبطِ نفس کا اندازہ ہوتا ہے، طویل عرصہ غلامی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں متعدد اخلاقی بیماریاں پیدا ہو چکی تھیں اور اب وہ تربیت کے مرحلہ سے گزر رہے تھے۔

{۳۲۴} سفرِ عدد باب ۱ آیت ۴۶ صفحہ ۱۵۵

{۳۲۵} خروج ۳۱: ۱۴

بنی اسرائیل کی آزمائش

آزمائش کی صورت یہ ہوئی کہ عام دنوں میں تو دریا میں زیادہ مچھلیاں نہیں آتی تھیں لیکن ہفتے کے دن ساحل کے قریب وہ ہر طرف تیرتی دکھائی دیتیں جنہیں اگر کوئی پکڑنا چاہتا تو بہت آسانی سے پکڑ سکتا تھا، لیکن ہفتے کے دن شکار کی حرمت کی وجہ سے ان کے لیے مچھلیاں پکڑنا ممکن نہ تھا، مزید یہ کہ حرمت کا حکم بھی ان کی خواہش پر نازل ہوا تھا، بنی اسرائیل عجیب کشمکش سے دوچار ہوگئے، اگر شکار کرتے ہیں تو ''یوم السبت'' کی حرمت پامال ہوتی ہے، اگر نہیں کرتے تو آسانی سے ہاتھ میں آنے والے شکار سے محروم رہتے ہیں، شیطان نے انہیں حیلہ سازی کا راستہ دکھا دیا، جب انسان کے دل پر دنیا کی محبت غالب آجائے اور اللہ کا خوف دل سے نکل جائے تو وہ اپنے خیال میں ایسا راستہ تلاش کرتا ہے جس سے دنیا کا نقصان بھی نہ ہو اور شریعت پر عمل بھی ہو جائے۔

بنی اسرائیل نے سمندر کے اردگرد حوض بنالیے، پانی چڑھتا تو مچھلیاں حوض میں آگرتیں یہ بند باندھ کر انہیں روک لیتے اور اتوار کے دن آکر پکڑ لیتے، دل کو تسلی دیتے کہ ہم نے ہفتے کے دن تو بہر حال مچھلیوں کو ہاتھ نہیں لگایا، اس کے بعد وہ تین گروہوں میں تقسیم ہوگئے، ایک گروہ تو وہ تھا جو عملی طور پر اس گناہ میں مبتلا تھا، دوسرا گروہ ان نیک انسانوں کا تھا جو انہیں اس معصیت سے باز آنے اور توبہ کرنے کی تلقین کرتا تھا اور تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جو خود تو اس حیلہ سازی سے بچے ہوئے تھے مگر سمجھانے والوں کی روک ٹوک کو بھی بے فائدہ سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ ایسے حیلہ سازوں کو وعظ ونصیحت کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے کہ اللہ نے ان کی ہلاکت اور بربادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔

توبہ کی تلقین کرنے والوں نے ان ملامت گروں کو جواب دیا کہ ہم انہیں دو وجہ سے سمجھاتے ہیں ایک تو اس لیے تاکہ ہم قیامت کے دن اللہ کے سامنے سرخرو ہوسکیں کہ ہم نے تو بہر حال پیغمبروں والا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی، دوسری وجہ یہ اُمید ہے کہ شاید سمجھانے بجھانے سے یہ لوگ اپنی حرکت سے باز آجائیں۔

﴿۱۶۴﴾ جب ان نافرمانوں پر وعظ ونصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا تو اللہ نے انہیں عذاب دینے اور برائی سے روکنے والوں کو بچانے کا فیصلہ کرلیا۔ تیسرے گروہ کے بارے میں قرآن خاموش ہے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، شاید اس لیے کہ داعیانہ کردار ادا کرنے سے پہلو تہی کی وجہ سے انہیں قرآن نے قابلِ ذکر نہیں سمجھا۔

بظاہر یہ ملامت گر بھی عذاب کے مستحق تھے {۳۲۶} اس لیے کہ جو شخص برائی سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو اس پر برائی سے روکنا واجب ہے، صحیح مسلم میں ہے:

{۳۲۶} روی عن عبداللہ رضی اللہ عنہ فالمأخوذ حینئذ السّاکتون والظالمون۔(روح المعانی ۶/۱۳۶)

﴿من رأی منکم منکرا فلیغیّره بیده فإن لّم یستطع فبلسانه فإن لم یستطع فبقلبه و ذالک اضعف الایمان﴾{۳۲۷}

''تم میں سے جو کوئی برائی ہوتے ہوئے دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا تو زبان سے روکے اور اگر زبان سے بھی نہیں روکتا تو کم از کم دل سے تو اسے ضرور برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ تیسرا گروہ بھی نجات پانے والوں میں سے تھا{۳۲۸} اس لیے کہ انہوں نے بھی اللہ کی نافرمانی سے روکنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن جو لوگ اس برائی میں مبتلا تھے وہ تاویل کی بناء پر اپنی حرکت کو جائز سمجھ رہے تھے اور اس سے توبہ کے لیے کسی طور تیار نہ تھے تو انہوں نے مایوس ہو کر اپنی کوشش ترک کر دی۔

﴿۱۶۵﴾...... جب وہ اللہ کی طرف سے پکڑ کے باوجود باز نہ آئے تو انہیں بندر اور خنزیر بن جانے کا حکم دے دیا گیا، جمہور کی رائے یہ ہے کہ ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں حقیقتاً بندر اور خنزیر بنا دیا گیا تھا جبکہ حضرت مجاھد فرماتے ہیں کہ ان کے دل اور عقلیں مسخ کر دی گئی تھیں جس کے بعد ان کی حرکتیں حیوانوں جیسی ہو گئی تھیں۔{۳۲۹}

حکمت وہدایت:

۱...... عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دشمنوں کے بارے میں بھی سچ بولا جائے اور ان میں جو اچھائی ہو یا جو اچھے لوگ ہوں ان کی تعریف کی جائے، سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا صحیح رویہ نہیں ہے۔(۱۵۹)

۲...... نظم قائم رکھنے کے لیے کسی جماعت کو گروپوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے۔(۱۶۰)

۳...... یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مختلف صورتوں سے آزماتے ہیں، عزت اور کامیابی کے مستحق وہی ہوتے ہیں جو آزمائش میں ثابت قدم رہتے ہیں۔(۱۶۳)

۴...... احکامِ الٰہی پر عمل سے بچنے کے لیے حیلہ سازی بدترین گناہ ہے۔(۱۶۳)

۵...... سچے مومن کی شان یہ ہے کہ وہ مایوس نہ ہو اور اپنی استطاعت کی حد تک برائی کے سدِّ باب کی کوشش جاری

{۳۲۷} ریاض الصالحین فی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر/۲۰۲، مسلم/ کتاب الایمان/ ۱/باب ۷۸

{۳۲۸} قلت من فریق الناجین، لانّھم من فریق الناھین(الکشاف ۲/ ۱۶۲)

{۳۲۹} تفسیر المراغی، الجزء التاسع/ ۹۶

بشکریہ اطلس القرآن اردو
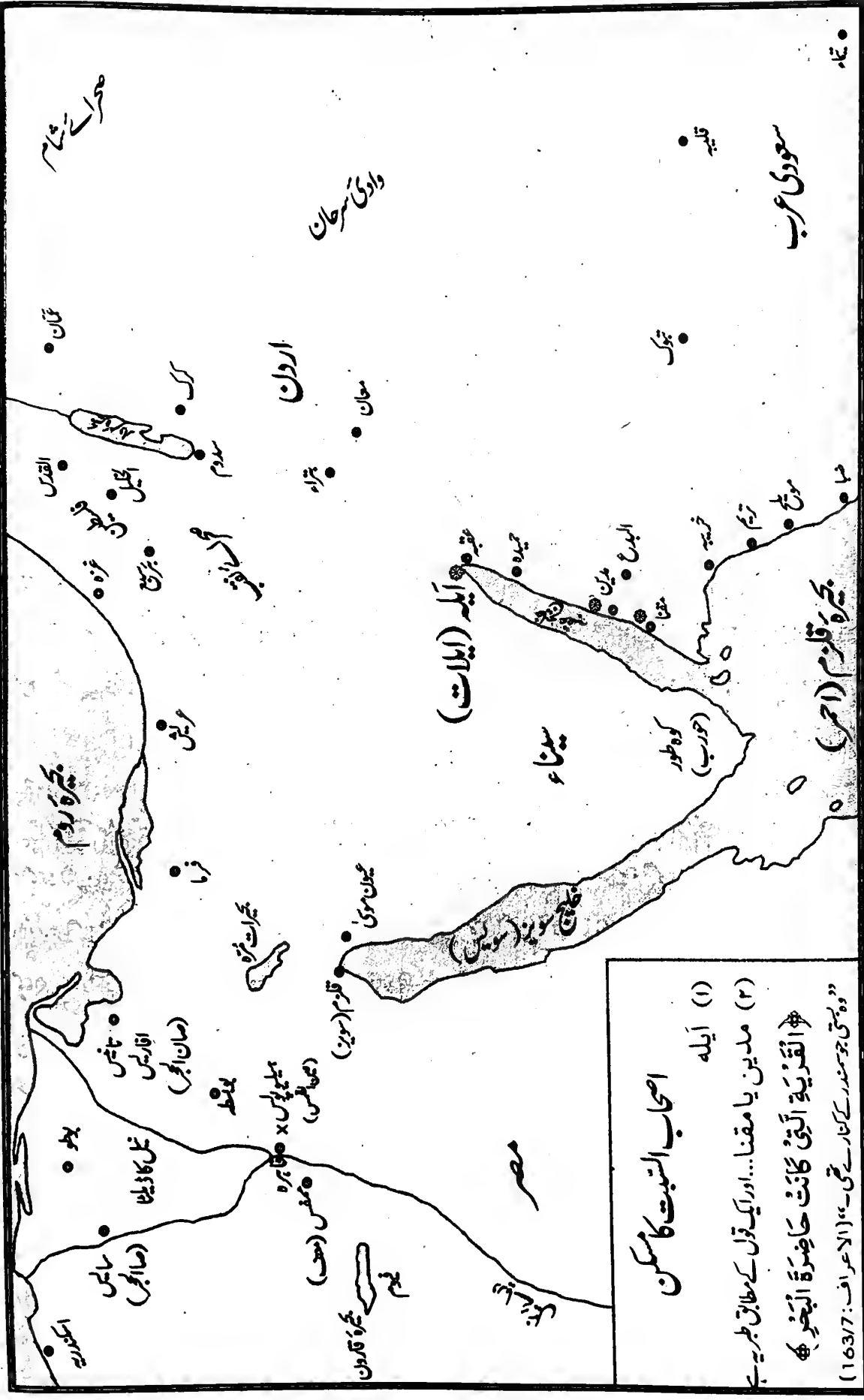
رکھے۔ (۱۶۴)

۶ ...... ہر وہ وسیلہ اور ذریعہ بھی حرام ہے جو حرام تک پہنچنے کا سبب بنے۔ (۱۶۴)

۷ ...... جب انسان اللہ کی طرف سے تنبیہ کے باوجود گناہ سے باز نہ آئے تو اسے نشانِ عبرت بنا دیا جاتا ہے۔

یہود کی ذلّت وخواری

﴿۱۶۷ ...... ۱۷۱﴾

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ

اور اس وقت کو یاد کرو جب خبر کردی تھی تیرے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا یہود پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو کہ دیا کرے

إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ۖ مِّنْهُمُ

ان کو برا عذاب، بیشک تیرا رب جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور متفرق کر دیا ہم نے ان کو ملک میں فرقے فرقے،

الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَٰلِكَ ۖ وَبَلَوْنَاهُم بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ

بعضے ان میں نیک اور بعضے اور طرح کے اور ہم نے ان کی آزمائش کی خوبیوں میں، اور برائیوں میں تاکہ وہ پھر آئیں۔ پھر ان کے پیچھے آئے

مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا

ناخلف جو وارث بنے کتاب کے، لے لیتے ہیں اسباب اس ادنیٰ زندگانی کا اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہو جائے گا اور اگر ایسا ہی اسباب

وَإِن يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ ۚ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لَّا يَقُولُوا عَلَى

ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیویں، کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا کہ نہ بولیں اللہ پر سوا سچ کے اور انہوں نے پڑھا ہے جو کچھ

اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِينَ

اس میں لکھا ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کیلئے، کیا تم سمجھتے نہیں؟۔ اور جو لوگ خوب پکڑ رہے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں

يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ﴿۱۷۰﴾ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ

نماز کو بیشک ہم ضائع نہ کریں گے ثواب نیکی والوں کا۔ اور جس وقت اٹھایا ہم نے پہاڑ ان کے اوپر مثل سائبان کے اور ڈرے کہ

كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۷۱﴾

وہ ان پر گرے گا ہم نے کہا پکڑ لو جو ہم نے تم کو دیا ہے زور سے اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم بچتے رہو۔

تسہیل: اور اس وقت کو یاد کیجیے جب تمہارے رب نے اعلان کر دیا تھا کہ یہود پر قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو

مسلّط کرتا رہوں گا جو انہیں بدترین سزا دیتے رہیں گے بلاشبہ تیرا رب نافرمانوں کو جلد سزا دے دیتا ہے اور توبہ کرنے والوں کو بخش دیتا اور ان پر رحم فرماتا ہے O اور ہم نے انہیں زمین میں کئی فرقوں میں تقسیم کر دیا، ان میں سے کچھ تو نیک ہیں اور کچھ ان سے بالکل مختلف ہیں، ہم نے انہیں نعمتیں دے کر بھی آزمایا اور مصائب میں بھی آزمایا کہ شاید وہ فسق وفجور سے باز آجائیں O پھر ان کے بعد نالائق جانشین آئے جو کتاب کے وارث بن کر دنیا ہی کا مال ومتاع سمیٹنے لگے اور کہتے یہ تھے کہ ''ہمیں معاف کر دیا جائے گا'' اور اگر ویسا دنیا کا مال ان کے سامنے دوبارہ آجائے تو اسے لے لیں گے، کیا ان سے تورات میں یہ وعدہ نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی طرف حق کے سوا کسی بات کی نسبت نہیں کریں گے؟ اور جو کچھ تورات میں تھا وہ پڑھتے بھی رہے اور آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ O اور جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں تو یقیناً ہم ایسے نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے O اور اس وقت کو بھی یاد کیجیے جب ہم نے کوہِ طور کو ان کے سروں پر یوں لا کھڑا کیا تھا گویا وہ سائبان ہے اور ہم نے کہا تھا کہ جو کچھ اس کتاب میں ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ O

تفسیر

﴿۱۶۷﴾......اے میرے حبیب! آپ اس وقت کو یاد کیجیے جب آپ کے ربّ نے یہود کو ان کے انبیاء کے واسطہ سے بتا دیا تھا کہ ان کی بدعملیوں کی وجہ سے قیامت تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں طرح طرح سے سزا دیتے رہیں گے، چنانچہ تاریخ کے مختلف ادوار میں یونانی، کشدانی، کلدانی، بابلی اور رومی ان پر مسلط رہے اور انہوں نے یہودیوں سے جزیہ بھی لیا اور خراج بھی وصول کیا۔ پھر اسلام کا دور آیا تو ہمارے آقا ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ آمد کے موقع پر یہود سے معاہدۂ صلح کر کے انہیں پُرامن زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کیا لیکن انہوں نے احد، احزاب وغیرہ مختلف مواقع پر مسلسل بدعہدی کی اور معاذ اللہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو ختم کرنے کے لیے درپردہ سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا بالآخر ان میں سے بعض کو قتل کر دیا گیا اور بعض کو مدینہ سے نکال دیا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جزیرۃ العرب سے ان کا مکمل صفایا کر دیا، جرمنی میں ہٹلر نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا وہ کسی سے بھی مخفی نہیں، باقی رہا ہمارے زمانے میں یہودیوں کا القدس پر تسلط، تو وہ ایک عارضی اور علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت ہے یہاں انہیں جمع کیا جا رہا ہے تاکہ ان کا قلع قمع کرنے کے لیے پوری دنیا میں انہیں تلاش کرنا نہ پڑے، آنے والا وقت ثابت کر دے گا کہ ''اسرائیل'' ان کے لیے پناہ گاہ نہیں بلکہ مقتل ہے جہاں وہ کشاں کشاں چلے آرہے ہیں۔

﴿۱۶۸﴾...... دوسری قوموں کے تسلط کے علاوہ عذاب کی دوسری صورت یہ تھی کہ انہیں فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا، یوں ان کی وحدت ختم ہو کر رہ گئی۔

یہود میں ایسے نیک لوگ بھی تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ دوسرے انبیاء پر بھی ایمان رکھتے تھے اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے تھے اور ایسے سرکش لوگ بھی تھے جو انبیاء کو قتل کرتے، سود اور رشوت کھاتے اور تورات میں تحریف کرتے تھے۔

﴿۱۶۹﴾...... پھر ان کے بعد ان کے نالائق جانشین آئے جن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد دنیا کمانا تھا خواہ حلال طریقے سے آئے یا حرام طریقے سے، ان کا خیال یہ تھا کہ چونکہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اس لیے ہم سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا بلکہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا۔

﴿وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ﴾ ایک طرف اپنی مغفرت کے دعوے کرتے ہیں دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ وہ گناہ چھوڑنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے، حالانکہ ان کی کتابوں میں مغفرت کا وعدہ کسی خاندان اور نسل کے لوگوں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے ہے جو ندامت، خوف اور آئندہ گناہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ توبہ کر لیں، یہی وعدہ قرآن میں بھی ہے، سورہ طٰہٰ میں ہے:

وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ {۳۳۰}

”اور میں ان لوگوں کو بہت معاف کرنے والا ہوں جو توبہ کرتے ہیں، ایمان لاتے ہیں، نیک عمل کرتے ہیں اور ہدایت پر قائم رہتے ہیں“

﴿أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ﴾ قرآن نے جس عہد کا ذکر کیا ہے وہ آج بھی تورات میں موجود ہے، کتاب استثناء میں ہے:

”تم اس کلام میں جو تمہیں فرماتا ہوں کچھ زیادہ نہ کیجیو اور نہ اس میں کم کیجیو“ {۳۳۱}

﴿۱۷۰﴾...... انفرادی اور اجتماعی اصلاح دو چیزوں کے بغیر ناممکن ہے ایک تمسّک بالکتاب اور دوسرے اقامتِ صلوٰۃ، کتاب کو صرف پڑھنا، اس کا ادب و احترام کرنا، ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر طاقوں میں سجانا اور چیز ہے اور تمسّک دوسری چیز ہے، پہلی چیز کا مقصد محض ثواب کا حصول ہے جبکہ دوسری کا مقصد نظریات اور اخلاق و اعمال کی تبدیلی ہے،

{۳۳۰} طٰہٰ/۲۰/۸۲

{۳۳۱} استثناء ۴:۲

تمسک کا معنی ہے کتاب اللہ کو سختی اور سنجیدگی سے پکڑ لینا، ویسے تو جو شخص جب اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے گا وہ ساری ہی عبادات کی پابندی کرے گا لیکن ان میں سے نماز کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ایمان کے بعد سب سے بڑی عبادت نماز ہے۔{٣٣٢}

دنیا کے چند ٹکوں کے عوض دین فروشی کرنے والے نالائق جانشینوں کا ذکر یونہی نہیں کیا گیا بلکہ امتِ اسلامیہ کو بتانا ہے کہ تمہارے دنیا پرست گدّی نشینوں میں بھی یہ بیماری پیدا ہوسکتی ہے جس کی وجہ سے اخلاق واعمال میں فساد برپا ہوجائے گا، حالات کی اصلاح اور اس قسم کی ساری روحانی بیماریوں کا علاج کتاب اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کے سوا کچھ نہیں۔

﴿١٧١﴾...... بنی اسرائیل کے قصے کے اختتام پر بتایا جارہا ہے کہ ان پر کوہِ طور اٹھا کر ان سے اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامنے کا عہد لیا گیا، انہوں نے یہ عہد کر بھی لیا تھا مگر بعد میں اسے فراموش کردیا۔ رہا یہ سوال کہ پہاڑ کا اٹھانا کیسے ممکن ہوگیا؟ تو یہ ممکن اور ناممکن کا مسئلہ تو انسان کے لیے ہے، باری تعالیٰ کے لیے سب کچھ ممکنات میں شامل ہے، البتہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ دراصل زلزلہ آیا تھا جس کی وجہ سے پہاڑ نے حرکت شروع کردی اس کے دامن میں رہنے والے سمجھے کہ ہم پر گرا چاہتا ہے، انہوں نے خوف کے مارے توبہ شروع کردی اور بقیہ زندگی میں تورات پر عمل کرنے کا وعدہ کرلیا۔

اسی لیے ''ظُلَّةٌ'' کے بجائے ''كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ'' کہا گیا ہے یعنی سائبان کی طرح محسوس ہوتا تھا اور اس کے بعد ''ظَنُّوٓا'' کا لفظ لا کر بتایا گیا ہے کہ ان کا گمان یہ تھا کہ ہمارے اوپر پہاڑ گرنے والا ہے۔

حکمت وہدایت:

١...... اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں پر ظالم حکمرانوں اور سرکش قوموں کو مسلط کردیتا ہے۔(١٦٧) یہ معاملہ صرف یہودیوں کے ساتھ نہیں تھا بلکہ خود مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے، بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ایک طرف مغربی اقوام ان پر مسلط ہیں تو دوسری طرف تقریباً پورے عالمِ اسلام پر ظالم حکمران قابض ہیں، ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے:

{٣٣٢} تفسیر کبیر/٥/٣٩٧

﴿اعمالکم عمالکم﴾ {۳۳۳}

''جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسے ہی تمہارے حکمراں ہوں گے''

یہاں یہ یاددہانی دوبارہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کو ماضی کی داستان سمجھ کر پڑھنا ہرگز مناسب نہیں یہ تو حال اور مستقبل کی کتاب اور ایسا شفاف آئینہ ہے جس میں ہر کوئی اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے، قرآن نے بار بار بتایا ہے کہ اللہ کے وضع کردہ عروج وزوال کے اصول اٹل ہیں، ایسا ناممکن ہے کہ جن راہوں پر پہلی قومیں چل کر زوال کا شکار ہوئیں، انہیں راستوں پر چل کر امتِ مسلمہ کو عروج حاصل ہو جائے، سورۂ نساء میں ہے:

لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَاۤ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْکِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ {۳۳۴}

''نہ تمہاری آرزوؤں سے کچھ ہوگا اور نہ ہی اہلِ کتاب کی خام خیالیوں سے کچھ ہوسکا، اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو بھی برائی کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا''

آج کا مسلمان یہودیوں کے نقشِ قدم پر چلنے کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ میں آخری پیغمبر کا امتی ہونے کی وجہ سے بہر حال عزت اور غلبے کا حقدار ہوں، ذلت تو صرف یہود کا مقدر ہے۔

۲......فرقہ واریت کا پھیلاؤ اور گروہ در گروہ تقسیم ہو جانا بھی عذابِ الٰہی کی ایک صورت ہے۔(۱۶۸)

۳......بے شمار لوگ ہیں جنہیں ذاتی صلاحیت کے بجائے محض وراثت میں مسند ملی ہے اس قسم کے ''گدی نشینوں'' اور ''صاحبزادوں'' نے دین کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔(۱۶۹)

۴......مغفرت کی امید پر مسلسل گناہ کیے جانا بہت بڑی جسارت بھی ہے اور حماقت بھی۔(۱۶۹)

۵......انہی لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے جو گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔(۱۶۹)

۶......زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی کتاب سے رہنمائی، اسے مضبوطی سے تھامنے اور عبادت کے اہتمام میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔(۱۷۰)

{۳۳۳} اتقان صفحہ ۶۵

{۳۳۴} النساء/۴/۱۲۳

عہدِ الست

﴿۱۷۲......۱۷۴﴾

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ

اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کے پٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں

أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ﴿١٧٢﴾ أَوْ

تمہارا رب بولے ہاں ہم اقرار کرتے ہیں کبھی کہنے لگو قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی۔ یا کہنے لگو کہ شرک تو نکالا تھا

تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ

ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے اور ہم ہوئے ان کی اولاد ان کے پیچھے تو کیا ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا

الْمُبْطِلُونَ ﴿١٧٣﴾ وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿١٧٤﴾

گمراہوں نے؟ اور یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں تا کہ وہ پھر آئیں۔

تسہیل: میرے حبیب! آپ ان کے سامنے وہ واقعہ ذکر کیجیے جب آپ کے رب نے آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا تھا اور انہیں خود اپنے اوپر گواہ بناتے ہوئے ان سے سوال کیا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں، آپ ہمارے رب ہیں ہم سب آپ کے رب ہونے کی گواہی دیتے ہیں، ہم نے تم سے یہ قول واقرار اس لیے لیا تا کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بالکل بے خبر تھے ○ یا یہ عذر نہ پیش کرو کہ شرک کی ابتداء تو ہمارے بڑوں نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں پیدا ہوئے، کیا آپ ہمیں ایسی غلطی کی سزا دیتے ہیں جس کی بنیاد غلط کار لوگوں نے رکھی تھی؟ ○ ہم اپنی نشانیاں یونہی کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تا کہ یہ لوگ حق کی طرف لوٹ آئیں ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۷۲﴾...... یہاں اس عظیم الشان عہد کا ذکر ہے جو عبد اور معبود کے درمیان اس وقت ہوا تھا جب یہ دنیا وجود میں نہیں آئی تھی، اسے عہدِ ازل بھی کہا جاتا ہے اور عہدِ الست بھی، قرآن نے اس عہد کو حیران کن انداز میں اجمالی طور پر پیش کیا ہے، تفصیل اس لیے بیان نہیں کی کیونکہ آج سے چودہ سو سال پہلے کا انسان اسے سمجھنے سے قاصر تھا، انسان کے

مزاج اور تخلیق کے بارے میں دنیا بھر کے دانشوروں کی معلومات چند اوہام اور مفروضات پر مشتمل تھیں، اس لاعلمی کے ماحول میں جب یہ بتایا گیا کہ آدم علیہ السلام کو پیدا فرمانے کے بعد قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کو بھی پیدا کرلیا گیا، جو چھوٹے چھوٹے جرثوموں کی شکل میں تھے اور ان سے عہد و پیمان لیا گیا تھا تو ظاہر پرست ذہنوں میں کئی اشکالات نے سر اٹھایا، مثلاً یہ کہ کیا ان جرثوموں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی تھی؟ یا یہ کہ وہ کونسا میدان تھا جس میں قیامت تک پیدا ہونے والے اربوں انسان سما گئے؟

جدید تحقیقات:

جدید تحقیقات کی روشنی میں ان اشکالات کا جائزہ لیا جائے تو بچگانہ معلوم ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ سچ فرماتے ہیں:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ {۳۳۵}

"ہم عنقریب انہیں آفاق اور خود ان کے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ حق ہے"

بہت ساری نشانیاں انسان دیکھ چکا ہے اور بے شمار ایسی ہیں جو پردۂ غیب میں ہیں اور بتدریج سامنے آرہی ہیں، ان انکشافات نے مادہ پرستوں کے نظریات کا کھوکھلا پن اور قرآن کی سچائی واضح کردی ہے، ان انکشافات میں سے اہم ترین انکشاف ڈی این اے کا وجود اور اس کی زندگی کا کوڈ ہے جس میں معلومات کا ایک انبار پوشیدہ ہوتا ہے۔ ڈی این اے ہمارے جسم کے سو کھرب خلیوں میں ہر ایک خلیے کے مرکزے (Nucieus) میں بڑی حفاظت سے موجود ہوتا ہے، ہر خلیے کا قطر میٹر کے دس لاکھویں حصے کے برابر ہوتا ہے، اتنے چھوٹے خلیے کے درمیان ڈی این اے محفوظ ہوتا ہے، اس ڈی این اے میں انسانی جسم کی ساخت اور بناوٹ کی تمام تر تفصیلات اتنی وسعت، گیرائی اور گہرائی کے ساتھ لکھی ہوئی ہیں کہ اس کا وجود اللہ رب العزت کی صناعی کی اپنے آپ میں ایک مثال ہے، اس علم کو ایک عظیم الشان شعبۂ علم سے وابستہ کرکے اس کو جنیات (Jenetice) کا نام دیا گیا ہے۔ ۲۱ ویں صدی کی یہ علمی شق ابھی گھٹنوں چلنے کی عمر میں ہے اس میدان میں ابھی اور نہ جانے کیا کیا انکشافات ہونے ہیں۔

آج مثلاً ۲۵ سال کی عمر میں ہم اپنا سراپا آئینے میں دیکھیں تو یہ بے داغ جسم، یہ حسین و پرکشش شکل و شباہت، یہ صحت و تندرستی، یہ علم و دانش سے آراستہ ذہن و عقل کس طور ترقی کرتے ہوئے اس حال کو پہنچیں گے، یہ علم ۲۵ سال پہلے اس ڈی این اے میں لکھ دیا گیا تھا جو ماں کے پیٹ میں سب سے پہلے بار آور شدہ بیضے (Edeg Fertilize)

{۳۳۵} حٰم السجدہ/۴۱/۵۳

کے خلیے کی شکل میں نمو پایا تھا۔

اتنا ہی نہیں ہماری لمبائی چوڑائی، وزن، ناک نقشہ، چہرہ مہرہ، بالوں اور آنکھوں کا رنگ، جلد کی رنگت، خون کی قسم وغیرہ نطفہ ٹھہرنے سے شروع ہو کر موت تک روز بروز، ماہ بہ ماہ، سال بہ سال تبدیلیوں کا حال ایک مکمل تسلسل کے ساتھ ڈی این اے میں موجود رہتا ہے، مثلاً اس میں لکھا رہتا ہے کہ کب کب خون کا دباؤ زیادہ ہوگا اور کب کم رہے گا، کب سر کا پہلا بال سفید ہوگا اور کب دور کی اور قریب کی نظر کمزور ہو جائے گی۔

ڈی این اے میں پوشیدہ معلومات کا ذخیرہ کوئی معمولی ذخیرہ نہیں، ایک ڈی این اے میں موجود معلومات کو اگر کتابی شکل میں منتقل کیا جائے تو یہ برطانوی انسائیکلوپیڈیا جیسی ۹۲۰ جلدوں یعنی فل سائز کے ۱۰ لاکھ صفحات میں سما سکے گا، ان جلدوں کو اگر ایک دوسرے کے اوپر سجایا جائے گا تو ۷۰ میٹر اونچا کتابوں کا مینار تیار ہو جائے گا، یہ سب معلومات اس ذرّے میں سما دی گئی ہیں جو پروٹین، چربی اور پانی کے چند مالیکیولوں سے مرکب ہے۔

جی جی تھامسن نے لکھا تھا کہ ہماری زمین پر کل جاندار اشیاء ایک ہزار ملین ہیں، ان تمام اشیاء کی معلومات ڈی این اے کی شکل میں جمع کی جائیں تو چائے کے ایک چمچے میں آجائیں گی اور پھر بھی جگہ خالی رہے گی۔

ایک انسانی خلیے کے ایک ڈی این اے میں ۲ لاکھ جینز ہوتے ہیں، ۲ لاکھ جینز میں محفوظ معلومات، ڈی این اے میں کل معلومات کا صرف ۳ فی صد ہی ہوتی ہیں، ۹۷ فی صد دفترِ علم ابھی تک پردۂ راز میں ہے اور اس تک انسان کی رسائی نہیں ہو سکی، صرف ۳ فی صد معلومات کا پتہ ملنے پر عقلِ انسانی حیران ہے۔☆

جب ۹۷ فی صد پوشیدہ معلومات کلی یا جزوی طور پر سامنے آئیں گی تو نمعلوم کیا ہوگا، لیکن اتنا ضرور ہوگا کہ وجودِ خدا کے منکر اس کا وجود اور قرآن کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، تب یقیناً ''عہدِ الست'' کے وقوع پذیر ہونے میں بھی کوئی شک نہیں رہے گا، لیکن ایک مسلمان آج بھی ایمان رکھتا ہے کہ ازل میں سارے انسانوں سے عہد لیا گیا تھا البتہ وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ اس عہد اور سوال و جواب کی کیفیت کیا تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو غیب میں رکھا ہے، یہ کیفیت انسان کی سمجھ میں تبھی آئے گی جب خود باری تعالیٰ اس کی ذہنی سطح بلند کر کے اس کے اندر ان معاملات کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر دے گا۔

☆ ...... یہ اس مضمون کا خلاصہ ہے جو ماہنامہ ترجمان القرآن کی جلد ۱۳۵ میں شائع ہوا تھا اور اس کا عنوان تھا ''ڈی این اے تخلیقِ الٰہی کا کرشمہ''

مزید وضاحت:

قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کی مزید وضاحت جن احادیث میں آئی ہے ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جو ابوداؤداور ترمذی میں حضرت مسلم بن یسار سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ رسولِ اکرم ﷺ سے بھی اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تھا، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر اپنا دستِ قدرت ان کی پشت پر پھیرا تو اس سے وہ نیک انسان نکل آئے جو مستقبل میں پیدا ہونے والے تھے، ان کے بارے میں فرمایا کہ میں نے انہیں جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جنت والے عمل ہی کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ہاتھ پھیرا تو جتنے بدکار انسان ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے وہ نکل آئے اور فرمایا کہ میں نے انہیں دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخ میں جانے والے عمل ہی کریں گے۔''

ایک شخص نے سوال کیا یارسول اللہ! جب جنتی اور دوزخی ہونے کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی کو جنت کے لیے پیدا فرماتا ہے تو وہ اہلِ جنت والے عمل ہی کرتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ اہلِ جنت ہی کے کسی کام پر ہو جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو دوزخ کے لیے پیدا فرماتا ہے تو وہ اہلِ دوزخ والے اعمال ہی میں لگتا ہے حتّٰی کہ اس کا خاتمہ بھی کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو دوزخیوں والا ہوتا ہے۔{۳۳۶}

یہ مضمون متعدد احادیث اور آثار میں آیا ہے جس کی وجہ سے اس نکتے پر تو تمام علماء کا اتفاق ہے کہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو پیدا کیا گیا اور ان میں سے جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان امتیاز کیا گیا لیکن ان سے عہد لیے جانے کے مفہوم کے بارے میں اختلاف ہے۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ انسانوں کو ذرّات اور جرثوموں کی صورت میں پیدا کرنے کے بعد انہیں عقل اور قوّتِ گویائی عطا کی گئی اور پھر ان سے عہد و پیمان لیا گیا، ڈی این اے کے حوالے سے اوپر جو بحث کی گئی ہے اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایسا ہونا عقلاً نہ محال ہے نہ ناممکن! ویسے بھی اللہ قادر ہے وہ لکڑی اور پتھر کو بھی سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت عطا کر سکتا ہے۔

{۳۳۶} ابوداؤد/۲/کتاب السنّۃ/۱۶/ترمذی، تفسیر/سورۃ۷، مسنداحمد/۱/۴۵

زبانِ حال:

دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس عہد و پیمان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو توحید کی فطرت پر پیدا کیا ہے اور جس شہادت کا یہاں ذکر ہے وہ قول سے نہیں حال سے لی گئی تھی۔

اس دعویٰ کی تائید میں کئی آیات اور احادیث پیش کی جاسکتی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

سورۂ توبہ میں ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ {۳۳۷}

''مشرکوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی مسجدیں تعمیر کریں جب کہ حال یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے ہیں''

مطلب یہ ہے کہ کافروں کا حال اور طرزِ زندگی ان کے کفر کی گواہی دیتا ہے ورنہ اپنی زبان سے تو وہ کافر ہونے کا اقرار نہیں کرتے تھے۔

سورۂ ابراہیم میں ہے:

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ {۳۳۸}

''اور اللہ نے تمہیں وہ سب کچھ دیا جس کا تم نے اس سے سوال کیا''

فطرت

جہاں تک توحید کی فطرت پر پیدا کیے جانے کا تعلق ہے تو اس کی تصدیق درجِ ذیل آیت اور حدیث سے ہوتی ہے:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ {۳۳۹}

''اے میرے حبیب! آپ یکسو ہو کر دین کی طرف متوجہ ہو جائیں یہی اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی اس بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی''

{۳۳۷} توبہ ۱۷/۹

{۳۳۸} ابراہیم ۳۴/۱۴

{۳۳۹} الروم ۳۰/۳۰

اسی طرح حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

(کلّ مولود یّولد علی الفطرۃ فأبواہ یھوّدانہ أوینصرانہ أویمجسّانہ، کمثل البھیمۃ تنتج البھیمۃ ھل تری فیھا جدعآء){۳۴۰}

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں جیسے جانور تندرست پیدا ہوتے ہیں، کیا تمہیں ان میں کوئی ایک بھی کان کٹا دکھائی دیتا ہے؟''

اسی طرح حضرت عیاض بن حماد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو سیدھا پیدا کیا، ان کے پاس شیطان آئے جنہوں نے انہیں دین کے سیدھے راستے سے ہٹا دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان پر حلال کی تھیں'' {۳۴۱}

ان آیات اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اولادِ آدم سے گواہی لیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں عقل وفہم کا ایسا درجہ عطا کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ کوشش کرتے تو اپنے رب کو پہچان سکتے تھے، کیونکہ انسان عقل وفہم ہی کی بناء پر مکلّف ہوتا ہے اگر وہ اس نور سے محروم ہو تو شارع کی نظر میں مکلّف نہیں ہوگا۔

حدیث میں تین افراد کو مرفوع القلم قرار دیا گیا ہے یعنی بچہ جب تک کہ بالغ نہ ہو جائے، دیوانہ جب تک کہ اسے افاقہ نہ ہو جائے اور سونے والا جب تک کہ بیدار نہ ہو جائے۔{۳۴۲}

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص مکمل طور پر یا کسی عارض کی وجہ سے وقتی طور پر عقل سے محروم ہو اس پر شریعت کے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔

زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں کو اسی لیے امانت یعنی عہدو پیمان کے قابل نہیں سمجھا گیا کہ وہ اس عقل سے خالی تھے جس کی وجہ سے افہام وتفہیم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے جبکہ نورِ عقل سے مشرف ہونے کی وجہ سے انسان کو اس بارِ امانت کے قابل سمجھا گیا۔

نابالغ بچہ اسی لیے غیر مکلف ہوتا ہے کہ وہ عقل کے اس معیار سے محروم ہوتا ہے جس کی روشنی میں صحیح اور غلط، حق اور باطل کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

{۳۴۰} بخاری ۱/۱۸۵/باب ماقیل فی اولاد المشرکین۔

{۳۴۱} صحیح مسلم/۲/جنّۃ/باب ۶۴

{۳۴۲} بخاری ۲/۷۹۴/باب الطّلاق فی الاغلاق والکرہ......الخ

ان مذکورہ دلائل کی بناء پر مفسرین کی ایک قابلِ ذکر جماعت کی رائے یہ ہے کہ شہادت لیے جانے کا مفہوم یہ ہے کہ اولادِ آدم کو توحید اور اسلام کی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے اور انہیں ایسی صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ غور وفکر کر کے حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔{۳۴۳}

﴿۱۷۴﴾...... انسان پر یہ حجت اس لیے قائم کی گئی تا کہ وہ قیامت کے دن بے خبری یا باپ دادا کی تقلید کا عذر پیش نہ کر سکے اس لیے کہ دین کے اصول اور عقائد میں تقلید کا کوئی اعتبار نہیں، ویسے بھی جب انہیں عقل وفہم سے نوازا گیا تھا تو انہیں اسے کام میں لانا چاہیے تھا۔

حکمت وہدایت:

۱...... یہ تسلیم کرنے میں کوئی تعجب نہیں کہ ازل میں اللہ نے سارے انسانوں کو پیدا کر کے ان سے اپنی ربوبیت کا عہد و پیمان لیا تھا۔(۱۷۲)

۲...... توحید کا اقرار اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے، انکار کرنے والے فطرت کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔(۱۷۲)

۳...... جہالت ایسا عذر نہیں جس کی وجہ سے قیامت کے دن کسی کو معاف کر دیا جائے اگر بالفرض کسی انسان تک رسالت کا پیام نہ بھی پہنچا ہو تو بھی اس پر شرک سے اجتناب لازم ہے۔(۱۷۳)

۴...... کافر حقیقت میں دہرا کفر کرتا ہے اس لیے کہ ایک تو وہ اس عہد کا انکار کرتا ہے جو ازل میں لیا گیا تھا دوسرے وہ اس عالمِ رنگ و بو میں دلائل دیکھ لینے کے باوجود اللہ کا انکار کرتا ہے، جبکہ کافر کے برعکس مومن کو دوبارا ایمان کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

۵...... جس کا بچپن ہی میں انتقال ہو جائے وہ عہدِ الست کی وجہ سے جنت میں داخل ہونے کا حقدار ہو گا لیکن عاقل بالغ شخص کی نجات کے لیے صرف ازلی عہد و پیمان کافی نہیں، زبان سے اقرار اور دل سے یقین بھی ضروری ہے۔

{۳۴۳} تفصیل کے لیے دیکھیے روح المعانی ۶/۱۴۶، قرطبی ۷/۲۷۶، کبیر ۵/۳۹۷، ابن کثیر ۲/۳۴۷

بلعم بن باعوراء کا قصّہ

﴿۱۷۵......۱۷۷﴾

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ

اور سنا دے ان کو حال اس شخص کا جس کو ہم نے دی تھیں اپنی آیتیں پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا پھر اس کے پیچھے لگا شیطان تو وہ

الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ

ہو گیا گمراہوں میں۔ اور ہم چاہتے تو بلند کرتے اس کا رتبہ ان آیتوں کی بدولت لیکن وہ تو ہو رہا زمین کا اور پیچھے ہو لیا اپنی

كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ

خواہش کے تو اس کا حال ایسا جیسے کتا، اس پر تو بوجھ لادے تو ہانپے اور چھوڑ دے تو ہانپے، یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَا ِۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ

نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو، سو بیان کر یہ احوال تاکہ وہ دھیان کریں۔ بری مثال ہے ان لوگوں کی کہ جھٹلایا انہوں نے ہماری

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

آیتوں کو اور وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

ربط: پہلے یہ بتایا گیا کہ ازل میں سارے انسانوں سے عہد و پیمان لیا گیا تھا اور یہ کہ انہیں علم و فہم کی صلاحیت دی گئی ہے، اب بتایا جا رہا ہے کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو علم رکھنے کے باوجود اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

تسہیل: اور آپ انہیں اس شخص کا قصہ سنائیے جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا لیکن وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا، پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں داخل ہو گیا ○ اگر ہم چاہتے تو ان آیات پر عمل کی توفیق دے کر اس کے درجات بلند کر دیتے لیکن اس نے پستی کا راستہ اختیار کیا اور اپنی خواہش کی اتباع کرنے لگا سو ایسے شخص کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تم اس پر حملہ کرو تو بھی وہ ہانپتا ہے اور اگر حملہ نہ کریں تو بھی وہ ہانپتا ہے، یہ ان سب لوگوں کی مثال ہے جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، آپ انہیں ایسے قصے سناتے رہیں شاید یہ لوگ غور و فکر کریں ○ ایسے لوگوں کی مثال بہت بری ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے اور خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۷۵﴾......اس آیتِ کریمہ میں جس شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس کا نام کسی روایت میں بلعام بن عامر، کسی

میں امیہ بن ابی صلت، کسی میں ابو عامر الراھب اور زیادہ تر روایات میں بلعم بن باعوراء بتایا گیا ہے۔{۳۴۴}

تورات میں بھی اس کا قصہ آیا ہے۔{۳۴۵}

ساری روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے علم وفضل اور عزت وکرامت سے نوازا تھا، بجائے اس کے کہ وہ اللہ کا شکرادا کرتا اور اپنے علم پر عمل کرتا، اس نے علم کے خلاف عمل کیا اور دنیا کے متاعِ قلیل کے بدلے ایمان فروشی کے لیے تیار ہوگیا چنانچہ اسے علم وفضل سے محروم کردیا گیا۔

دیکھا جائے تو یہ ہر اس شخص کا قصہ ہے جسے علم اور ایمان عطا کیا گیا ہو لیکن وہ دنیا کی زیب وزینت سے متاثر ہوکر اپنے خالق ومالک کے حکموں اور علم کے تقاضوں کو فراموش کردے اور تقوای کا لباس ایسے اتار دے جیسے بوسیدہ اور میلے کچیلے کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں اور جیسے سانپ موسم بدلنے پر اپنی کینچلی اتار دیتا ہے۔{۳۴۶}

﴿۱۷۶﴾...... اگر ہم چاہتے تو اس شخص کو کمال کے درجات تک پہنچا دیتے اور علم وعرفان میں اسے وہ مقام عطا کردیتے جو باعمل علماء کو عطا کیا جاتا ہے لیکن خود اس شخص نے مادیت کو روحانیت پر، ذلت اور پستی کو عزت اور بلندی پر، دنیاداروں کی خوشنودی کو اللہ کی رضا اور قرب پر اور اپنی خواہشات کی اتباع کو احکامِ الٰہی کی اتباع پر ترجیح دی۔{۳۴۷}

اللہ کا دستور

لہٰذا ہم نے بھی اسے تزکیہ اور اتباع پر مجبور نہیں کیا اس لیے کہ یہ ہمارا دستور نہیں، ہمارا دستور تو یہ ہے کہ ہم انسان کو عقل کا نور عطا کرتے ہیں، اس کی ہدایت کے لیے انبیاء اور رسل بھیجتے ہیں، وحی کے ذریعے اسے حق اور باطل کا فرق بتاتے ہیں، یہ بھی سمجھا دیتے ہیں کہ وحی کی اتباع میں کامیابی اور خواہشات کی اتباع میں ناکامی ہے اس سب کچھ کے باوجود بھی اگر کوئی ضلالت ہی کے راستے پر چلنا پسند کرے تو ہم اسے اسی راہ پر چلنے دیتے ہیں جس پر وہ چلنے کا فیصلہ کرلے۔

{۳۴۴}قرطبی ۷/۲۸۱-۲۸۰، التفسیر الکبیر ۵/۴۰۳

{۳۴۵}تورات سفرِ عدد باب ۲۲-۲۳-۲۴ صفحہ ۱۸۵-۱۹۰

{۳۴۶}انسلغ من ثیابہ...... تجرّد الحیّة من قشرھا)(المنجد ۳۴۴(قال ابوسعود فالتعبیر عنہ بالانسلاخ......للایذان بکمال مباینتہ للآیات بعدان کان بینھما کمال الاتصال (ابی سعود ۳/۵۲)

{۳۴۷} والمعنی ولکنہ آثرالدنیا الدنیة علی المنازل السنیة(حوالۂ مذکورہ)

﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ ''ہم اسے ادھر ہی پھیر دیتے ہیں جدھر کا اس نے رخ کیا ہے''

سورۂ اسراء میں ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۤءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۤئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَاۤءِ وَهٰۤؤُلَاۤءِ مِنْ عَطَاۤءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاۤءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝ {۳۴۸}

''جو شخص دنیا چاہتا ہو تو ہم جس کو دینا چاہیں اور جتنا چاہیں دے دیتے ہیں پھر ہم اس کے لیے دوزخ مقدر کر دیتے ہیں جس میں وہ ذلیل اور دھتکارا ہوا داخل ہوگا اور جو آخرت کا طلبگار ہو اور اس کے لیے کوشش بھی کرے اور وہ مومن ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش کی قدر کی جائے گی، ہم دونوں قسم کے لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور یہ آپ کے رب کا عطیہ ہے اور آپ کے رب کا عطیہ بند نہیں ہے دیکھو ہم نے کیسے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور آخرت کے درجات اور فضیلت تو بہت بڑی ہوگی''

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ اس شخص کی حالت کتّے کی سی ہے جو ہر حال میں ہانپتا رہتا ہے، عام جانور صرف اس وقت ہانپتے ہیں جب انہیں مشقت اٹھانی پڑے یا جب ان پر کوئی حملہ کر دے لیکن کتا ہر حال میں ہانپتا رہتا ہے خواہ وہ امن اور سکون ہی سے بیٹھا ہوا کیوں نہ ہو۔

﴿ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ﴾ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اللہ کی آیات کو جھٹلاتے اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، انہیں کسی حالت میں بھی سکون اور چین نصیب نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں حاصل ہونے کے باوجود انہیں مزید عیش و عشرت کی ہوس پریشان رکھتی ہے۔ اگر اہلِ کتاب اور مشرکین اللہ کی عطا کی ہوئی فطری صلاحیتوں کو کام میں لاتے تو انہیں روحانی بلندیاں نصیب ہوتیں مگر انہوں نے تو وہی رویہ اختیار کیا جو اس شخص نے اختیار کیا تھا جسے علم و فضل عطا کیا گیا تھا لیکن اس نے علم پر عمل کے بجائے دین دشمنوں کا ساتھ دیا اور اس جرم کی پاداش میں اسے نورِ علم سے محروم کر دیا گیا۔

﴿۱۷۷﴾...... جو لوگ اللہ کی آیات میں تدبّر اور تفکّر کے بجائے ان سے اعراض کرتے ہیں اور علم کو چند ٹکوں کے بدلے بیچ دیتے ہیں وہ کسی اور پر نہیں صرف اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، اللہ نے تو انہیں فطری صلاحیتیں عطا کی تھیں مگر ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے انہوں نے ان صلاحیتوں کو شر اور ضرر ہی میں استعمال کیا۔

{۳۴۸} الاسراء/۱۷/۱۸-۲۱

حکمت وہدایت:

۱......جسے اللہ تعالیٰ نے علمِ دین عطا کیا ہو اس کے باوجود وہ مادی خواہشات کو دین کے تقاضوں پر ترجیح دے اسے کبھی سکون نہیں مل سکتا اور اس کی مثال ہانپتے ہوئے کتے کی سی ہے جو بلا ضرورت ہر وقت ہانپتا رہتا ہے۔(۱۷۶)

۲......کسی شخص کو اپنے علم و فضل اور زہد و عبادت پر ناز نہیں کرنا چاہیے، حالات بدلتے اور بگڑتے دیر نہیں لگتی جیسے بلعم بن باعوراء کا حشر ہوا، طاعت و عبادت کے ساتھ اس کی توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر اور استقامت کی دعا اور اللہ تعالیٰ پر توکّل کرنا چاہیے۔{۳۴۹}

۳......ایسے مواقع اور ان کے مقدمات سے بھی آدمی کو پرہیز کرنا چاہیے جہاں اس کو اپنے دین کی خرابی کا اندیشہ ہو، خصوصاً مال اور اہل و عیال کی محبت میں اس انجامِ بد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔{۳۵۰}

۴......مفسد اور گمراہ لوگوں سے تعلق اور ان کا ہدیہ یا دعوت وغیرہ قبول کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے، بلعم اس بلاء میں ان کا ہدیہ قبول کرنے کے سبب مبتلا ہوا۔{۳۵۱}

۵......قرآن کریم کی بیان کردہ مثالوں اور قصوں میں خوب غور و فکر کرنا چاہیے اس لیے کہ ان میں بہت ساری عبرتیں اور نصیحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

۶......تدبّر اور تفکر کی اللہ کے نزدیک خصوصی اہمیت ہے اس لیے کہ صحیح نھج پر غور و فکر انسان کو حقیقی علم اور معرفت کا راستہ دکھاتا ہے، متعدد آیات میں اس کی ترغیب دی گئی ہے:

سورۂ زمر میں ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ {۳۵۲}

''بے شک اس میں ایسے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں''

سورۂ یونس میں ہے:

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ {۳۵۳}

''اسی طرح ہم آیات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں''

{۳۴۹} معارف القرآن ۱۲۲/۴

{۳۵۰} حوالۂ مذکورہ

{۳۵۱} حوالۂ مذکورہ

{۳۵۲} الزمر/۳۹/۴۲

{۳۵۳} یونس/۱۰/۲۴

۷......یہ آیتِ کریمہ (۱۷۵) اہلِ علم کے لیے بڑی سخت ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو عالم اپنے علم پر عمل نہ کرے وہ علم کی برکت سے محروم اور اللہ سے بہت دور چلا جاتا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

﴿من ازداد علما، ولم يزدد زهدا، لم يزدد من الله الابعدا﴾ {۳۵۴}

''جسے اللہ زیادہ علم عطا کرے مگر اس کے زہد میں اضافہ نہ ہو تو ایسا علم اس شخص کو اللہ سے بعید سے بعید تر کرنے کا سبب بنتا ہے۔

ہدایت وضلالت کے اسباب

﴿۱۷۸......۱۷۹﴾

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا

جس کو اللہ رستہ دے وہ ہی رستہ پاوے اور جس کو وہ بچلا دے سو وہی ہیں ٹوٹے میں۔ اور ہم نے پیدا کیے دوزخ کے واسطے

لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ

بہت سے جن اور آدمی، ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں کہ ان سے

بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

سنتے نہیں، وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ وہی لوگ ہیں غافل۔

تسہیل: ہدایت اسی کو ملتی ہے جسے اللہ ہدایت دیتا ہے اور جنہیں اللہ گمراہ کردے وہ خسارے میں پڑ جاتے ہیں ○ یقیناً ہم نے بہت سے جنّات اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں، ان کے دل تو ہیں مگر وہ ان سے حق بات کو نہیں سمجھتے، ان کی آنکھیں تو ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے کان تو ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں، یہی لوگ غافل ہیں ○

﴿۱۷۸﴾......اللہ تعالیٰ نے انسان کو دونوں راستے دکھادیے ہدایت کا راستہ بھی اور گمراہی کا راستہ بھی۔

{۳۵۴} تفسیر کبیر ۵/۴۰۵

سورۂ بلد میں ہے:

﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾

''اور ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں''

سورۂ دھر میں ہے:

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾

''ہم نے اسے راستہ بتا دیا ہے اب یا تو وہ شکر کرنے والا بنے گا یا کفر کرنے والا''

راستہ دکھانے سے بھی پہلے اسے باری تعالیٰ نے اچھی فطرت پر پیدا کیا اور عقل اور حواس عطا کیے اگر اسے ان حواس کو راہِ ہدایت پر چلنے کے لیے استعمال کی توفیق دے دی جائے تو وہ ہدایت پا جاتا ہے اور اگر وہ توفیق سے محروم رہے تو گمراہ ہو جاتا ہے۔

چونکہ ہدایت کا راستہ ایک ہی ہے اور گمراہی کے راستے مختلف ہیں اس لیے اس آیت میں ہدایت پانے والے کو مفرد کے صیغے ''الْمُهْتَدِیْ'' سے تعبیر کیا گیا اور گمراہوں کو جمع کے صیغے ''الْخٰسِرُوْنَ'' سے ذکر کیا گیا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ گمراہوں کی سزا تو ذکر کی گئی ہے یعنی خسارہ مگر ہدایت پانے والوں کی جزا ذکر نہیں کی گئی بلکہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ جسے اللہ ہدایت دیدے وہ ہدایت یافتہ ہے...... اس میں اشارہ ہے کہ ہدایت، بذاتِ خود اتنی بڑی نعمت اور جزا ہے کہ دوسری کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، جسے ہدایت مل گئی اسے جنت، راحت، مغفرت اور رضوان سمیت سب کچھ مل گیا۔

اہلِ ضلالت

﴿۱۷۹﴾...... اس آیتِ کریمہ میں اہلِ ضلالت کی مزید وضاحت ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے، متعدد دوسرے مقامات کے علاوہ سورۂ شوریٰ میں بھی یہ مضمون آیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ {۳۵۵} ''ایک جماعت جنت میں ہوگی اور دوسری جماعت دوزخ میں جائے گی''

اس کے بعد دوزخ میں جانے کے اسباب بتائے گئے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی دی ہوئی علمی اور فکری قوتوں کو صحیح کاموں میں نہیں لگاتے، جن کی عقل، کان اور آنکھیں سب غلط کاموں میں استعمال ہو رہے ہیں

{۳۵۵} الشوریٰ /۴۲/۷

وہی دوزخ میں جائیں گے۔ اگر وہ اپنے دل اور دماغ صحیح مصرف میں استعمال کرتے تو جان لیتے کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق ہے اس کے وجود اور قدرت کی نشانیاں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں، وہی اس کا نظام چلا رہا ہے، ہر قسم کی عبادت کا مستحق وہی ہے، اس کے ساتھ کسی بھی مخلوق کو شریک ٹھہرانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اگر وہ اپنی عقل پر ظلمت اور مادیّت کے ردّے نہ چڑھا لیتے تو جان لیتے کہ منکرات سے بچنے اور حسنات کے اختیار کرنے ہی میں دنیا اور آخرت کی فلاح ہے، اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی اتباع میں سعادت کا راز پوشیدہ ہے اور اس سے بغاوت میں شقاوت ہی شقاوت ہے۔

اگر وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف نہ کر لیتے تو ضرور جان لیتے کہ مرنے کے بعد کی زندگی یقینی اور ایک ایسے دن کا ہونا ضروری ہے جب سارے انسانوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک انصاف ہو، ظالم کو اس کے ظلم کی سزا ملے اور مظلوم کی دادرسی ہو۔

﴿ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ ﴾ مشرکین اپنے کانوں اور آنکھوں کو بھی آیاتِ الٰہیہ میں غور و فکر کے لیے استعمال نہیں کرتے، اگر وہ ایسا کرتے تو دنیا اور آخرت کی سعادت سے محروم نہ رہتے، ایسے ہی لوگ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے دلوں، آنکھوں اور کانوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے:

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ {۳۵۶}

''اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے''

سورۂ نحل میں ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ {۳۵۷}

''یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں''

مہر لگانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ علم و ہدایت کے ان ذرائع سے فائدہ نہیں اٹھاتے، یہ مطلب نہیں کہ انہیں حقیقتاً بہرا، اندھا اور پاگل کر دیا گیا تھا کیونکہ عملی زندگی میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کفار کسبِ معاش اور دنیا میں فتنہ و فساد پھیلانے میں بڑے تیز طرار ثابت ہوتے ہیں۔

{۳۵۶} البقرۃ/۲/۷

{۳۵۷} النحل/۱۶/۱۰۸

﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ﴾ جولوگ اپنی عقل اور دوسرے حواس کو صرف دنیا تک محدود رکھتے ہیں وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں، کیونکہ چوپائے اپنی طبعی اور حیوانی ضروریات کی تکمیل کے لیے فطرت کے طریقوں اور حدود سے تجاوز نہیں کرتے جبکہ انسان جب مقامِ انسانیت سے گرجاتا ہے تو کھانے پینے اور شہوانی خواہشات کی غلامی میں تمام حدود پھلانگ جاتا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ غفلت کے مختلف درجات ہیں لیکن سب سے بڑے غافل وہ ہیں جو اللہ کی عطا کردہ علمی اور عقلی صلاحیتوں کو اس کی معرفت اور آیات میں غور وتدبر کے لیے استعمال نہیں کرتے۔

حکمت وہدایت:

۱...... ہدایت اور ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے، جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے اللہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔(۱۷۸)

۲...... جولوگ ذہنی اور فکری قوتوں کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں وہ دوزخ میں جائیں گے۔(۱۷۹)

۳...... ایمان اور ہدایت سے محروم انسان، چوپایوں سے بھی بدتر ہیں۔(۱۷۹)

۴...... بے شمار انسان ہیں جو بظاہر عقل بھی رکھتے ہیں اور سنتے اور دیکھتے بھی ہیں مگر اللہ کی نظر میں وہ دیوانے، بہرے اور اندھے ہیں۔(۱۷۹)

ہدایت وضلالت کے اسباب

﴿۱۸۰﴾

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا

اور اللہ کے لئے ہیں سب نام اچھے سو اس کو پکار، وہی نام کہہ کر اور چھوڑ دو ان کو جو کج راہ چلتے ہیں اس کے ناموں میں، وہ

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

بدلہ پارہیں گے اپنے کئے کا۔

ربط: گزشتہ آیت میں بتایا گیا کہ جو لوگ اللہ کی معرفت سے محروم ہیں وہی حقیقی غافل ہیں، چنانچہ یہاں اس غفلت کا علاج بتایا جارہا ہے یعنی اللہ کا ذکر اور شکر۔

تسہیل: اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں، اسے انہی ناموں سے پکارا کرو اور ان سے الگ ہو جاؤ جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں، جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں اس کی سزا انہیں مل کر رہے گی O

﴿تفسیر﴾

﴿۸۰﴾......قرآنِ کریم کی چار سورتوں میں اللہ کے اسماء حسنیٰ کا ذکر ہے: اعراف، اسراء، طٰہٰ اور سورۂ حشر۔

اللہ تعالیٰ کے بے شمار نام ہیں {۳۵۸} بعض نام اس نے اپنے بندوں کو بتائے ہیں اور بعض نہیں بتائے، جیسا کہ مؤطا مالک کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے، جو کعب احبار سے منقول ہے، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

﴿وأسألک بأسمائک الحسنیٰ ماعلمت منها ومالم أعلم﴾{۳۵۹}

''میں آپ سے ان اسماء حسنیٰ کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جو میں جانتا ہوں اور جو میں نہیں جانتا''

اسی طرح مسند احمد میں جو دعا نبی کریم ﷺ سے منقول ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

﴿أسألک بکل إسم هولک سمیت به نفسک، أوأنزل الله فی کتابک أوعلّمته أحدا من خلقک، أو استأثرت به فی علم الغیب عندک﴾{۳۶۰}

''میں آپ سے ہر اس نام کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جو آپ نے اپنے لیے تجویز کیا ہے یا اسے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا عالمِ غیب میں آپ نے اس کا علم صرف اپنی ذات تک محدود رکھا ہے''

اسماء حسنیٰ کی فضیلت

بخاری اور مسلم میں اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے:

﴿انّ لله تسعا وتسعین اسما، من احصاها دخل الجنة وهو وتریحب الوتر﴾{۳۶۱}

''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو انہیں یاد رکھے گا وہ جنت میں داخل ہوگا، اللہ طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے''

{۳۵۸} الاسماء الحسنیٰ غیرمنحصرة فی تسعة وتسعین (ابن کثیر ۲/۲۵۸)

{۳۵۹} موطا مالک فی الشعر حدیث ۱۲

{۳۶۰} مسند احمد/۱/۴۵۶

{۳۶۱} بخاری/۲/ کتاب الدعوات باب ۶۹/ مسلم/۲/ کتاب الذکر والدعاء......الخ/ باب ۵-۲، الدارمی، صلاۃ/۲۰۹

علماء کہتے ہیں اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ننانوے ناموں کے سوا اللہ کا کوئی اور نام نہیں ہے بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے دل و دماغ میں ان اسماء کو اتار لے گا اور ان کے معانی میں غور و فکر کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

ترمذی میں ولید بن مسلم کی روایت ہے جس میں صراحۃً یہ ننانوے نام آئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سارے ہی نام اچھے ہیں اس لیے کہ وہ اپنے مسمّٰی کے ایسے کمال پر دلالت کرتے ہیں جس سے اعلیٰ درجہ کوئی نہیں ہوسکتا، ویسے یہ نام دلوں اور کانوں کو متأثر کرنے میں بھی اچھے لگتے ہیں، ایک سچے مومن کی نظر میں ان ناموں کے اچھا ہونے کے لیے یہی وجہ کافی ہے کہ یہ اس کے محبوبِ حقیقی کے نام ہیں۔

﴿فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (اسے انہی ناموں کے ساتھ پکارو) اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جب حمد و ثناء سے اس کا ذکر کرنے لگو تو اسے انہی ناموں سے پکارو اپنی طرف سے کوئی نام اس کے لیے تجویز نہ کرو۔

دوسرا مطلب یہ کہ جب اپنے مسائل اور ضروریات کے لیے دعا کیا کرو تو بھی اللہ سے کیا کرو اور انہی ناموں کے ساتھ دعا کیا کرو۔

اللہ تعالیٰ کے یہ ننانوے نام پڑھ کر جب اس سے دعا کی جائے تو قبول ہوتی ہے، علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس قسم کا کوئی مسئلہ اللہ کے حضور پیش کیا جائے، اس کی مناسبت سے کسی نام کا واسطہ دے کر دعا کرنے سے قبولیت کی اُمید زیادہ ہوتی ہے مثلاً یوں کہا جائے (یارحمن إرحمنی) ”اے رحمٰن مجھ پر رحم فرما“، (یا غفار إغفرلی) ”اے غفّار میری مغفرت فرمادے“، (یا رزّاق أرزقنی) ”اے رزاق مجھے رزق عطا فرمادے“

اسماءِ حسنٰی کو وردِ زبان بنانے سے دل میں ایمان راسخ ہو جاتا ہے، اللہ کی صفات کا یقین مستحضر رہتا ہے، محبوبِ حقیقی کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، غموں اور پریشانیوں سے نجات ملتی ہے، حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص درجِ ذیل دعا پڑھے گا، اللہ اسے غم اور پریشانی سے نجات دے گا:

﴿لاالہ الا اللہ العظیم الحلیم، لاالہ الا اللہ رب العرش العظیم، لا الہ الا اللہ رب السمٰوٰت والأرض وربّ العرش الکریم﴾{۳۶۲}

دعا صرف اللہ سے کی جائے گی، اللہ کے سوا کسی بھی زندہ اور مرحوم مخلوق سے دعا جائز نہیں ہے۔

{۳۶۲} بخاری/دعوات، باب ۲۷/ ترمذی/ وتر، باب ۱۷، طب، باب ۴۲/ ابن ماجہ/ جنائز، باب ۴

کسی کام کو آہستہ آہستہ اور بتدریج کرنا، کھلم کھلا گمراہی میں مبتلا ہونے کے باوجود کسی بھی سرکش قوم پر باری تعالیٰ فوراً عذاب نازل نہیں فرماتے بلکہ اسے مہلت دیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی کرتوتوں کے انجام سے بالکل بے خبر ہو جاتی ہے پھر ایسا ہوتا ہے کہ اچانک اسے اللہ کا عذاب اپنی گرفت میں لے لیتا ہے سورۂ انعام میں ہے:

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ {۳۶۷}

''جب یہ لوگ اس چیز کو بھلا بیٹھے جو انہیں یاد دلائی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ وہ ان نعمتوں پر اکڑنے لگے جو انہیں عطا کی گئی تھیں تو ہم نے انہیں اچانک عذاب میں پکڑ لیا تو وہ بالکل ناامید ہو کر رہ گئے''

یہ استدراج کفار کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور گناہ گار مسلمان کے ساتھ بھی ہوتا ہے، اسی لئے صحابہ اور سلف صالحین کا حال یہ تھا کہ جب انہیں مختلف نعمتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں تو وہ ڈر گئے کہ کہیں یہ استدراج تو نہیں؟

اسی طرح سورۂ مومن میں ہے:

أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴿٥٦﴾ {۳۶۸}

''کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انہیں مال اور بیٹے عطا کرتے ہیں تو کیا ہم انہیں بھلائیاں دینے میں جلدی کر رہے ہیں؟ بلکہ اصل بات کا تو انہیں شعور ہی نہیں''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جب کسریٰ کے خزانے لائے گئے تو انہوں نے دعا کی:

''اے اللہ مجھے ان میں سے نہ بنانا جنہیں تو مہلت دے کر بتدریج پکڑتا ہے، کیونکہ تیرا فرمان ہے کہ ''ہم انہیں اس طریقہ سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر ہی نہیں ہوگی''

﴿۱۸۳﴾...... میں نے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے، انہیں اپنی سازشوں کے تانے بانے کی مضبوطی پر تو یقین ہے مگر اس کی تدبیر کے استحکام سے وہ بے خبر ہیں۔ انہیں سرے سے اللہ کی اسکیم کا پتہ ہی نہیں، اس کی اسکیم جب سامنے آئے گی تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

﴿۱۸۴﴾...... نبی کریم ﷺ نے بچپن سے جوانی تک کی زندگی قریش کے سامنے گزاری تھی اور وہ آپ کی ذکاوت وذہانت، معصومیت اور کردار کی بلندی سے خوب واقف تھے ''صدیق وامین'' کا لقب قریش ہی کا تجویز کردہ تھا مگر

{۳۶۷} الانعام/۶/۴۴

{۳۶۸} مؤمنون/۲۳/۵۵

جب آپ نے نبوّت کا دعوٰی کیا تو ان میں سے بعض بد بخت آپ کو شاعر اور مجنون کہنے لگے، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ضد، حسد، اور نفس پرستی سے ہٹ کر آپ کی سیرت و کردار اور گزشتہ زندگی کے بارے میں غور وفکر کریں تو وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ آپ نہ تو شاعر ہیں اور نہ ہی آپ پر دیوانگی کا کوئی اثر ہے جس کی عقل وحکمت نے دنیا بھر کے عقلاء اور حکماء کو حیرت زدہ کر دیا ہوا سے دیوانہ کہنا خود دیوانہ ہونے کی علامت ہے

سورۂ سبا میں بھی عقل ودانش کے ان جھوٹے مدّعیوں سے کہا گیا:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾ {۳۶۹}

”فرما دیجئے میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم ان کے واسطے دو دو مل کر یا اکیلے اکیلے ہو کر خوب سوچو کہ کیا تمہارے صاحب پر دیوانگی کا کوئی اثر ہے؟ وہ تو محض ایک سخت عذاب سے پہلے تمہیں ڈرانے والا ہے“

﴿۱۸۵﴾...... جھٹلانے والوں کو پہلے تو حکم دیا گیا حضور اکرم ﷺ کی سیرت وکردار میں غور وفکر کرنے کا اور یہاں حکم دیا جا رہا ہے پوری کائنات میں غور وفکر کرنے کا۔

قدرت کی نشانیاں

اس کائنات کا نظام اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ جو انسان کافرانہ تعصب سے ہٹ کر اس میں غور کرتا ہے اسے ستاروں اور سیاروں، سمندروں اور دریاؤں، پہاڑوں اور ندی نالوں، حیوانات اور نباتات غرضیکہ ہر جگہ اللہ کے وجود، اس کی قدرت اور علم وخبر کی نشانیاں بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

﴿وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ﴾ اس کی توحید اور بادشاہت کے دلائل صرف آسمانوں اور زمین جیسی عظیم الشان مخلوقات ہی میں نہیں بلکہ چھوٹی اور حقیر چیزوں میں بھی ایسی نشانیاں موجود ہیں جن میں غور وفکر انسان کے سر کو بے اختیار اللہ کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے (آپ مچھر ہی کو لے لیں جو حقیر ترین مخلوق ہے)

ہم سب جانتے ہیں کہ مادہ مچھر خون چوستی ہے اس کے خون چوسنے کا نظام بڑا عجیب ہے اس لئے کہ اللہ نے انسانی جسم میں ایک کیمیائی خمیر رکھا ہے جو زخم کی صورت میں خون کو لوتھڑے کی شکل دے کر رسنے کی جگہ بند کر دیتا ہے مچھر جب اپنا ڈنک کھال کے اندر داخل کرتا ہے تو اسے خطرہ ہوتا ہے کہ یہ کیمیائی خمیر میرے لئے مسئلہ پیدا کر دے گا

{۳۶۹} سبا/۳۴/۴۶

چنانچہ وہ اپنے جسم سے رسنے والی ایک خاص مائع کو اس جاندار کے جسم میں ٹیکے کی مانند اسی مقام تک پہنچا دیتا ہے جہاں اس نے ڈنک مار کر جگہ کاٹی تھی، یہ مائع اس کیمیائی خمیر کو بے اثر بنا دیتی ہے جس نے خون کو لوتھڑے میں تبدیل کرنا تھا یہ یقیناً ایک غیر معمولی عمل ہے جس سے ذہن میں درج ذیل سوالات ابھرتے ہیں (ا) مچھر کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی جسم میں ایک کیمیائی خمیر ہے جس سے خون لوتھڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے اس کیمیائی خمیر کے خلاف اپنے جسم میں ایک بے اثر کرنے والی رطوبت پیدا کرنے کے لئے اسے اس کیمیائی خمیر کی کیمیائی ساخت کا علم ہونا ضروری ہے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اگر اسے حاصل بھی کر لیا جائے تو یہ اپنے جسم میں رطوبت کس طرح پیدا کرے گا اور اپنے جبڑوں تک منتقل کرنے کے لیے مطلوبہ تکنیکی تنصیب کیسے کرے گا؟ ایک مسلمان کے لیے ان سوالات کا جواب دینا بہت آسان ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ وہ ہستی کرتی ہے جس نے انسان کو بھی پیدا کیا اور مچھر کو بھی۔

﴿وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ﴾ کیا یہ جھٹلانے والے اس بارے میں نہیں سوچتے کہ ممکن ہے ان کی زندگی کی مہلت ختم ہونے والی ہو اگر انہوں نے زندگی کا سورج غروب ہونے سے پہلے نہ تو کائنات کے نظام میں غور وفکر کیا اور نہ ہی انہیں قبولِ ایمان کی سعادت حاصل ہوئی تو انہیں کفر کی حالت میں موت آجائے گی جس کے بعد ایمان اور عمل کا نہ تو اعتبار ہوگا اور نہ ہی مہلت دی جائے گی۔

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ﴾ جو لوگ قرآن سے متاثر نہیں ہوتے وہ کسی دوسرے کلام سے بھی متاثر نہیں ہوسکتے اور جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے وہ اور کسی کتاب پر ایمان لائیں گے؟ کیا دنیا میں کوئی دوسری کتاب ہے جو قرآن سے زیادہ حقائق بیان کرنے والی ہو؟

﴿۱۸۶﴾...... جو لوگ محض ہٹ دھرمی اور عصبیت کی بناء پر جھٹلاتے اور کفر وشرک پر اصرار کرتے تھے ان کے معاندانہ رویے سے نبی کریم ﷺ سخت رنجیدہ ہوتے تھے جبکہ آپ کی چاہت یہ تھی کہ ہر کوئی ایمان قبول کرلے اسی لئے آپ کو تسلی دینے کے لئے فرمایا کہ جن کے مقدر میں گمراہی لکھ دی گئی ہے انہیں آپ یا کوئی دوسرا ہدایت نہیں دے سکتا اور یہ وہی لوگ ہیں جو ظلم اور سرکشی میں حد سے تجاوز کر گئے اور یوں انہوں نے اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو مٹی میں ملا دیا ورنہ اللہ کسی کو گمراہی پر مجبور نہیں کرتا۔

حکمت وہدایت:

ا...... ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی جماعت ایسی ہوتی ہے جو ہر حال میں حق کا ساتھ دیتی ہے امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے

ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی زمانے میں دنیا کو کسی داعی حق کے وجود سے خالی نہیں رہنے دیتے۔ (۱۸۱) {۳۷۰}

۲......کثرتِ اولاد، مالی فراوانی، اقتدار کی چمک دمک اور ظاہری شان و شوکت سے کبھی دھوکہ نہیں کھانا چاہئے، یہ ساری چیزیں اللہ کی طرف سے بطور استدراج اور مہلت کے بھی ہو سکتی ہیں۔ (۱۸۲)

۳......اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق انسان پر کائنات میں غور و فکر کرنا واجب ہے یہ غور و فکر ایمان میں مضبوطی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ صوفیہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ غور و فکر عبادت سے بھی افضل ہے جبکہ فقہاء نماز اور ذکر کو افضل قرار دیتے ہیں، امام ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے درمیانہ راستہ اختیار کیا ہے وہ یہ کہ ایسا عالم جو تفکر کی مضبوط استعداد رکھتا ہو اس کے لئے تفکر افضل ہے جبکہ عام انسان کے لئے نیک اعمال ہی افضل ہیں۔

۴......انسان کو ہر وقت موت کے لئے تیار رہنا چاہئے ممکن ہے اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہو۔

قیامت کا علم

﴿۱۸۷﴾

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ

تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو کہ کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت، تو کہہ! اس کی خبر تو میرے رب ہی کے پاس ہے وہی کھول دکھائے گا

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا

اس کو اس کے وقت پر وہ بھاری بات ہے آسمانوں اور زمین میں جب تم پر آئیگی تو بے خبر آئے گی تجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ گویا تو اس کی تلاش میں لگا ہوا ہے،

عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

تو کہہ دے اس کی خبر ہے خاص اللہ کے پاس لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

ربط: قرآن کے تین بنیادی مضامین میں سے دو یعنی توحید اور نبوت کا ذکر ہو چکا اب آخرت کا ذکر کیا جا رہا ہے، ویسے بھی جب موت کے قریب آجانے کے امکان سے ڈرایا گیا تو اس کے بعد قیامت کا تذکرہ مناسب ہے۔

تسہیل: یہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ قیامت کب قائم ہوگی؟ آپ انہیں بتا دیجئے کہ قیامت کے قائم ہونے کا علم صرف میرے ربّ کو ہے، وہی اسے اپنے وقت پر ظاہر کر دے گا، قیامت کا حادثہ آسمانوں اور زمین پر بڑا بھاری حادثہ ہوگا جو اچانک ہی تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گا، وہ آپ سے یوں پوچھتے ہیں گویا آپ اس کی تحقیق کر چکے ہیں،

{۳۷۰} فدلّت الآیۃ علی أن اللہ عزّوجلّ لایخلی الدنیا فی وقت من الاوقات من داعٍ یدعو إلی الحق۔ (قرطبی ۷/۲۸۹)

اسماءِ الٰہیہ میں کجروی:

اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد اور کجروی کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی ایسا نام استعمال کیا جائے جو قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں ہے مثلاً سخی، طبیب، عاقل اور فقیہ وغیرہ کہنا جائز نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اسماءِ حسنیٰ میں سے کسی نام کو نامناسب سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کا غیر اللہ پر اطلاق کیا جائے، کہا جاتا ہے کہ مشرکین کے جو تین مشہور بت تھے یعنی لات، عزّیٰ اور مناۃ یہ تینوں بالترتیب الٰہ، عزیز اور منّان سے ماخوذ تھے۔

بعض اوقات انسانوں پر بھی ان ناموں کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، اس میں کچھ تفصیل ہے وہ یہ کہ اسماءِ حسنیٰ میں سے جن ناموں کا غیر اللہ کے لیے استعمال کرنا قرآن اور حدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لیے استعمال ہوسکتے ہیں جیسے رحیم، رشید، عزیز، علی، کریم اور رؤف وغیرہ اور جن ناموں کا غیر اللہ کے لیے استعمال قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں ان کا غیر اللہ کے لیے استعمال الحاد، ناجائز اور حرام ہے مثلاً رحمٰن، سبحان، رزّاق، خالق، غفّار اور قدوس وغیرہ۔{۳۶۳}

بعض حضرات، اللہ اور رحمٰن کے علاوہ باقی تمام اسماء کے غیر اللہ پر اطلاق کو جائز قرار دیتے ہیں۔{۳۶۴}

حکمت وہدایت:

۱......اسماء حسنیٰ بے شمار ہیں، بعض کا علم بندوں کو ہے اور بعض کا علم نہیں ہے۔

۲......اللہ تعالیٰ کے سارے نام اس کے حسن وکمال پر دلالت کرتے ہیں، اس کے اسماء اور صفات سے دو چیزیں واضح ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ کسی کا محتاج نہیں، دوسری یہ کہ ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔

۳......نہ اللہ پر ایسے نام کا اطلاق جائز ہے جو قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں اور نہ ہی غیر اللہ کے لیے ایسے نام کا استعمال جائز ہے جس کا استعمال ثابت نہیں۔

۴......اسم اور مسمّٰی دو الگ الگ چیزیں ہیں، اسماء کے تعدد سے ذات کا تعدد لازم نہیں آتا۔

{۳۶۳} معارف القرآن ۱۳۲/۴

{۳۶۴} التفسیر المنیر ۱۷۵/۹

۵......اسماءِ حسنیٰ کے واسطہ سے دعا کرنے سے قبولیت کی زیادہ امید ہوتی ہے۔

۶......اللہ کے ناموں کو بگاڑنا یا ان میں تخفیف کرنا سخت بے ادبی بلکہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ہے...... یہ گناہ ہمارے معاشرہ میں کثرت سے کیا جارہا ہے۔

ہدایت یافتہ اور جھٹلانے والے

﴿۱۸۱......۱۸۶﴾

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ

اوران لوگوں میں کہ جن کو ہم نے پیدا کیا ہے، ایک جماعت ہے کہ راہ بتلاتے ہیں سچی اوراس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔اور جنہوں نے جھٹلایا

مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ

ہماری آیتوں کو ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔اور میں ان کو ڈھیل دوں گا بیشک میرا داؤ پکا ہے۔

جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ

کیاانہوں نے دھیان نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو کچھ بھی جنون نہیں ؟وہ تو ڈرانے والا ہے صاف۔کیاانہوں نے نظر نہیں کی سلطنت میں

اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

آسمان اورزمین کی؟اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے ہر چیز سے اوراس میں کہ شاید قریب آگیا ہوان کا وعدہ؟سواس کے پیچھے کس بات پر ایمان لائیں گے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

جس کواللہ بچلائے اس کوکوئی نہیں راہ دکھلانے والا اور اللہ چھوڑ رکھتا ہے ان کوان کی شرارت میں سرگرداں۔

ربط: پہلے بتایا گیا کہ بہت سی مخلوق کو ہم نے دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی عطا کردہ عقل اور حواس کو حصولِ ہدایت کے لیے استعمال نہیں کرتے ،اس کے بعد اسماءِ حسنیٰ کا ذکر ہوا جن کے ذریعے دعا کرنے سے ایمان مضبوط ہوتا ہے،اب یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ کی مخلوق میں دوقسم کے لوگ ہیں ایک جماعت وہ ہے جو حق اور عدل کے مطابق زندگی گزارتی ہے اور دوسری جماعت وہ ہے جو آیاتِ الٰہیہ کو جھٹلاتی ہے،انہیں اللہ کی سلطنت میں غور وفکر کی ترغیب دی گئی ہے۔

تسہیل: ہماری مخلوق میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتی اور اسی کے مطابق انصاف کرتی ہے O اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں ہم انہیں بتدریج اس طریقے سے تباہی کی طرف لے

جائیں گے کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوگی O میں انہیں مہلت دے رہا ہوں یقیناً میری تدبیر بہت مضبوط ہے O اور کیا یہ لوگ سوچتے نہیں ہیں کہ ان کے ساتھی پر دیوانگی کا کوئی اثر نہیں؟ وہ تو محض دوٹوک انداز میں خبردار کرنے والا ہے O کیا یہ لوگ آسمان اور زمین کی سلطنت اور اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز میں بھی غور وفکر نہیں کرتے؟ اور اس بارے میں بھی کبھی نہیں سوچتے کہ ممکن ہے ہماری مہلتِ زندگی ختم ہونے والی ہو، جو لوگ قرآن سے بھی متاثر نہیں ہوتے وہ قرآن کے بعد کونسی بات پر ایمان لائیں گے؟ O جسے اللہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور اللہ انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۸۱﴾......اس آیتِ کریمہ میں جس جماعت کا ذکر ہے کہ وہ حق پر قائم رہے گی اور عدل وانصاف کے مطابق فیصلے کرے گی اس سے مراد امّت محمدیہ ﷺ ہے، اس بات کی وضاحت خود رسولِ اکرم ﷺ نے فرمادی ہے، حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری امت میں سے ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، انہیں چھوڑنے والا اور ان کی مخالفت کرنے والا انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی'' {۳٦۵}

عبد بن حمید کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب یہ آیتِ کریمہ پڑھتے تو فرماتے یہ آیت تمہارے بارے میں نازل ہوئی ہے اور تم سے پہلے بھی ایسی امت گزر چکی ہے جسے یہ صفات عطا ہوئی تھیں، پھر آپ نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ {۳٦٦}

''اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک جماعت ایسی تھی جو حق کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتی اور اس کے مطابق انصاف کرتی تھی''

حق پر قائم رہنے والی جماعت

قرآن اور حدیث کے مطالعہ سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ سے ایسی جماعت رہی اور رہے

{۳٦۵} بخاری ۲/۱۰۸۷، مسلم، امارۃ/۱۷۰، ترمذی، فتن/۵۱، ابوداؤد، فتن/۱، جہاد/۴، ابن ماجہ، مقدمہ/۱، مسند احمد/۴/۹۹

{۳٦٦} الاعراف/۷/۱۵۹

گی جو حق پر قائم ہوگی، لوگوں کو حق کی دعوت دے گی اور حق کے مطابق انصاف کرے گی، جب دنیا میں کہیں بھی ایسی جماعت باقی نہ رہی تو یہ نظامِ ہستی ختم ہو جائے گا، امت محمدیہ ﷺ کا ماضی یہ بتاتا ہے کہ اس کی امتیازی خصوصیت حق پرستی رہی ہے اس نے اپنے افکار و نظریات حق پر استوار کیے، انفرادی زندگی میں بھی حق پر عمل کیا اور اجتماعی نظام میں بھی حق کے قوانین نافذ کیے۔

حق پرستی کے مقابلے میں مختلف قسم کی پرستشوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے مثلاً مال پرستی، منصب پرستی، مغرب پرستی وغیرہ لیکن ان سب کو جو جامع لفظ ہے وہ ہے نفس پرستی! دنیا میں سب سے زیادہ نفس ہی کی پرستش ہو رہی ہے، اسے ایک مذہب کا درجہ حاصل ہو چکا ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ پیروکار آپ کو اسی کے ملیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ اکثر مسلمانوں کی زندگی میں ایمانی جذبات اور تعلیمات کی وہ جھلک دکھائی نہیں دیتی جو نظر آنی چاہئے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اگر آسمانی تعلیمات کسی امت کے پاس محفوظ ہیں تو وہ صرف امتِ محمدیہ ہے، باقی تمام مذاہب میں تحریف و تغیر ہو چکا ہے۔

اسی طرح پوری دنیا میں صرف مسلمان ہی ایسی امت ہیں جن میں آج بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو حق پر قائم ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں حق کو قائم کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں باقی امتوں کے حالات اور خیالات کے حقیقت پسندانہ مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی واضح اکثریت مذہب سے دستبردار ہو چکی ہے جو مذہب کو تسلیم بھی کرتے ہیں وہ اپنی پرائیویٹ زندگی میں تو اس پر عمل کے قائل ہیں مگر اجتماعی زندگی میں اس کے کردار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

﴿۱۸۲﴾...... کسی کے ذہن میں اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ جب قومی ترقی کا مدار حق پرستی پر ہے تو وہ غیر مسلم اقوام جو حق سے کوسوں دور ہیں، وہ مادی ترقی کے میدان میں کیوں پیش پیش ہیں؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ عالمِ اسباب ہے اللہ تعالیٰ نے مادی ترقی کے بھی کچھ اسباب رکھے ہیں، وہ اسباب جو بھی اختیار کرے اسے ترقی نصیب ہوگی چاہے وہ مومن ہو یا کافر! کفار کے پھلنے پھولنے کا راز ان کا کفر نہیں بلکہ ترقی کے اسباب اختیار کرنا ہے اور مسلمانوں کی پسماندگی کی وجہ معاذ اللہ ایمان نہیں بلکہ ان اسباب سے غفلت اور دوری ہے

دوسرا جواب وہ ہے جس کی وضاحت یہ آیتِ کریمہ کرتی ہے، وہ یہ کہ کفار کو ظاہری شان و شوکت اور خوشحالی کا حاصل ہونا ان کی بھلائی کے لئے نہیں بلکہ باری تعالیٰ کی طرف سے استدراج کے طور پر ہے، استدراج کا معنی ہے

آپ فرما دیجئے قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

﴿۱۸۷﴾...... یہود ہوں یا قریش {۳۷۱} سب ہی قیامت کے بارے سوال کرتے تھے کوئی بالواسطہ اور کوئی بلاواسطہ ایسوں کو جواب دیا گیا کہ قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے وہ ہی جانتا ہے کہ کائنات کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا حادثہ اور خوفناک ترین زلزلہ کس سال، کس مہینے اور کس تاریخ میں وقوع پذیر ہوگا چھوٹی قیامت یعنی موت کا علم بھی صرف اللہ ہی کو ہے اور بڑی قیامت یعنی آخرت کا علم بھی اسی کو ہے اس کا علم نہ فرشتوں کے سردار جبرائیلؑ کو دیا گیا نہ انسانوں کے سردار محمد رسول ﷺ کو دیا گیا سورۃ لقمان میں ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ عِندَهُۥ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ {۳۷۲}

”بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے“

مخالفین کا یہ سوال کرنا معلومات کے حصول کے لئے نہ تھا بلکہ امتحان کے لئے یا بطور استہزاء کے تھا، سورۂ یونس میں ہے:

﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ {۳۷۳}

”اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اگر تم سچے ہو“

وقوعِ قیامت کا علم پوشیدہ رکھنے میں بھی بہت ساری حکمتیں ہیں، اگر بتا دیا جاتا کہ قیامت مثلاً دو ہزار سال بعد آئے گی تو جھٹلانے والے اور زیادہ مذاق اڑاتے اور اس کا وقت قریب آجانے کی صورت میں ایمان والوں کی زندگی معطل ہو کر رہ جاتی۔ ان کے لئے کھانا پینا اور اہل وعیال کے ساتھ ہنسی مذاق بھی ختم ہو جاتا۔

﴿ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ﴾ سوال کا جواب دینے کے بعد بتایا گیا کہ قیامت کے وقوع کی تاریخ کے پیچھے پڑنے کے بجائے تم اس کی تیاری کی فکر کرو کیونکہ قیامت کا حادثہ زمین وآسمان میں رہنے والوں کے لئے بہت بھاری اور ہولناک حادثہ ہوگا۔ {۳۷۴} جب وہ وقوع پذیر ہوگا تو سورج بے نور ہو جائے گا، آسمان پھٹ جائے گا، ستارے جھڑ

{۳۷۱} قیل نزلت فی قریش، وقیل فی نفر من الیهود (ابنِ کثیر/۲/۳۵۹)

{۳۷۲} لقمان/۳۱/۳۴

{۳۷۳} یونس/۱۰/۴۸

{۳۷۴} خفی علمها علی السموات والارض وکل ماخفی علمه وهوثقیل علی الفؤاد وقیل کبر مجیئها علی اهل السموات والأرض (قرطبی/۷/۲۹۴)

جائیں گے، زمین کانپ اٹھے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، ویسے بھی یہ حادثہ اچانک رونما ہوگا، حدیث میں ہے کہ ''دو آدمیوں نے سودا کرنے کے لئے کپڑے کا تھان کھول رکھا ہوگا ابھی لپیٹنے بھی نہ پائیں گے کہ قیامت قائم ہو جائے گی، دوسرا شخص اونٹنی کا دودھ نکالنے کے بعد گھر لوٹ رہا ہوگا ابھی چکھنے بھی نہ پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی تیسرا شخص اپنے حوض کو لیپے گا اس سے سیراب نہ ہو سکے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی چوتھا لقمہ اٹھائے گا مگر اسے منہ میں ڈال نہ پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ {۳۷۵}

ایسا حادثہ جو ہولناک بھی ہے اور اس کا وقوع بھی اچانک ہوگا، اس کی تیاری سے غافل ہونا مسلمان کی شان نہیں
''كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا''، یہ آپ سے یوں سوال کرتے ہیں کہ گویا آپ اس کی تحقیق کر چکے ہیں اور اس کا علم رکھتے ہیں۔

﴿قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ﴾ بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسی آیت میں یہ الفاظ پہلے بھی گزر چکے ہیں لیکن بغور دیکھا جائے تو تکرار نہیں ہے اس لئے کہ سوال دو تھے پہلا سوال قیامت کی تاریخ کے بارے میں تھا اور دوسرا اس کی حقیقت اور شدت کے بارے میں تھا پہلے سوال کے جواب میں بھی کہا گیا کہ اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اور دوسرے سوال کا بھی یہی جواب دیا گیا۔ {۳۷۶}

حکمت وہدایت:

۱......ظہورِ قیامت کا وقت اور اس کی شدت کا ٹھیک ٹھیک علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔

۲......قیامت کا دن ساری مخلوق پر بڑا بھاری ثابت ہوگا۔

۳......نہ تو نبی کریم ﷺ کو وقوعِ قیامت کی تاریخ کا علم تھا اور نہ ہی آپ اس کی تحقیق میں پڑتے تھے، اپنی امت کو بھی آپ نے اس کی تحقیق میں پڑنے کے بجائے اس کی تیاری کی ترغیب دی، ایک دیہاتی نے آپ سے سوال کیا کہ قیامت کب آئی گی تو آپ نے فرمایا ''قیامت کا آنا تو یقینی ہے تم یہ بتاؤ کہ تم نے اس کے لئے تیاری کیا کی ہے؟'' {۳۷۷}

۴......حضور اکرم ﷺ نے ظہورِ قیامت کی متعین تاریخ تو نہیں بتائی البتہ اس کی علامات آپ نے بیان فرمائی ہیں جو کہ کتبِ حدیث میں مذکور ہیں۔

{۳۷۵} مسلم/کتاب الفتن/۲/۴۰۱، بخاری/۲/۱۵۵

{۳۷۶} وزعم الجبائی ان السؤال الاوّل......وھذا السؤال عن کیفیتھا وتفصیل مافیھا من الشدائد والاحوال(روح المعانی/۶/۱۹۵)

{۳۷۷} بخاری/ کتاب الادب/ ۹۶، مسلم/ کتاب البر/ ۱۶۴

رسالت کی حقیقت

﴿۱۸۸﴾

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ

تو کہہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں جان لیا کرتا کہ غیب کی بات تو

مِنَ الْخَيْرِ ۛ وَمَا مَسَّنِىَ السُّوْٓءُ ۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

حاصل کر لیتا اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی میں تو بس ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایماندار لوگوں کو۔

ربط: ماقبل سے مناسبت بالکل واضح ہے پہلے بتایا گیا کہ قیامت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اب رسول اکرم ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ سارے معاملات اللہ کے حوالے ہیں غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں یہ وہ دروازہ ہے جو کسی کے لئے بھی نہیں کھولا گیا نبی ہو یا غیر نبی سب کا علم اس دروازے پر آ کر رک جاتا ہے اللہ کے رسول کو بھی مستقبل کے حالات، ظاہری نظروں سے مخفی اشیاء اور آخرت میں پیش آنے والے واقعات میں سے صرف اتنا ہی علم ہو سکتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ انہیں عطا کر دے، ہر ہر بات کا انہیں بھی علم نہیں ہو سکتا، سورۂ جنّ میں ہے:

تسہیل: آپ فرما دیجئے کہ میں کسی دوسرے کے لئے تو کیا خود اپنے لئے بھی نہ نفع کا اختیار رکھتا ہوں نہ نقصان کا البتہ جو اللہ چاہے اس کا مجھے اختیار ہو سکتا ہے اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو اپنے لئے بہت سا نفع حاصل کر لیتا اور کوئی تکلیف مجھے چھو کر بھی نہ گزرتی، میں تو محض ایسے لوگوں کو ڈرانے اور بشارت دینے والا ہوں جو ایمان رکھتے ہیں۔

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ {۳۷۸}

"اللہ غیب کا جاننے والا ہے، وہ اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا سوائے ایسے رسول کے جسے وہ کوئی غیب کی بات بتلانا پسند کرے"

﴿تفسیر﴾

﴿۱۸۸﴾......اللہ کے پیغمبر نے کبھی بھی خدائی اختیارات اور عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا مگر مشرکین کا تصور

{۳۷۸} جنّ/۷۲/۲۵،۲۶

انبیاء کے بارے میں یہ تھا کہ انہیں خدائی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اس لئے وہ کہتے تھے کہ ہم تب ایمان لائیں گے جب آپ مکہ کی سنگلاخ زمین سے نہریں اور چشمے جاری کردیں گے یا جب آپ ہم پر آسمان سے کوئی ٹکڑا گرادیں گے، ایسے ہی احمقوں کے سامنے حضور اکرم ﷺ نے رسالت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میں نہ تو نفع نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ ہی غیب کا علم مجھے حاصل ہے اگر ایسا ہوتا تو مجھے کبھی بھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی اور نہ ہی نقصان اٹھانا پڑتا، کسی راستے پر چلنے سے پہلے ہی میں منزل کے بارے میں جان لیتا اور کوئی معاملہ کرنے سے پہلے ہی مجھے نفع نقصان کی خبر ہوجاتی جبکہ ایسا نہیں ہے، مجھے تکلیف بھی پہنچتی ہے اور بعض اوقات نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے، میرا اصل کام پیغامِ وحی کا انسانوں تک پہنچانا اور انذار و بشارت ہے یعنی عذاب سے ڈرانا اور جنت کی بشارت سنانا، مگر میرے انذار اور بشارت سے بھی صرف انہی لوگوں کو فائدہ ہوسکتا ہے جن کے دل و دماغ ایمان کے نور سے روشن ہوچکے ہیں صحابہ کرام کی جماعت ایسی ہی جماعت تھی جنہوں نے پہلے اپنے سینوں کو نورِ ایمان سے منور کیا اس کے بعد جب انہوں نے قرآن سُنا تو قرآن نے انہیں سر سے پاؤں تک بدل کر رکھ دیا۔

حکمت وہدایت:

۱......سیدالانبیاء ہونے کے باوجود جب نبی کریم ﷺ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے تو کسی دوسرے ولی، قطب اور ابدال کو غیب کا علم کیسے ہوسکتا ہے؟

۲......جو لوگ بشارت وانذار والا عمل کرتے ہیں وہی حقیقت میں انبیاء کے وارث ہیں۔

شرک کی مذمت

﴿۱۸۹......۱۹۳﴾

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا تاکہ اس کے پاس آرام پکڑے پھر جب مرد نے

حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ

عورت کو ڈھانکا حمل رہا ہلکا سا حمل تو چلتی پھرتی رہی اس کے ساتھ، پھر جب بوجھل ہوگئی تو دونوں نے پکارا اللہ اپنے رب کو

مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

کہ اگر تو ہم کو بخشے چنگا بھلا تو ہم تیرا شکر کریں۔ پھر جب ان کو دیا چنگا بھلا تو بنانے لگے اس کے لئے شریک اس کی بخشی

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ

ہوئی چیز میں، سو اللہ برتر ہے ان کے شریک بنانے سے۔ کیا شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو پیدا نہ کریں ایک چیز بھی اور وہ

يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ

پیدا ہوئے ہیں؟ اور نہیں کر سکتے ہیں ان کی مدد اور نہ اپنی مدد کریں۔ اور اگر تم ان کو پکارو رستہ کی طرف تو نہ چلیں تمہاری

اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾

پکار پر برابر ہے تم پر کہ ان کو پکار دیا چپکے رہو۔

ربط: سورۂ اعراف کی ابتداء ہوتی ہے توحید اور اتباعِ قرآن کے مضمون سے، اب جبکہ یہ سورت اپنے اختتام کی طرف جا رہی ہے اس مضمون کا اعادہ ہو رہا ہے ویسے ہی جیسے کسی موضوع پر بات کرنے والا خطیب مضمون کو پھیلانے کے بعد آخر میں دوبارہ اصل موضوع کی طرف واپس آجاتا ہے۔

تسہیل: وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس سے سکون حاصل کرے، پھر جب مرد نے عورت کے ساتھ جماع کیا تو اسے ہلکا سا حمل ٹھہر گیا جسے لیکر وہ چلتی پھرتی رہی، پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ سے دعا کی جوان کا رب تھا کہ اگر آپ نے ہمیں اچھا سا بیٹا عطا کیا تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے O جب اللہ نے انہیں تندرست بیٹا عطا کر دیا تو وہ اللہ کی اس عطا میں دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگے، اللہ بلند و برتر ہے ان سے جنہیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں O کیا یہ انہیں شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کے بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے بلکہ وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں؟ O وہ ایسے عاجز ہیں کہ نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی مدد کر سکتے ہیں O اگر تم انہیں ہدایت کی طرف دعوت دو تو وہ تمہاری دعوت کا جواب نہیں دیں گے تمہارے لئے انہیں پکارنا یا خاموش رہنا دونوں برابر ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۸۹﴾......وہ اللہ ہے، جس کے سوا کوئی نہیں جس نے سارے انسانوں کو ایک ہی جان اور ایک ہی حقیقت سے پیدا کیا ہو، سورۂ حجرات میں ہے:

﴿یَا أَیُّھَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِّن ذَکَرٍ وَّأُنثَىٰ﴾{۳۷۹}

''اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا ہے''

پھر انسان کی جنس ہی سے اس کے جوڑے کو بھی پیدا کردیا اس لئے کہ اس کائنات کی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے اور ہر ایک کا جوڑا اس کی جنس ہی سے ہے سورۂ ذاریات میں ہے:

﴿وَمِن کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ﴾{۳۸۰}

''ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا بنایا ہے''

یہ جو الفاظ ہیں ''وَجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا'' ان کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ آدم کے جسم سے ان کی بیوی کو پیدا کیا گیا{۳۸۱} ور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ آدم کی جنس سے ان کی زوجہ کی تخلیق ہوئی۔{۳۸۲} جو حضرات پہلے قول کے قائل ہیں وہ بخاری اور مسلم کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں عورت کے پسلی سے پیدا ہونے کا ذکر آتا ہے اور جو حضرات دوسرا معنی بیان کرتے ہیں وہ اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں پسلی سے پیدا ہونے کا ذکر بطور تمثیل کے ہے کہ جس طرح پسلی دیکھنے میں میں ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے یہی حال عورت کا ہے، لیکن پسلی کا حسن اور اس کی صحت اس کے ٹیڑھا ہونے ہی میں ہے۔{۳۸۳}

علاوہ ازیں یہ حضرات سورۂ روم کی اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں سارے ہی انسانوں کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے کہ:

''اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس ہی سے بیویاں پیدا کی ہیں''{۳۸۴} یہاں ''مِّنْ أَنفُسِکُمْ'' کے جو الفاظ ہیں ان کا معنی کسی مفسر نے یہ بیان نہیں کیا کہ ہر مرد کی بیوی اس کے جسم سے پیدا کی گئی ہے بلکہ سب نے جنس ہی کا معنی مراد لیا ہے ''لِیَسْکُنَ إِلَیْھَا'' (تاکہ اس سے سکون حاصل کرے) ایک تندرست انسان جب بالغ ہوجائے اور ازدواجی زندگی کی عمر تک پہنچ جائے تو وہ اپنی طبیعت میں خاص

{۳۷۹} الحجرات/۴۹/۱۳

{۳۸۰} الذاریات/۵۱/۴۹

{۳۸۱} فانھا أنثی تولّدت من ذکر بلاواسطة انثی (نظم الدرر/۲/۲۰۶)

{۳۸۲} زعم (ابومسلم) ان معنی "منھا" من جنسھا والآیة علی حدّ قوله تعالیٰ جعل لکم من انفسکم ازواجا (روح المعانی/۳/۲۸۵)

{۳۸۳} اصلاحی خطبات ''مولانا مفتی محمد تقی عثمانی'' (۲/۳۳)

{۳۲۸۴} الروم ۳۰/۲۱

قسم کی بے چینی اور اضطراب پاتا ہے جس کا علاج شادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور اگر یہ علاج نہ کیا جائے تو وہ مختلف قسم کی جسمانی، نفسیاتی اور اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

﴿فَلَمَّا تَغَشّٰهَا﴾ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس اللہ نے انسان کو اور اس کے جوڑے کو پیدا کیا وہ ہمیشہ اس کا شکر گزار ہوتا مگر اس کا طرزِ عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔

جب میاں بیوی کے اختلاط سے حمل ٹھہر جائے تو ابتداء میں چونکہ بوجھ نہیں ہوتا اس لئے عورت کو زیادہ محسوس بھی نہیں ہوتا جب وقت گزرنے کے ساتھ حمل کی نشو نما ہوتی ہے اور عورت بوجھ محسوس کرنے لگتی ہے تو مختلف وساوس اور خیالات ماں باپ کو پریشان کرنے لگتے ہیں کہ نا معلوم بچہ کیسا ہوگا، کہیں دیوانہ، اندھا، گونگا اور معذور بچہ ہی نہ پیدا ہو جائے چنانچہ وہ دعائیں کرنے لگتے ہیں کہ اے اللہ! اگر آپ نے ہمیں صحیح سالم بچہ عطا کیا تو ہم شکر گزار رہیں گے۔

﴿۱۹۰﴾......لیکن جب اللہ انہیں صحیح سالم بچہ عطا فرمادیتے ہیں تو وہ شرک کرنے لگتے ہیں، اس شرک کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، بچے کو کسی ولی یا بزرگ یا ڈاکٹر اور حکیم کی عطا سمجھنا، ولادت کے بعد کسی زندہ یا مرحوم کے سامنے اس کا ماتھا ٹیکنا، اس کا مشرکانہ نام رکھنا یہ سب شرک کی صورتیں ہیں۔

اسی طرح اللہ کو بھلا کر صرف ظاہری اسباب اور تدابیر ہی کو سب کچھ سمجھ لینا اور اولاد یا کسی بھی دوسری نعمت کی نسبت ان کی طرف کرنا مومن کی شان سے بہت بعید ہے۔شرک کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ صاحبِ اولاد ہو جانے کے بعد ان کے دل میں اولاد کی محبت اللہ کی محبت پر غالب آجاتی ہے اور اس میں وہ ایسا کھو جاتے ہیں کہ اللہ کے ذکر اور شکر کو بھول جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کا جو قصہ ان آیات میں بیان ہوا ہے وہ کسی فردِ معین کا قصہ نہیں بلکہ سمجھانے کے لئے کسی بھی مرد اور عورت کا قصہ بطور مثال کے بیان کیا گیا ہے {۳۸۵} تا کہ مسلمان اپنے دامن کو اس قسم کے شرک کی آلودگی سے بچا سکیں، اگرچہ حدیث کی بعض کتابوں میں مذکورہ آیات کے ذیل میں حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کا قصہ بیان کیا گیا لیکن چونکہ ان آیات کی تفسیر اس قصے پر موقوف نہیں اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں دوسری بات یہ ہے کہ محقق علماء نے متعدد وجوہ کی بناء پر اس روایت میں ذکر کی گئی تاویل کو نا قابلِ اعتبار ٹھہرایا ہے تیسری اور اہم بات یہ ہے کہ اگر اس قصے کو تسلیم کرنے سے حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر حرف آتا ہے

{۳۸۵} واقرب واللہ اعلم أن یکون المراد جنسی الذکر والأنثی لا یقصد فیه الی معیّن (کتاب الانتصاف/۲/۱۷۶)

تو ہمیں اسے ذکر کرنے سے پہلے سو بار سوچنا ہوگا، ہم اگلی آیت کو دیکھتے ہیں تو یقین آ جاتا ہے کہ یہ قصہ حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کا نہیں ہے بلکہ ان کی نسل میں پیدا ہونے والے مشرکوں کا ہے جو اللہ کو بھی مانتے تھے اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بھی ٹھہراتے تھے۔

﴿۱۹۱﴾...... کیا یہ مشرک ایسوں کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں جو کسی حقیر سے حقیر چیز کے پیدا کرنے کی بھی قدرت نہیں رکھتے، جیسا کہ سورۂ حج میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ﴾

"جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ اگر سارے بھی جمع ہو جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے"

﴿وَهُمْ يُخْلَقُوْنَ﴾ وہ کسی کو تو کیا پیدا کریں گے اپنے آپ کو بھی پیدا نہیں کر سکتے انہیں بھی خالق حقیقی نے پیدا کیا ہے۔

﴿۱۹۲﴾...... ایک طرف تو وہ خالق ہونے کے بجائے مخلوق ہیں دوسری طرف عاجز اور کمزور اتنے ہیں کہ نہ کسی دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں، جو عاجز اور کمزور ہو وہ معبود اور شریک کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کے ضعف اور بیچارگی کا یہ حال ہے کہ اگر مکھی جیسی حقیر مخلوق ان سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس سے واپس نہیں لے سکتے سورۂ حج کی مذکورہ بالا آیت میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴾

اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اسے چھڑا بھی نہیں سکتے، مانگنے والے بھی کمزور اور جن سے مانگا جا رہا ہے وہ بھی کمزور۔

﴿۱۹۳﴾...... کسی چیز کی تخلیق اور مدد سے بھی بڑھ کر ان کی بیچارگی اور کمزوری کا حال یہ ہے کہ اگر تم انہیں ہدایت کے لئے پکارو تو وہ تمہاری اتباع نہیں کر سکیں گے "ھدایت کے لیے پکارنے" کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ ان کے ماننے والے ان سے اپنی ہدایت اور رہنمائی کے لئے درخواست کریں تو وہ انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔{۳۸۶} دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خود انہیں فائدہ پہنچانے اور ان کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے انہیں پکارو تو بھی تمہاری پکار سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔{۳۸۷}

{۳۸۶} أی وإن تدعوا الأصنام ایھا المشرکون إلی أن یرشدوکم (روح المعانی/۶/۲۰۸)

{۳۸۷} نظم الدرر/۳/۱۷۰

حکمت وہدایت:

۱......اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو ہم جنس بنایا ہے تا کہ ان کے درمیان طبعی موافقت اور محبت ہو (۱۸۹)

۲......ازدواجی زندگی کا ایک بڑا مقصد سکون کا حصول ہے اور سکون تبھی حاصل ہوگا جب میاں بیوی دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی فکر ہوگی اور وہ شریعت کے مطابق زندگی گزاریں گے۔

۳......تجرّد کی زندگی خلافِ فطرت ہے، ایسی زندگی گزارنے والوں کو بعض اوقات بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۴......مسلمان کا ایمان ہے کہ ہر چھوٹی بڑی نعمت اللہ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے اس لئے وہ اولاد ہو یا رزقِ حلال، عہدہ ومنصب ہو یا صحت اور فراغت ہر نعمت کی نسبت اللہ ہی کی طرف کرتا ہے۔

۵......کوئی پیر فقیر، حکیم اور ڈاکٹر اولاد نہیں دے سکتا، یہ اختیار صرف اللہ کے پاس ہے کہ وہ جسے چاہے اولاد دے اور جسے چاہے محروم رکھے، جسے چاہے لڑکے اور جسے چاہے لڑکیاں دے دے۔

۶......اگر بالفرض نیت درست بھی ہو تو بھی ایسے نام رکھنا جن سے شرک کی بو آتی ہو گناہِ عظیم ہے۔

۷......بچوں کے نام ایسے رکھنے چاہییں جن سے ان کا مسلمان اور موحد ہونا ظاہر ہوتا ہو۔ اگر اللہ اور رسول کے نام کو بچے کے نام کا حصہ بنا دیا جائے تو یہ سب سے بہتر ہے ویسے صحابہ اور صحابیات اور سلف صالحین کے ناموں سے بھی اسلامیت ظاہر ہوتی ہے۔

معبودانِ باطلہ کی بیچارگی

﴿۱۹۴......۱۹۸﴾

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا

جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ بندے ہیں تم جیسے، بھلا پکارو تو ان کو، پس چاہئے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو اگر تم

لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۹۴﴾ أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا أَمْ

سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے

لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ

دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں تو کہہ دے کہ پکارو اپنے شریکوں کو پھر برائی کرو میرے حق میں اور مجھ کو

ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنظِرُونِ ﴿١٩٥﴾ إِنَّ وَلِـِّۧيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ﴿١٩٦﴾

ڈھیل نہ دو۔میرا حمایتی تو اللہ ہے جس نے اتاری کتاب اور وہ حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی۔اور جن کو تم پکارتے ہو اس

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ﴿١٩٧﴾ وَإِن

کے سوا، وہ نہیں کر سکتے تمہاری مدد اور نہ اپنی جان بچا سکیں۔اور اگر تم ان کو پکارو رستہ کی طرف تو کچھ نہ سنیں اور تو دیکھتا ہے

تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا ۖ وَتَرَاهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٩٨﴾

ان کو کہ تک رہے ہیں تیری طرف اور وہ کچھ نہیں دیکھتے۔

ربط: ماقبل آیات میں توحید باری تعالیٰ کا اثبات اور معبودانِ باطلہ سے الوہیّت کی نفی تھی، زیرِ نظر آیات میں بھی وہی مضمون تاکید کی غرض سے ذکر کیا گیا ہے تاکہ انسانوں کے دلوں میں توحید راسخ ہو جائے اور شرک کا قلع قمع ہو۔

تسہیل: اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تمہارے ہی جیسے عاجز بندے ہیں تم انہیں پکار کر دیکھ لو، اگر تم انہیں معبود ماننے میں سچے ہو تو انہیں چاہئے کہ تمہاری پکار کا جواب دیں O کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ کوئی چیز پکڑ سکتے ہیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں؟ یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں؟ آپ ان سے فرما دیجئے کہ تم اپنے سارے شریکوں کو بلوا لو پھر سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرلو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو O بیشک پروردگار صرف اللہ ہے جس نے میرے اوپر یہ کتاب نازل فرمائی ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ نیک بندوں کی مدد کرتا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی مدد کرتے ہو وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں نہ ہی اپنی مدد کر سکتے ہیں O اور اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار نہیں سنتے اور جب تم انہیں دیکھتے ہو تو یوں لگتا ہے کہ وہ بھی تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ ان کے اندر تو دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں O

تفسیر

﴿۱۹۴﴾......مشرکین سے خطاب ہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ مخلوق اور، عاجز ہونے میں تمہارے جیسے ہیں بلکہ عبادت کرنے والے اپنے بعض معبودوں سے کئی اعتبار سے بہتر ہیں {۳۸۸} اس لئے کہ اللہ نے انہیں سننے، دیکھنے، چلنے پھرنے اور پکڑنے کی صلاحیت عطا کی ہے جبکہ ہاتھوں سے تراشے گئے صنم ان صلاحیتوں سے محروم ہیں ایک مسلمان کی نظر میں اس سے بڑا عجوبہ نہیں ہو سکتا کہ عابد بہتر اور معبود کمتر! لیکن اس ترقی یافتہ دور میں

{۳۸۸} انها عبید مثل عابدیها إلى مخلوقات مثلهم بل الأناس أكمل منها۔(ابن کثیر/۲/۳۶۷)

بھی یہ عجوبہ کاری دنیا کے متعدد ممالک میں بڑے زور وشور سے ہو رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کی فطرت اور عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ کبھی بھی ان بتوں کی عبادت نہ کرے لیکن بہت سے انسانوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ جس ماحول میں آنکھیں کھولتے ہیں اسی کے اثرات کو پوری طرح قبول کر لیتے ہیں اور انہی اثرات کی غلامی میں زندگی بسر کر دیتے ہیں۔

﴿فَادْعُوْهُمْ﴾ اگر ان بتوں کے معبود ہونے کے بارے میں تمہارا دعوای سچا ہے تو ان سے کوئی دعا مانگو، عدمِ تکمیل کی صورت میں تم خود ہی جان لوگے کہ یہ عبادت کے ہرگز مستحق نہیں۔

﴿۱۹۵﴾......قرآن، مشرکانہ سوچ پر ضرب لگانے کے لئے بات کو آگے بڑھاتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ یہ معبود اپنی پرستش کرنے والوں سے کمتر ہیں، اس تردید پر قرآنِ کریم انسانی عقل کو متوجہ کرتا ہے، قرآن کہتا ہے ان بتوں کا حال یہ ہے کہ وہ نہ چل سکتے ہیں نہ پکڑ سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی سن سکتے ہیں جبکہ ان کے پجاری ان اعضاء کے بغیر زندگی بہت مشکل محسوس کرتے ہیں، خود ان کے پجاری بھی اپنے معبودوں کی بیچارگی محسوس کرتے ہیں مگر قومی اور خاندانی تعصب انہیں کفر وشرک کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہونے دیتا مشرکین کی تاریخ میں ایسے لطائف بھی ملتے ہیں کہ شدید بھوک اور مجبوری کی حالت میں انہوں نے اپنے پیٹ کی آگ آٹے اور مٹھائی سے بنائے گئے ''معبود'' ہی سے بجھالی۔

﴿قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ﴾ آخر میں نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان پجاریوں اور ان کے لاچار خداؤں کو چیلنج کریں کہ تم سب اکٹھے ہو کر مجھے نقصان پہنچانے کی جو تدبیر بھی کر سکتے ہو کر گزرو، مجھے یقین ہے کہ تم سب میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے ایک تو اس لئے کہ تمھارے اختیار میں کچھ نہیں۔

﴿۱۹۶﴾......دوسرے اس لئے کہ میرا حامی و ناصر اللہ ہے میں اس پر اعتبار کرتا ہوں اور جسے اللہ کی نصرت حاصل ہو جائے پوری دنیا مل کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی آپ ﷺ نے یہ بھی بتا دیا کہ میرا بھروسہ اس اللہ پر ہے جس نے میرے اوپر کتاب نازل فرمائی ہے، یہ کتاب بتاتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں نہ دعا قبول کر سکتا اور نہ نفع نقصان پہنچا سکتا ہے۔

﴿وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ﴾ وہ صرف میرا ہی حامی و ناصر نہیں بلکہ وہ تمام لوگ جو شرک سے اجتناب کریں اور اس پر توکل کریں وہ ان کی مدد کرتا ہے، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو آزمانے اور کھوٹے کھرے میں فرق کرنے کے لیے انہیں آزمائشوں میں ڈالتا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ پر ان کا اعتماد تزلزل کا شکار نہیں ہوتا۔

حضرت عبداللہ ابن مظعون، عتبہ بن ربیعہ مشرک کی پناہ میں تھے، انہوں نے اپنے آپ کو عتبہ کی پناہ سے نکال دیا

کیونکہ وہ یہ پسند نہ کرتے تھے کہ وہ عتبہ جیسے مشرک کی پناہ میں رہیں اور دوسرے مسلمانوں پر تشدد جاری ہو، جب انہوں نے عتبہ کی پناہ کو حقارت سے ٹھکرا دیا تو مشرکین ان پر ٹوٹ پڑے انہوں نے ان پر اس قدر تشدد کیا کہ وہ ایک آنکھ سے محروم ہوگئے عتبہ دیکھتے تھے کہ ان پر تشدد ہو رہا ہے اور وہ ان کو دعوت دیتے تھے کہ وہ دوبارہ اس کی پناہ میں آ جائیں انہوں نے کہا: میں ایک ایسی ذات کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ طاقتور ہے، عتبہ کہتا اے میرے بھائی تیری آنکھ اس سے مستغنی اور محفوظ تھی جو اذیت اسے پہنچی تو وہ جواب دیتے ''ہرگز نہیں خدا کی قسم! میری دوسری آنکھ بھی اس کی متمنی ہے کہ اسے اللہ کے راستے میں وہ کچھ پہنچے جو اس کے لئے بہتر ہو''، وہ جانتے تھے کہ اللہ کی پناہ بندوں کی پناہ سے زیادہ طاقتور ہے، ان کو یقین تھا کہ رب تعالیٰ ہرگز انہیں بے سہارا نہ چھوڑیں گے اگر چہ وہ نفس کو سر بلند کرنے اور آزمانے کے لئے اس کو مشکلات سے دوچار کرتا ہے، کیا خوب کہا ''خدا کی قسم میری دوسری آنکھ بھی اس صورت حال کی مستحق ہے جو اس کے لئے اللہ کے راستے میں بہتر ہو''۔

﴿۱۹۷﴾......اللہ کو چھوڑ کر جن معبودوں کو تم پکارتے ہو وہ نہ تو تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی مدد کر سکتے ہیں، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، مشرکین نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان کے معبود اپنے آپ کو توڑ پھوڑ سے نہ بچا سکے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے بارے میں آتا ہے کہ مدینہ منورہ میں قبولِ اسلام کے بعد یہ دونوں رات کی تاریکی میں بتوں کو توڑ پھوڑ دیا کرتے تھے تاکہ ان کی قوم کو عبرت حاصل ہو۔ حضرت عمرو بن جموح قوم کے سردار تھے انہوں نے بھی عبادت کے لئے ایک بت رکھا ہوا تھا یہ دونوں نوجوان رات کو آتے اس بت کے سر پر کوڑا کرکٹ پھینکتے اور اسے غلاظت سے لت پت کر دیتے، صبح حضرت عمرو بن جموح آ کر اسے غسل دے کر خوشبو لگاتے اور اس کے پاس تلوار رکھ کر کہتے کہ ان ستم گروں سے انتقام لو، یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا بالآخر انہوں نے یہ کیا کہ اس بت کو ایک مردہ کتے کے ساتھ باندھ کر قریبی گڑھے میں ڈال دیا جب حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھا تو ان کے دل نے گواہی دی کہ بت پرستی غلط اور اسلام سچا مذہب ہے چنانچہ انہوں نے ایمان قبول کر لیا اور بت کو مخاطب کر کے یہ شعر کہا۔

تاللہ لو کنت إلها مستدن............لم تک والکلب جمیعا فی قرن .{۳۸۹}

اللہ کی قسم! اگر تم واقعی معبود ہوتے تو تم اور کتا اکٹھے ایک گڑھے میں نہ پڑے ہوتے

{۳۸۹} تفسیر ابن کثیر ۲/۳۶۷

﴿۱۹۸﴾......مشرکین کو خطاب ہے{۳۹۰} کہ جن بتوں کی تم پرستش کرتے ہو نہ تو یہ مادی نصرت کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی یہ ہدایت وارشاد کی قدرت رکھتے ہیں اگر تم ان سے ہدایت کی درخواست کرو تو اول تو یہ تمہاری درخواست سنیں گے ہی نہیں اور اگر بالفرض سن لیں تو قبول نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہ قبولیت سے عاجز ہیں اور جب تم ان کی طرف دیکھتے ہو تو ان کی مصنوعی آنکھوں کی وجہ سے تمہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ تو بصارت ہی سے محروم ہیں تمہاری طرف کیسے دیکھ سکتے ہیں؟

دوسری تفسیر اس آیت کی یہ کی گئی ہے کہ اس میں خطاب مشرکوں سے نہیں بلکہ حضور اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ سے خطاب ہے{۳۹۱} ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر آپ لوگ انہیں اللہ کی ہدایت یعنی ایمان اور توحید کی دعوت دیں تو یہ سنی ان سنی کر دیں گے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ یہ تو اس بصیرت ہی سے خالی ہیں جس کے ذریعہ حق اور باطل سچ اور جھوٹ میں فرق کیا جا سکتا ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......انسان اشرف المخلوقات ہے اس کا مٹی، پتھر اور دوسری چیزوں سے بنی ہوئی مورتیوں کی عبادت کرنا حماقت اور جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

۲......قادرومختار ذات کو چھوڑ کر ایسی مخلوق کی عبادت جو نفع دے سکتی ہے نہ نقصان عقل وفہم کے سراسر خلاف ہے۔

۳......اہلِ ایمان کا دل خود ساختہ معبودوں اور مادی طاقتوں کے خوف سے خالی ہوتا ہے ان کے آقا ﷺ نے بظاہر طاقتور نظر آنے والے مشرکوں اور ان کے معبودوں کو چیلنج دے کر فرمایا تھا کہ تم سب مل کر میرے خلاف جو بھی تدبیر کر سکتے ہو کر لو مگر وہ کچھ نہ کر سکے۔

۴......اللہ پر توکل کرنا مسلمان پر واجب ہے اس لئے کہ اللہ اپنے نیک بندوں کو کبھی بھی بے یار ومددگار نہیں چھوڑتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی کے آخری ایام میں بعض خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ اپنے بیٹوں کے لئے کچھ چھوڑ جاتے تو بہتر ہوتا۔ آپ نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا تھا ”میرا بیٹا نیکوں میں سے ہوگا یا مجرموں میں سے، اگر وہ نیکوں میں سے ہوا تو اللہ اس کا مددگار ہوگا اور جس کا مددگار اللہ ہوا سے میرے مال کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر وہ مجرموں میں سے ہوا تو اللہ فرماتے ہیں” میں مجرموں کا ہرگز مددگار نہیں بنوں

{۳۹۰} المراد بذلك المشركون (قرطبی ۷/۳۰۱)

{۳۹۱} وعن الحسن ان الخطاب فی ”وان تدعوهم“ للمؤمنين ......وتراهم خطابا لسيد المخاطبين (روح المعانی ۲/الجزء التاسع ۲۱۲)

گا'' اور جسے اللہ رد کردے میں اس کی ضروریات کی فراہمی میں مشغول نہیں ہوسکتا'' {۳۹۲}

۵......اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی نصرت سے بتوں کے عاجز ہونے کو دو دفعہ بیان کیا ہے، پہلی دفعہ مشرکین کو ڈانٹ ڈپٹ کیلئے اور دوسری دفعہ یہ فرق بتانے کے لئے کہ کس کی عبادت جائز ہے اور کس کی عبادت جائز نہیں، معبودِ حقیقی اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے مگر بت کسی کی مدد نہیں کرتے۔

۶......بت پرستی صرف قدیم زمانے میں ہی نہیں ہوتی تھی دورِ جدید میں بھی ہوتی ہے اور آج کا انسان مختلف قسم کے شرک میں مبتلا ہے، نفسانی خواہشات، قوم، وطن، سیاسی جماعتیں، مغربی تہذیب غیر مجسم بت ہیں ان کی بھی پوجا کی جاتی ہے جیسے مجسم بتوں کی پوجا کی جاتی تھی، ان کی چوکھٹ پر بھی قربانیاں دی جاتی ہیں جس طرح بت خانوں میں خون بہایا جاتا تھا۔

عورت کی بے راہروی اور عریانیت ہو یا سود خوری پر مبنی نظامِ معیشت، مرد و زن کا آزادانہ اختلاط ہو یا انفرادی اور معاشرتی زندگی کے مسائل، ہر جگہ اور ہر شعبے میں اللہ کے حکموں کو پامال کیا جاتا ہے اور کسی نہ کسی غیر مجسم بت کی پرستش کی جاتی ہے۔

قدیم بت پرستی ایک اعتبار سے فوقیت رکھتی تھی وہ یہ کہ بتوں کی پرستش کو اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، ماڈرن بت پرستی کی لعنت میں اللہ کا قرب اور اس کی رضا جیسے الفاظ نامانوس ہوکر رہ گئے ہیں۔

اجتماعی اخلاق اور شیطانی وساوس

﴿۱۹۹......۲۰۲﴾

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ

عادت کر درگزر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنارہ کر جاہلوں سے۔ اور اگر ابھارے تجھ کو شیطان کی چھیڑ تو پناہ مانگ اللہ

نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ

سے وہی ہے سننے والا جاننے والا۔ جن کے دل میں ڈر ہے، جہاں پڑ گیا ان پر شیطان کا گزر چونک گئے، پھر اسی وقت ان کو

تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں وہ ان کو کھینچتے چلے جاتے ہیں گمراہی میں پھر وہ کمی نہیں کرتے۔

ربط: گزشتہ آیات میں مشرکین کے نظریات کی تردید تھی یہاں حضورِ اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو نصیحت ہے کہ

{۳۹۲} تفسیر منیر ۹/ ۲۱۴

لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں اور اگر ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے آپ کو غصہ آ جائے تو شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کریں۔

تسہیل: اے پیغمبر ﷺ! آپ عفو ودرگزر کا طریقہ اختیار فرمائیں، اچھی باتوں کی تلقین کریں اور جاہلوں سے اعراض فرمائیں O اگر کبھی شیطان وسوسہ اندازی کی کوشش کرے تو آپ اللہ کی پناہ مانگیں، وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے O جن لوگوں کے دل میں تقوٰی ہوتا ہے ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر کبھی شیطانی خیال ان کے قریب سے بھی گزر جائے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے لئے درست طریقہ کیا ہے O شیطانوں کے بھائی انہیں کج روی میں کھینچے چلے جاتے ہیں اور انہیں گمراہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۹۹﴾......اس چھوٹی سی آیت کریمہ میں باری تعالیٰ نے تین بنیادی خُلق بیان فرمائے ہیں:

ا۔ پہلا خلق، عفو ودرگذر کا طریقہ اختیار کرنا ہے یعنی لوگوں کے ساتھ معاشرت اور باہم میل جول میں سختی کے بجائے نرمی کی جائے اور ان کے اندر جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں ان کے بارے میں عفو ودرگزر سے کام لیا جائے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

یسّروا و لا تعسّروا، وبشّروا و لا تنفروا.

’’آسانی پیدا کیا کرو تنگی نہ کیا کرو، بشارت دیا کرو اور انہیں متنفر نہ کیا کرو‘‘{۳۹۳}

قطع رحمی کرنے والوں سے صلہ رحمی کرنا، گناہ گاروں کو معاف کرنا، تجارت اور مالی معاملات میں بہت زیادہ سختی نہ کرنا، دین کی دعوت میں ہمدردی اور حکمت سے کام لینا یہ سب کچھ اس حکم میں شامل ہے۔ ہمارے آقا ﷺ کی زندگی عفو ودرگزر اور حکمت ومحبت کا اعلیٰ نمونہ تھی، اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾

’’اگر آپ تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے اردگرد سے منتشر ہو جاتے‘‘

۲۔ ’’معروف کی تلقین کریں‘‘ ہر وہ کام جس کا حسن اور خوبی عقلِ سلیم یا شریعت سے ثابت ہو، اسے معروف کہا جاتا ہے۔{۳۹۴}

دین کے داعی کو چاہیے کہ آغاز میں معروف امور کی دعوت دے ورنہ ابتداء ہی سے سختی کرنے سے نفسِ انسانی

{۳۹۳} بخاری، علم، ۱۱، جہاد، ۱۶۴/ مسلم، جہاد، ۵/ ابوداؤد، ادب، ۱۷/ مسند احمد، ۴، ۲۱۲، ۴۱۲، ۴۱۷

{۳۹۴} والمعروف اسم لکل فعل یعرف بالعقل اوالشرع حسنه (المفردات/ ۳۳۱)

کے بد کنے کا خطرہ رہتا ہے۔

۳۔ ''جاہلوں سے اعراض فرمائیں'' جہالت کا لفظ رشد وہدایت کے مقابلے میں بھی بولا جاتا ہے اور علم کے مقابلہ میں بھی، حقیقت میں جہالت اور ضلالت دونوں ایسے دوست ہیں جو عام طور پر اکٹھے ہی رہتے ہیں۔

جاہلوں سے اعراض کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ بحث وتکرار سے احتراز کیا جائے، بحث وتکرار سے ان کا راہِ راست پر آجانا تو یقینی نہیں مگر داعی اور جاہلوں کے درمیان دوری کا پیدا ہونا تقریباً یقینی ہے۔

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے جبریل سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے عرض کیا کہ ''آپ کا رب فرماتا ہے جو آپ سے تعلق توڑتے ہیں آپ ان سے تعلق جوڑیں، جو آپ کو محروم رکھتے ہیں آپ انہیں عطا فرمائیں اور جو زیادتی کرتے ہیں آپ ان سے درگزر فرمائیں'' {۳۹۵}

حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو اس آیتِ کریمہ میں اچھے اخلاق کا حکم دیا ہے اور پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ اچھے اخلاق کی جامع کوئی آیت نہیں۔ {۳۹۶}

﴿۲۰۰﴾......نبی کریم ﷺ ان ربانی ہدایات پر بہت زیادہ عمل کرنے والے تھے لیکن آپ بہر حال بشر تھے، بعض اوقات جاہلوں کی حرکتیں ایسی ناقابل برداشت ہوتی تھیں کہ بتقاضائے بشریت آپ کو غصہ آجاتا تھا، یہ صورتحال ہر زمانے کے اصحابِ دعوت کو پیش آسکتی ہے اس لئے حکم دیا جارہا ہے کہ اگر کبھی شیطان وسوسہ اندازی کرے اور جاہلوں سے انتقام لینے اور ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے پر اکسائے تو تم اللہ کی پناہ کے ذریعہ اپنے غصے اور جوش پر قابو پانے کی کوشش کیا کرو۔

﴿اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ جاہلوں کی جہالت بھی سنتا ہے اور تمہارے جذبات کو بھی جانتا ہے۔

﴿۲۰۱﴾......جن لوگوں کے دل میں اللہ کا تقویٰ ہوتا ہے ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر کبھی شیطانی خیال ان کے قریب سے گزر جائے تو ذرا سی دیر کے لئے تو ان پر اس کا اثر ہوتا ہے لیکن پھر وہ چوکنے ہو جاتے ہیں، انہیں اللہ بھی یاد آجاتا ہے اور اسکی جزا وسزا، انعامات واحسانات اور اس کی قدرت واختیار سب کچھ یاد آجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ہمیں کونسے راستے پر چلنا چاہئے۔ ہر انسان کے ساتھ فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی، فرشتہ اس کے دل میں اچھے خیالات پیدا کرتا ہے اور شیطان وساوس کی یلغار کرتا ہے، اگر اچھے خیالات آئیں تو جان لینا چاہئے کہ یہ اللہ کی

{۳۹۵} کبیر ۵/۴۳۵

{۳۹۶} وقال جعفر الصادق: امر اللہ نبیّہ لمکارم الاخلاق......ولیس فی القرآن آیۃ أجمع لمکارم الاخلاق من هذه الآیۃ۔(قرطبی/۷/۳۰۳)

طرف سے ہیں اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اگر خدانخواستہ برے خیالات آئیں تو شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے یہ مضمون حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں بیان ہوا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے ہر کسی کے ساتھ جن لگا ہوا ہے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں! میرے ساتھ بھی ہے مگر اللہ نے میری مدد فرمائی چنانچہ میں اس کے شر سے بچ گیا'' {۳۹۷}

﴿۲۰۲﴾......اہل تقویٰ اور نیک لوگ اللہ کی یاد کی برکت سے شیطان کے جھانسے میں آنے سے بچ جاتے ہیں جن کا دل تقویٰ سے خالی ہوتا ہے وہ شیطان کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جاتے ہیں شیطان انہیں کھینچ کر کج روی میں بہت دور تک لے جاتا ہے۔

حکمت وہدایت:

۱......ایک مسلمان کو اچھے اخلاق کا چلتا پھرتا نمونہ بننا چاہئے جن میں سے افضل ترین یہ ہے کہ وہ زیادتی کرنے والے کو معاف کردے، محروم رکھنے والوں کو عطا کرے اور قطع تعلقی کرنے والوں سے صلہ رحمی کرے۔ (۱۹۹)

۲......جب شیطانی وسوسہ یا غصے کا غلبہ ہو تو شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، عصام بن مصطلق نے حضرت حسن اور ان کے والد حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کو گالیاں دیں لیکن انہوں نے گالیوں کے جواب میں اسے شفقت ومحبت کی نظر سے دیکھا پھر فرمایا: ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○ {۳۹۸}

۳......انسان کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان کے پاس سب سے مؤثر ہتھیار وسوسہ ہے حتّٰی کہ وہ بعض اوقات ایک مسلمان کے دل میں ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں بھی وساوس پیدا کر دیتا ہے۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''شیطان تم میں سے کسی کے پاس آکر اس سے سوال کرتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا ہے، فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا ہے؟ سوالات کا یہ سلسلہ دراز کرتے ہوئے اس سے پوچھتا ہے کہ یہ بتاؤ تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا ہے؟ جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو اللہ کی پناہ مانگو اور رک جاؤ۔ {۳۹۹}

{۳۹۷} مسند احمد/۱/۳۸۵

{۳۹۸} تفسیر منیر ۹/۲۲۲

{۳۹۹} مسلم، کتاب الایمان/۳۱۳، بخاری، بدء الوحی باب ۱۱

۴......صرف زبان ہی سے ''اعوذ باللہ'' پڑھنا کافی نہیں ہے بلکہ دل میں بھی اللہ کی پناہ میں آنے کا تصوّر ہونا چاہئے شاید اسی لئے آیت کے اختتام پر فرمایا گیا ''اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ '' (اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے) یعنی زبان سے استعاذہ کے الفاظ کہو کیونکہ اللہ ''سمیع'' ہے اور دل میں اس کے معانی کا استحضار کرو کیونکہ وہ ''علیم'' ہے۔(۲۰۰)

۵......شیطان کا وسوسہ اتنا زور دار ہوتا ہے کہ بعض اوقات نیک لوگوں کی آنکھوں کے سامنے بھی وقتی طور پر اندھیرا چھاجاتا ہے پھر جب وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں تو اندھیرا چھٹ جاتا ہے اور وہ ہدایت کی روشنی میں آجاتے ہیں (۲۰۱)

۶......شیطانی حملوں سے بچاؤ تقوٰی اور ذکرِ الٰہی سے ممکن ہے (۲۰۱)

۷......جنی اور انسی شیطان آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں، دوسرے انسانوں کو گمراہ کرنے میں بھی یہ ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوتے ہیں (۲۰۲)

۸......شیاطین گمراہی کی اشاعت میں کوتاہی نہیں کرتے جبکہ دین کے علمبردار اشاعتِ دین میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ضمیمہ

فائدہ عجیبہ

امامِ تفسیر، ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک عجیب بات یہ لکھی کہ پورے قرآن میں تین آیتیں اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم و تلقین کیلئے جامع آئی ہیں اور تینوں کے آخر میں شیطان سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے ایک تو سورۂ اعراف کی مذکورہ آیت ہے۔

دوسری سورۂ مؤمنون کی یہ آیت:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ {۴۰۰}

''برائی کو دفع کرو بھلائی سے، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ کہا کرتے ہیں اور یوں دعا کیجئے کہ اے میرے پروردگار! میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے دباؤ سے اور اے میرے پروردگار! میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں''

{۴۰۰} سورۃ المومنون آیت ۹۷

تیسری آیت سورۃ حم السجدہ میں ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿۳۵﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۶﴾ {۴۰۱}

"نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی، آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کریں پھر یکا یک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحبِ نصیب ہے اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے"

ان تینوں آیتوں میں غصہ دلانے والوں سے عفو و درگزر اور برائی کے بدلے میں بھلائی کرنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو انسانی جھگڑوں سے خاص دلچسپی ہے، جہاں جھگڑے کا کوئی موقع پیش آتا ہے اس کو اپنی شکار گاہ بنالیتا ہے اور بڑے سے بڑے بردبار، باوقار آدمی کو غصہ دلا کر حدود سے نکال دینے کی کوشش کرتا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ جب غصہ قابو میں نہ آتا دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ شیطان مجھ پر غالب آرہا ہے اور اللہ کی طرف رجوع ہو کر پناہ مانگیں تب مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہو سکے گی اسی لئے بعد میں تیسری اور چوتھی آیت میں بھی شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ {۴۰۲}

خصوصیاتِ قرآن اور آدابِ ذکر

﴿۲۰۳......۲۰۶﴾

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي

اور جب تو لے کر نہ جائے ان کے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں کیوں نہ چھانٹ لایا تو کچھ اپنی طرف سے؟ تو کہہ دے میں تو چلتا ہوں اس پر جو حکم آئے

هَٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۲۰۳﴾ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ

میری طرف میرے رب سے یہ سوجھ کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کو جو

{۴۰۱} حم السجدہ ۴۱/۳۴-۳۶

{۴۰۲} معارف القرآن/۴/۱۵۹

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ

مومن ہیں۔اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔اور یاد کرتا رہ اپنے رب کو

خِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ﴿۲۰۵﴾

اپنے دل میں گڑگڑاتا ہوا اور ڈرتا ہوا اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو صبح کے وقت اور شام کے وقت، اور مت رہ بے خبر۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾

بے شک جو تیرے رب کے نزدیک ہیں وہ تکبر نہیں کرتے اس کی بندگی سے اور یاد کرتے ہیں اس کی پاک ذات کو اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

ربط: سابقہ آیات میں شیاطین کے گمراہ کرنے کے بارے میں بتایا گیا تھا یہاں ان کے گمراہ کرنے کی ایک خاص صورت کا بیان ہے، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کے دشمن آپ سے مختلف قسم کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے تاکہ مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں لوگوں کو ورغلا سکیں کہ آپ سچے نبی نہیں۔

تسہیل: اور جب آپ انہیں ان کا منہ مانگا معجزہ نہ دکھائیں تو وہ کہتے ہیں آپ نے خود ہی کیوں نہ گھڑ لیا، آپ فرما دیجئے میں تو صرف اسی کی اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے، یہ تمہارے رب کی طرف سے بصیرت افروز دلائل ہیں اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں ○ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو شاید کہ تم پر بھی رحمت نازل ہو ○ اور آپ ہر کسی سے کہہ دیں کہ اپنے رب کو صبح شام یاد کیا کرو عاجزی اور خوف کے ساتھ، اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ یاد کیا کرو اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ○ فرشتے جو تیرے رب کے مقرب ہیں وہ اس کی بندگی سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے سامنے سجدے کرتے ہیں ○

﴿تفسیر﴾

﴿۲۰۳﴾......مشرکین حضور اکرم ﷺ سے مختلف معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور جب ان کا مطلوبہ معجزہ انہیں دکھایا نہ جاتا تو وہ طرح طرح کی باتیں بناتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ رسالت کی حقیقت سے ناواقف تھے ان کا خیال تھا کہ کسی بھی معجزہ کا دکھانا پیغمبر کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے حالانکہ اللہ کے پیغمبر اپنی قوم کے سامنے وہی کچھ ظاہر کرتے ہیں جو کچھ انہیں اللہ کی طرف سے دیا جاتا ہے اس لئے آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کے سامنے اعلان فرما دیجئے کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا میں تو بس وہی کرتا ہوں جس کا مجھے حکم دیا جاتا ہے۔

﴿هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ﴾ {۴۰۳} میرے پاس سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے جس میں ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ہے۔

قرآن اتنا بڑا معجزہ ہے کہ کوئی مادی معجزہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، یہ صرف اپنے زمانہ نزول ہی میں معجزہ نہیں تھا بلکہ قیامت تک کے لئے معجزہ ہے، فصاحت و بلاغت کے علاوہ تاثیر کے اعتبار سے بھی اس کے اندر اعجازی شان پائی جاتی ہے، قرآن اور صاحبِ قرآن کے جو بدترین دشمن تھے وہ بھی جانتے تھے کہ ہم اپنی قوم کو اس سے متاثر ہونے سے نہیں روک سکتے اس لئے وہ اپنے کارندوں کو یہ مشورہ دیتے تھے:

لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَالۡغَوۡا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ {۴۰۴}

"قرآن کو سنو نہیں بلکہ جب پڑھا جائے تو تم شور مچاؤ شاید کہ تم غالب آجاؤ"

قرآنِ کریم اپنے دامن میں جو حقائق اور اسرار رکھتا ہے وہ ابھی سارے کے سارے انسانوں پر ظاہر نہیں ہوئے اس لئے کہ انسان کا علم ناقص ہے، جوں جوں اس کا علم ترقی کرتا جائے گا اس پر حقائق کھلتے جائیں گے فی الحال تو اس پر یہ لازم ہے کہ "غیب" پر ایمان رکھے، جو قرآن نے کہہ دیا اسے تسلیم کر لے، سورۂ کہف میں ہے:

قُلۡ لَّوۡ كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّـكَلِمٰتِ رَبِّىۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىۡ وَلَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِهٖ مَدَدًا {۴۰۵}

"فرما دیجئے کہ اگر اللہ کے کلمات کیلئے سمندروں کو سیاہی بنا دیا جائے تو یہ سمندر ختم ہو جائیں گے مگر اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے اگرچہ ہم اتنی ہی سیاہی اور بنا دیں"

قرآن کے علوم و معارف بحرِ بے کنار ہیں جبکہ ان کے مقابلہ میں انسان کا علم چند قطروں پر مشتمل ہے۔ کائنات کی تخلیق کا مسئلہ ہو یا اس میں پوشیدہ قوتوں کا، انسان کی نفسیات ہوں یا عقائد و ادیان کی بحث ہو، حیاتیات کا موضوع ہو یا سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی مسائل کا، ان تمام شعبوں کے بارے میں قرآن بحث کرتا ہے قرآن کی موجودگی میں کسی دوسرے معجزے کی ضرورت ہی نہیں، مگر جاہلیتِ قدیمہ کے علمبردار قرآن سے توجہ ہٹانے کے لئے مختلف قسم کے مادی معجزوں کا مطالبہ کرتے رہتے تھے، اسی سے ملتا جلتا رویہ جاہلیتِ جدیدہ کے علمبرداروں کا بھی ہے، ان کی بھی پوری کوشش یہی ہے کہ لوگ قرآن کی آواز پر کان نہ دھریں، قرآن سے دور رکھنے کیلئے وہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ بھی کرتے ہیں اور انسانوں کو لھو و لعب اور رقص و سرود میں مشغول رکھنے کیلئے طرح طرح کے حربے بھی آزماتے رہتے ہیں، چونکہ آج کے دور کا سب سے مؤثر ہتھیار میڈیا ان کے قبضے میں ہے اس لئے وہ بظاہر اپنے منصوبوں میں کامیاب

{۴۰۳} مشیر الی مایوحی الیہ (نظم الدرر/۳/۱۷۷)

{۴۰۴} حم السجدہ/۴۱/۲۶

{۴۰۵} الکہف/۱۸/۱۰۹

دکھائی دیتے ہیں مگر تا بکے؟ ایک نہ ایک دن حقیقت کا سورج طلوع ہو کر رہے گا، انسانوں کو ہمیشہ کے لئے روشنی سے محروم نہیں رکھا جا سکتا، اس میں شک ہی کیا ہے کہ قرآن میں روشنی ہے، بصیرت ہے اور ہدایت و رحمت ہے مگر اسے محسوس کرنے اور اس سے مستفید ہونے کے لئے ایمان بھی شرط ہے اور توجہ کے ساتھ سننا بھی شرط ہے۔

﴿۲۰۴﴾...... جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔ اس آیتِ کریمہ کے شان نزول کے بارے میں مختلف روایات ہیں بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں امام کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے، بشیر بن جابر سے روایت ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی تو انہوں نے کچھ لوگوں کو امام کے ساتھ قرأت کرتے ہوئے سنا جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم سمجھ جاؤ اور اللہ کا یہ ارشاد سننے کے بعد نماز میں خاموش رہو جیسا کہ اس نے تمہیں حکم دیا ہے "وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا"

حضرت ابنِ عباس بھی فرماتے ہیں کہ یہ آیت فرض نماز کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ حضرت مجاہدؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت نماز اور خطبہ دونوں کے بارے میں ہے احناف اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی بھی نماز مین مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے۔

قال رسول الله ﷺ انما جعل الإمام ليؤتم به فإذا كبّر فكبّروا و إذاقرأ فأنصتوا.

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا امام اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے چنانچہ جب وہ تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہا کرو اور جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہا کرو) {۴۰۶}

احناف کے برعکس غیر مقلدین کی رائے یہ ہے کہ فاتحہ خلف الامام ہر نماز میں واجب ہے خواہ سری نماز ہو یا جہری، جبکہ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ صرف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کو واجب کہتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام ایک ایسا اختلافی مسئلہ ہے جس پر مختلف علماء نے لمبی لمبی کتابیں لکھی ہیں، بعض حضرات اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ نجات کا مدار بس اسی مسئلہ کے حل ہونے پر ہے، عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں نہ تو انہیں ان کا ادراک ہے اور نہ ہی ان کی تردید کے لئے ان کے پاس وقت ہے، ان کے جسم و جان اور قلم و زبان کی ساری صلاحیتیں صرف فاتحہ خلف الامام، آمین بالجھر اور رفعِ یدین جیسے مسائل کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہیں ان کی شبانہ روز کوششوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر امت نے اجتماعی طور

{۴۰۶} بحوالہ تفسیر منیر ۲۲۹/۹

پر ان کی رائے پر عمل کر لیا تو اس کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، اس آیت کے ذیل میں بھی فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ ہی کو زور و شور سے بیان کیا جاتا ہے، بہت کم لوگ ہیں جو اس آیتِ کریمہ کے اصل مفہوم کی طرف توجہ دیتے ہوں، یہاں عمومی طور پر مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو وہ خاموش رہیں، اسے توجہ سے سنیں اور اس پر عمل کریں۔

قرآنِ کریم کو توجہ کے ساتھ سننے اور اس میں غور و تدبر کرنے کا حکم صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ غیرِ نماز میں بھی ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ کوئی بھی حکم اپنے شانِ نزول کے ساتھ خاص نہیں ہوتا، قرآن میں غور و تدبر کرنے سے انسان کے دل و دماغ پر عجیب و غریب اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس کی سوچ اور عمل میں بڑی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ قرآن کی اکثریت نہ تو قرآن کو سمجھتی ہے اور نہ ہی اس میں غور و تدبر کی عظمت اور فضیلت کی قائل ہے، اکثر مسلمان تو قرآن پڑھتے ہی نہیں جو پڑھتے ہیں وہ اسے سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ حسنِ قرأت کی محفلوں میں باوجودیکہ سامعین کی اکثریت دینی مدارس کے طلباء، حفاظ اور قراء کی ہوتی ہے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کی تمامتر توجہ آواز کے مدو جزر پر ہوتی ہے، ہزاروں کے مجمع میں گنتی کے چند افراد ہوتے ہیں جو معانی پر نظر رکھتے ہیں چنانچہ یہ مجمع قاری صاحب کی طرف سے اظہارِ فن کی صورت میں بشارت کی آیات پر بھی اچھل اچھل کر سبحان اللہ کہتا ہے اور عذاب اور غضب کی آیات پر بھی اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار کرتا ہے، حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فہمِ قرآن کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" کچھ لوگ ایسے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا (تو ایسی تلاوت کا کیا فائدہ ہوگا) فائدہ تو تب ہوگا جب قرآن دل میں اتر کر راسخ ہو جائے گا" {۴۰۷}

امام ابنِ قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: تدبر کے ساتھ تلاوت سے زیادہ کوئی چیز بھی دل کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی اس میں سالکوں کی ساری منزلیں، عاملوں کے سارے احوال اور عارفین کے سارے مقامات اللہ نے جمع کر دئے ہیں، تدبرِ قرآن کی برکت سے دل میں محبت، شوق، خوف، امید، انابت، توکل، رضا، صبر و شکر اور وہ تمام احوال پیدا ہوتے ہیں جن سے دل کو زندگی اور کمال حاصل ہوتا ہے، اسی طرح تدبرِ قرآن ان تمام بری صفات اور افعال سے پاک کر دیتا ہے جن سے دل کی موت واقع ہوتی ہے اگر لوگوں کو ان فوائد کا علم ہو جائے جو تدبر کے ساتھ قرأتِ قرآن میں پوشیدہ ہیں تو وہ سب کام چھوڑ کر اسی میں مصروف ہو جائیں، قرآن کو سمجھ کر پڑھنے والا انسان جب کسی ایسی آیت کی

{۴۰۷} صحیح مسلم/حدیث ۱۸۵۸

تلاوت کرے گا جس میں دل کی شفا ہوگی تو وہ اسے سو بار بلکہ پوری رات پڑھنے کے لئے تیار ہو جائے گا قرآن کی ایک آیت کو سمجھ کر پڑھنا بغیر سمجھے پورا قرآن پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے اس سے دل کو بھی نفع ہوتا ہے اور ایمان اور قرآن کی حلاوت کا ذوق بھی حاصل ہوتا ہے۔{۴۰۸}

اس میں شک نہیں کہ احادیث میں ترتیل وتجوید اور خوش آوازی کے ساتھ قرآن پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تدبر کو قطعًا نظر انداز کر دیا جائے اور سارا زور آواز کے بنانے اور سنوارنے پر لگا دیا جائے۔

﴿۲۰۵﴾......قرآن کے بعد مطلق ذکر اللہ کا حکم اور اسکے آداب کا بیان ہے، اللہ کے ذکر کی مختلف صورتیں اور مختلف صیغے اور الفاظ ہیں، استغفار، درود شریف، دعا، نماز اور تلاوت یہ سب اللہ کے ذکر ہی میں شامل ہیں۔حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ پہلی آیت کی طرح یہ آیتِ کریمہ بھی تلاوتِ قرآن ہی سے متعلق ہے اور اس میں ذکر سے مراد قرآن ہے۔{۴۰۹}

اس آیتِ کریمہ میں ذکر اللہ اور تلاوتِ قرآن کے تین طریقے بتائے گئے ہیں، پہلا طریقہ یہ ہے کہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور قرآنِ کریم کے معانی میں غور وفکر کیا جائے۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زبان کو بھی حرکت دی جائے مگر آواز کو اتنا پست رکھا جائے کہ کوئی دوسرا نہ سن سکے، اگر کوئی شخص صرف زبان سے اللہ کا ذکر کرے جبکہ اس کا دل غافل ہو تو ایسا ذکر بھی فائدہ سے خالی نہیں کیونکہ بسا اوقات زبانی ذکر قلبی ذکر کا ذریعہ بن جاتا ہے، مشہور اصول ہے "اذا تکرّر تقرّر فی القلب" جب زبان سے کسی چیز کا بار بار ذکر کیا جائے گا تو آہستہ آہستہ اس کی محبت دل میں بیٹھ جائے گی، جو شخص صبح شام اٹھتا بیٹھتا اللہ اللہ کرے گا انشاء اللہ اس کے دل میں اللہ کی محبت ضرور گھر کر جائے گی، ویسے بھی زبان سے ذکر کی صورت میں جسمانی اعضاء میں سے کم از کم ایک عضو تو عبادت میں مصروف ہوتا ہے اگر ہم نے اسی پر زور دیا کہ غفلت کی صوررت میں ذکر و تلاوت اور نماز کا ذرہ بھی فائدہ نہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ بے شمار لوگ جنہیں دورانِ عبادت وساوس اور خیالات پریشان کرتے رہتے ہیں وہ عبادت ہی سے دلبرداشتہ ہو جائیں گے، البتہ اس میں شک نہیں کہ ذکر کا پورا فائدہ تبھی حاصل ہوگا جب زبان کے ساتھ دل بھی مصروف اور متوجہ ہو، کامل ذکر اسی کو کہا جائے گا جس کے کرنے والے کے دل میں محبت کی حرارت ہو اور جس کا اثر اس کی ذات اور اعمال

{۴۰۸} مفتاح دار السعادہ صفحہ ۲۲۱

{۴۰۹} قرطبی /۷/ ۳۱۰

پڑھو اور اسے خوف وخشیت، ادب واحترام اور عاجزی کے ساتھ کیا جائے۔ کیا یہ بات ہمارے لئے باعث شرم نہیں کہ ہم دنیاوی عہدوں پر فائز شخصیات کے سامنے درخواست پیش کرتے ہوئے انتہائی خوشامد، لجاحت اور تواضع کا انداز اختیار کریں لیکن پوری کائنات کے مالک کے سامنے دعا کرتے ہوئے اور اس کی عبادت اور ذکر کرتے ہوئے از راہِ غفلت، لاپرواہی اور بے نیازی کا مظاہرہ کریں؟

ذکر کا تیسرا طریقہ جو اس آیتِ کریمہ سے ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دل کے دھیان اور زبان کی حرکت کے ساتھ آواز بھی بلند کی جائے مگر اسے ایک حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے "وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ" میں اس طریقہ کی نشاندہی کی گئی ہے، اس کی مزید وضاحت سورۂ اسراء کی درج ذیل آیت میں کی گئی ہے:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا﴾ {۴۱۰}

"اپنی قرأت میں نہ تو آواز بہت بلند کیا کریں نہ ہی بالکل پست رکھا کریں بلکہ جہر اور اخفاء کے درمیانی کیفیت اختیار کریں"

رات کی نماز میں قرأت کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے حضرت صدیقِ اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کو یہی نصیحت فرمائی تھی۔ ابوداؤد میں ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ کریم ﷺ رات کے آخری حصے میں گھر سے نکلے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز میں مشغول تھے مگر تلاوت آہستہ آواز سے کر رہے تھے پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ بہت بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ جب صبح کو یہ دونوں حضرات حاضرِ خدمت ہوئے تو آپ نے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں رات تمہارے پاس گیا تو دیکھا کہ تم پست آواز سے تلاوت کر رہے تھے، صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! مجھے جس ذات کو سنانا تھا اس نے سن لیا یہ کافی ہے، اسی طرح فارق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ قرأت میں جہر کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ نیند کا غلبہ نہ رہے اور شیطان اس کی آواز سے بھاگے، آنحضرت ﷺ نے فیصلہ فرمایا اور صدیقِ اکبر کو یہ ہدایت کی کہ ذرا آواز بلند کیا کریں اور فارقِ اعظم کو یہ کہ کچھ پست کیا کریں۔ {۴۱۱}

حضرت عائشہؓ سے جب نبی کریم ﷺ کی تلاوت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ سرًّا اور جہرًا دونوں طرح تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ضرورت اور حالات کے مطابق بلند آواز سے بھی تلاوت کی

{۴۱۰} الاسراء ۱۱۰/۱۷

{۴۱۱} ابوداؤد/۱/۱۹۵/باب فی رفع الصّوت بالقرأۃ فی صلوٰۃ الّلیل۔

جاسکتی ہے اور آہستہ آہستہ بھی مگر بلا ضرورت خواہ مخواہ چیخ چیخ کر ذکر و دعا صحیح نہیں بالخصوص اگر نام و نمود اور دکھاوے کے لئے ہو تو قطعاً جائز نہیں، اسی طرح اگر آواز بلند کرنے سے دوسروں کی عبادت یا آرام میں خلل آتا ہو تو سب کے نزدیک آہستہ ہی پڑھنا افضل ہے۔ ہمارے آقا ﷺ نے بلاوجہ چلا چلا کر دعا کرنے کو پسند نہیں کیا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سفر کے دوران نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو بلند آواز میں دعا کرتے ہوئے سنا تو فرمایا "اے لوگو! اپنے اوپر رحم کرو، تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے بلکہ اس اللہ کو پکار رہے ہو جو سننے والا ہے اور قریب ہے حتّٰی کہ تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے" {۴۱۲}

ہمارے ہاں جو لوگ نعت و تلاوت اور ذکر و بیاں کے لئے سپیکر کا بے تحاشا استعمال کرتے ہیں انہیں اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہئے بعض اوقات مسجد کے ہال میں چند افراد بیٹھے ہوتے ہیں جن تک آواز پہنچانے کیلئے سپیکر کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ ایسا بھی دیکھا اور سنا گیا ہے کہ مسجد بالکل خالی ہے مگر اسپیکر کی آواز اتنی تیز رکھی جاتی ہے کہ لگتا ہے ہزاروں کا مجمع گوش بر آواز ہے۔

﴿ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ اللہ کا ذکر کسی وقت کے ساتھ مخصوص نہیں مومن کی شان یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے ہر وقت اسی کی زبان معطر اور دل منوّر رہے، صبح و شام کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کیونکہ ان اوقات میں کائنات میں عظیم تغیر رونما ہوتا ہے، دن سے رات اور رات سے دن نمودار ہوتا ہے، اس تغیر کا اثر انسان کے قلب و نظر پر بھی ہوتا ہے اور وہ قبولیت کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔

﴿ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ﴾ اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کی یاد سے غافل ہیں، نہ ان کی زبان پر اللہ کا نام آتا ہے نہ ان کے دل اس کی یاد میں دھڑکتے ہیں چنانچہ ان کے لئے ربّ کی پسندیدہ زندگی گزارنا اور عجز و نیاز اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔

﴿۲۰۶﴾...... آخری آیت میں بارگاہِ الٰہی کے مقرّبین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کبھی گھمنڈ کا شکار نہیں ہوتے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر رب کی عبادت میں کوتاہی نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو عاجز اور محتاج جان کر ہمیشہ اللہ کی عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول رہتے اور اس کے سامنے جھکتے رہتے ہیں، اس ذکر و عبادت سے انہیں ایسی روحانی قوت حاصل ہوتی ہے جو کسی مادی وسیلے اور ظاہری سبب سے حاصل نہیں ہوسکتی، کارگاہِ حیات میں ایک

{۴۱۲} بخاری۔ الفتح ۱۳ (۷۳۸۶) مسلم (۲۷۰۴)

مومن اور بالخصوص دین کے داعی کو اس اضافی طاقت کی ضرورت قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے، یہ بھی ملحوظ رہے کہ اللہ کے سامنے جھکنے اور اس کے آگے اپنے آپ کو محتاج سمجھنے والے کو نہ کسی اور کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اور نہ ہی ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کا دامن ہر قسم کے شرک سے پاک ہوتا ہے۔سورۂ اعراف کی اس آخری آیت کو آیتِ سجدہ کہا جاتا ہے، اس کے پڑھنے یا سننے کی صورت میں سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتا ہے۔صحیح مسلم میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آدم کا بیٹا آیتِ سجدہ پڑھتا اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا بھاگتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس! انسان کو سجدہ کرنے کا حکم ملا اور اس نے تعمیل کر لی تو اس کا ٹھکانہ جنت ہوا اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا میں نے نافرمانی کی تو میرا ٹھکانہ دوزخ ہوا۔{۴۱۳}

اللہ کو سجدہ کرنا بڑا محبوب ہے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب کے قریب سب سے زیادہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں ہو لہٰذا سجدہ کی حالت میں خوب دعا کیا کرو کیونکہ اس کے قبول ہونے کی بڑی امید ہے۔{۴۱۴}

حکمت وہدایت:

۱......نبی کریم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسٰی علیہ السلام تک تمام انبیاء کو جتنے بھی معجزات عطا کئے گئے یہ ان سب سے عظیم معجزہ ہے۔

۲......قرآن میں ان لوگوں کے لئے بصیرت، ہدایت اور رحمت ہے جن کے سینے ایمان کے نور سے منور ہیں (۲۰۴)

۳......قرآن نماز میں پڑھا جائے یا غیر نماز میں، اسے توجہ اور عمل کی نیت سے سننا چاہئے۔

۴......فہم و تدبّر کے ساتھ تلاوت کرنا، قرآن کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔

۵......امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔احناف کی رائے یہ ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے کسی بھی نماز میں قرأت نہیں کرنی چاہئے خواہ سری نماز ہو یا جہری، ان کا استدلال ان روایات سے ہے جن میں امام کی قرأت کو مقتدی کے لئے کافی قرار دیا گیا ہے مثلاً حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "من کان لہ' إمام فقراتہ لہ' قراءۃ" (جو امام کی اقتداء میں نماز پڑھے اس کے لئے امام کی

{۴۱۳} مسلم/کتاب الایمان/۱۳۳، ابن ماجہ/ اقامۃ/۷۰

{۴۱۴} مسلم/۴۸۲

قرأت کافی ہے){۴۱۵}

متعدد صحابہ جن میں حضرت علی ، حضرت ابنِ مسعود، حضرت سعد، حضرت جابر، حضرت ابن عباس، حضرت ابودرداء، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت انس رضی اللہ عنہم اجمعین بھی شامل ہیں، اسی کے قائل ہیں۔

مالکیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ سری نماز میں مقتدی کو قرأت کرنی چاہئے اور جہری میں خاموش رہنا چاہئے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے مختلف اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ مقتدی کو سرّی اور جہری دونوں نمازوں میں فاتحہ پڑھنی چاہیے۔

۶......امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سجدۂ تلاوت کو واجب قرار دیتے ہیں، سجدۂ تلاوت کے لئے تکبیرِ تحریمہ، رفعِ یدین اور سلام کی ضرورت نہیں، ۔اگر درجِ ذیل دعا سجدہ میں پڑھ لی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

"اللّٰھم لک سجد سوادی ، وبک آمن فؤادی، اللّٰھم ارزقنی علما ینفعنی وعملا یرفعنی"

(اے اللہ! میرا جسم آپ کے سامنے سجدے میں ہے، میرا دل آپ پر ایمان رکھتا ہے، اے اللہ! مجھے ایسا علم عطا فرما جو مجھے نفع دے اور ایسے عمل کی توفیق عطا فرما جو مجھے رفعت عطا کردے)۔{۴۱۶}

اگر یہ دعا یاد نہ ہو تو تسبیح کے پڑھنے پر ہی اکتفاء کرلے۔

۷......جو لوگ اللہ کے جتنے قریب ہوتے ہیں وہ اتنا ہی تسبیح اور سجدوں کا اہتمام کرتے ہیں۔

{۴۱۵} ابن ماجہ/ اقامۃ/ باب ۱۳)

{۴۱۶} بحوالہ تفسیر منیر/۹/۲۳۴

سُورَةُ الْاَنْفَالِ

مَدَنِيَّةٌ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ انفال کے اہم مضامین

سورۂ انفال مدنی ہے، اس میں پچھتر آیات اور دس رکوع ہیں، دوسری مدنی سورتوں کی طرح اس میں بھی شرعی احکام کے بیان کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ خاص طور پر ”جہاد فی سبیل اللہ“ کا موضوع اس میں بہت نمایاں ہے، یہ سورت غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی جو کہ تاریخِ اسلام میں ہونے والے غزوات کی بنیاد اور ابتداء تھا، اس غزوہ میں اللہ کی نصرت کا دیکھتی آنکھوں سے مشاہدہ کیا گیا اور چھوٹے سے لشکر نے اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔ اس سورت کی ابتدا مالِ غنیمت کا حکم بیان کرنے سے ہوئی ہے کیونکہ اس کی تقسیم کے بارے میں مسلمانوں میں باہم اختلاف ہو گیا تھا، اس کے بعد سچے مومنوں کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں یعنی اللہ کی خشیت، تلاوتِ قرآن سے ایمان کی زیادتی، رحمٰن پر توکل، نماز کی حفاظت اور اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان۔ اگلی آیات میں غزوۂ بدر کی تفصیل ہے۔

سورۂ انفال کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو چھ بار ”یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا“ کے محبت آمیز الفاظ سے خطاب فرما کر انہیں ایسے اصول بتائے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وہ میدانِ جہاد میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ سکتے ہیں۔

پہلا خطاب آیت ۱۵ میں ہے جس میں فرمایا گیا ”اے ایمان والو! جب تم میدانِ جنگ میں کافروں سے ٹکراؤ تو ان سے پیٹھ مت پھیرو“

دوسرا خطاب آیت ۲۰ میں ہے جس میں ہے ”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو اور اسے سن کر اعراض نہ کرو“

تیسرا خطاب آیت ۲۴ میں ہے ”اے ایمان والو! اللہ اور رسول کا حکم مانو جب وہ تمہیں ایسے کام کی طرف بلائیں جس میں تمہاری زندگی ہے“

چوتھا خطاب آیت ۲۷ میں ہے ”اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور آپس کی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو“

پانچواں خطاب آیت ۲۹ میں ہے ”اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں فرقان عطا کر دے گا، تمہارے گناہ تم سے دور کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے“

چھٹا خطاب آیت ۴۶ میں ہے اور یہ آیت دسویں پارہ میں ہے ''اے ایمان والو! جب کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''

ان آیات میں جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان پر عمل پیرا ہو کر اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے باز آ کر مسلمان یقیناً دنیا کی سب سے مضبوط اور طاقتور قوم بن سکتے ہیں۔ ایسی جماعت کبھی شکست سے دوچار نہیں ہو سکتی جو دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہے، جو اللہ اور رسول کے احکام کی اطاعت کرنے والی ہو، جو ایسی دعوت پر لبیک کہنے والی ہو، جس میں دلوں کی زندگی اور عزت و سعادت کا راز پوشیدہ ہو، جو نہ دین میں خیانت کرتی ہو اور نہ دنیاوی حقوق کی ادائیگی میں خیانت کا ارتکاب کرتی ہو، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خوفِ خدا اور تقوی کی صفت سے متصف ہو اور آخری بات یہ کہ وہ گولہ بارود کی بارش میں بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی رہے، اس کا کلمہ ایک ہو، اس کی صفوں میں کامل اتحاد ہو، وہ نفسانی اور گروہی تنازعات اور اختلافات میں مبتلا نہ ہو، ذرا غور کیجیے جس جماعت میں یہ صفات پائی جائیں وہ کبھی شکست کھا سکتی ہے؟ یقیناً وہ فتح ہی سے ہمکنار ہوگی اگر چہ اس کا مقابلہ پہاڑوں ہی سے کیوں نہ ہو۔

سورۃ الانفال کا کچھ حصہ دسویں پارہ میں بھی آیا ہے، انفال، نفل کی جمع ہے، مالِ غنیمت کو کہتے ہیں، اس سورت کی پہلی آیت میں ایک ایسے ہی سوال کا جواب دیا گیا تھا جو مالِ غنیمت کے بارے میں کیا گیا تھا، دسویں پارہ کے شروع میں اس کی مزید تفصیل ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ رسولِ اکرم ﷺ، آپ کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو دیا جائے گا جبکہ چار حصّے مجاہدین کے درمیان تقسیم کیے جائیں گے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کا حکم بتانے کے بعد دوبارہ غزوۂ بدر کی تفصیل ہے جس میں قرآنِ حکیم نے اپنے خاص اسلوب میں اس کی یوں منظر کشی کی ہے کہ گویا سامعین اپنی آنکھوں سے اس غزوہ کا حال دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا:

''اس وقت کو یاد کرو جب تم قریب کے ناکے پر تھے اور وہ دور کے ناکے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے اتر گیا تھا'' (۴۲)

غزوۂ بدر کے حوالے سے جو باتیں یہاں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے خاص خاص باتیں درجِ ذیل ہیں:

☆...... جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو کفار بہت کم دکھائی دیئے، ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس جنگ کا ہونا طے فرما دیا تھا اور اللہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی فریق بھی دوسرے کی کثرت سے مرعوب ہو کر راہِ افرار اختیار کر جائے۔ (۴۳-۴۴)

☆......اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی نصرت کا تذکرہ کرنے کے بعد اپنی نصرت کے حصول کے چار عناصر ذکر فرمائے ہیں: (۱) میدانِ جنگ میں ثابت قدمی۔ (۲) اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرنا۔ (۳) آپس میں اختلاف اور لڑائی جھگڑے سے بچ کر رہنا۔ (۴) دشمن سے مقابلہ کے وقت ناموافق امور پر صبر کرنا۔ (۴۶)

☆......غزوۂ بدر میں شیطان مشرکین کے سامنے ان کے اعمال کو مزیّن کر کے پیش کرتا رہا، دوسری جانب مسلمانوں کی مدد کے لیے آسمان سے فرشتے نازل ہوئے جو کافروں کے چہروں اور پیٹھوں پر سخت ضربیں لگاتے تھے۔ (۴۸-۵۱) مفسرین فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ آیات غزوۂ بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن مفہوم کے اعتبار سے عام ہیں۔ چنانچہ موت کے وقت ہر کافر کی پٹائی لگتی ہے۔

☆......قریش پر غزوۂ بدر میں آفت آئی اور وہ ذلیل وخوار ہوئے تو اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ جب کوئی قوم شکر کی بجائے کفر اور اطاعت کی بجائے معصیت شروع کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا معاملہ بدل دیتا ہے اور اسے نعمت کی جگہ نکبت اور راحت کی جگہ مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

☆......غزوۂ بدر کے پسِ منظر میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ دشمنوں سے مقابلہ کے لیے مادی، عسکری اور روحانی تینوں اعتبار سے تیاری مکمل رکھیں، ظاہر ہے غزوۂ بدر میں مادّی تیاری مکمل نہ تھی، یہ تو اللہ کی خاص نصرت کا نتیجہ تھا کہ مادّی اور عسکری اعتبار سے کمزوری اور دونوں لشکروں میں بے پناہ تفاوت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی لیکن آئندہ کے لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ حالات اور ضروریات کے مطابق بھرپور تیاری کریں تا کہ ان کے اسلحہ اور ساز وسامان کو دیکھ کر دشمن پر رعب طاری ہو جائے اور وہ اسلامی لشکر کے مقابلے میں آنے کی جرأت ہی نہ کرے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''جہاں تک ہو سکے تم ان سے مقابلے کے لیے تیاری رکھو، قوت بھی اور گھوڑوں کا پالنا بھی کہ اس کے ذریعہ تمہاری دھاک بیٹھی رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسرے لوگوں پر جنہیں تم نہیں جانتے اور اللہ انہیں جانتا ہے'' (۸:۶۰)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مادی قوت وطاقت کی اہمیت کے باوجود روحانی قوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دشمن سے دو بدو ہونے کے لیے روحانی اور ایمانی قوت، تمام دوسری قوتوں اور وسائل کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو کمزور کو طاقتور بناتی ہے، جو چھوٹے لشکر کو بڑے لشکر کے ساتھ ٹکرانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے، جو شہادت کی راہ پر چلنا آسان کرتی ہے، ایمانی قوت رکھنے والوں کو ایسا رعب عطا کیا جاتا ہے جو بڑے بڑے سور ماؤں کو لرزہ براندام کر دیتا ہے، اپنی اس اجتماعی کمزوری کا کیسے اعتراف کیا جائے کہ آج

کے مسلمان فکری، علمی، مادی اور روحانی ہر اعتبار سے ضعف اور کمزوری کا شکار ہیں۔

☆...... جہاں مسلمانوں کو جنگ کے لیے ہمہ وقت مستعد رہنے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ

''اگر یہ (کافر) صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ'' (۸:۶۱)

اس آیت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اگر صلح میں مسلمانوں کی مصلحت ہو تو صلح کر لینی چاہیے، جنگ کی تیاری اور جذبۂ جہاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بہرصورت جنگ ہی کرنا ضروری ہے اور مصالحت سے دور رہنا ہی اللہ کا حکم ہے، خود نبی کریم ﷺ نے متعدد مواقع پر صلح کا راستہ اختیار فرمایا ہے۔

☆...... جنگِ بدر میں ستر مشرکین گرفتار ہوئے تھے، ہمارے آقا ﷺ نے اپنی عادت کے موافق ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے یہ تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ دیا کہ انہیں فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے، حضور پاک ﷺ نے اسی رائے کو پسند فرمایا اور ان قیدیوں کو رہا کر دیا، اس پر اللہ کی طرف سے عتاب نازل ہوا، فرمایا گیا: ''اگر اللہ کا حکم نہ ہو چکا ہوتا تو جو فدیہ تم نے لیا ہے اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا''۔ (۸:۶۸)

اس قسم کی آیات جن میں رسولِ اکرم ﷺ پر عتاب فرمایا گیا ہے قرآن کی صداقت وحقانیت کی دلیل ہیں، اگر بالفرض قرآن اللہ کا کلام نہ ہوتا تو ایسی آیات کو قرآن میں ہرگز جگہ نہ ملتی۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ عتاب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس فدیہ کے کھانے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اسے حلال اور پاکیزہ قرار دیا جو مشرک قیدیوں سے لیا گیا تھا۔ سورت کے اختتام پر ان لوگوں کو ایک دوسرے کا رفیق قرار دیا گیا ہے جو اللہ کی رضا کے لیے ہجرت اور جہاد کرتے ہیں، ایک دوسرے کو ٹھکانہ فراہم کرتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اس سورت کی ابتداء جہاد اور غنیمت کے ذکر سے ہوئی تھی اور اختتام نصرت اور ہجرت کے ذکر پر ہو رہا ہے گویا کہ یہ سورت ابتداء سے اختتام تک جہاد ہی کے بیان پر مشتمل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مالِ غنیمت کی تقسیم اور مومنون کی صفات

﴿۱.....۴﴾

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا، تُو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا، سو ڈرو اللہ سے اور صلح کرو آپس میں اور حکم

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ① اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ

مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اگر ایمان رکھتے ہو۔ ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام آئے اللہ کا تو ڈر جائیں ان کے دل اور

قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ② الَّذِيْنَ

جب پڑھا جائے ان پر اس کا کلام تو زیادہ ہو جاتا ہے ان کا ایمان اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو کہ قائم

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ

رکھتے ہیں نماز کو اور ہم نے جو ان کو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ وہی ہیں سچے ایمان والے، ان کے لئے

دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ④

درجے ہیں اپنے رب کے پاس اور معافی اور روزی عزت کی۔

شانِ نزول

اس سورۃ کی پہلی آیت کے شانِ نزول کے بارے میں مختلف روایات آئی ہیں جن سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب غزوۂ بدر کے مالِ غنیمت کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی، {۱} ان روایات میں سے کسی میں اختلاف کے عام سبب کا اور کسی میں خاص سبب کا ذکر ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں قسم کے اسباب پیش آگئے ہوں۔

امام جصّاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ جنگ سے پہلے نبی کریم ﷺ نے مالِ غنیمت کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا تھا جنگ سے فارغ ہونے کے بعد مجاہدین میں اختلاف ہو گیا، اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ﴾ جس میں غنیمت کی تقسیم کا اختیار حضورِ اکرم ﷺ کو دے دیا گیا اور آپ نے اسے مجاہدوں کے درمیان برابر تقسیم فرما دیا۔{۲}

{۱} ابن کثیر ۲/۳۷۶

{۲} احکام القرآن للجصاص ۲/۴۵

تسہیل: یہ لوگ آپ سے غنیمتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ انہیں بتا دیجئے کہ غنیمتیں اللہ اور اس کے رسول کی مِلک ہیں، پس تم اللہ سے ڈرو اور آپس کے تعلقات درست رکھو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو اگر تم واقعی مومن ہو ○ حقیقی مومن تو بس وہی ہیں جن کے سامنے جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب انہیں اللہ کی آیات سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں ○ وہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں ○ یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجات ہیں اور مغفرت اور عزت کی روزی بھی ہے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱﴾......اے میرے حبیب! یہ لوگ آپ سے مالِ غنیمت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اسے کیسے تقسیم کیا جائے؟ آپ انہیں بتا دیجئے کہ یہ مال اللہ کا ہے، وہ اس کے بارے میں جو چاہے گا فیصلہ فرمائے گا اور اللہ نے اس کی تقسیم کا اختیار اپنے رسول کو دے دیا ہے، یہ حکم یہاں اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے جبکہ کچھ آگے چل کر آیت (۴۱) میں اس کے مصارف کی وضاحت کردی گئی ہے۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ جب غنیمت کا معاملہ اللہ اور اس کے رسول کے حوالے ہے تو اے ایمان والو! تم اپنی جماعت میں وحدت وصلاح قائم رکھنے کیلئے تین چیزوں کا اہتمام کرو، تقوای، اصلاح اور اطاعت۔

اصل چیز تقوای، اور خوفِ خدا ہے جب دلوں میں تقوای پیدا ہو جائے تو آپس کے تعلقات کی اصلاح اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اگر تم واقعی مومن ہو تو اپنے اندر یہ تینوں صفات پیدا کرو، ایمان صرف خوبصورت الفاظ اور دل خوش کرنے والی آرزوؤں کا نام نہیں، ایمان جب دل میں جگہ بنالے تو انسان کے اعمال اور سیرت و کردار میں اس کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے، فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لیس الإیمان بالتّحلّی ولا بالتّمنّی ولکن هو ماوقر فی القلب وصدّقه الأعمال.{۳}

''ایمان صرف زیبائش وآرائش اور خوبصورت تمناؤں کا نام نہیں، یہ تو دل میں جاگزین ہوتا ہے اور اعمال اس کی تصدیق کرتے ہیں''

{۳}اقتضاء العلم العمل للخطیب البغدادی بحوالہ نضرۃ النعیم ۴۸/۳

جب دل میں کامل ایمان ہوگا تو تقویٰ بھی حاصل ہوگا اور اطاعت اور اصلاح کی توفیق بھی ہوگی، جب یہ ساری صفات جمع ہوجائیں گی تو آپس کے جھگڑے ختم ہوجائیں گے اور محبت والفت کے رشتے استوار ہوجائیں گے۔

﴿۲﴾......جن دلوں میں ایمان راسخ ہوجائے ان کے اندر درجِ ذیل پانچ صفات پیدا ہوجاتی ہیں، ان صفات کی روشنی میں ہر مسلمان کو اپنا محاسبہ کرنا چاہئے، اگر اس کے اندر یہ صفات پائی جاتی ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرے اور اگر وہ ان میں سے بعض صفات سے محروم ہو یا پائی تو جاتی ہوں مگر کمزور درجہ میں، تو اسے ان کے حصول کی فکر کرنی چاہئے۔

خوفِ خدا

پہلی صفت خوفِ خدا ہے جب اہلِ ایمان کے سامنے اللہ کی عظمت وکبریائی کا، اس کی ذات وصفات کا اور اس کے وعدے اور وعید کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل پر ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، یہ ہیبت صرف خدا کی پکڑ اور دوزخ کے عذاب کے تصوّر سے طاری نہیں ہوتی بلکہ اس کی بادشاہی کی وسعت، بے انتہاء عزّت وقدرت اور بے حدوحساب عظمت کے تصوّر سے بھی طاری ہوتی ہے سورۂ فاطر میں ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَٰٓؤُا﴾ {۴} ”اللہ کے بندوں میں سے اہلِ علم ہی کے دل اس کی خشیت سے لبریز ہوتے ہیں“

ایک صاحبِ علم جب کائنات کی وسعتوں اور قدرت کی لامحدود نشانیوں میں غوروفکر کرتا ہے تو اس کا دل لرز کررہ جاتا ہے۔ قرآن نے یہاں ”خوف“ کا نہیں ”وجل“ کا لفظ استعمال کیا ہے، وجل مطلق ڈر کو نہیں کہتے بلکہ اس اضطراب اور بے قراری کو کہتے ہیں جو انجام کے تصور سے یا کسی بڑے کی جلالتِ شان سے دل میں پیدا ہوتی ہے، یہ خوف اور بے قراری بڑی مبارک کیفیت ہے، حضرت امِ درداء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما دونوں فرماتی ہیں کہ جس وقت دل میں یہ کیفیت محسوس ہو اس وقت دعا کرنا باعثِ قبولیت ہوتا ہے۔ {۵}

ثابت بنانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک اللہ والے نے بتایا کہ مجھے قبولیتِ دعا کے لمحات کی خبر ہوجاتی ہے، پوچھا گیا وہ کیسے؟ فرمایا جب میرے رونگٹے کھڑے ہوجائیں، دل بے قرار ہوجائے، آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں تو وہ قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے۔

ایمان میں ترقی

اہلِ ایمان کی دوسری صفت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کی ایمانی کیفیات

{۴} فاطر/۳۵/۲۸

{۵} روح المعانی/۶/الجزء التاسع ۲۳۹

میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس لئے کہ دلائل کی کثرت، یقین کی زیادتی اور عقیدے کی پختگی کا سبب بنتی ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے، انہوں نے اپنے رب سے درخواست کی کہ مجھے موت کے بعد زندہ ہونے کا منظر دکھایا جائے، سوال کیا گیا

﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ "کیا تم ایمان نہیں رکھتے ؟" جواب دیا۔

﴿بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ﴾ {۶} "کیوں نہیں! لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہوجائے"

ظاہر ہے اطمینان ایک کیفیت کا نام ہے جس ایمان میں اطمینان ہوگا اس کا درجہ مجرّد ایمان سے اعلیٰ ہوگا۔ جو شخص ادب، احترام اور فہم و تدبر کے ساتھ اللہ کا کلام سنے گا اس کے نورِ ایمان میں یقیناً اضافہ ہوگا جس کی برکت سے اسے گناہوں سے طبعی نفرت ہوجائے گی، اللہ تعالیٰ نے قرآن اور قلبِ انسانی کے درمیان ربط اور تعلق رکھا ہے ان کے درمیان صرف کفر اور آثارِ کفر یعنی تکبر اور فسق و فجور کا پردہ حائل ہوتا ہے اگر اس پردے کو ہٹا دیا جائے تو دل قرآن کے نور سے منور ہونے لگتا ہے، پھر رونگٹے بھی کھڑے ہوتے ہیں، آنکھوں سے آنسو بھی بہتے ہیں اور ایمانی کیفیات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

سورۂ زمر میں ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾ {۷}

"اللہ نے بہترین کلام نازل کیا جو ایسی کتاب ہے جس کے مضامین ملتے جلتے ہیں اور بار بار دہرائے جاتے ہیں جن سے ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں پھر ان کی جِلد اور ان کے دِل نرم ہوکر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہوتے ہیں، یہی اللہ کی ہدایت ہے، وہ جسے چاہتا ہے قرآن کے ذریعہ ہدایت دیتا ہے اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں"

توکل

مومنوں کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ اللہ پر توکّل کرتے ہیں، یعنی ساری امیدیں اللہ ہی سے رکھتے ہیں، غیر اللہ

{۶} البقرہ/۲/۲۶۰

{۷} الزمر/۳۹/۲۳

سے کوئی امید نہیں رکھتے،{۸} توکل توحید کے اعلیٰ مقامات میں سے ہے اس لئے کہ جو شخص اس پر ایمان رکھتا ہے کہ اس کا رب ہی کائنات کا نظام چلانے والا ہے، زندگی اور موت، صحت اور بیماری، امیری اور غریبی سب اس کے ہاتھ میں ہے، اس سے یہ چیز بہت بعید ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور پر اعتماد کرے، توکل کا مطلب ترکِ اسباب نہیں ہے، اسباب بھی اللہ ہی کے پیدا کردہ ہیں اور انہیں اختیار کرنے کا حکم بھی اللہ ہی نے دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر توکل کرنے والا کون ہوگا؟ آپ خود بھی جائز اسباب اختیار فرماتے تھے اور دوسروں کو اختیار کرنے کا حکم دیتے تھے، آپ نے جتنے بھی غزوات میں حصہ لیا، ممکن حد تک پوری تیاری کے بعد ہی حصہ لیا، اگر توکل کے مفہوم میں ترکِ اسباب شامل ہوتا تو آپ بدر و حنین کے لئے سفر نہ فرماتے، یونہی غزوۂ احزاب میں خندق کی کھدائی کے مشکل ترین کام میں حصہ بھی نہ لیتے بلکہ مسجدِ نبوی یا حجرہ شریف میں بیٹھ کر کفار کی ہلاکت کیلئے بددعا فرما دیتے جس سے ان سب پر اجتماعی موت مسلّط کردی جاتی، صحابہ کرام جب آپ سے خانگی، تجارتی اور معاشی معاملات پر مشورہ فرماتے تو آپ انہیں اسباب سے بے اعتنائی کا کبھی بھی مشورہ نہیں دیتے تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سوال کیا یا رسول اللہ! کیا میں جانور کی رسی باندھنے کے بعد توکل کروں یا اسے آزاد چھوڑ کر؟ آپ نے فرمایا پہلے اسے باندھو، پھر توکل کرو۔{۹}

یہاں ایک حدیث کی وضاحت ضروری ہے جس کے ظاہری مفہوم سے بعض لوگ دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''اگر تم اللہ پر ویسے توکل کرتے جیسے توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں ویسے روزی دیتا جیسے پرندوں کو روزی دیتا ہے وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں''{۱۰}

اس حدیث سے ترکِ اسباب پر استدلال بالکل غلط ہے اس لئے کہ پرندے گھونسلے میں بیٹھے نہیں رہتے بلکہ صبح کے آغاز ہی سے روزی کی تلاش میں ہیں، سارا دن مارے مارے پھرتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ انہیں محروم نہیں رکھتا، شام کو جب وہ واپس لوٹتے ہیں تو ان کا پیٹ بھرا ہوتا ہے۔

امام ابنِ قیم اور فیروز آبادی رحمہما اللہ نے آدھا دین توکل کو اور آدھا دین انابت کو قرار دیا ہے اس لئے کہ دین

{۸} أي لا يرجون سواه ولا يقصدون إلّا إيّاه (ابنِ کثیر ۲/۳۷۹)
{۹} ترمذی/۲۵۱۷
{۱۰} ترمذی/۲۳۴۴

استعانت اور عبادت کا مجموعہ ہے، توکل میں استعانت آجاتی ہے اور انابت میں عبادت آجاتی ہے۔{۱۱}

جاہلیتِ جدیدہ کے علمبرداروں کے سامنے اگر توکّل کا لفظ بولا جائے تو وہ بولنے والے کو بڑے تعجب سے پوچھیں گے کہ یہ ''توکّل'' کونسی بلا کا نام ہے؟ یہ لوگ صرف اسباب پر ایمان رکھتے ہیں مسبب الاسباب کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں، انہیں یقین ہے کہ طبعی قوانین اٹل ہیں، اسباب کے بغیر کوئی نتیجہ سامنے نہیں آسکتا، ان کے یہ نظریات جو کہ درحقیقت مفروضے تھے، بتدریج غلط ثابت ہورہے ہیں، اہلِ ایمان کی سوچ اعتدال اور حقیقت پر مبنی ہے وہ اسباب کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود انہیں سب کچھ نہیں سمجھتے، ان کا ایمان ہے کہ اللہ کی تقدیر اور غیبی قوت کے بغیر محض اسباب سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، پانی میں سیرابی، دوا میں شفا، آگ میں حرارت، تجارت میں کامیابی اور زمین سے غلّہ اللہ ہی کے حکم سے پیدا ہوتا ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ

اہلِ ایمان کی چوتھی صفت اقامتِ صلوٰۃ ہے، یہ نکتہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ قرآن نے نماز پڑھنے کا نہیں بلکہ اسے قائم کرنے کا حکم دیا ہے، نماز پڑھنے کے لئے جیسے تیسے اس کے ارکان کی ادائیگی کافی ہے مگر اسے قائم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ قیام وقعود اور رکوع وسجود جیسے سارے ظاہری ارکان کی کامل طریقے سے ادائیگی کے ساتھ خشوع وخضوع اور فہم وتدبر کا بھی اہتمام کیا جائے، یہی نماز ہے جو بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے، یہاں ایک خطرناک فتنے کی نشاندہی بھی ضروری ہے جسے اٹھانے والے مسلمانوں کے ہاں چودہ صدیوں سے مروجہ نماز کو اٹھک بیٹھک اور ورزش کا نام دیتے ہیں یہ لوگ نماز کو حکیم مانی مجوسی کی ایجاد قرار دینے سے بھی باز نہیں آتے، ان حضرات کا بنیادی استدلال بھی ''اقامت'' ہی کے لفظ سے ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی تعمیل نماز پڑھنے سے نہیں ہوسکتی بلکہ اس کیلئے صلوٰۃ کا نظام قائم کرنا ضروری ہے، اس استدلال کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ چودہ صدیوں میں آج تک کوئی بھی ''اقامتِ صلوٰۃ'' کا مفہوم نہیں سمجھ سکا اور وہ تمام احادیث جن میں مروجہ نماز کا طریقہ مذکور ہے وہ معاذ اللہ سب کی سب مجوسیوں کی وضع کردہ ہیں۔

انفاقِ مال

مومنوں کی پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کا دیا ہوا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، فرض زکوٰۃ بھی ادا کرتے

{۱۱} قال ابن قیّم والفیروزآبادی رحمهما الله "التوكّل نصف الدين، والنّصف الثانی الإنابة...... الخ (مدارج السالكين ۱۱۸/۲)

ہیں اور نفلی صدقات میں سے بھی کچھ نہ کچھ مال نکالتے رہتے ہیں، اشاعتِ دین کا مصرف ہو یا جہاد فی سبیل اللہ کا، معاملہ رشتہ داروں کا ہو یا غریبوں، یتیموں اور مساکین کا، وہ ہر مد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، قرآنِ کریم میں اکثر نماز اور زکوٰۃ کو اکٹھے ذکر کیا گیا ہے اس لئے کہ امت کے روحانی اور اجتماعی اخلاق کی اصلاح اور مقاصد کی تکمیل کا مدار ان دونوں عبادتوں پر ہے۔

﴿۴﴾......جن لوگوں کے اندر یہ پانچ صفات پائی جاتی ہیں وہ حقیقی اور سچے مؤمن ہیں، زبان سے ایمان کے دعوے کرنے والے تو بے شمار ہیں مگر حقیقی مومن وہ ہیں جن کے اندر اہلِ ایمان والی صفات پائی جائیں۔

حضرت حارث بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرا گزر رسول اللہ ﷺ کے قریب سے ہوا آپ نے فرمایا "اے حارثہ! تم نے اپنی صبح کا آغاز کیسے کیا؟ میں نے عرض کیا "حقیقی مومن کی صورت میں میں نے دن کا آغاز کیا" آپ نے فرمایا "سوچ لو تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ میں نے عرض کیا میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا ہے اس لئے میں شب بیداری کرتا ہوں اور دن میں روزے رکھتا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں اپنے رب کے عرش کو علانیہ دیکھ رہا ہوں، یونہی اہلِ جنت کو باہم ملاقاتیں کرتے ہوئے اور اہلِ دوزخ کو چیختے چلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، آپ نے تین بار فرمایا اے حارثہ! تم نے ایمان کی حقیقت کو جان لیا اب اسی پر قائم رہنا۔{۱۲}

﴿لَهُمْ دَرَجٰتٌ﴾ دنیا میں بھی اہلِ ایمان کے درجات مختلف ہیں، ایک امیر ہے تو دوسرا غریب، ایک عالم ہے تو دوسرا جاہل، ایک ذہین ہے تو دوسرا غبی، جیسا کہ سورۂ انعام میں ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۵﴾ {۱۳}	"وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے اور درجات کے اعتبار سے تمہیں ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے تاکہ اس نے تمہیں جو کچھ عطا کیا ہے اس میں تمہیں آزمائے بے شک اللہ بہت جلد سزا دینے والا اور بہت بخشنے والا اور انتہائی مہربان ہے"

اسی طرح ایمانی اور اخروی درجات کے اعتبار سے بھی ان میں بڑا فرق ہے، ظاہر ہے جو فضیلت مہاجر اور مجاہد کو حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتی، اسی طرح جو مقام سخی اور عبادت گزار کا ہے وہ دوسرے کا نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ

{۱۲} ابن کثیر ۲/۳۸۰

{۱۳} الأنعام/۶/۱۶۵

خود انبیاء کرام علیہم السلام جو ظاہر ہے سارے کے سارے نیک، متقی اور پارسا ہوتے ہیں ان کے مراتب میں بھی بہت فرق ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ {۱۴}

''ان رسولوں میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی، ان میں کچھ تو ایسے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا، کچھ وہ ہیں جن کے درجات بلند کئے''

اہلِ جنت کے درجات بھی مختلف ہونگے، صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اونچے مقامات پر فائز اہلِ جنت کو نیچے والے ایسے دیکھیں گے جیسے تم کسی بہت دور کے ستارے کو دیکھتے ہو جو آسمان کے آفاق میں سے کسی افق میں ہو''

صحابہ نے عرض کیا یہ تو انبیاء کے مراتب ہوں گے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے؟ آپ نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے انبیاء کی تصدیق کی'' {۱۵}

حکمت وہدایت

۱...... ہر اختلاف اور نزاع شر نہیں بعض اوقات اس کا نتیجہ خیر کی صورت میں نکلتا ہے، مجاہدین کے درمیان مالِ غنیمت کی تقسیم میں اختلاف کا ہونا سبب بنا غنیمت کا حکم بیان کرنے کا۔

۲...... صحابہ کرام دینی مسائل کا حل معلوم کرنے کے بڑے حریص تھے، جو بات معلوم نہ ہوتی اللہ کے نبی سے دریافت کر لیتے (۱)

۳...... سارے احکامِ شرعیہ کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہاں سے احکام صادر ہوتے تھے جنہیں نبی کریم ﷺ بندوں تک پہنچاتے تھے (۱)

۴...... امت کی اصلاح اور قوت وعزت کا راز تین چیزوں میں پوشیدہ ہے۔ تقوای، جھگڑوں سے بچتے ہوئے باہمی تعلقات کی درستگی اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت (۱)

۵...... دل میں حقیقی ایمان کی موجودگی انسان کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر مجبور کر دیتی ہے (۱)

۶...... سچے مومنوں کے اوصاف درج ذیل ہیں:

☆ اللہ کا خوف ☆ تلاوت قرآن سے ایمانی کیفیات میں اضافہ ☆ اپنے رب پر توکل ☆ اقامتِ صلوٰۃ ☆ انفاق فی سبیل اللہ (۲-۳)

{۱۴} البقرۃ/۲/۲۵۳

{۱۵} مسلم/۲۸۳۱

۷......ہر چیز کی ایک ظاہری صورت ہوتی ہے اور دوسری اس کی حقیقت ہوتی ہے، ایک شخص نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے سوال کیا ’’اے ابوسعید! کیا آپ مومن ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں اگر تم مجھ سے اللہ پر، فرشتوں، کتابوں، رسولوں، جنت، دوزخ اور بعث وحساب کے بارے میں سوال کرتے ہو تو میں واقعی مومن ہوں اور اگر تم مجھ سے اس ایمان کے بارے میں سوال کرتے ہو جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال کی آیت ۲۔۳ اور ۴ میں کیا ہے تو اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ میں ان میں سے ہوں یا نہیں ہوں۔ {۱۶}

۸......آیت ۲ سے وہ حضرات استدلال کرتے ہیں جو ایمان میں نقص وزیادت کے قائل ہیں جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ نفسِ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی البتہ ایمانی کیفیات میں کمی اور زیادتی ضرور ہوتی ہے۔

۹......قرآنی آیات سن کر انہی لوگوں کی ایمانی کیفیات اور خوف وخشیت میں اضافہ ہوتا ہے جو غور وتدبر سے قرآن پڑھتے اور سنتے ہیں۔

غزوۂ بدر کے لئے خروج

﴿۵......۸﴾

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ

جیسے نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے حق کام کے واسطے اور ایک جماعت اہلِ ایمان کی راضی نہ تھی۔ وہ تجھ سے جھگڑتے تھے

فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ

حق بات میں اس کے ظاہر ہو چکنے کے بعد، گویا وہ ہانکے جاتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے۔ اور جس وقت تم سے

اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ

وعدہ کرتا تھا اللہ دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے

اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ

اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کر دے سچ کو اپنے کلاموں سے اور کاٹ ڈالے جڑ کافروں کی۔ تاکہ سچا کرے سچ کو اور جھوٹا کر دے جھوٹ

وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸

کو اور اگرچہ ناراض ہوں گنہگار۔

ربط: حضورِ اکرم ﷺ کے مدینہ منورہ سے نکلنے کو اس حکم کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کا ذکر گزشتہ آیات میں ہوا ہے اس تشبیہ ہی سے ماقبل کیساتھ مناسبت ثابت ہو جاتی ہے، پہلی آیات میں جس حکم کا ذکر ہوا وہ غنیمت کی تقسیم کا تھا،

{۱۶} قرطبی ۷/۳۲۳

اگر چہ اس حکم کے سامنے سارے ہی صحابہ نے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بعض طبیعتوں پر یہ حکم گراں گزر رہا تھا اور اہلِ ایمان کا کمال یہی ہے کہ وہ ایسے احکام کے تسلیم کرنے میں چوں چرا نہیں کرتے جو طبعاً گراں محسوس ہوتے ہیں، بتایا جا رہا ہے کہ جیسے غنیمت کا حکم بعض طبیعتوں پر گراں گزر رہا تھا یونہی آپ کا مدینہ منورہ سے غزوۂ بدر کیلئے نکلنا بھی انہیں مشکل محسوس ہو رہا تھا

غزوۂ بدر کا پسِ منظر

قریش کے ظلم وستم سے تنگ آکر حضورِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ آگئے تھے مگر اس کے باوجود قریش کی شرارتوں اور سازشوں کا سلسلہ جاری رہا، وہ دینِ حق کو پھلنے پھولنے کی اجازت دینے کے لئے کسی طور بھی تیار نہیں تھے۔ پہلے انہوں نے عبداللہ بن ابی کو مسلمانوں پر حملے کیلئے آمادہ کیا لیکن آنحضرت ﷺ کو پہلے سے خبر ہوگئی، آپ کے سمجھانے سے وہ اپنے ارادے سے باز آگئے، پھر انہوں نے یہود کو اکسایا، وہ خود بھی مسلمانوں سے خفا تھے، لیکن آپ نے میثاقِ مدینہ کے ذریعہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ قریش نے ان قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان آباد تھے چنانچہ ان قبائل نے بھی مدینہ آنے جانے والوں پر سختیاں شروع کر دیں، اس زمانے میں اہلِ مدینہ کو ہر وقت مشرکینِ مکہ کے حملہ کا خوف لگا رہتا تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ بذاتِ خود راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے، اسی طرح صحابہ بھی اپنے ہتھیار ساتھ لے کر سوتے تھے، ایک بار عکرمہ بن ابی جہل اور دوسری بار اس کا باپ تین تین سو کا لشکر لیکر مدینہ منورہ کی طرف بڑھے مگر آپ کی بروقت تدابیر اور پیش قدمی سے وہ ناکام ہو کر واپس چلے گئے، ربیع الاول ۰۲ھ ہجری میں کرز بن جابر آیا اور مدینہ کے باہر جو مویشی چر رہے تھے انہیں لوٹ کر لے گیا۔

رجب ۰۲ھ ہجری میں آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ قریش کی نقل وحرکت اور ان کے ارادوں کا پتہ لگائیں، وہ ٹوہ لینے مکہ کے قریب تک جا پہنچے، وہاں انہیں قریش کا ایک قافلہ نظر آیا جو شام سے واپس آرہا تھا، حضرت عبداللہ اور ان کے ساتھیوں نے ان پر حملہ کیا، لڑائی میں عمرو بن حضرمی مارا گیا، دو کافر قید ہوئے اور مالِ غنیمت ہاتھ آیا، آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ کے اس فعل پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا، عمرو بن حضرمی قریش کے معززین میں سے تھا اور وہ کافر جو قید ہوئے وہ قریش کے سردار مغیرہ کے بیٹے تھے، اس لئے اس واقعہ نے قریش کے جوشِ انتقام کو بھڑکا دیا اور نتیجہ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔

ابوسفیان کے تجارتی کارواں پر مسلمانوں کا حملہ تو محض ایک بہانہ تھا ورنہ قریش اس سے پہلے ہی مدینہ پر بھرپور حملے کی تیاری کر چکے تھے، اس کارواں کے ذریعہ سامانِ جنگ بھی منگوالیا گیا اور منظم انداز میں کوشش کی گئی کہ مکہ کے

زیادہ سے زیادہ گھروں کا مالِ تجارت اس میں شامل ہوتا کہ جب حملے کی افواہ عام ہو تو ان سب لوگوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل کیا جاسکے جنہیں مسلمانوں کے ہاتھوں اپنا مال لٹتا ہوا محسوس ہو چنانچہ ایسے ہی ہوا، جب حضورِ اکرم ﷺ کو ابوسفیان کے تجارتی قافلے کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ تین سو سے زیادہ صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکلے تاکہ تجارتی کارواں کی مزاحمت کی جاسکے، جب مخالف فریق حالتِ جنگ میں ہو تو ایسی کارروائیاں ہر قوم اور معاشرے میں کی جاتی ہیں، محض اس مزاحمت اور دشمن کی معیشت کو مفلوج کرنے کے پروگرام کی بناء پر مسلمانوں کو ڈاکو ہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ڈاکہ زنی کو ان کا مستقل ذریعۂ معاش قرار دینا سخت قسم کی بددیانتی، تعصب اور دروغ گوئی کے سوا کچھ نہیں، ابوسفیان کو آپ کے خروج کی اطلاع ملی تو اس نے ایک کام تو یہ کیا کہ راستہ بدل کر بدر کو بائیں بازو چھوڑ کر سمندر کے کنارے کنارے نکل گیا، دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ ضمضم بن عمرو غفاری کو معقول اجرت دے کر مکہ روانہ کردیا تاکہ کمک بروقت مل سکے، ضمضم غفاری نے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اونٹ کے کان کاٹ دیئے، ناک چیر دی، کجاوہ الٹ دیا، کرتا پھاڑ لیا اور چیخ چیخ کر شہر سر پر اٹھالیا ''اے قبیلۂ قریش! اپنے تجارتی کارواں کی خبر لو، مسلمان تمہارے سامان والے اونٹوں کی گھات میں ہیں، اپنا مال واسباب بچاؤ، دوڑو، جلدی کرو، فریاد ہے، فریاد ہے'' بس پہلے سے تیار تھا، اس ہولناک خبر اور ضمضم غفاری کی چیخ پکار نے آگ سی لگادی، قریش کے جوش وخروش کا ایک عجیب عالم تھا قریش کے روساء عام لوگوں کو بھی مشتعل کررہے تھے کہ وہ اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، ابوجہل اس سارے مشن کا سربراہ تھا، دو تین دن کے اندر کیل کانٹوں سے لیس ایک ہزار کا لشکر تیار ہوگیا، ان کے ساتھ رقص کرنے والی کنیزیں تھیں جو جوش دلانے کیلئے دف بجا بجا کر گیت گا رہی تھیں۔

مجاہدین کا جذبہ جانثاری

تجارتی قافلہ جب بچ نکلا تو ابوسفیان نے سردارانِ قریش کو پیغام بھیجا کہ لوٹ جاؤ، اب تمہاری ضرورت نہیں مگر اس کیلئے ابوجہل تیار نہ ہوا، ادھر صورت یہ تھی کہ حضورِ اکرم ﷺ حضرت عبداللہ بن اِم مکتوم کو نماز پڑھانے کیلئے اپنا نائب بنا کر مدینہ سے روانہ ہوئے اور مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے جب ذفران کے مقام پر پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ قریش کے جنگجو ایک بڑا لشکر لے کر اپنے تجارتی کارواں کی حفاظت اور مسلمانوں سے مقابلہ کے لئے روانہ ہوچکے ہیں اس اطلاع نے ساری صورتحال کو بدل کر رکھ دیا، مسلمان ابوسفیان کے تعاقب میں نکلے تھے اور اب اچانک معلوم ہوا کہ ابوسفیان تو نکل گیا اور مقابلہ کرنا ہوگا قریش کے لشکرِ جرار کے ساتھ، اس لئے اس مقام پر نبی کریم ﷺ نے مجلسِ مشاورت قائم کی، جب سب جمع ہوئے تو آپ نے موجودہ صورتحال بتاتے ہوئے ان کی رائے طلب کی، سب

سے پہلے حضرت ابوبکر اٹھے اور انہوں نے مشکل اور آسانی میں ساتھ دینے کا عہد کیا، پھر حضرت عمر فاروق اٹھے اور انہوں بھی جذبۂ جاں نثاری کا اظہار کیا، ان کے بعد حضرت مقداد بن عمرو اٹھے اور عرض کیا ''یارسول اللہ ﷺ! اللہ نے آپ کو جانے کا حکم دیا ہے، آپ تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں، ہم آپ کو وہ جواب نہیں دیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا کہ ''تم اور تمہارا خدا جاؤ اور جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں'' بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا رب تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ مل کر جنگ کریں گے، اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اگر آپ ہمیں برکِ غماد تک بھی لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ چلیں گے اور آپ کی قیادت میں دشمن کے ساتھ جنگ کرتے جائیں گے یہاں تک کہ آپ وہاں پہنچ جائیں''

حضور ﷺ نے حضرت مقداد کے ایمانی جذبات کی تعریف فرمانے کے ساتھ ان کے لئے دعاءِ خیر بھی فرمائی انصار کے دل میں یہ حسرت پیدا ہوئی کہ اے کاش! ہم نے وہ جواب دیا ہوتا جو حضرت مقداد نے دیا، یہ جواب ہمارے لئے مالِ عظیم کے مقابلے میں بہت بڑی نعمت ہوتا، اس کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ''اے لوگو! مجھے مشورہ دو'' اندازِ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ انصار کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں اس لئے کہ انصار نے صرف مدینہ میں رہتے ہوئے نصرت اور دفاع کا وعدہ کیا تھا، اندیشہ یہ تھا کہ وہ کہیں مدینہ سے باہر جنگ کرنے سے انکار نہ کردیں، جب آپ نے بار بار مشورہ دینے کے لئے فرمایا تو انصار سمجھ گئے کہ روئے سخن ہماری طرف ہے چنانچہ ان کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! شاید آپ ہماری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں، آپ نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے عرض کیا ''یقیناً ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے اور اس بات کی گواہی دی ہے کہ آپ جو کچھ لے کر آئے ہیں وہ حق ہے اور اس پر ہم نے آپ کے ساتھ وعدے کئے ہیں اور ہم نے عہد و پیمان دیا تھا کہ آپ کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے، یارسول اللہ ﷺ! آپ کو اللہ نے جہاں جانے کا حکم دیا ہے آپ وہاں تشریف لے جایئے، اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں سمندر کے سامنے لے جائیں اور اس میں داخل ہوجائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ اس میں داخل ہوجائیں گے، ہم میں سے ایک شخص بھی پیچھے نہیں رہے گا، اگر آپ کل ہی دشمن سے ٹکرانا چاہتے ہیں تو ہم سب اس کیلئے تیار ہیں، ہم جنگ کے وقت صبر کرنے والے ہیں اور دشمن سے مقابلہ کے وقت ہم سچے ہیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ کارنامے دکھائے گا جن سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں گی، اب آپ اللہ کے نام کی برکت سے ہمیں لے کر چلیں جہاں جانا ہے۔

انصار کی اس ترجمانی کو سن کر فرطِ مسرّت سے چہرۂ انور کھل اٹھا اور آپ نے فرمایا!:
''اللہ کا نام لیکر چل پڑو، اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ دونوں لشکروں میں سے کسی ایک پر فتح عطا فرمائے گا یا تو اس کارواں پر جو ابوسفیان کی قیادت میں شام سے آرہا ہے یا اس گروہ پر جو ابوجہل کی سربراہی میں پہنچنے والا ہے، واللہ! میں قوم کے مقتولوں کی قتل گاہوں کی طرف دیکھ رہا ہوں''
اس سے مجاہدین کو یقین ہوگیا کہ اب جنگ ہوکر رہے گی، حضور اکرم ﷺ نے تین جھنڈے بلند کئے جو بالترتیب حضرت مصعب بن عمیر، حضرت علی اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم کو دیئے گئے۔

غیبی مدد کی پہلی جھلک

بدر پہنچنے کے بعد ایک اہم مسئلہ پڑاؤ کے لئے موزوں مقام کا انتخاب تھا، سپہ سالارِ اعظم ﷺ نے جہاں پڑاؤ ڈالا تھا وہاں زمین ریتیلی تھی، قرآن نے اسے عدوۃ الدنیا (قریب کا کنارا) کہا ہے اور مشرکین نے جس جگہ کو پسند کیا وہاں کی مٹی بھربھری اور نرم تھی اسے عدوۃ القصویٰ (دور کا کنارا) کہا گیا ہے، یہ رمضان المبارک کی سولہویں اور جمعہ کی رات تھی، اس رات خوب بارش ہوئی مسلمان نہائے دھوئے اور انہوں نے پانی ذخیرہ بھی کرلیا، پانی کی وجہ سے ریتیلی زمین سخت ہوگئی اور وہاں چلنا پھرنا آسان ہوگیا، جہاں دشمن تھا وہاں کیچڑ بن گیا جس کی وجہ سے چلنے پھرنے میں مشکل پیش آنے لگی، اس رات اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو بہت خوشگوار نیند آئی، صبح تک وہ تازہ دم ہوگئے جبکہ قریش ساری رات سفر کرتے رہے تھے اور صبح کے وقت مقابلے پر آگئے، جمعہ کی صبح کا سورج طلوع ہوا تو حضورِ اکرم ﷺ نے صحابہ کی صف بندی فرمائی جو عربوں کیلئے ایک نیا تجربہ تھا، مسلمانوں میں کامل اتفاق، موقف کی صداقت کا یقین اور امیر کی اطاعت کا جذبہ تھا جبکہ قریش کی رائے مختلف تھی، ان میں ایسوں کی کمی نہ تھی جو تذبذب کا شکار تھے اور اس جنگ کو ضد، جہالت اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ سمجھتے تھے، قریش کا سارا اعتماد اپنی افرادی قوّت اور ظاہری وسائل پر تھا جبکہ مسلمانوں کو اللہ کے سوا کسی پر اعتماد نہ تھا، قریش کا دل بڑھانے کیلئے گانے والیاں ساتھ تھیں جبکہ مسلمان ذکر و تلاوت سے صبر و استقامت کی غذا حاصل کررہے تھے، قریش کے سورما غرور اور تکبر میں مبتلا تھے جبکہ مسلمان مجاہدین کی چال ڈھال سے عجز و تواضع کا اظہار ہوتا تھا اور ان کے عظیم قائد جنگ کے وقت سر بسجود ہوکر دعا کررہے تھے ''اے احکم الحاکمین! یہ قریش کا گروہ ہے جو غرور و تکبر کے ساتھ تجھے اور تیرے رسول کو جھٹلانے کے لئے مقابلے پر آیا ہے، اے اللہ! انہیں ہلاک کردے، اے مالک! اپنی نصرت نازل فرما'' {۱۷}

{۱۷} تفصیل کے لیے دیکھیے طبقات ابنِ سعد حصّہ اوّل، صحیح بخاری جلد دوم، سیرتِ مصطفیٰ حصہ دوم، سیرت ابنِ ھشام، واقدی، مغازی الرسول، زادالمعاد حصّہ دوم، اصحّ السیّر وغیرہ

اسی غزوۂ بدر کا ذکر اللہ تعالیٰ نے درجِ ذیل آیات میں فرمایا ہے

تسہیل: جیسے آپ کو آپ کے رب نے حکمت کے ساتھ گھر سے نکالا جبکہ مومنوں کے ایک گروہ پر یہ نکلنا ناگوار گزر رہا تھا O حقیقت واضح ہو چکنے کے بعد وہ اس بارے میں آپ کے ساتھ یوں بحث کر رہے تھے گویا انہیں موت کی طرف ہانکا جا رہا ہو اور وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے ہوں O اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہارے ہاتھ ضرور لگے گا اور تم یہ چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ تمہارے قابو میں آجائے حالانکہ اللہ کا ارادہ تھا کہ اپنے احکام کا حق ہونا ثابت کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ کر رکھ دے O تاکہ وہ حق کو غالب کردے اور باطل کو مٹا دے اگرچہ مجرموں کو ناگوار گزرے O

﴿تفسیر﴾

﴿۵﴾...... چونکہ قرآنِ کریم قصّوں کہانیوں کی نہیں بلکہ عبرت و نصیحت کی کتاب ہے اس لئے بعض اوقات جس طرح واقعہ پیش آیا ہوتا ہے اس ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تاکہ پڑھنے والا اسے تاریخ کے طور پر نہ پڑھے بلکہ موعظت حاصل کرنے کیلئے اس میں غور و تدبر کرے۔

غزوۂ بدر کیلئے نکلنے کا واقعہ پہلے پیش آیا تھا اور مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ بعد میں اٹھا تھا مگر قرآن نے غنیمت کا مسئلہ پہلے ذکر کیا اور بدر کی طرف روانگی کا تذکرہ بعد میں کیا۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب سے خطاب کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ آپ کو آپ کے رب نے گھر سے نکالا، گویا آپ اپنی چاہت سے نہیں نکلے، رب کی مرضی اور چاہت سے نکلے، اس میں آپ کے کمالِ عبدیت و اطاعت کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کا فعل حقیقت میں اللہ کا فعل تھا، اللہ کے مخصوص اور مقرب بندوں کا یہی حال ہوتا ہے، ان کا دیکھنا، سننا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، جنگ اور صلح سب کچھ رب کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ جیسے بعض نوجوانوں کو مساوات کے ساتھ غنیمت کی تقسیم ناگوار گزری تھی یونہی قریش کے ساتھ جنگ کے لئے جانا بھی ناگوار گزرا تھا، طبعی ناگواری ایمان و تقویٰ کے منافی نہیں، خصوصاً جب دل ایمان پر مطمئن ہو اور حکم کی تعمیل میں کوئی کمزوری بھی نہ دکھائی جائے تو مصائب و خطرات میں پریشان ہونے کی بناء پر عام مسلمان پر بھی انگلی اٹھانا جائز نہیں چہ جائیکہ کوئی بدبخت اصحابِ بدر کو ہدفِ تنقید بنائے جو اس امت کے افضل ترین انسانوں میں سے تھے، مسلمان مدینہ منورہ سے محض چالیس افراد پر مشتمل تجارتی کارواں کے تعاقب میں نکلے تھے، کیل کانٹوں سے لیس ایک ہزار جنگجوؤں کے ساتھ ٹکراؤ ان کے تصور میں بھی نہ تھا، ہمیں تو اس ناگواری میں بھی ان

کا کمال دکھائی دیتا ہے کہ تصور اور طبیعت کے بالکل برعکس معاملہ پیش آنے کے باوجود نہ انہوں نے میدانِ جنگ سے فرار اختیار کیا، نہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے۔

﴿٦﴾......حضور اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ سے اطلاع پا کر مسلمانوں کو بتا چکے تھے کہ دونوں لشکروں میں سے ایک پر انہیں ضرور غلبہ عطا کیا جائے گا، یہ اطلاع سو فیصد سچی تھی جس کے بعد تردد کا اظہار یا بحث و تکرار صحابہ کرام جیسے کامل اہلِ ایمان کی شان کے مناسب نہ تھا لیکن اس کے باوجود بعض حضرات نے یہ عذر پیش کیا کہ ہم تو صرف تجارتی کارواں پر حملے کی نیت سے آئے تھے اب جبکہ ہمارا سامنا ایک مسلح لشکر سے ہے تو تیاری کے بغیر اس سے ٹکرانا مناسب نہیں، قرآن نے صحابہ کرام کی طرف ''جدال'' کی نسبت کی ہے جس کا اردو میں معنی جھگڑا کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جھگڑا کرنے کا تصور کم از کم صحابہ سے تو محال ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ عربی میں جدال کا لفظ ہمیشہ بے ادبی اور جھگڑنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اپنی رائے پر زور دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ ہود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا ہے:

يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ ﴿۱۸﴾ ''وہ ہمارے ساتھ قومِ لوط کے بارے میں جھگڑا کررہے تھے''

یونہی سورۂ مجادلہ میں خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں آیا ہے:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا ﴿۱۹﴾ ''یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے شوہر کے بارے میں آپ سے جھگڑ رہی تھی''

﴿۷﴾......بتقاضائے بشریت مسلمانوں کی خواہش یہی تھی کہ طاقتور دشمن کے بجائے نسبتاً کمزور دشمن پر حملہ آور ہونے کا موقع مل جائے جس پر قابو پانا بھی آسان تھا اور کثیر مقدار میں مالِ غنیمت ہاتھ آنے کی بھی توقع تھی مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ کچھ اور تھا اور ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اللہ کے ارادے اور مسلمانوں کے ارادے میں واضح فرق تھا مسلمان ظالم قوم کے ایک تجارتی قافلے پر حملہ کر کے اس کے معاشی مفادات پر ضرب لگانا چاہتے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ حق کے غلبہ اور باطل کی شکست کی ایک روشن مثال قائم کرنا چاہتا تھا۔

﴿۸﴾......اس فتح اور شکست سے حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا کھل کر سامنے آ گیا، ایک طرف مادی اسباب و

{۱۸} ہود/۱۱/۷۴

{۱۹} المجادلۃ/۵۸/۱

غزوہ بدر الکبریٰ

یوم الفرقان، یوم التقی الجمعان

۱۷ رمضان ۲ ھ

۶۲۴م

﴿إِنَّ اللّٰہ یحبُّ الَّذینَ یقاتِلُونَ فی سبیلہ صَفًّا کأنّھم بنیانٌ مَرصُوصٌ.﴾

(الصفّ: ۶۱/۴)

﴿ولقد نصرکُمُ اللّٰہُ ببدرٍ وأنتم أذلّۃ فاتّقوا اللّٰہَ لعلّکُم تشکرون.﴾

(آل عمران: ۳/۱۲۳)

بشکریہ اطلس القرآن اردو

وسائل سے آراستہ پیراستہ بہت بڑا لشکر تھا جسے اپنی ظاہری طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا اور دوسری طرف چھوٹی سی جماعت تھی جس کے پاس نظریاتی پختگی اور اللہ پر کامل اعتماد کے سوا کوئی قابلِ ذکر سہارا نہ تھا۔

حکمت و ہدایت
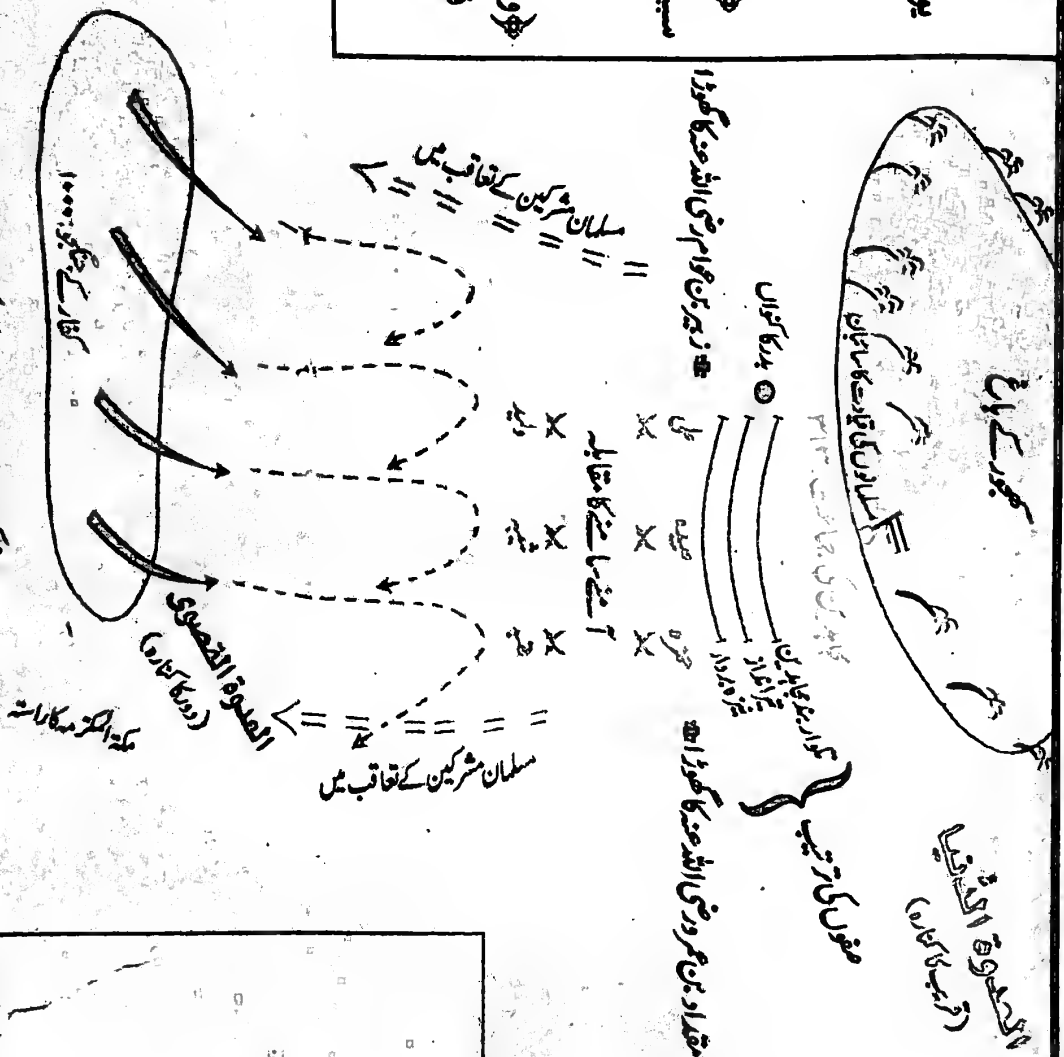
۱......حضور اکرم ﷺ کی زندگی عبدیت و اطاعت کا کامل نمونہ تھی، آپ کا ہر عمل اللہ کے حکم اور مرضی کے تابع تھا (۵)

۲......اللہ تعالیٰ انسان کا بھی خالق ہے اور اس کے افعال کا بھی خالق ہے (۵)۔

۳......اللہ تعالیٰ جو بھی حکم دیتے ہیں اس میں بھلائی ہی بھلائی ہوتی ہے جبکہ انسان بعض اوقات شر کو خیر اور خیر کو شر سمجھ لیتا ہے (۵)

۴......دل میں خطرات اور مصائب سے وحشت اور خوف کا ہونا کمالِ ایمان کے منافی نہیں (۵)۔

۵......باری تعالیٰ ایسی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے جن سے حق کا حق ہونا ظاہر ہو جاتا ہے (۵)۔

۶......جس جماعت کے ساتھ اللہ کی نصرت ہو اسے افراد کی قلت اور وسائل کے فقدان کے باوجود کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

غزوۂ بدر میں اللہ کی غیبی مدد

﴿۹......۱۴﴾

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ﴿٩﴾ وَمَا

جب تم لگے فریاد کرنے اپنے رب سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ میں مدد کو بھیجوں گا تمہاری ہزار فرشتے لگاتار آنے والے۔

جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ

اور یہ تو دی اللہ نے فقط خوشخبری اور تاکہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے، بیشک اللہ

حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم

زور آور ہے حکمت والا۔ جس وقت کہ ڈال دی اس نے تم پر اونگھ اپنی طرف سے تسکین کے واسطے اور اتارا تم پر آسمان سے

بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾ إِذْ

پانی کہ اس سے تم کو پاک کر دے اور دور کر دے تم سے شیطان کی نجاست اور مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو اور جما دے

يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا

اس سے تمہارے قدم۔ جب حکم بھیجا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں ساتھ ہوں تمہارے سو تم دل ثابت رکھو مسلمانوں

الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

کے، میں ڈال دوں گا دل میں کافروں کے دہشت، سو مارو گردنوں پر اور کاٹو ان کی پور پور۔ یہ اس واسطے ہے کہ وہ مخالف ہوئے

شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

اللہ کے اور اس کے رسول کے اور جو کوئی مخالف ہوا اللہ کا اور اس کے رسول کا تو بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ یہ تو تم

ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝

چکھ لو اور جان رکھو کہ کافروں کے لئے ہے عذاب دوزخ کا۔

تسہیل: اس وقت کو یاد رکھو جب تم اپنے رب کے سامنے آہ و زاری کر رہے تھے، اللہ نے تمہاری دعا قبول کرتے ہوئے وعدہ کر لیا کہ میں یکے بعد دیگرے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا O یہ اطلاع دینے میں حکمت صرف یہ تھی کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں ورنہ مدد تو بس اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، یقیناً اللہ بڑا زبردست اور حکمت والا ہے O تمہیں وہ وقت بھی یاد ہوگا جب اللہ نے خوف و ہراس کی کیفیت ختم کرنے کے لئے تم پر غنودگی طاری کر دی تھی اور آسمان سے بارش برسا دی تھی تاکہ تمہیں پاک کر دے اور شیطانی وسوسوں کو دور کر دے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تمہیں ثابت قدمی عطا فرما دے O میرے پیغمبر! ان لمحات کو یاد کیجئے جب آپ کا رب فرشتوں سے کہہ رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں پس تم ایمان والوں کے قدم جمائے رکھو، میں کافروں کے دل میں رعب ڈال رہا ہوں لہٰذا تم ان کی گردنوں اور جوڑ جوڑ پر ضرب لگاؤ O انہیں مارنے کا حکم اس لئے دیا گیا کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے تھے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے اللہ اسے شدید سزا دیتا ہے O کافروں سے کہا گیا کہ دنیا میں اس عذاب کا مزہ چکھو اور آخرت میں کافروں کے لئے دوزخ کا عذاب ہے O

تفسیر

شانِ نزول

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بدر کے دن حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کو دیکھا جو کہ تین سو دس سے کچھ اوپر تھے اور ان کے مقابلے میں مشرکین کی تعداد ہزار سے بھی اوپر تھی تو آپ نے قبلہ رخ ہو کر ہاتھ پھیلا کر اللہ سے مانگنا شروع کیا ''اے اللہ! تو نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا فرما، اے اللہ! اگر آج تو نے اہلِ اسلام کی اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ آپ دونوں

ہاتھ پھیلا کر مسلسل یہ دعا کرتے رہے حتّٰی کہ آپ کی چادر گر گئی، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چادر اٹھا کر آپ کے شانۂ مبارک پر ڈالی اور آپ کو تسلی دیتے ہوئے عرض کیا ''یا نبی اللہ! بس کیجئے آپ کا رب اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی ''اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ'' {۲۰}

﴿۹﴾......مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم نعمت یاد کرائی جا رہی ہے جو مسلمانوں کی دعا کی قبولیت کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی، سپہ سالارِ اعظم ﷺ تڑپ تڑپ کر دعا فرما رہے تھے اور سارے مجاہدین ''آمین آمین'' کہہ رہے تھے، باری تعالیٰ نے فوری طور پر ایک ہزار فرشتے بھیجنے کا وعدہ فرما لیا، پھر اس تعداد کو بڑھا کر تین ہزار کر دیا گیا جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۲۴ میں ہے:

بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ ﴿۱۲۴﴾ {۲۱}

''کیا آسمان سے تین ہزار فرشتے اتار کر اللہ کا تمہاری مدد کرنا تمہیں کافی نہ ہوگا؟''

اسی سورت کی آیت ۱۲۵ میں ہے:

بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ {۲۲}

''بلکہ اگر تم صبر و پرہیزگاری کرو گے تو تمہارا رب تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو نشان دار ہوں گے''

﴿۱۰﴾......حقیقی نصرت صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاصل ہوتی ہے، مادی اسباب بھی اس کے قبضے میں ہیں اور معنوی اسباب بھی اس کے اختیار میں ہیں، اس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی ہل نہیں سکتا، فرشتوں کا نزول محض اہلِ ایمان کی تسلی کے لئے تھا کیونکہ جس کی تائید کیلئے فرشتے کو بھیج دیا جائے اس کی روحانی اور ایمانی قوت میں بھی بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ فرشتوں نے جنگ بدر میں عملی طور پر حصہ لیا تھا یا نہیں؟ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ فرشتوں کو صرف اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھنے اور ان کی روحانی مدد کیلئے بھیجا گیا تھا، اگر وہ جنگ میں حصہ لیتے تو ہزاروں کی ضرورت تو کیا پیش آتی ایک فرشتہ بھی لشکرِ کفار کو نیست و نابود کرنے کے لئے کافی تھا، جن قوموں پر اللہ کا عذاب آیا ان کیلئے جبریل علیہ السلام ہی نے انہیں تباہی سے دوچار کر دیا تھا جبکہ جمہور علماء کہتے ہیں کہ فرشتوں نے عملی طور

{۲۰} صحیح مسلم/۲/صفحہ ۹۳ باب الإمداد بالملئكة فی غزوة بدر وإباحة الغنائم۔ ترمذی/۲/ابواب التفسیر/صفحہ ۱۳۹، تفسیر ابی سعود ۳/۸۱

{۲۱} آلِ عمران/۱۲۴

{۲۲} آلِ عمران/۱۲۵

پر جنگ میں حصہ لیا تھا، صحیح روایات سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔{۲۳}

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ غالب ہے، وہ خود بھی مغلوب نہیں ہوسکتا اور جسے وہ غلبہ دینا چاہے اس پر بھی کوئی غالب نہیں آسکتا۔

﴿حَكِيْمٌ﴾ وہ حکیم ہے اس کا کوئی فیصلہ اور فعل حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا۔

﴿۱۱﴾......غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوئیں ان میں سے پہلی نعمت ان کا جہاد کیلئے نکلنا تھا، پورے واقعہ پر نظر ڈالنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ نکلے نہیں تھے نکالے گئے تھے، اس لیے اللہ نے بھی نکالنے ہی سے تعبیر کیا ہے "كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ"

دوسری نعمت فرشتوں کے ذریعے مدد کا وعدہ، تیسری نعمت دعا کی قبولیت اور چوتھی اور پانچویں نعمت نیند کا غلبہ اور بارانِ رحمت کی آمد تھی۔ معرکۂ بدر سے ایک رات پہلے تین سو تیرہ بے سروسامان لوگ میدان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے، اگلے دن ان کا مقابلہ ایک ایسے دشمن سے ہونے والا تھا جس کی تعداد ان سے تین گنا زیادہ تھی، میدانِ جنگ کا ہموار حصہ ان کے قبضے میں تھا، نچلا حصہ جس میں ریت کی وجہ سے پاؤں دھنس دھنس جاتے تھے مسلمانوں کے حصے میں آیا تھا، طبعی پریشانی اور فکر سب کو تھی، شیطان بھی وسوسہ اندازی کررہا تھا، ان حالات میں مسلمانوں پر ایک خاص قسم کی نیند مسلط کردی گئی جس کی وجہ سے ان کے دلوں سے دشمن کا رعب اور شیطان کے وساوس نکل گئے اور وہ ہشاش بشاش ہوکر جنگ کے لئے تیار ہوگئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بدر کی رات ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے نیند نہ آگئی ہو سوائے رسول اللہ ﷺ کے کہ آپ صبح تک نماز پڑھتے رہے اور روتے رہے جبکہ دوسری روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ خود نبی کریم ﷺ کو بھی اونگھ آگئی تھی اور آپ نے بیدار ہوکر مسکراتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جبریل علیہ السلام کی آمد اور دشمن کی شکست کی خوشخبری سنائی تھی۔{۲۴}

اسی رات مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی دوسری نعمت بارش کی صورت میں عطا ہوئی جس نے میدانِ جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا، قریشی لشکر نے جس جگہ کو پسند کیا تھا اس کی مٹی بھربھری تھی جو بارش کی وجہ سے دلدل بن گئی جس میں چلنا پھرنا سخت دشوار ہوگیا جبکہ مسلمانوں نے ریتلی زمین پر پڑاؤ ڈالا تھا جو بارش کی وجہ سے جم گئی اور وہاں چلنا پھرنا آسان

{۲۳} فعلی هذا لم تقاتل الملائكة يوم بدر وانما حضروا للدعاء بالتثبيت والاول اكثر(قرطبی ۱۹۰/۴)

{۲۴} ابن کثیر ۳۸۶/۲

ہو گیا۔ بارش کی وجہ سے نہ صرف قدم جمانے میں آسانی ہو گئی بلکہ دلوں سے وسوسے بھی جاتے رہے اور مسلمان غسل کر کے نہ صرف پاک بلکہ تازم دم بھی ہو گئے۔

﴿۱۲﴾......چھٹی نعمت کا ذکر ہے وہ یہ کہ جو فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لئے بھیجے گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں میری خصوصی معیت حاصل ہے، تم جاؤ اور مسلمانوں کی ہمت بڑھاؤ، فرشتوں کی طرف سے، ہمت افزائی کی دو صورتیں ممکن ہیں ایک تو یہ کہ وہ صحابہ کرام کے کسی جانے پہچانے دوست کی صورت میں ان کے سامنے آتے اور ان سے کہتے:

"یہ کفار تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، اللہ تمہارے ساتھ ہے آگے بڑھو اور انہیں ہلاک کر دو" {۲۵}

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ مسلمان مجاہدین کے دلوں میں قوت وشجاعت القاء کرتے تھے اس لئے کہ جیسے شیطان وسوسہ اندازی کی صلاحیت رکھتا ہے، ملائکہ کو خیر کے القاً کی صلاحیت دی گئی ہے۔ {۲۶}

﴿سَأُلْقِي﴾ مسلمانوں پر ربّ تعالیٰ کی ساتویں نعمت کا ذکر ہے یعنی کافروں کے دل میں سچے اہلِ ایمان کا رعب ڈال دیا جائے گا، یہ بہت بڑی نعمت ہے اور انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو واقعی مومن ہوتے ہیں اور جو محض زبانی کلامی حد تک مومن ہوتے ہیں ان سے کافر تو کیا مرعوب ہوں گے وہ خود کفار سے خوفزدہ اور ان کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار رہتے ہیں۔

﴿فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ﴾ اس دور کی جنگ نیزوں اور تلواروں سے دست بدست ہوتی تھی، ایسی جنگ میں دشمن کو ناکارہ اور فوری طور پر ٹھنڈا کرنے کا بہترین حربہ یہی ہو سکتا تھا کہ اس کی انگلیوں {۲۷} پر وار کر کے لڑائی کے ناقابل بنا دیا جائے {۲۸} اور گردن کے اوپر ایسی ضرب لگائی جائے کہ فوراً اس کی موت واقع ہو جائے، دشمن کو تڑپا تڑپا کر مارنے کی ضرورت نہیں۔

﴿۱۳﴾......کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی مدد اس لئے کی جاتی ہے کیونکہ کافر اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے دوستوں سے عداوت رکھتا {۲۹} اور ان کی مخالفت کرتا ہے اسے دنیا اور آخرت

{۲۵} ابشروا فانّھم لیسوا بشیءٍ واللہ معکم، کروا علیھم۔ (روح المعانی ۶/۲۵۷)

{۲۶} وقال الزّجاج: کأن باشیاء یلقونھا فی قلوبھم......الخ (حوالۂ مذکورہ)

{۲۷} البنان الأصابع یرید الأطراف (کشاف ۲/۱۹۵)

{۲۸} خصّہ لأجل أنّھم بھا تقاتل وتدافع (المفردات/۶۲)

{۲۹} شاقوا اللہ ای اولیاءہ (قرطبی ۷/۳۳۳)

میں سخت سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حکمت وہدایت

۱......غزوۂ بدر کے موقع پر سرورِ دوعالم کی آہ وزاری اور اضطراب آمیز دعاؤں کی وجہ سے بعض حضرات کو یہ اشکال ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصرت کے وعدوں کے باوجود آپ اس قدر پریشان کیوں تھے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ مقامِ خوف میں تھے اور یہ کمالِ توکل کے منافی نہیں ہے (۹)

۲......مومن اور کافر کے درمیان ایک بڑا فرق یہ ہے کہ کافر ظاہری وسائل پر بھروسہ رکھتا ہے جبکہ مومن کا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے (۹)

۳......اللہ کی رضا کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا عزم رکھنے والوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں (۹)

۴......فرشتے اللہ کے بندے ہیں اور وہ ہر اس کام کیلئے آمادہ رہتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کیا جاتا ہے (۹)

۵......حقیقی نصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ مدد کیلئے کسی ظاہری سہارے کا محتاج نہیں (۱۰)

۶......غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو بہت ساری نعمتیں عطا ہوئیں جن میں سے سات یہاں مذکور ہیں۔

۷......اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرنے والا دنیا وآخرت میں عذاب کا مستحق ہوتا ہے (۱۳)

۸......اللہ ایمان والوں پر اس قدر مہربان ہے کہ وہ انہیں جنگ کی جزئیات کی بھی تعلیم دیتا ہے (۱۲)

۹......اسلام مقتولوں کے دفن کرنے کا حکم دیتا ہے اگرچہ ان کا تعلق لشکرِ کفار ہی سے کیوں نہ ہو، نبی کریم ﷺ نے ستر مشرکوں کو بدر کے ایک پرانے کنویں میں دفن فرمادیا تھا۔

اللہ کی مدد

﴿۱۵......۱۹﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ

اے ایمان والو! جب بھڑو تم کافروں سے میدانِ جنگ میں تو مت پھیرو ان سے پیٹھ۔ اور جو کوئی ان سے پھیرے پیٹھ اس

يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ

دن مگر یہ کہ ہنر کرتا ہو لڑائی کا یا جا ملتا ہو فوج میں سو وہ پھرا اللہ کا غضب لے کر اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا برا

مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ

ٹھکانا ہے۔ سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا اور تُو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت کہ پھینکی تھی لیکن اللہ نے

مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ

پھینکی اور تا کہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان، بیشک اللہ ہے سننے والا جاننے والا۔ یہ تو ہو چکا اور جان

عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ

رکھو کہ اللہ سست کر دیگا تدبیر کافروں کی۔ اگر تم چاہتے ہو فیصلہ تو پہنچ چکا تمہارے پاس فیصلہ اور اگر باز آؤ تو تمہارے لئے

وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ

بہتر ہے اور اگر پھر یہی کرو گے تو ہم بھی پھر یہی کرینگے اور کچھ کام نہ آئے گا تمہارے تمہارا جتھا اگرچہ بہت ہو اور جان لو

وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

تسہیل: اے ایمان والو! جب تمہارا کافروں سے آمنا سامنا ہو جائے تو ان سے پیٹھ پھیر کر مت بھاگنا ○ اور جو کوئی مقابلے کے وقت ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگے گا تو وہ اللہ کے غضب کا مستحق ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے، ہاں البتہ اگر کوئی جنگی تدبیر کے تحت یا اپنے لشکر کے ساتھ جا ملنے کے لیے بھاگے گا تو وہ اس وعید سے مستثنیٰ ہوگا ○ کافروں کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ انہیں اللہ نے قتل کیا اور جب آپ نے ان پر خاک کی مٹھی پھینکی تھی تو وہ آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھی اور یہ اس لئے تھا تا کہ اللہ ایمان والوں کو اچھی طرح آزمالے، یقیناً اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے ○ علاوہ ازیں اس میں دوسری مصلحت یہ تھی کہ اللہ کافروں کی تدبیر کمزور کر دینا چاہتا تھا ○ اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو فیصلہ تو ہو چکا، اب اگر تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ تو تمہارے حق میں بہت بہتر ہے اور اگر تم باز نہ آئے تو

ہم تمہارے ساتھ وہی کچھ کریں گے جو پہلے کیا ہے، یادرکھو! تمہاری جماعت تمہارے کچھ کام نہیں آسکے گی اگرچہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو اور اللہ تو بس ایمان والوں کے ساتھ ہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۵﴾......اے وہ لوگو! جو اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کر چکے ہو، تم جانتے ہو کہ فتح اور شکست، موت اور زندگی صرف اللہ کے قبضے میں ہے، اگر تمہارا دشمن سے دوبدو مقابلہ ہو جائے تو تمہیں میدانِ جنگ سے بھاگنے کی اجازت نہیں۔

﴿۱۶﴾......جو کوئی پیٹھ پھیر کر بھاگے گا وہ اللہ کے غضب کا مستحق ہو جائے گا، البتہ دو صورتوں میں بھاگنے کی اجازت ہے، ایک تو اس صورت میں جب کوئی مجاہد محض جنگی چال کے طور پر دشمن کو دکھانے کیلئے پیچھے ہٹے تاکہ اسے بیوقوف بنا کر پلٹ کر زوردار حملہ کر سکے، دوسرے اس صورت میں جب اپنے ہیڈ کوارٹرز کی طرف یا دوسری کمک سے ملنا مقصد ہوتا کہ ان کے ساتھ مل کر دوبارہ حملہ کر سکے۔

یہ آیات غزوۂ بدر میں نازل ہوئیں اور اس وقت یہی حکم تھا کہ دشمن کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اس کے مقابلے سے پشت پھیرنا اور میدان چھوڑنا جائز نہیں، بعد میں اس حکم میں تخفیف کر دی گئی اور یہ قانون جاری کر دیا گیا کہ اگر دشمن کی تعداد دوگنی ہو تو مسلمانوں کو بھاگنے کی اجازت نہیں اور اگر اس کی تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہو تو پھر میدان چھوڑنے کی اجازت ہے۔{۳۰}

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ {۳۱}

”اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور اس نے جان لیا کہ تمہارے اندر کچھ کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو آدمی صبر کرنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آئیں گے“

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم قیامت تک کیلئے ہے، حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں محض خوف اور بزدلی کی وجہ سے میدان سے بھاگنا جائز نہیں، ویسے تو کافر بھی انسان ہے اور مومن بھی انسان ہے لیکن مومن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق ایسی ذات کے ساتھ ہے جس پر کوئی غالب نہیں آسکتا، مومن کو بتا دیا گیا ہے کہ تم زندہ

{۳۰} فمن فرّ من اثنين فهو فارّ من الزحف ومن فرّ من ثلاثة فليس بفارّ من الزّحف (قرطبی ۷/۳۴۴)
{۳۱} الأنفال ۸/۶۶

رہو تو بھی تمہاری فتح ہے اور اگر بالفرض تمہیں مار دیا جائے تو بھی تمہاری فتح ہے اس لئے تمہیں کسی صورت بھی راہِ فرار اختیار نہیں کرنا چاہئے، باقی رہے جنگ کے مصائب تو ان کا سامنا تمہیں بھی کرنا پڑتا ہے اور کافروں کو بھی۔

شانِ نزول

﴿۱۷﴾...... بدر میں جب جنگ کی بھٹی دہک رہی تھی تو گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا، تلواریں تلواروں سے ٹکرا رہی تھیں، اللہ کے رسول ﷺ نے مٹھی بھر ریت زمین سے اٹھائی اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور اسے مشرکین کی جانب پھینکتے ہوئے فرمایا:

﴿ شاهت الوجوه ﴾ {۳۲} ''ان کے چہرے رسوا ہوئے''

فرشتوں نے اس خاک کو ہر مشرک کی آنکھ میں پہنچا دیا۔ سپہ سالارِ اعظم نے اپنے مجاہدوں کو آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا، صحابہ اور کفار دوبدو لڑنے لگے ان کی تلواروں نے کفار کے سرداروں کو زمین بوس کرنا شروع کر دیا، آیت ۱۷ میں اسی طرف اشارہ ہے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی جا رہی ہے کہ اے مجاہدین! بے شک ہاتھ تمہارے ہی استعمال ہو رہے تھے، تلواریں اور نیزے تم ہی چلا رہے تھے لیکن جتنے بھی مشرکین قتل ہوئے وہ محض تمہاری مادی قوت اور وسائل سے نہیں ہوئے بلکہ اللہ کی خصوصی تائید اور غیبی مدد سے ہوئے، یہ اللہ ہی تھا جس نے کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور فرشتے بھیج کر تمہارے دل مضبوط کر دیئے، مجاہدین کے بعد سپہ سالارِ اعظم ﷺ سے خطاب ہے کہ آپ نے مٹھی بھر ریت جو پھینکی تھی تو وہ آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھی آپ کیلئے ممکن ہی نہ تھا کہ اسے ایک ہزار مشرکین کی آنکھوں، نتھنوں اور موہنوں میں پہنچا سکیں، گویا یہ ایک معجزہ تھا جو سرورِ دو عالم ﷺ کے ہاتھوں ظاہر ہوا، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں عصا، اژدہا بن جاتا تھا یونہی ہمارے آقا ﷺ کے ذریعہ مٹھی بھر ریت سینکڑوں دشمنوں کی آنکھ میں پہنچ گئی۔

﴿وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (تاکہ اللہ ایمان والوں کو اچھی طرح آزما لے) اللہ کی طرف سے آزمائش یا تو نعمت اور عطا سے ہوتی ہے یا مصیبت اور محرومی سے جیسا کہ سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کے بارے میں کہا گیا ہے:

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ {۳۳} ''اور ہم نے انہیں اچھے اور برے حالات میں آزمایا''

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو آزمایا گیا اللہ کی خصوصی نصرت، مالِ غنیمت اور جرأت و شجاعت کی شہرت کے ساتھ۔

{۳۲} ابن کثیر ۲/۳۹۱، ابی سعود ۳/۸۷
{۳۳} الاعراف ۷/۱۶۸

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اہلِ بدر کے ساتھ اس خصوصی معاملہ کی علت بیان کی جارہی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ سننے والا اور جاننے والا ہے اس لئے وہ ان دعاؤں کو سن رہا تھا جو صدق و اخلاص، یقین اور اعتماد کے ساتھ اس سے کی جارہی تھیں اور ان جذبات اور کیفیات کو بھی جانتا تھا جو اہلِ ایمان کے دل میں موجزن تھیں۔

﴿۱۸﴾......قرآنی اسلوب کے مطابق اہلِ ایمان کے بعد اہلِ کفر کا ذکر بھی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصی معاملے کی دوسری علت کا بیان بھی ہے وہ یہ کہ کفار، نبی کریم ﷺ، اہلِ ایمان اور دعوتِ توحید کو دبانے کے لئے جو تدبیریں کررہے تھے اللہ تعالیٰ ان تدبیروں کو کمزور کردینا چاہتا تھا چنانچہ ایسے ہی ہوا، مسلمانوں کی بے مثال فتح نے سرزمینِ عرب میں کفر وشرک کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

﴿۱۹﴾ اس آیتِ کریمہ میں قریشی لشکر سے خطاب بھی ہے اور ان کی ایک دعا کی طرف اشارہ بھی ہے، اصل میں ہوا یہ تھا کہ جب مشرکین، مکہ سے بدر کی طرف جانے لگے تو انہوں نے غلافِ کعبہ پکڑ کر اللہ سے دعا کی:

﴿أللّٰهم انصر أعلى الجندين و أهدى الفئتين و أكرم الحزبين﴾{۳۴} ''اے اللہ! دونوں لشکروں میں سے جو اعلیٰ، دونوں جماعتوں میں سے جو جماعت زیادہ ہدایت یافتہ اور دونوں قبیلوں میں سے جو زیادہ معزز ہے تو اس کی مدد فرما''

بلکہ میدانِ جنگ میں بھی ابوجہل دعا کرتا رہا ''اے اللہ ہم پرانے دین پر قائم ہیں، اور محمد نے نیا دین نکال لیا ہے دونوں دینوں میں سے تجھے جو زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے اس دین کے پیروکاروں کو فتح عطا فرمادے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابوجہل دین کے حوالے سے دھوکے میں مبتلا تھا لیکن سارے سرداروں کی ذہنیت یہ نہیں تھی بلکہ ان میں سے اکثر تکبر اور حسد میں مبتلا تھے، خود ابوجہل کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ بھی فخر وغرور اور انانیت کا مریض تھا، بہرحال صورتحال جو بھی ہو اللہ تعالیٰ متکبروں کی اس جماعت سے خطاب کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ تم نے غلافِ کعبہ پکڑ پکڑ کر جو دعا کی تھی وہ قبول ہوگئی اور اللہ نے اس دین کے علمبرداروں کو فتح عطا فرمادی جو اس کے ہاں معتبر اور پسندیدہ تھا۔

﴿وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ اگر تم کفر وعناد اور رسول اللہ ﷺ کی عداوت اور جنگ وجدال سے باز آجاؤ تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم شرارتوں سے باز نہیں آئے تو ہم اہلِ ایمان کو وہ عظیم ترین فتح دیں گے جو جزیرۃ العرب سے کفر وشرک کی جڑ کاٹ کر رکھ دے گی۔

{۳۴} ابی السعود ۸۸/۳

﴿وَلَنْ تُغْنِیَ عَنْكُمْ﴾ اپنی کثرتِ تعداد سے دھوکہ نہ کھاؤ جب تم اس چھوٹے سے لشکر سے ٹکراؤ گے جو صبر و ثبات اور یقین و ایمان جیسی صفات سے متصف ہے تو اللہ کی مدد اسی کے ساتھ ہوگی اور جس کے ساتھ اللہ کی مدد ہو اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

حکمت و ہدایت

۱......میدانِ جنگ سے بھاگنا مسلمان کے لئے حرام ہے ایک حدیث میں سرورِ دو عالم ﷺ نے اسے ان سات کبیرہ گناہوں میں سے شمار کیا ہے جو انتہائی مہلک ہیں۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات مہلک گناہوں سے بچو، پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ! وہ کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، اس جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہو، سود خوری، یتیم کا مال کھانا، لڑائی سے بھاگنا اور سادہ مزاج پاکدامن مومن خواتین پر تہمت لگانا'' {۳۵}

البتہ اگر دشمن کی تعداد دوگنا سے بھی زائد ہو تو فرار کی اجازت ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کچھ لوگوں کے ساتھ میں بھی جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا، ہم نے مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا بہتر ہے، اگر ہمارے لئے توبہ کی کوئی صورت ہوئی تو بہتر ہے ورنہ ہم چلے جائیں گے، ہم صبح کی نماز سے پہلے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے دریافت فرمایا ''تم کون لوگ ہو؟'' ہم نے عرض کیا ہم جنگ سے بھاگنے والے مجرم ہیں، آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تم کمک حاصل کر کے دوبارہ حملہ کرنے والے ہو اور میں مسلمانوں کیلئے کمک ہوں۔ {۳۶}

دشمن کا لشکر دوگنا ہونے کی صورت میں بھاگنے کی اجازت کے باوجود اگر مجاہدین ڈٹے رہیں تو یہ زیادہ بہتر ہے، جنگِ موتہ میں مجاہدین تین ہزار تھے مگر وہ دو لاکھ مشرکوں کے سامنے ڈٹے رہے۔

۹۳ ہجری میں اندلس کے محاذ پر طارق بن زیاد رحمہ اللہ کے ساتھ سترہ سو مجاہد تھے جبکہ دشمنوں کا لشکر ستر ہزار شہ سواروں پر مشتمل تھا، مسلمان کشتیاں جلا کر میدان میں اتر آئے اور فتح انہی کا مقدر ٹھہری۔

۲......دوسرے گناہوں کی طرح فرار کا گناہ بھی سچی توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔

{۳۵} البخاری۔ الفتح ۵/۲۷۶۶، مسلم/۸۹

{۳۶} ابوداؤد/جلد ۱ کتاب الجهاد، باب فی التولّی یوم الزّحف صفحه ۳۶۲، مسنداحمد ۲/۷۰

نبیٔ کریم ﷺ سے منقول ہے کہ جو شخص یہ کلمات پڑھے:

﴿استغفر الله الّذی لاإله إلاهو الحیّ القیّوم وأتوب إلیه﴾{۳۷} "اللہ اس کے گناہ معاف فرمادے گا اگر چہ وہ جنگ سے بھاگا ہوا ہی کیوں نہ ہو"

۳......اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے حکم اور قدرت سے ہوتا ہے، ہر چیز کا خالق بھی وہی ہے، بندہ اسباب اختیار کرنے کا مکلف ہے نتائج اللہ کے حکم سے ظاہر ہوتے ہیں۔(۱۷)۔

۴......مسلمان اگر واقعی مسلمان ہوں تو کفار کی تدبیریں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں اس لئے کہ ان کی پشت پر اللہ ہوتا ہے اور اللہ کے سامنے یہ تدبیریں مکڑی کے جالے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

۵......دعا کی قبولیت پر اترانا نہیں چاہئے بعض اوقات کافروں اور فاسقوں کی دعا بھی قبول ہو جاتی ہے(۱۹)۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت

﴿۲۰......۲۳﴾

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ﴿۲۰﴾

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس سے مت پھرو سن کر۔ اور اُن جیسے مت ہو

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۲۱﴾ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ

جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور وہ سنتے نہیں۔ بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہی

الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۲۲﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ

بہرے گونگے ہیں جو نہیں سمجھتے۔ اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا اور

وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿۲۳﴾

اگر ان کو اب سنا دے تو ضرور بھاگیں منہ پھیر کر۔

تسہیل: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی مان کر چلو اور حکم سن لینے کے بعد اس سے روگردانی نہ کرو○ اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا، جو کہتے ہیں ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں○ بے شک اللہ کے نزدیک مخلوق میں سے بدترین لوگ وہ ہیں جو بہرے اور گونگے ہیں اور جو عقل سے ذرا بھی کام نہیں لیتے○ اگر اللہ تعالیٰ ان میں طلب اور بھلائی دیکھتے تو انہیں سننے کی توفیق دے دیتے لیکن اگر طلب کے بغیر انہیں سنا بھی دیا جائے تو یہ بے رخی کرتے ہوئے پیٹھ پھیر جائیں گے○

{۳۷} النسائی/۱/۲۷۹، ترمذی ۲/۱۸۳

﴿تفسیر﴾

﴿۲۰﴾......سورۂ انفال کا آغاز بڑے خوبصورت اور متوجہ کرنے والے انداز میں مالِ غنیمت کا حکم بیان کرنے سے ہوا، پھر کامل مومن کی صفات بیان کی گئیں اس کے بعد غزوۂ بدر کے اہم واقعات ذکر کئے گئے جن سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ اللہ کی مدد مومنوں کے ساتھ ہے، یہاں سے آیت ۲۹ تک چار بار اہلِ ایمان کو "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا" کہہ کر خطاب کرتے ہوئے بعض چیزوں کا حکم دیا گیا ہے اور بعض امور سے منع کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر آیت میں ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور آیات وکلمات کو سنتے ہوئے روگردانی نہ کریں، سماع سے مراد وہ سماع ہے جو فہم اور تصدیق کی صفت کے ساتھ ہو، ایسا ہی سماع انسان کو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے اور ایسے سننے والوں ہی کیلئے بشارتیں ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾ {۳۸}

"میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو کان لگا کر بات کو سنتے ہیں پھر اس بات کی اتباع کرتے ہیں جو بہترین ہے یہی ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی عقلمند بھی ہیں"

﴿۲۱﴾......اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا حالانکہ انہوں نے کچھ نہیں سنا، بظاہر تو کافر اور منافق بھی سنتے تھے لیکن ان کا سننا نہ تو ایمان اور تصدیق کے لئے تھا اور نہ ہی عبرت ونصیحت اور عمل کے لئے بلکہ وہ عیب جوئی اور تنقید کیلئے سنتے تھے۔

﴿۲۲﴾......زمین پر چلنے پھرنے والی مخلوق میں سے بدترین مخلوق وہ انسان ہیں جو بہرے اور گونگے ہیں...... بہرے اس لئے ہیں کہ معرفتِ حق کی نیت سے بات نہیں سنتے اور گونگے اس لئے ہیں کہ انہیں کلمۂ حق کہنے کی توفیق نہیں ہوتی اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایسی عقل سے محروم ہیں جو حق اور باطل میں فرق کر سکے۔

﴿۲۳﴾......"اگر اللہ تعالیٰ ان میں بھلائی دیکھتے" یہاں بھلائی سے مراد حق کی طلب ہے جس انسان کے اندر طلب پائی جاتی ہے وہ بہت بڑی بھلائی سے متصف ہے اور جو اس سے محروم ہے وہ گویا ہر خیر سے محروم ہے، اگر ان میں کوئی بھلائی ہوتی تو وہ اللہ کے علم میں ضرور ہوتی، جب اس کے علم میں نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر کوئی بھلائی ہے ہی نہیں، طلبِ حق سے محرومی کی حالت میں اگر انہیں حق بات سنا بھی دی جائے تو بھی انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ ان

{۳۸} الزمر ۳۹/۱۸

لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے بداعمالیوں اور مسلسل نافرمانیوں کی وجہ سے اپنی فطری استعداد خود ختم کردی تھی اور دل و دماغ کے دروازے بند کر دیئے تھے اور جو لوگ ایسا کر لیتے ہیں انہیں کسی بھی دلیل، کسی بھی نشانی اور کسی بھی معجزہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

حکمت وہدایت

۱......اللہ کا کلام سننے اور جاننے کے باوجود اس سے اعراض کرنا مومن کی شان نہیں ہے (۲۰)

۲......مومن اور کافر کے سماع میں واضح فرق ہے، مومن سنتا ہے تصدیق اور اطاعت کے جذبے سے جبکہ کافر تکبر اور سرکشی کی کیفیت کے ساتھ سنتا ہے۔

۳......دل میں حق کی طلب کا ہونا بہت بڑی سعادت اور اس سے محرومی بہت بڑی شقاوت ہے۔

۴......مسلسل گناہوں کی وجہ سے قبولیتِ حق کی فطری استعداد ختم ہو جاتی ہے۔

ابدی زندگی

﴿۲۴......۲۶﴾

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسْتَجِيبُواْ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور رسول کا جس وقت بلائے تم کو اس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے

وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ وَأَنَّهُۥٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۲۴﴾ وَٱتَّقُواْ فِتْنَةً

اور جان لو کہ اللہ روک لیتا ہے آدمی سے اسکے دل کو اور یہ کہ اسی کے پاس تم جمع ہوگے۔ اور بچتے رہو

لَّا تُصِيبَنَّ ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنكُمْ خَآصَّةً ۖ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اس فساد سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص ظالموں ہی پر اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

وَٱذْكُرُوٓاْ إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِى ٱلْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ ٱلنَّاسُ فَـَٔاوَىٰكُمْ

اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے، مغلوب پڑے ہوئے ملک میں، ڈرتے تھے کہ اچک لیں تم کو لوگ، پھر اس نے تم کو

وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِۦ وَرَزَقَكُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۲۶﴾

ٹھکانا دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تا کہ تم شکر کرو۔

ربط: الفاظ مختلف ہیں ورنہ مضمون وہی ہے جو سابقہ آیات میں بیان ہوا یعنی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ترغیب!

تسہیل: اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا کرو جب کہ وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف دعوت دیں جو زندگی بخشنے والی ہے اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ تم سب کو اللہ ہی کے پاس جمع ہونا ہے O اور اس فتنے سے بچو جس کا وبال صرف ان لوگوں پر واقع نہیں ہوگا جو تم میں سے گناہوں میں مبتلا ہوئے ہیں اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے O اور اس وقت کو یاد کرو جب تم قلیل تھے اور سرزمینِ مکہ میں تمہیں کمزور شمار کیا جاتا تھا، تمہیں یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں لوگ تمہارا وجود مٹا ہی نہ دیں، اللہ نے تمہیں جائے پناہ عطا کر دی اور اپنی مدد سے تمہیں مضبوط کر دیا اور تمہیں نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم شکر کرو O

﴿تفسیر﴾

﴿۲۴﴾......اللہ کے پیغمبر نے جن نظریات کی دعوت دی ان میں زندگی کا سامان ہے، یہ دعوت ایسے عقائد پیش کرتی ہے جن سے مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں اور وہ اوہام اور افسانوں سے نجات پا جاتے ہیں۔ یہ دعوت انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلاتی ہے خواہ وہ اپنے نفس اور خواہشات کی غلامی ہو یا کہ دوسرے انسانوں کی غلامی۔

یہ دعوت ذات پات اور رنگ ونسب کے بتوں کو پاش پاش کر دیتی ہے، روئے زمین کے سارے انسانوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتی ہے اور انسانوں کی صرف ایک ہی تقسیم باقی رہ جاتی ہے یعنی مومنین اور کافرین۔

یہ دعوت قرآن کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنانے کا حکم دیتی ہے جو کہ سرچشمہ ہے نور اور ہدایت کا، اور یہ دعوت حکم دیتی ہے انسانِ کامل حضرت محمد ﷺ کو آئیڈیل اور نمونہ بنانے کا کہ جن کی حیاتِ طیبہ سے بہتر نمونہ انسانوں کیلئے کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ دعوت بلاتی ہے جہاد فی سبیل اللہ کی طرف تاکہ پوری دنیا میں حق کا بول بالا ہو اور حاکمیت کے ان جھوٹے دعویداروں کا اقتدار ختم کیا جا سکے جنہوں نے انسانوں کو پنجۂ استبداد میں جکڑ رکھا ہے۔ قرآن جب رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے کا حکم دیتا ہے تو اس میں قرآن، ایمان، جہاد فی سبیل اللہ، اسوۂ حسنہ اور سارے نیک اعمال اور احکامِ شریعت آ جاتے ہیں۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ﴾ اس دعوت کے قبول کرنے میں دیر نہ لگاؤ اس لئے کہ ممکن ہے آنے والے وقت میں تمہارے دل میں طلبِ حق کا وہ جذبہ باقی نہ رہے جو آج ہے، اس لئے کہ انسان کی قلبی کیفیات بدلتی رہتی ہیں کبھی سختی کبھی نرمی، کبھی محبت کبھی عداوت، کبھی توجہ اور کبھی غفلت، حضرتؓ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی

کریم ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے:

﴿یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک﴾ ”اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر مضبوط رکھنا“

ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ پر بھی ایمان لائے اور اس دعوت پر بھی ایمان لائے جو آپ لیکر آئے ہیں کیا آپ ہمارے بارے میں اندیشہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم بدل جائیں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں! کیونکہ دل اللہ کے ہاتھ میں ہیں، وہ دلوں کو بدلتا رہتا ہے۔{۳۹}

مقصد یہ ہے کہ انسان کو اپنے بارے میں مطمئن ہو کر سستی اور غفلت کا شکار نہیں ہو جانا چاہیے ورنہ کسی بھی وقت اس پر شیطان حملہ آور ہو سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ جملہ نیکو کاروں کے دل میں خوف اور گناہ گاروں کے دل میں امید پیدا کرتا ہے، نیکو کاروں کو اپنے زہد و تقوای، عبادت و اطاعت اور ذکر و تلاوت پر نہ تو گھمنڈ کرنا چاہیے اور نہ ہی مطمئن ہو کر بیٹھ جانا چاہیے کہ اب تو ہمارا جنتی ہونا یقینی ہو گیا اس لئے کہ ہو سکتا ہے شیطان انہیں صراطِ مستقیم سے ہٹا دے، یونہی گناہ گاروں کو بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی انہیں حقارت کی نظر سے دیکھنا چاہئے اس لئے کہ بے شمار ایسی مثالیں ہیں کہ رقص و سرود، چوری اور ڈکیتی، شراب و شباب اور دوسرے گناہوں میں غرق انسانوں کو باری تعالیٰ نے توبہ کی توفیق عطا فرما دی۔

”حائل ہو جانے“ کی ایک اور تفسیر بھی کی گئی ہے وہ یہ کہ انسان کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ کسی بھی وقت موت آکر اس کے اور اس کے عزائم کے درمیان رکاوٹ بن سکتی ہے لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ زندگی کی مہلت کو غنیمت جانے اور نیک عمل کے کرنے میں ہرگز دیر نہ کرے۔ یہاں سرورِ دو عالم ﷺ کی وہ حدیث پیش کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں آپ نے فرمایا ”پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو صحت کو بیماری سے پہلے، زندگی کو موت سے پہلے، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، مالداری کو فقر سے پہلے اور فراغت کو مصروفیت سے پہلے“۔{۴۰} مذکورہ بالا دونوں تفسیروں کا حاصل ایک ہی ہے وہ یہ کہ موت اور بیماری، رکاوٹوں اور اغرار سے پہلے دعوتِ خیر قبول کر لو اور رضاءِ الٰہی کے حصول کے لئے جو کچھ کر سکتے ہو وہ کر گزرو۔

فتنہ سے کیا مراد ہے؟

﴿۲۵﴾......اور اس فتنے سے بچو جس کا وبال صرف گناہ گاروں تک محدود نہیں رہے گا، ”فتنہ“ کا کیا معنی ہے؟ اہلِ علم

{۳۹} ترمذی ۲/صفحہ ۳۵-۳۶، باب ماجاء أنّ القلوب بین أصبعی الرّحمٰن

{۴۰} مستدرک حاکم ۵/۴۳۵

نے فتنہ کے انیس معانی لکھے ہیں،{۴۱}اس کا زیادہ معروف معنی ابتلاء اور آزمائش ہے، یہاں بعض مفسرین نے فتنہ کا معنی گناہ کیا ہے،سوال یہ ہے کہ وہ کونسا گناہ ہے جس کا وبال صرف گناہ کرنے والوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ ناکردہ گناہ لوگ بھی اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس گناہ سے مراد ''ترکِ جہاد'' کا گناہ ہے،{۴۲} خصوصاً اس وقت جب اسلامی مملکت اور مسلمانوں کا دفاع اور اسلامی شعائر کی حفاظت اس پر موقوف ہو، جہاد وہ عمل ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اسلام کی بلند ترین چوٹی اور مخصوص حالات میں افضل ترین عمل قرار دیا ہے، ترکِ جہاد کے نتیجے میں ذلت کا جو عذاب آتا ہے وہ چند افراد تک محدود نہیں رہتا بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے جیسا کہ آج کل آئی ہوئی ہے۔

متعدد مفسرین کا خیال یہ ہے کہ اس گناہ سے مراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جدو جہد کا ترک کرنا ہے{۴۳} کیونکہ متعدد احادیث میں نیکی کی تلقین اور برائی سے روک ٹوک کرنے کے عمل سے کنارہ کشی کو بھی ایسا فتنہ قرار دیا گیا ہے جس کا عذاب کسی خاص قوم تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے اثرات پوری قوم میں پھیل جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس قوم میں گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہو اور اس قوم میں ایسے لوگ موجود ہوں جو روکنے کی طاقت رکھنے کے باوجود خاموش رہیں تو اس پر اللہ کا عمومی عذاب آجاتا ہے'' یہی مفہوم عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا ہے وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ''اللہ عزوجل خاص لوگوں کی بدعملی کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا جب تک یہ صورت نہ ہو جائے کہ ان کے اندر برائی عام ہو جائے اور وہ قدرت کے باوجود اس سے منع نہ کریں، ایسی صورت میں اللہ کا عذاب عام اور خاص سب پر نازل ہوتا ہے۔{۴۴}

صحیح بخاری کی ایک روایت میں جو کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کو حسی مثال کے ذریعے سمجھایا ہے آپ نے فرمایا ''جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قانونی حدود توڑنے والے گناہگار ہیں اور جو لوگ ان کو دیکھ کر مداہنت اور خاموشی اختیار کرنے والے ہیں ان دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کے دو طبقے ہوں، نیچے کے طبقہ والے اوپر آکر اپنی ضرورت کے لئے پانی لیتے ہوں جس سے اوپر والے تکلیف

{۴۱} الفتنة وآثارها المدمّرة/۲۴

{۴۲} والمراد بالفتنة الذنب، والتكاسل فى الجهاد حسبما يقتضيه المعنى-(روح المعانى ۶/الجزء التاسع ۲۷۹)

{۴۳} والمداهنة فى الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر-(ابى سعود ۳/۹۱)

{۴۴} بحوالہ ابنِ کثیر ۲/۳۹۶، موطا، کلام، ۲۳/ مسندِ احمد، ۴/۱۹۲

محسوس کریں، نیچے والے یہ دیکھ کر یہ صورت اختیار کریں کہ کشتی کے نچلے حصہ میں سوراخ کر کے اس سے اپنے لئے پانی حاصل کریں اور اوپر کے لوگ ان کی اس حرکت کو دیکھیں اور منع نہ کریں تو ظاہر ہے کہ پانی پوری کشتی میں بھر جائے گا اور جب نیچے والے غرق ہوں گے تو اوپر والے بھی ڈوبنے سے نہ بچ سکیں گے'' {۴۵}

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ فتنے سے بچنے کی کوشش نہ کرنے والے افراد اور امتوں پر اللہ کا عذاب آکر رہتا ہے، اس کا عذاب دنیا میں بھی آتا ہے اور آخرت میں بھی آئے گا مگر بے شمار انسان ایسے ہیں جو عذاب میں مبتلا ہونے کے باوجود یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہم پر عذاب آچکا ہے، دیہاتوں، شہروں اور ملکوں میں فرقے اور جماعتیں، باہمی جھگڑے اور قتل و غارت گری، مہنگائی اور قحط سالی، رزق میں بے برکتی اور قلبی بے چینی، اولاد کی سرکشی اور عدمِ تحفظ، کفار کا تسلط اور مسلمانوں کی مغلوبیت یہ سب اللہ کے عذاب ہی کی تو مختلف صورتیں ہیں مگر بہت کم لوگ ہیں جو ان چیزوں کو عذابِ الٰہی سمجھتے ہیں۔

﴿۲۶﴾...... ایک قول کے مطابق یہ مہاجرین سے خطاب ہے {۴۶} جو مکہ میں انتہائی مظلومانہ زندگی گزار چکے تھے، قریش ہر اعتبار سے طاقتور تھے اور مسلمان ان کے سامنے دبے رہنے اور جور و جفا سہنے پر مجبور تھے۔

دوسرے قول کے مطابق یہ ان تمام اہلِ ایمان سے خطاب ہے جو نزولِ قرآن کے زمانے میں موجود تھے اور انہیں یاد دلایا گیا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے اقوامِ عالم میں ان کی کچھ بھی حیثیت نہیں تھی، انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، شاہانِ روم و ایران انہیں اپنے غلاموں کی طرح سمجھتے تھے، ان کی اکثریت کے پاس نہ ڈھنگ کا لباس ہوتا تھا نہ رہنے کیلئے معیاری مکان، روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے تھے، تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے، ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرِ پیکار تھا، اجتماعیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ منظم حکومتوں سے خوفزدہ رہتے تھے۔

حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں ''اللہ کی قسم! اس زمانے میں ہمیں کسی ایسی قوم کا علم نہیں جو عربوں سے زیادہ ذلیل ہو حتّٰی کہ اللہ نے انہیں اسلام کی نعمت عطا فرمادی جس کی برکت سے ان کے حالات بدل گئے، ان کی قوت و طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا، ان کے رزق میں وسعت ہوگئی، اللہ نے انہیں انسانوں پر بادشاہ بنادیا، اے اہلِ عرب! تمہیں جو کچھ ملا اسلام کی برکت سے ملا لہٰذا اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو کیونکہ تمہارا رب منعم ہے، شکر کو پسند کرتا ہے اور اہلِ شکر اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں کے مستحق ہوجاتے ہیں۔ {۴۷}

{۴۵} بخاری، شہادات/باب ۳۰، ترمذی، فتن/باب ۱۲، مسند احمد ۴/۲۷۰

{۴۶} قال الکلبی نزلت فی المہاجرین (قرطبی ۷/۳۴۵، تفسیر القاسمی ۸/۳۷)

{۴۷} ابنِ کثیر ۲/۳۹۷

حکمت وہدایت

۱......اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہنا واجب ہے، اس دعوت میں ایمان اسلام، عبادت، اطاعت، جہاد اور حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت وسنت وغیرہ سب شامل ہیں بلکہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور آپ اسے بلائیں تو اسے چاہئے کہ وہ نماز چھوڑ کر آپ کی بات سنے اور ایسا کرنے سے اس کی نماز باطل نہیں ہوگی، اس سلسلہ میں سعید بن معلیٰ کی روایت نقل کی جاتی ہے، وہ فرماتے ہیں میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے آواز دی، میں نے جواب نہ دیا، نماز سے فارغ ہو کر میں حاضرِ خدمت ہوا تو آپ نے پوچھا کہ میرے بلانے پر تم کیوں نہ آئے؟ میں نے نماز کا عذر پیش کیا تو آپ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ''اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا کرو جب وہ تمہیں پکاریں'' {۴۸}
جیسے نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ کی دعوت پر لبیک کہنا ضروری تھا یونہی آپ کے دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد بھی آپ کی دعوت پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۲......اگر دل میں نیک کام کے کرنے کا داعیہ پیدا ہو تو اسے روبعمل لانے میں دیر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ممکن ہے بعد میں ارادہ بدل جائے یا کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے (۲۴)۔

۳......انسانی قلوب سمیت ساری کائنات اللہ کے قبضے میں ہے وہ اس میں جو چاہے تصرف کرتا ہے (۲۴)۔

۴......فتنہ اور اس کے اسباب سے بچنا اور دوسروں کو بچانا واجب ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو فتنہ کا وبال صرف مجرموں تک محدود نہیں رہتا خاموش رہنے والے غیر مجرم بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں (۲۵)

۵......اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں کو خاص طور پر یاد کرتے رہنا چاہیے، انہیں یاد کرنا انسان کو شکر اور اپنے فرائض کی ادائیگی پر آمادہ کرتا ہے۔ (۲۶)

{۴۸} بخاری/۲/کتاب التفسیر/صفحہ ۶۶۹

خیانت اور تقوٰی

﴿۲۷......۲۹﴾

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٧﴾

اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ سے اور رسول سے اور خیانت نہ کرو آپس کی امانتوں میں جان کر۔

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾

اور جان لو کہ بیشک تمہارے مال اور اولاد خرابی میں ڈالنے والے ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَ

اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو کردے گا تم میں فیصلہ اور دور کردیگا تم سے تمہارے گناہ

يَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾

اور تم کو بخش دے گا اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

ربط: اہلِ ایمان سے خطابات کا سلسلہ جاری ہے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دینے کے بعد خیانت سے منع کیا جارہا ہے جو کہ اطاعت کی ضد ہے، جس دل میں تقوٰی ہو وہ خیانت نہیں کرسکتا اس لئے تقوٰی کی فضیلت بھی بیان کردی گئی ہے۔

تسہیل: اے ایمان والو! جان بوجھ کر اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ ہی تم آپس کی امانتوں میں خیانت کرو○ اور جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش کی چیز ہیں جبکہ اس آزمائش میں کامیاب ہونے والوں کے لئے اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے○ اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو تو وہ تمہیں نورِ بصیرت عطا کردے گا، تمہارے گناہ تم سے دور کردے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے○

شانِ نزول

پہلی آیت کے بارے میں متعدد روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، اصل میں ہوا یہ تھا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر یہود کے قبیلہ بنوقریظہ کی عہد شکنی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کرلیا جو کہ پچیس روز تک جاری رہا یہاں تک کہ وہ اس محاصرہ سے تنگ آگئے اور انہوں نے خود درخواست کی کہ قبیلۂ اوس، جو کہ ان کا حلیف تھا اس کے کسی فرد کو ان کے پاس بھیجا جائے، آپ نے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو

بھیج دیا، ان کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہوگئے اور عورتیں اور بچے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے، یہ دیکھ کر ان کا دل پسیج گیا، یہود نے ان سے پوچھا کہ کیا محمد ﷺ کا فیصلہ ہم تسلیم کرلیں؟ انہوں نے کہا ہاں! اس کے ساتھ انہوں نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر اشارہ کیا (کہ تمہارے لیے قتل کا فیصلہ ہو چکا) ابولبابہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابھی میرے قدم وہاں سے نہ ہٹے تھے کہ میں نے جان لیا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی ہے، حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ وہاں سے واپس لوٹے اور حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا اور قسم کھالی کہ نہ تو میں کچھ کھاؤں گا اور نہ ہی پیوں گا، وہ اسی حالت میں رہے یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کرنے کا اعلان فرما دیا، اس کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو اس وقت تک کھولنے سے انکار کر دیا جب تک کہ خود نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں، چنانچہ آپ تشریف لائے اور اپنے دستِ مبارک سے انہیں کھولا، تقریباً بیس دن تک وہ اس ستون سے بندھے رہے، نماز کے وقت ان کی اہلیہ آکر انہیں کھول دیتیں، نماز ادا کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو دوبارہ باندھ لیتے۔{۴۹}

چونکہ سورۂ انفال، غزوۂ بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے جبکہ یہ واقعہ غزوۂ قریظہ کے موقع پر پیش آیا تھا جو کہ ۵ھ ہجری میں واقع ہوا تھا اس لئے بعض حضرات نے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس آیت کے نازل ہونے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اس آیتِ کریمہ کا اطلاق ان کے واقعہ پر بھی ہوتا ہے۔{۵۰}

﴿۲۷﴾...... یہ آیتِ کریمہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی یا نہیں ہوئی اس بارے میں تو اختلاف ہے لیکن اِس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس میں تمام مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول اور آپس کی امانتوں میں خیانت سے منع کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فرائض پر عمل سے پہلوتہی، اس کی حدود کی پامالی، اس کی حرام کردہ چیزوں کا استعمال، جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے ان کا ارتکاب اور جو دین اس نے عطا کیا ہے اس کی سربلندی کیلئے کوشش نہ کرنا اللہ کے ساتھ خیانت ہے۔{۵۱}

کلمہ پڑھ لینے کے باوجود محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع نہ کرنا، آپ کی سنت اور سیرت کے بجائے اپنے خاندانی اور قومی رسم و رواج کو فوقیت دینا اور جس دین کی دعوت و اشاعت کے لئے آپ نے اپنی مبارک زندگی وقف کر دی اس

{۴۹} معارف القرآن ۴/۲۱۵

{۵۰} نزلت فی ابی لبابۃ (قرطبی ۷/۳۴۶، قال ابن عباس رضی اللہ عنہ نزلت ھذہ الآیۃ فی ابی لبابۃ (کبیر ۵/۴۷۵)

{۵۱} أی لاتخونوھما بتعطیل الفرائض والسنن۔(ابی سعود ۳/۹۲)

سے غفلت کا رویہ اختیار کرنا آنحضرت ﷺ سے خیانت ہے۔{۵۲}

﴿وَتَخُونُوٓا أَمَٰنَٰتِكُمْ﴾ آپس کی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو، جمع کا صیغہ یعنی ''امانات'' استعمال کرنے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ امانتیں کئی قسم کی ہیں، امانت کا اطلاق صرف اس چیز پر نہیں ہوتا جو کسی کے پاس حفاظت کی غرض سے رکھی جاتی ہے بلکہ ہر وہ چیز امانت ہے جس کے ساتھ کسی کا حق متعلق ہو اور جس کی حفاظت اور مالک کی طرف ادائیگی انسان پر لازم ہو، اہلِ علم نے ایمان اور دین، جسم اور جان، مال ومتاع، علوم ومعارف، شہادت اور قضاء، عہدہ ومنصب، سمع وبصر اور تمام حواس، راز اور مشورہ ان سب چیزوں کو امانت شمار کیا ہے۔{۵۳}

رسول اللہ ﷺ کی نظر میں امانت کی اس قدر اہمیت تھی کہ آپ خطبے میں اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے:

﴿لا إیمان لمن لا أمانة له ولا دین لمن لا عهد له﴾{۵۴} ''جس کے اندر امانت کی صفت نہیں اس کے ایمان کا اعتبار نہیں اور جس کے اندر ایفائے عہد کی صفت نہیں اس کے دین کا اعتبار نہیں''

امانت میں خیانت کرنے کو منافق کی تین نشانیوں میں سے ایک نشانی بتایا گیا ہے۔

﴿۲۸﴾...... مال اور اولاد اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت بھی ہیں اور انسان کیلئے باعثِ فتنہ بھی ہیں، عربی زبان میں ''فتنہ'' کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے، قرآنِ کریم میں اس لفظ کا استعمال گیارہ، پندرہ اور انیس معانی میں بتایا گیا ہے۔{۵۵}

لغت میں فتنہ کا لفظ اس سونے کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے آگ میں ڈال کر تپایا جائے تا کہ اس کا کھرا اور کھوٹا ہونا واضح ہو جائے اسی لئے عام طور پر فتنہ کا معنی ابتلاء اور امتحان کیا جاتا ہے کیونکہ ابتلاؤں میں بھی انسان کے کھرا اور کھوٹا ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔

فتنہ کی نشاندہی

مال اور اولاد دونوں کی محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے یہ محبت جب حد سے تجاوز کر جائے تو فتنہ کا باعث

{۵۲} عن ابن عباس رضی الله عنه ان خیانة الله سبحانه بترك فرائضه والرّسول بترك سنّته وارتكاب معصیته(روح المعانی ۲۸۳/۶)

{۵۳} الأخلاق الاسلامیه وأسسها(۱/ ۶۴۶-۶۴۷)

{۵۴} مسند احمد۱۳۵/۳)

{۵۵} الفتنه وآثارها المدمّرة ۲۳-25

بن جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو مال کے فتنے سے خاص طور پر ڈرایا ہے، ارشادِ گرامی کا مفہوم ہے:

''اللہ کی قسم! مجھے تمہارے بارے میں فقر کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ تمہیں بھی دنیا میں خوشحالی عطا کردی جائے جیسے تم سے پہلے لوگوں کو عطا کی گئی اور تم آپس میں مقابلہ کرنے لگو جیسے پہلے لوگوں نے کیا، پھر حصولِ دنیا میں یہ مسابقت تمہیں بھی تباہ کردے جیسے اس نے تم سے پہلوں کو تباہ کردیا'' {۵۶}

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لكل امة فتنة و فتنة امتی المال﴾{۵۷} ''ہر امت کے لئے کوئی فتنہ تھا اور میری امت کا فتنہ مال ہے''

صرف وہ مال انسان کیلئے فتنہ ہوتا ہے جو اسے اللہ کے ذکر سے غافل کردے، جو انسان کو غرور اور تکبر میں مبتلا کردے، جس مال میں سے اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا نہ کیا جائے، جسے اسراف اور معاصی میں اڑایا جائے، جس کی وجہ سے آپس میں بغض اور حسد پیدا ہو جائے اور جو قناعت کے بجائے حرص اور طمع پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

اولاد کی محبت ہر نیک اور بد کے دل میں ہوتی ہے، انبیاء علیہم السلام اللہ سے نیک اولاد کی دعا کرتے تھے لیکن اگر یہ محبت افراط کا شکار ہو جائے تو اس کی وجہ سے انسان بعض اعمالِ حسنہ سے محروم ہو جاتا ہے اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، حضورِ اکرم ﷺ نے اولاد کے بارے میں فرمایا:

﴿الولد محزنة، مجنبة، مجهلة، مبخلة﴾{۵۸} ''اولاد، والدین کے لئے حزن والم، بزدلی جہالت اور بخل کا سبب بن جاتی ہے''

اولاد کی بیماری اور اس کی ضروریات کی عدمِ تکمیل سے انسان پریشان ہو جاتا ہے، اس کے یتیم ہو جانے کا اندیشہ اسے جہاد میں نہیں جانے دیتا، اس کی محبت اسے طلبِ علم سے محروم رکھتی ہے اور اس کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ پر آسائش بنانے کی آرزو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روک دیتی ہے لیکن اگر اولاد نیک ہو اور اس کی تعلیم و تربیت کا حق ادا کر دیا جائے تو وہ والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور سفرِ آخرت کا قیمتی توشہ ثابت ہوتی ہے، بسا اوقات انسان مال کے فتنے میں اولاد کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے، وہ اس کی خاطر بخل بھی کرتا ہے اور حرام ذرائع سے آمدنی میں اضافہ بھی کرتا ہے اس لئے پہلے مال کے فتنے کو اور بعد میں فتنۂ اولاد کو ذکر کیا گیا، اسے اصطلاح میں کہتے

{۵۶}بخاری ۲/کتاب الرقاق/ صفحہ ۹۵۱/ ابن ماجہ/ باب فتنة المال/صفحہ۲۸۸

{۵۷}ترمذی/۲/صفحہ ۵۹/ باب ماجاء ان فتنة هذه الامة المال

{۵۸}الطبرانی فی معجمہ الکبیر ۲۴۱/۲۴ بحوالہ الفتنة/۵۵

ہیں "الانتقال من الادنی إلی الأعلیٰ" (ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف انتقال کرنا)

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ جو کوئی اموال اور اولاد کے بارے میں حدودِ شریعت کی پابندی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے دنیا اور آخرت میں اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

﴿۲۹﴾...... ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ کے الفاظ کے ساتھ مومنوں کو جو وصیتیں فرمائی جارہی تھیں یہ ان میں سے آخری اور سب سے جامع وصیت ہے، ایمان والوں سے کہا جارہا ہے کہ اگر تم اپنے اندر تقویٰ کی صفت پیدا کرلو تو اللہ تمہیں "فرقان" عطا کردے گا، عربی زبان میں "تقویٰ" کا معنی ہے بچنا اور پرہیز کرنا اور اصطلاح میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے دل میں اللہ کے حاضر ناظر ہونے کا یقین پیدا ہوجائے، ظاہر ہے کہ جس کے دل میں یہ یقین پیدا ہوجائے اس کے لئے گناہوں سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں باری تعالیٰ نے "تقویٰ" کا لفظ بول کر اللہ سے ڈرنے، گناہوں اور آگ سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

جس انسان کے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہوجائے اسے انعام کے طور پر "فرقان" کی صفت عطا کردی جاتی ہے گویا تقویٰ ایک درخت ہے اور فرقان اس درخت پر لگنے والا پھل!

﴿فُرْقَانًا﴾ فرق کے مادہ سے ماخوذ ہے اور لغت میں اس کا معنی ہے دو یا کئی چیزوں میں فرق کرنا۔ {۵۹}

تقویٰ کی وجہ سے انسان کے دل میں ایسا نورِ بصیرت پیدا ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے حق اور باطل میں فرق کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ {۶۰}

زندگی میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں انسان کی فکر و نظر الجھ کر رہ جاتی ہے اور اس کیلئے حق اور باطل میں فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے لیکن اگر اس کے دل میں نورِ بصیرت پیدا ہوچکا ہو تو اس کے اشکالات خود بخود دور ہوجاتے ہیں اور وہ جان لیتا ہے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے، اس کا دل مطمئن ہوجاتا ہے اور اس کے قدم سچائی کے راستے پر جم جاتے ہیں۔

﴿وَیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ﴾ تقویٰ کے نتیجے میں دوسرا انعام انسان کو یہ دیا جاتا ہے کہ اس کے گناہوں کے آثار مٹا دیے جاتے ہیں اور دنیا میں ان پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ {۶۱}

{۵۹} لأنّ مادة "فرق" ترجع إلی الفصل۔ (نظم الدرر ۳/۲۰۸)

{۶۰} فرقاناً ای هدایة ونوراً فی قلوبکم تفرقون به بین الحق والباطل (روح المعانی ۶/۲۸۵)

{۶۱} وتکفیر ذنوبه وهو محوها، وغفرها وسترها عن الناس (ابن کثیر ۲/۳۹۹)

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ﴾ تیسرا انعام اسے آخرت میں عطا ہوگا وہ یہ کہ اللہ اپنے فضل وکرم سے اس کے سارے گناہوں کو معاف فرما کر اسے جنت میں داخل فرمادیں گے۔{۶۲}

تقوٰی کی بنیاد پر جن انعامات کا وعدہ اللہ نے یہاں کیا ہے انہی سے ملتے جلتے انعامات کا وعدہ دوسرے مقامات پر بھی کیا ہے، سورۂ طلاق میں ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ {۶۳}

''اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کیلئے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو''

سورۂ طلاق ہی میں ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا ۝ {۶۴}

''جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے گناہ مٹادے گا اور اسے بڑا بھاری اجر دے گا''

حکمت وہدایت

۱......خیانت مطلقاً حرام ہے اور بدترین خیانت وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کی جائے (۲۷)

۲......اموال اور اولاد کی محبت میں حد سے بڑھ جانا باعثِ فتنہ ہے (۲۸)

۳......عربی زبان میں فتنہ کا اطلاق ہمیشہ ناپسندیدہ چیز پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور پسندیدہ چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ (۲۸)

۴......مال اور اولاد کی شدید محبت بسا اوقات انسان کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت پر آمادہ کردیتی ہے اس لئے انسان کو خوب چوکنا رہنا چاہیے۔

۵......آخرت کی سعادتیں دنیا کی سعادتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور افضل ہیں اسی لئے فرمایا گیا "وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ"

۶......تقوٰی کے نتیجے میں گناہ، نیکیوں میں بدل جاتے ہیں اور انسان کو ایسا نور عطا کردیا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان کے لئے مشتبہ امور میں غلط اور صحیح کو پہچاننا آسان ہو جاتا ہے۔ (۲۹)

{۶۲} قيل وفى الآخره فيدخلكم الجنّة (قرطبی ۳۴۸/۷)

{۶۳} الطلاق/آیت ۲،۳

{۶۴} الطلاق/آیت ۵

مشرکین کی تدبیریں

﴿۳۰......۳۱﴾

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ

اور جب فریب کرتے تھے کافر کہ تجھ کو قید کردیں یا مارڈالیں یا نکال دیں اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور

اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ

اللہ بھی داؤ کرتا تھا اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ اور جب کوئی پڑھے ان پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سن چکے، اگر ہم

لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں ایسا، یہ تو کچھ بھی نہیں مگر احوال ہیں اگلوں کے۔

ربط: گزشتہ آیات میں ان احسانات کا ذکر تھا جو صحابہ پر ہوئے یہاں ان نعمتوں میں سے بعض کا ذکر ہے جو رسولِ اکرم ﷺ پر ہوئیں۔

تسہیل: اور اس واقعہ کا بھی ذکر کیجئے جب کافر لوگ آپ کے بارے میں بری بری تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا وطن سے باہر نکال دیں، وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ کی تدبیر سب سے بہتر ہوتی ہے ○ اور جب ان کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسا کلام بنا سکتے ہیں، یہ تو بس بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے منقول چلی آ رہی ہیں ○

شانِ نزول

آیت ۳۰ کے شانِ نزول کے بارے میں سیرت، حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کافی بڑی تعداد میں مسلمان مکہ سے ہجرت کر گئے تو مشرکینِ مکّہ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اگر محمد ﷺ بھی اپنے اصحاب کے پاس مدینہ چلے گئے تو بعید نہیں کہ مسلمان ان کی قیادت میں متّحد ہو کر قریشی اقتدار اور مکّی سلطنت کیلئے خطرہ بن جائیں لہٰذا حالات کے قابو سے باہر جانے سے پہلے فیصلہ کن قدم اٹھانا ضروری ہے، چنانچہ باہمی مشاورت کے لیے قریش کے سردار اور اصحابِ رائے "دار الندوہ" میں جمع ہوئے جسے مکہ کے پارلیمنٹ ہاؤس کا درجہ حاصل تھا، انسانی شکل میں شیطان بھی آ ٹپکا اور اس نے اپنے آپ کو نجد کا سردار بتایا جو کہ محض قریش کی خیر خواہی کے جذبے سے مشورہ دینے کیلئے آیا تھا جب سب معززین جمع ہو گئے تو اصل موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، اسلام کی دن

بدن ترقی اور محمد ﷺ کے مدینہ پہنچ جانے کی صورت میں ریاستِ مدینہ کے استحکام کی طرف متوجہ کرتے ہوئے تمام شرکاء سے رائے طلب کی گئی۔ابوالبختری بن ہشام نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہیں زنجیروں میں جکڑ کر کسی مکان میں بند کر دیا جائے پھران کی موت کا انتظار کیا جائے حتّٰی کہ یہ بھی اسی طرح ہلاک ہو جائیں جیسے ان سے قبل زہیر اور نابغہ جیسے شعراء ہلاک ہو چکے ہیں، شیخ نجدی فوراً پکار اٹھا اللہ کی قسم! یہ رائے قطعاً درست نہیں، اگر تم نے ایسا کیا تو اس کی اطلاع ان کے جانثاروں کو ہو جائے گی اور وہ بزورِ بازو انہیں تم سے چھین کر لے جائیں گے۔

پھر ابوالاسود ربیعہ کھڑا ہوا اور اس نے تجویز پیش کی کہ انہیں یہاں سے نکال دو، جب مکہ سے چلے جائیں گے تو ہماری جان چھوٹ جائے گی۔نجدی شیخ اس بار بھی خاموش نہ رہ سکا اور اس نے اس تجویز کو بھی فضول اور لایعنی قرار دیا، اس نے مجمع کو مخاطب بناتے ہوئے کہا ''کیا تم ان کی شیریں بیانی، فصاحت لسانی اور دل موہ لینے والے اندازِ گفتگو سے بے خبر ہو؟ اگر تم نے انہیں یہاں سے نکال دیا تو یہ کسی دوسرے قبیلے میں جا کر رہائش پذیر ہو جائیں گے اور پھر اپنے سحر آفریں بیان سے انہیں متاثر کر کے تمہارے اوپر حملہ آور ہونگے، تمہارے رؤساء کو قتل کر دیں گے اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں گے۔تمام حاضرین نے بھی نجدی سردار کی بات کی تائید کی اور کوئی دوسری تجویز پیش کرنے کیلئے کہا، اب کی بار ابوجہل کھڑا ہوا اور اس نے کہا ''میں تمہیں ایسا مشورہ دیتا ہوں جس کے بعد کسی اور مشورہ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی'' حاضرین نے ہمہ تن گوش ہو کر سوال کیا کہ وہ کیا ہے؟ ابوجہل نے جواب دیا ''تم ہر قبیلے سے ایک بہادر طاقتور اور عالی نسب نوجوان کا انتخاب کرو پھر ان میں سے ہر ایک کو ایک تیز تلوار دے دو، یہ سارے نوجوان یکبارگی ان پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیں، بنو ہاشم سارے قبائل کا تو مقابلہ نہیں کر سکیں گے اور اگر وہ ہم سے دیت کا مطالبہ کریں گے تو ہم سب مل کر دیت دے دیں گے اور یوں ہماری پریشانی ختم ہو جائے گی'' شیخ نجدی نے اس تجویز کو خوب سراہا اور کہا کہ درست بات تو وہی ہے جو اس بہادر شخص نے کہی ہے، میری بھی یہی رائے ہے، تمام حاضرین نے بھی اس رائے کو پسند کیا اور اس پر ان کی مجلس کا اختتام ہوا۔{۶۵}

جبریل امین اس رات بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہجرت کی اجازت کی اطلاع پہنچائی چنانچہ آپ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے۔

یہاں پہلی آیتِ کریمہ (۳۰) میں اسی واقعہ اور نعمتِ باری تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے۔

{۶۵} سیرت ابن ھشام ۲/۹۳، ابن کثیر ۲/۲۲۷

﴿تفسیر﴾

﴿۳۰﴾......اے میرے حبیب! اس واقعے کو یاد کیجئے جب مشرکین جمع ہوکر آپ کی ذات اور آپ کی دعوت کے سدِّ باب کے بارے میں مشورے کررہے تھے، ان میں سے کسی کی رائے آپ کو قید کرنے کی، کسی کی مکہ سے نکال دینے کی اور کسی کی قتل کرنے کی تھی، ان کا خیال تھا کہ ہمارے مشورہ کی آپ کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوسکے گی لیکن حاضر اور غائب پر نظر رکھنے والی ذات نہ صرف ان کی سازش کی جزئیات سے واقف تھی بلکہ اس نے اس کا توڑ بھی تجویز کررکھا تھا چنانچہ وہ آپ کا بال بھی بیکا نہ کرسکے۔

﴿۳۱﴾......اور جب ان مشرکین کے سامنے ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ سُن کر کہتے ہیں کہ ایسی باتیں تو ہم بھی بنا سکتے ہیں اور ایسے قصے تو ہم بھی سنا سکتے ہیں، ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ وہی پرانی کہانیاں ہیں جو ہم سنتے چلے آرہے ہیں۔

قرآن سے دور کرنے کی کوششیں

تعارف، نضر بن حارث......کون تھا جس نے یہ بات کہی تھی؟ تفسیروں میں عام طور پر نضر بن حارث کا نام ملتا ہے{۲۶} جو کہ سرزمینِ فارس کی طرف سفر کرتا رہتا تھا، وہاں نہ صرف رستم اور اسفندیار خان اور عجم کے دوسرے سورماؤں، پہلوانوں، شہ سواروں، جادوگروں اور بادشاہوں کے قصے سنتا بلکہ آتے جاتے یہود و نصاریٰ سے تورات اور انجیل بھی سن لیتا، وہ جب سفر سے واپس آتا تو قصوں اور کہانیوں کی کتابیں خرید کر لے آتا اور لوگوں سے کہتا "محمد ﷺ تمہیں عاد و ثمود کے قصے سناتے ہیں، آؤ میں تمہیں ان سے کہیں زیادہ دلچسپ قصے سناتا ہوں"۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس قسم کا پروپیگنڈہ صرف نضر بن حارث کرتا تھا اس کے دوسرے بیٹی بند بھائی بھی پوری طرح اس مذموم حرکت میں شریک تھے اور عوام کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے طرح طرح کی باتیں بناتے رہتے تھے، ان سب کو اپنا اقتدار اور چودھراہٹ خطرے میں نظر آرہی تھی، وہ دیکھ رہے تھے کہ جو لوگ قرآن پر ایمان لے آتے ہیں وہ جاہلی اقدار سے باغی ہوجاتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں اپنے قبیلے، اپنے خاندان اور جاہلی قیادت کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے، اس قسم کے لوگوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا جس نے قریش کے وڈیروں

{۲۶} روی ان النضر بن حارث خرج الی الحیرة تاجرا (کبیر ۵/۴۷۸)، قیل ان القائل لذلك هو النضر بن حارث (ابن کثیر ۲/۳۰۲) قال المفسّرون و کان النضر (المنار ۹/۵۴۵)

کی نیندیں حرام کردیں تھیں، انہوں نے عربوں کو قرآن سے باز رکھنے کیلئے کئی حربے آزمائے، ان میں سے ایک حربہ وہ تھا جس کا اس آیت میں ذکر ہے یعنی یہ کہ یہ تو سنی سنائی کہانیاں ہیں اگر ہم چاہیں تو ایسی کہانیاں تصنیف کرسکتے ہیں...... مخالفین کا معاملہ بڑا عجیب تھا، ایک تو وہ کسی بات پر ٹکتے نہیں تھے ،قرآن کو کبھی ''سحر'' کبھی ''کہانت''، کبھی ''شعر'' اور کبھی ''اساطیر'' کہتے ،مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو قرآن کے سننے سے روکا جائے، دوسری طرف خود ان کا اپنا حال یہ تھا کہ رات کی تاریکی میں جب حبیبِ خدا ﷺ قرآن کی تلاوت فرماتے تو ابوجھل، ولید بن مغیرہ اور نضر بن حارث جیسے دشمنانِ دین چھپ چھپ کر سنتے تھے اور اگر اتفاق سے نظروں میں آجاتے تو ایک دوسرے کو ملامت کرتے اور آئندہ باز رہنے کا عہد کرتے لیکن قرآن کی ذاتی کشش اور نبی کریم ﷺ کا درد اور مسحور کن لہجہ انہیں پھر عہد شکنی پر مجبور کردیتا، ولید بن مغیرہ کی زبان سے ایک موقع پر بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے تھے:

﴿إنـه يعلـو ولا يعـلـىٰ عليـه و انـه يحطم ماتحته﴾{۶۷}

''یہ کلام غالب تو آسکتا ہے مگر اس پر کوئی دوسرا کلام غالب نہیں آسکتا، اس کے اندر ایسی تاثیر اور طاقت ہے کہ اپنے ماسوا کو زیروزبر کر کے رکھ دے گا''

ایک دشمن کے منہ سے نکلی ہوئی حیرت انگیز پیشگوئی تھی جو سو فیصد پوری ہو کر رہی۔

حکمت وہدایت

۱...... اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرتے رہنا چاہئے تاکہ دل میں شکر کا داعیہ پیدا ہو اور شکر کرنے کی توفیق ملے۔(۳۰)

۲...... جو لوگ دلیل کے میدان میں شکست کھاجاتے ہیں عام طور پر وہی طاقت کے زور پر حق کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔(۳۰)

۳...... واقعۂ ہجرت اپنے اندر معجزانہ شان رکھتا ہے کہ بڑی باریک بینی سے تیار کی گئی مخالفین کی تدبیر ناکام ہوگئی اور اللہ کی تدبیر غالب آکر رہی۔(۳۰)

۴...... ڈینگیں مارنے والے زبان سے بہت کچھ کہہ دیتے ہیں مگر عملی طور پر کچھ نہیں کرتے ...... مشرکین کا یہ کہنا کہ ''ہم بھی ایسا کلام بنا سکتے ہیں'' ڈینگ کے سوا کچھ نہیں تھا۔(۳۱)

۵...... بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ابتداء میں مشرکین کو یہ وہم ہوا تھا کہ ہم قرآن جیسا کلام بنالیں گے لیکن جب انہوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔{۶۸}

{۶۷} المنار ۹/۵۴۶

{۶۸} وقيل انّهم توهّموا أنّهم يأتون بمثله كما توهّمت سحرة موسىٰ ثمّ راموا ذلك فعجزوا عنه۔(قرطبی ۷/۳۴۸)

ہجرت نبوی
﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾
"اور یاد کیجئے! جب تدبیر کر رہے تھے آپ کی بابت وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تاکہ وہ قید کر دیں آپ کو یا قتل کر دیں آپ کو یا نکال دیں آپ کو اور تدبیریں کر رہے تھے وہ اور تدبیر کر رہا تھا اللہ بھی اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے O" (الانفال: 30/8)
﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾
"اگر نہ مدد کرو گے تم اس کی، تو تحقیق مدد کی اس (پیغمبر) کی اللہ نے جب کہ نکال دیا تھا اس کو ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا (وہ) دوسرا تھا دو میں سے جب وہ دونوں تھے غار میں، جب کہ وہ کہہ رہا تھا اپنے ساتھی سے غم نہ کر بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے، پس نازل کی اللہ نے اپنی سکینت اس پر اور مدد کی اس کی ایسے لشکروں سے کہ نہیں دیکھا تم نے ان کو"
(التوبہ: 40/9)
ہجرت کا راستہ
قافلوں کا متروک راستہ
* نبی ﷺ 12 ربیع الاول مطابق 24 ستمبر 622ء بروز پیر کو قباء پہنچے۔ یکم محرم 1ھ 16 جولائی 622ء کے مطابق ہے اور یہی ہجری تاریخ کی ابتداء ہے۔
ذات الجیش
عقیق
مدینہ منورہ
قباء
ملل
ذوالحلیفہ (آبارعلی)
بطن رئم
روجاء
رویثہ
عرج
منصرف
حمراء الاسد
جداجد
بطن ذی کثیر
مرنجاج
مولجہ حجاج
مولجہ لقف
ثنیۃ المرہ
بدر
رابغ
الجحفہ
رابغ البحر
قُدید
خیمہ ام معبد
مشلل
عُلیس
امج
کدید
غدیر الاشطاط
ثنیۃ الغزال
عسفان
سرف
حدیبیہ
جدہ
مکہ مکرمہ
جبل ثور
طائف
بحیرہ احمر (قلزم)
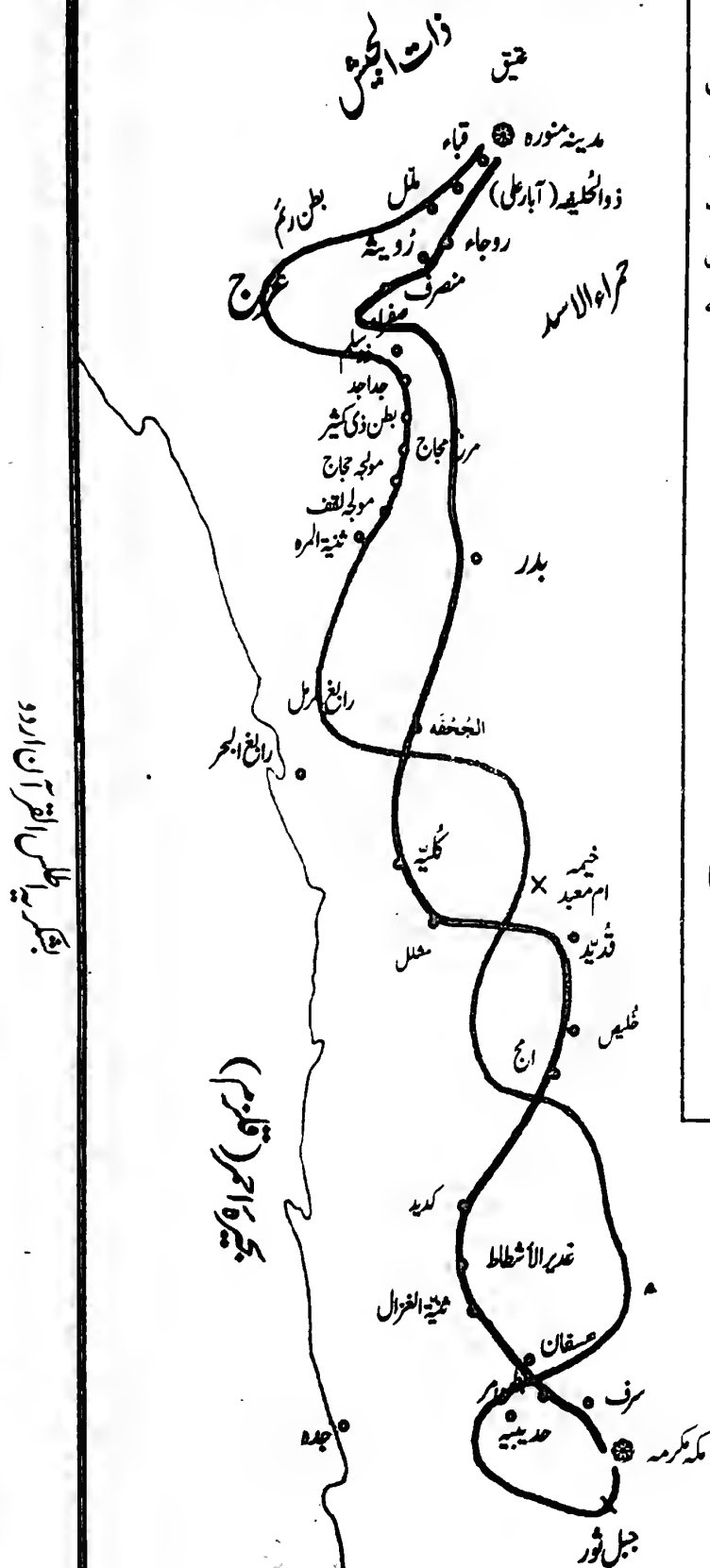
۶......صرف نضر بن حارث اور اس کے ہم مشرب ساتھیوں نے نے ہی عالمِ انسانی کو قرآن سے دور رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی، یہ کوششیں آج بھی جاری ہیں لیکن تمام تر مخالفت کے باوجود قرآن اپنا راستہ بنا رہا ہے۔

مشرکین کا مطالبہ اور غیر سنجیدہ حرکتیں

۳۲......۳۵

وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ

اور جب وہ کہنے لگے کہ یااللہ! اگر یہی دین حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر برسا دے پتھر آسمان سے یا لا ہم پر

السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ

کوئی عذاب دردناک۔ اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا ان پر جب تک تُو رہتا ان میں اور اللہ ہرگز نہ عذاب کریگا

اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ

ان پر جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے۔ اور ان میں کیا بات ہے کہ عذاب نہ کرے ان پر

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ

اللہ، اور وہ تو روکتے ہیں مسجدِ حرام سے اور اس کے اختیار والے نہیں، اس کے اختیار والے تو وہی ہیں

لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا

جو پرہیزگار ہیں لیکن ان میں اکثروں کو اس کی خبر نہیں۔ اور ان کی نماز نہیں تھی کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں بجانی اور

الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۳۵﴾

تالیاں سو چکھو عذاب بدلہ اپنے کفر کا۔

تسہیل: اور وہ بات بھی تو یاد کرو جو انہوں نے کہی تھی کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن واقعی تیرا کلام ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا، یا ہمیں المناک عذاب سے دوچار کردے ○ اور ایسا کرنا اللہ کی شان کے لائق نہ تھا کہ ان کے درمیان آپ کے موجود ہوتے ہوئے اپنا عذاب ان پر نازل کردے اور نہ ہی اللہ کا یہ دستور ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو عذاب دے جو استغفار کرتے ہوں ○ ویسے ان لوگوں کو اللہ کے عذاب سے بچے رہنے کا کوئی حق نہیں جو دوسروں کو مسجدِ حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کے جائز متولی بھی نہیں، اس کے متولی ہونے کا حق تو صرف اہلِ تقویٰ کو حاصل ہے لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے ○ بیت اللہ میں ان کی نماز صرف یہ تھی کہ وہ سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے تھے تو لو اب عذاب کا مزہ چکھو اس کفر کی وجہ سے جو تم کرتے رہے ہو ○

﴿تفسیر﴾

﴿۳۲﴾......نضر بن حارث سے جب کہا گیا کہ اللہ سے ڈرو، اللہ کے کلام کو قصے کہانیاں قرار دے رہے ہو تو اس نے اپنے مذہب پر پختگی ظاہر کرنے اور عام لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے دعا کی: ﴿اَللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا﴾ {۶۹}

صحیح بخاری میں اس دعا کی نسبت ابو جہل کی طرف کی گئی ہے، {۷۰} ممکن ہے دونوں ہی نے یہ دعا کی ہو۔ {۷۱}

یہ دعا ان کی جہالت، کفر وعناد اور تکبّر کی انتہا پر دلالت کرتی ہے، کہنا تو یہ چاہئے تھا کہ اے اللہ! اگر یہ حق ہے تو ہمیں اسے قبول کرنے کی توفیق دے دے لیکن انہوں نے یہ دعا کی کہ اگر یہ حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا دے، اللہ کے عذاب کے بارے میں اس قسم کی جہالت اور حماقت کا ارتکاب وہ اکثر کرتے رہتے تھے، سورۂ عنکبوت میں ہے:

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ {۷۲}

"یہ لوگ آپ سے جلد عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر عذاب کا وقت مقرر نہ ہوتا تو ان پر اب تک آچکا ہوتا اور وہ ان پر اس طرح اچانک آئے گا کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی"

﴿۳۳﴾......مشرکین کی حرکتوں اور ضد وعناد کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان پر اب تک عذاب آچکا ہوتا مگر اللہ کا دستور یہ ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں فرماتا جب تک اللہ کا پیغمبر ان کے درمیان موجود ہو حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوط علیہم السلام ہی کے معاملہ کو دیکھ لیا جائے کہ جب تک انہیں اپنے اپنے شہر سے نکال نہیں لیا گیا اس وقت تک ان کی قوم پر عذاب نہیں آیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

﴿لم يعذب أهل قرية حتى يخرج البنى ﷺ والمؤمنون ويلحقوا بحيث أمروا﴾ {۷۳}

"کسی بھی بستی والوں پر اس وقت تک عذاب نہیں آیا جب تک اللہ کا نبی اور ایمان والے وہاں سے نکل کر ایسی جگہ نہیں چلے گئے جہاں اللہ نے انہیں جانے کا حکم دیا تھا"

{۶۹} قال له النّبی صلی اللہ علیه وسلم ویلك انّه کلام اللہ فقال ذٰلك۔(روح المعانی ۲۸۹/۶، ابی سعود ۹۴/۳)

{۷۰} صحیح بخاری ۲/کتاب التفسیر ۶۶۹

{۷۱} لاینافی ذلك مافی الصحیح لاحتمال ان یکونا قالاہ۔(المنار ۵۴۷/۹)

{۷۲} عنکبوب ۵۳/۲۹

{۷۳} قرطبی ۳۴۹/۷

استغفار......دفعِ عذاب کا اکسیر علاج

دوسری وجہ اہلِ مکہ پر عذاب نہ آنے کی یہ تھی کہ وہ استغفار کرتے تھے، یہاں مکہ کے تمام باشندوں کا استغفار کرنا مراد ہے یا ان میں سے صرف اہلِ ایمان کا؟ دونوں ہی قول نقل کیے گئے ہیں۔

مشرکین جیسے بھی تھے بہر حال اللہ کے وجود کا اقرار بھی کرتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق اس کی عبادت اور استغفار بھی کرتے تھے۔{۷۴}

یہ استغفار اگرچہ آخرت کے عذاب سے بچانے میں تو سودمند نہ تھا مگر اس کی وجہ سے ان پر دنیا میں ویسا آسمانی عذاب نازل نہ ہوا جیسا عاد وثمود وغیرہ پر نازل ہوا تھا اور جو ان کا نام ونشان ہی مٹا دیتا، اور اگر ان کمزور مسلمانوں کا استغفار مراد لیا جائے جو اپنی مجبوریوں کی بنا پر مکہ سے ہجرت نہیں کر سکے تھے{۷۵} تو پھر کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا، آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ چونکہ مکہ مکرمہ میں ایسے اصحابِ ایمان موجود ہیں جو کہ استغفار کرتے رہتے ہیں اس لئے ان کی برکت سے وہاں رہنے والے سرکش بھی عذاب سے محفوظ ہیں۔

ایک تیسرا قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہاں استغفار، ایمان کے معنی میں ہے اور اس میں مستقبل کا زمانہ ملحوظ ہے یعنی ان پر عذاب نازل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ یہ مشرکین یا ان کی اولادیں مستقبل میں ایمان لے آئیں گے۔{۷۶}

چنانچہ ایسے ہی ہوا اور آج کے دشمن آگے چل کر اسلام کے وفادار اور مخلص مبلّغ ثابت ہوئے۔

﴿۳۴﴾......مشرکین، نبی کریم ﷺ کے وجودِ مسعود اور اہلِ ایمان یا اپنے استغفار کی وجہ سے اگرچہ ایسے عذاب سے تو محفوظ رہے جو ان کا کلی خاتمہ کر دیتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ عذاب کے مستحق نہیں تھے یا اگر بڑا عذاب ان پر نہیں آیا تو چھوٹا موٹا عذاب بھی ان پر نہ آئے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ مسلمانوں کو مسجدِ حرام کے طواف سے بھی روکتے ہیں اور نماز بھی نہیں پڑھنے دیتے اور وہ اپنے کفر وشرک اور نازیبا حرکات کی وجہ سے مسجدِ حرام کے متولّی بننے کے حقدار بھی نہیں ہیں، سوال ہوا کہ پھر کون متولّی بننے کا حقدار ہے؟ یہ سوال اگرچہ عبارت میں مذکور نہیں لیکن سیاق وسباق میں غور وفکر کرنے سے خود بخود سمجھ آتا ہے اور قرآن کا یہ عمومی انداز ہے کہ وہ سوالات ذکر کئے بغیر ان کے جوابات دیتا چلا جاتا ہے جیسے یہاں جواب دیا گیا ہے کہ مسجد کے متولّی بننے کے حقدار صرف وہ لوگ ہیں جن کے اندر تقوٰی کی صفت پائی جاتی ہو۔

{۷۴} قال ابن عباس رضی اللہ عنہ هم الکفار یقولون فی الطواف: غفرانك(تفسیرمنیر ۹/۳۱۴)

{۷۵} یعنی المؤمنین الّذین کانوا بمکۃ۔(ابن کثیر ۲/۴۰۳)

{۷۶}وماکان اللہ معذب هؤلآء الکفار وفی علم اللہ انّه یکون لهم اولاد یؤمنون باللہ ویستغفرونه فوصفوا الصفة اولادهم وذراریهم۔(کبیر ۵/۴۸۰)

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ مسجد کا متولی ہونے کیلئے کونسی صفات درکار ہیں، ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ مسجد کا متولی اور اللہ کا ولی ہونے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ان کی نسبت کا ہونا کافی ہے۔

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ یہاں عدمِ علم کی نسبت سب کی طرف نہیں کی گئی بلکہ ان کی اکثریت کی طرف کی گئی ہے اس لئے کہ ان میں ایسے بھی تھے جو اپنی جہالت اور پستی سے خوب آگاہ تھے، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم نہ تو ولایت کے حقدار ہیں اور نہ ہی تولیت کے مگر محض عناد اور اپنے سرداروں کے ڈر سے خاموش تھے {۷۷} اور اسی رخ پر چلنے پر مجبور تھے جدھر زمانے کی ہوا چل رہی تھی۔

گہری نظر سے قرآن کا مطالعہ کرنے والے حضرات جانتے ہیں کہ قرآن کسی بھی قوم کی مخالفت اور گمراہی کی وجہ سے پوری کی پوری قوم کو طعن و تشنیع کا مورد نہیں ٹھہراتا بلکہ ان میں جو حق پرست اقلیت ہوتی ہے اس کا استثناء ضرور کرتا ہے خواہ وہ یہود و نصاریٰ ہوں یا کہ مشرک اور کافر۔

﴿۳۵﴾...... جو لوگ اپنے آپ کو کعبے کا متولی اور اللہ کا ولی قرار دے رہے ہیں ان کے باطن کا حال یہ ہے کہ اس میں کفر و شرک کی نجاست بھری ہوئی ہے اور ظاہر کا حال یہ ہے کہ انہوں نے نماز کا حلیہ تک بگاڑ کر رکھ دیا ہے حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جوارِ کعبہ میں اپنی اولاد کو بسانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ وہ نماز قائم کریں گے۔

نماز ایسی عبادت ہے جو سراسر خشوع، فروتنی، عجز و نیاز، متانت اور وقار کا تقاضا کرتی ہے لیکن ان کی نماز کیا ہے؟ سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا!

کعبہ کی تولیت کے دعویداروں کا باطن تو جو تھا وہ تھا ان کا ظاہر بھی ایسا تھا کہ دین کا تھوڑا سا ذوق اور تعمیرِ کعبہ کے مقاصد جاننے والا فوراً پہچان لیتا تھا کہ یہ لوگ بیت اللہ جیسی عظیم عبادت گاہ کے متولی بننے کے ہرگز حقدار نہیں، کہاں بیت اللہ کی تولیت جیسا عظیم عہدہ اور کہاں مرد و زن کا ننگے ہو کر طواف کرنا اور تالیاں اور سیٹیاں بجانا، بعض اوقات یہ مسخرہ پن اس وقت بھی کرتے تھے جب رسولِ اکرم ﷺ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھنے لگتے تھے۔ {۷۸}

{۷۷} وفیه اشعار بانّ منهم من یعلم ذلك ولکنه یعاند۔ (ابی سعود ۹۵/۳)

{۷۸} یروی انّهم کانو إذا أراد النّبی صلی اللہ علیه وسلم ان یصلّی یخلطون علیه بالصفیر والتصفیق (روح المعانی ۲۹۴/۶)، قال مقاتل کان اذا صلّی الرسول فی المسجد یقومون عن یمینه ویساره بالتصفیر والتصفیق لیخلطوا علیه صلاته۔ (کبیر ۴۸۱/۵)

حکمت وہدایت

۱......شرک انسان کو معقولیت پسندی سے نکال کر جہالت کے اندھیروں میں لیجاتا ہے......مشرکینِ مکہ کی جہالت دیکھئے کہ قرآن کے حق ہونے کی صورت میں قبولِ حق کی توفیق کی دعا مانگنے کے بجائے عذاب کا سوال کررہے تھے۔

۲......نبی کریم ﷺ اپنی امت کے لئے حفظ وامان کا سبب ہیں، آپ کی امت پر ایسا عذاب نہیں آسکتا کہ اس کا نام ونشان مٹ جائے۔

۳......اللہ کے ہاں استغفار کی بڑی قدر و قیمت ہے، یہ انسان کو دنیا اور آخرت کے عذاب سے نجات دیتا ہے۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل مکہ کے لئے امن اور تحفظ کا سبب دو چیزیں تھیں نبی کریم ﷺ کا وجودِ مسعود اور استغفار، اللہ کے نبی دنیا سے چلے گئے مگر استغفار روزِ قیامت تک باقی ہے۔{۷۹}

۴......کسی کو اللہ کے گھر میں عبادت سے روکنا بہت بڑا جرم ہے۔

۵......اللہ کے ولی وہ ہیں جن کے اندر توکل کی صفت پائی جاتی ہے اور مسجدوں کا متولی بننے کا حق بھی انہی کو حاصل ہے، تعجب ہے کہ بعض مسلمان ایسے لوگوں کو اولیاء اللہ مانتے ہیں جن کے اندر تقوای کی صفت تو کیا ہوگی انہیں انسانوں کی طرح جینے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا، ان میں سے کسی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ موسم سے بے نیاز ننگ دھڑنگ رہتا ہے، کئی مہینوں بلکہ شاید سالوں تک غسل نہیں کرتا، گندگی کی وجہ سے اس کے سر کے بال چپک جاتے ہیں اور جوئیں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کسی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے پاس آنے والوں کو ننگی گالیاں دیتا ہے، کسی کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی بھر خیرات اور چندوں سے اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔

۶......کسی بھی عبادت خصوصاً نماز میں سنجیدگی، وقار، خشوع اور خضوع کا ہونا اور نازیبا حرکات سے بچنا اشد ضروری ہے۔

۷......ڈھول ڈھمکا، تالیاں اور سیٹیاں اور رقص وسرود مسلمانوں کے لیے زیبا نہیں ہے۔

{۷۹} قال ابن عباس: کان فیهم أمانان، نبیّ الله والاستغفار، امّا النبیّ فقد مضی واما الاستغفار فهو باق الی یوم القیامة۔(کبیر ۵/۴۸۰)

اللہ کا انتقام

﴿۳۶......۳۷﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا

بیشک جو لوگ کافر ہیں وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کی راہ سے، سو ابھی اور خرچ کرینگے

ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾

پھر آخر ہوگا وہ ان پر افسوس اور آخر مغلوب ہونگے اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے۔

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ

تاکہ جدا کردے اللہ ناپاک کو پاک سے اور رکھے ناپاک کو ایک کو ایک پر پھر اس کو ڈھیر کردے

جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اکٹھا، پھر ڈال دے اس کو دوزخ میں، وہی لوگ ہیں نقصان میں۔

تسہیل: جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ اپنے مال اس لیے خرچ کر رہے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں، خیر یہ تو خرچ کرتے ہی رہیں گے لیکن بالآخر ان کا خرچ کرنا ان کے لئے سرمایۂ حسرت بنے گا، پھر یہ مغلوب ہوجائیں گے اور کافروں کو دوزخ کی طرف ہنکایا جائے گا○ تاکہ اللہ ناپاک لوگوں کو پاک لوگوں سے جدا کردے اور ناپاکوں کو ایک دوسرے پر ڈھیر کر کے جہنم میں ڈال دے، ایسے لوگ مکمل طور پر خسارے میں ہیں○

تفسیر

﴿۳۶﴾......اس آیت کے شانِ نزول میں مفسرین نے وہ روایات نقل کی ہیں جن میں غزوۂ بدر میں المناک شکست کے بعد انتقام کے لیے مشرکین کی زوردار تیاریوں کا ذکر کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس تیاری میں انہوں نے بے پناہ مال خرچ کیا تھا بعض روایات کے مطابق بچ کر آ جانے والے تجارتی کارواں کا رأس المال اور نفع دونوں یا صرف نفع انتقام کی نذر کردیا گیا تھا۔{۸۰}

ہم اس سے قبل کئی مواقع پر عرض کر چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کی اکثر آیات بھی اپنے شانِ نزول کے ساتھ خاص نہیں، صحابہ کرام جب یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی تو ہر جگہ اس کا یہ مطلب لینا قطعا

{۸۰} المنار/۹/۵۵۱-۵۵۲

مناسب نہیں کہ پہلے یہ واقعہ پیش آیا اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، بسا اوقات آیت پہلے نازل ہو چکی ہوتی تھی اور واقعہ بعد میں پیش آتا تھا اس کے باوجود وہ فرماتے تھے کہ یہ آیت (بعد میں پیش آنے والے) اس واقعے کے بارے میں نازل ہوئی، ظاہر ہے اس صورت میں اس کے سوا کوئی مطلب ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ آیت دیگر واقعات کی طرح اس واقعہ پر بھی صادق آ رہی ہے۔ کافر ماضی کے ہوں یا حال کے یہ سب اشاعتِ اسلام کا راستہ روکنے کے لیے اپنے اموال بے دریغ خرچ کرتے رہے ہیں لیکن یہ خرچ کرنا ان کے لیے ہمیشہ باعثِ حسرت ثابت ہوا ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ سرمایۂ حسرت ہی ہوگا، آج کی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو دبانے کے لیے لاتعداد اخبارات رسائل اور کتابیں شائع کی جا رہی ہیں، سینکڑوں ویب سائٹس، ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشنز مخالفانہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اربوں کھربوں ڈالر اسلحہ کی تیاری پر خرچ کیے جا رہے ہیں، بے شمار تنخواہ دار ایجنسیاں، جماعتیں، این جی اوز اور افراد اس مذموم مہم میں شریک ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ بے تحاشا ڈالرز اور پاؤنڈز خرچ کر کے اسلام کی آواز کو جو کہ حقیقت میں فطرت کی آواز ہے، دبانے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر ان کا یہ خیال دیوانے کے خواب سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، سوچیے بھلا فطرت کی آواز اور تقاضوں کو بھی کوئی دبا سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اسلام مخالف ملکوں اور جماعتوں کے مقدر میں ذلت و رسوائی، ناکامی اور پسپائی کے سوا کچھ نہیں اس لیے کہ اللہ نے اسلام کے غلبے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ {۸۱} ”اللہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی بالآخر غالب آئیں گے“

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ دنیا میں انہیں ہزیمت، ندامت اور حسرت سے دوچار ہونا پڑے گا اور آخرت میں ان سب کو جانوروں کی طرح ہانک کر دوزخ میں گرا دیا جائے گا۔

﴿۳۷﴾...... مومنوں کے لیے اللہ کی مدد اور کافروں کے لیے ہزیمت کا فیصلہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ اللہ پاک کو ناپاک سے اور مومن کو کافر سے جدا کر دے، حق اور باطل کی کشمکش کا یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ اہلِ حق اور اہلِ باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے، اہلِ حق میں جو کمزور لوگ ہوتے ہیں وہ بھی جدا ہونے پر مجبور ہوتے ہیں اور صرف باوفا اور مخلص افراد مسلمانوں کی جماعت میں رہ جاتے ہیں۔

﴿وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ﴾ پھر آخرت میں یہ ہوگا کہ شرارت اور خباثت کے سارے علمبرداروں کو کوڑا کرکٹ کی

{۸۱} المجادلۃ/۵۸/۲۱

طرح جمع کر کے ڈھیر لگا دیا جائے گا اور پھر اس سارے ڈھیر کو دوزخ میں گرا دیا جائے گا جیسے کچرا کسی گڑھے میں گرا دیا جاتا ہے۔

ویسے دنیا میں بھی اسی انداز میں انہیں گڑھے میں گرانے کا واقعہ زمانۂ نبوت میں پیش آچکا ہے جب بدر کی جنگ کے اختتام پر مشرک سرداروں کو ایک گڑھا کھود کر اس میں ڈال دیا گیا تھا۔

بعض حضرات نے خبیث اور طیب سے مراد افراد کے بجائے مال لیا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ کفار نے جو اموال خرچ کیے تھے وہ ناپاک تھے ان کا نتیجہ بھی برا نکلا کہ مال بھی گیا اور جانیں بھی گئیں، ان کے مقابلے میں مسلمانوں نے جو مال خرچ کیا وہ اگرچہ تھوڑا تھا مگر پاک تھا اور نیک مقصد کے لیے خرچ کیا گیا تھا اس لیے اس کے خرچ کرنے والے آخرت میں اجر کے مستحق بھی ہو گئے اور دنیا میں مالِ غنیمت بھی مل گیا۔

دعوتِ استغفار اور حکمِ قتال

﴿۳۸......۴۰﴾

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ

تُو کہہ دے کافروں کو کہ اگر وہ باز آجائیں تو معاف ہو ان کو جو کچھ ہو چکا اور اگر پھر بھی وہی کرینگے

سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۸ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ

تو پڑ چکی ہے راہ اگلوں کی۔ اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۳۹ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

حکم سب اللہ کا، پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے کام کو دیکھتا ہے۔ اور اگر وہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ

مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۴۰

تمہارا حمایتی ہے کیا خوب حمایتی ہے اور کیا خوب مددگار۔

ربط: گزشتہ آیات کی طرح ان آیات میں بھی قریشِ مکہ اور متکبر نافرمانوں کا ذکر ہے لیکن اس انداز میں کہ انہیں توبہ کی ترغیب دی جائے۔

تسہیل: آپ ان کافروں سے کہہ دیجیے کہ اگر یہ کفر سے باز آجائیں تو ان کے وہ سارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں اور اگر انہوں نے اپنی پرانی حرکتیں جاری رکھیں تو پہلوں کے بارے میں جو سنتِ الٰہیہ

رہی وہی ان کے بارے میں بھی رہے گیO کفر سے باز نہ آنے کی صورت میں تم ان سے اس وقت تک جنگ کرتے رہو جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے اور سارا دین اللہ ہی کا ہو جائے اور اگر یہ باز آجائیں تو جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہےO اور اگر انہوں نے اعراض کیا تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارا کارساز ہے، وہ بہت ہی اچھا مولیٰ اور بہت ہی اچھا مددگار ہےO

تفسیر

﴿۳۸﴾......اے میرے حبیب! کافروں سے کہہ دیجیے کہ اگر وہ کفر و شرک اور ضد و عناد سے باز آجائیں تو جو گناہ اور جرائم ان سے ہو چکے وہ انہیں معاف کر دیئے جائیں گے، اس لیے کہ قبولِ اسلام ایسا عظیم عمل ہے کہ اس کی برکت سے بڑے سے بڑے گناہوں کی غلاظت لمحوں میں صاف ہو جاتی ہے۔

حضرت عمرو بن عاصی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈال دی تو میں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اپنا ہاتھ آگے بڑھائیے میں بیعت کرنا چاہتا ہوں، آپ نے دستِ مبارک بڑھایا تو میں نے ہاتھ سمیٹ لیا، آپ نے ہاتھ سمیٹنے کی وجہ دریافت کی تو میں نے عرض کیا کہ ایک شرط لگانا چاہتا ہوں، آپ نے پوچھا وہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ ''میرے گناہ معاف ہو جائیں'' آپ نے فرمایا ''اے عمرو! کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اسلام، ہجرت اور حج کی برکت سے تمام گزشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟'' {۸۲}

﴿وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ......الخ﴾ اور اگر یہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے اور ان کا سلسلہ انہوں نے جاری رکھا تو انہیں بھی اسی سنتِ الٰہیہ کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے پہلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں اور سنتِ الٰہیہ یہ ہے کہ جس قوم میں اللہ کا رسول آجائے اس قوم پر حجت تام ہو جاتی ہے، اگر وہ قوم پھر بھی انکار اور سرکشی کی روش پر قائم رہے تو اسے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ قومِ عاد و ثمود، مدین اور قومِ لوط کے انجام سے سارے ہی اہلِ عرب واقف تھے کہ جب انہوں نے اللہ کے نبیوں کو جھٹلایا تو انہیں عذاب سے کوئی چیز نہ بچا سکی، نہ ان کی مادی قوت و طاقت، نہ افراد کی کثرت، نہ ظاہری وسائل و اسباب اور نہ ہی مضبوط قلعے اور محلات۔

﴿۳۹﴾......اگر یہ اپنی حرکتوں کا سلسلہ جاری رکھیں تو تم ان سے اس وقت تک جنگ کرتے رہو جب تک کہ فتنہ ختم نہ

{۸۲} مسلم/۱۲۱

ہوجائے، سرزمینِ حرم پر نہ تو اللہ کے سوا کسی کی عبادت ہو اور نہ ہی کسی کے اندر اتنی جرات ہو کہ وہ اہلِ ایمان کو دینِ اسلام کے قبول کرنے اور اس پر عمل سے روک سکے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر اللہ کی عبادت کے لیے ہوئی تھی، یہاں یہ برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا کہ خدا پرستوں کو تو معبودِ حقیقی کے سامنے سر جھکانے کی بھی اجازت نہ دی جائے اور بتوں کے پجاری اس مقدس گھر کے متولی بن کر بیٹھ جائیں، اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس وقت تک جنگ کرتے رہیں جب تک سرزمینِ حرم سے دینِ اسلام کے سوا ہر دین کا خاتمہ نہ ہوجائے۔

نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے، آپ نے فرمایا:

﴿لایبقینَّ دینان بأرض العرب﴾{۸۳} ''جزیرۃ العرب میں دو دین جمع نہیں ہوسکتے''

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے ''فتنہ'' سے مراد شرک {۸۴} لیا ہے، عام مفسرین نے یہی قول اختیار کیا ہے، اس تفسیر کے مطابق یہ حکم صرف اہلِ عرب کے لیے ہے، پوری دنیا میں اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب کو برداشت کیا جاسکتا ہے مگر جزیرۃ العرب جو کہ مرکزِ اسلام ہے وہاں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب قابلِ قبول نہیں۔{۸۵}

گویا حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک فتنہ ختم ہوجانے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ یہ دونوں تفسیریں صحیح ہیں، صحابہ اور مفسرین کے درمیان اس قسم کے اختلاف کو اختلافِ تنوع کہا جاتا ہے، یہ اختلافِ تضاد نہیں ہے کہ دونوں کو مراد لینا ممکن ہی نہ ہو۔

یہ حقیقت تو قرآنِ کریم کا ہر قاری جانتا ہے کہ جہاد و قتال کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ کفار کو ایمان قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اس لیے کہ قرآنِ کریم میں واشگاف الفاظ میں صراحت کردی گئی ہے ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ {۸۶} ''دین میں جبر نہیں ہے'' ویسے بھی ایمان کا تعلق دل سے ہے اور دل پر کسی کا زور اور اختیار نہیں چل سکتا، تلوار سے کسی کے جسم کو تو جھکایا جاسکتا ہے مگر دل کو نہیں۔

مسلمانوں سے جنگ کے بعد کفار کے سامنے دو ہی راستے ہیں ایک تو یہ کہ وہ اسلام قبول کرلیں دوسرا یہ کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے فتنہ و شرارت سے باز آجائیں اور قبولِ اسلام کی صورت میں کسی کو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنائیں ان دونوں صورتوں میں مسلمانوں کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ بھی اپنی تلوار نیام میں ڈال لیں۔

{۸۳} موطا، مدینۃ/۱۷

{۸۴} وروی عن ابن عباس تفسیر الفتنۃ بالشرک/المنار/۹/۵۵۵

{۸۵} المراد ''ویکون الدین کلہ للہ'' فی ارض مکۃ وماحوالیھا۔(کبیر/۵/۴۸۴)

{۸۶} البقرۃ/۲/۲۵۶

﴿فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ کسی کے ذہن میں یہ اشکال آ سکتا تھا کہ ممکن ہے کفار کی جانب سے صلح کا معاہدہ یا قبولِ اسلام کا اعلان دھوکہ دہی پر مبنی ہو تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ تم صرف ظاہری اعمال کے پابند ہو، دلوں کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں کسی بھی قوم نے ظاہری صورت پر اتنا اعتبار نہیں کیا جتنا مسلمانوں نے کیا، جب بھی کسی فرد یا جماعت نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا مسلمانوں نے اسے اپنی برادری کا حصہ بنا لیا، کلمہ طیبہ کے الفاظ سنتے ہی اٹھی ہوئی تلواریں جھک گئیں اور بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ظاہری اعتماد ان کے لیے عام طور پر کسی بڑی ابتلاء کا سبب نہیں بنا۔

﴿۴۰﴾ ——— اور اگر نہ تو وہ اسلام قبول کریں نہ ہی پُر امن طریقے سے رہنے پر آمادہ ہوں تو پھر مسلمانوں کو غفلت کی نیند سونے کے بجائے جہاد و قتال کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے، اگر وہ یہ سلسلہ جاری رکھیں گے تو یقیناً انہیں اللہ کی نصرت حاصل ہوگی۔

نصرتِ خداوندی کے حقدار مؤمنین صادقین ہیں

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ کی نصرت کا وعدہ مجاہدوں اور سراپا عمل انسانوں کے لیے ہے، مجاوروں اور نکموں کے لیے نہیں، آیاتِ نصرت کے پڑھنے اور سننے سے بعض سادہ لوح دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ کریں یا نہ کریں، بہر حال اللہ کی نصرت کے حقدار ہیں، بالخصوص ہمارے زمانے کے مسلمانوں کا حال تو بڑا عجیب ہے، ان کے گھر اور بازار، دکانیں اور مارکیٹیں، مسجدیں اور خانقاہیں، مدرسے اور کالج کفار کی مصنوعات، ملبوسات، ماکولات، مشروبات اور عطریات وغیرہ سے بھری پڑی ہیں، ان کی فوجیں تماشائی قسم کی جنگی مشقوں، اپنے شہریوں پر مشقِ ستم ڈھانے اور اپنے فرمانرواؤں کی حفاظت کے سوا کوئی کام نہیں کرتیں، انہوں نے اپنے قیمتی ساحل اور فوجی اڈے کفار کے حوالے کر رکھے ہیں، ان کا خوشحال طبقہ یہود و نصاریٰ کی چاپلوسی میں خاص قسم کی طمانیت محسوس کرتا ہے، ان کے امراء اور با اثر افراد گرین کارڈ وغیرہ کے لئے بے چین رہتے ہیں، ان کے بچے اور بچیاں امریکہ اور برطانیہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کی معیشت اور معاشرت پر کفر کے گہرے اثرات ہر آنکھ والے کو دکھائی دیتے ہیں، احساسِ کمتری کی وجہ سے وہ انگریزوں کے لب و لہجے میں بات کرنا اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتے ہیں، اگر کسی مغربی ملک کا صدر یا نائب صدر بلکہ نائب کا بھی نائب اسلامی ملک کے دورے پر آ جائے تو اس کے کرتا دھرتا بچھ بچھ جاتے ہیں پھر جب وہ مسجد میں یا حرم میں جمع ہوتے ہیں تو ہاتھ دراز کر کے دعائیں کرتے ہیں "اے اللہ! تو کفار کو

نیست و نابود کردے، ان کے قدموں میں لغزش پیدا کردے، ان کی جمعیت کو منتشر کردے، ان کے شہروں کو ویرانوں میں بدل دے" ہائے! کیسے کہا جائے عین اس دعا کے وقت بھی ان کے سر پر جاپان کا رومال، جسم پر برطانیہ کا جبہ، ہاتھ میں جاپان کی گھڑی اور زمین پر چین کا قالین بچھا ہوتا ہے، ان کے جسم سے فرانس کے پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہوتی ہے اور ان کا بیٹ کے ائیر کنڈیشنر اور پیپسی سے بھرا ہوتا ہے۔

اللہ کے مولیٰ اور نصیر ہونے میں ہرگز شک نہیں، شک ہے تو اس بارے میں کہ ہم ولایت اور نصرت کے حقدار بھی ہیں یا نہیں؟

حکمت و ہدایت:

۱۔۔۔اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کا دروازہ ہر وقت اور ہر کسی کیلئے کھلا ہے (۳۸)

۲۔۔۔اسلام کے اندر اللہ نے ایسی تاثیر رکھی ہے کہ اس کی برکت سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں (۳۸)

۳۔۔۔جس قوم میں پیغمبر آجائے اس پر حجت قائم ہو جاتی ہے، اسے ایمان کے علاوہ کوئی چیز عذاب سے نہیں بچا سکتی (۳۸)

۴۔۔۔اللہ کی سنت یہ ہے کہ ظالموں کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوتا اگرچہ انہیں کتنی طویل مہلت ہی کیوں نہ مل جائے (۳۸)

۵۔۔۔فتنہ کے خاتمہ کے لئے مسلمانوں پر قتال واجب ہے (۳۹) ان کا آپس میں لڑنا فتنے سے کم نہیں۔

۶۔۔۔جب تک دنیا میں شرک اور مشرک موجود ہیں اہل ایمان پر جہاد واجب ہے۔

۷۔۔۔اللہ تعالیٰ ہر اس فرد اور جماعت کا ولی اور مددگار ہے جو واقعی اس سے دوستی لگائے اور اس کے دین کی مدد کرے (۴۰)

تقسیمِ غنیمت

﴿۴۱﴾

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور

وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا

اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے، اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم

یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾

نے اتاری اپنے بندے پر فیصلہ کے دن جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ربط: اس سورت کا آغاز مالِ غنیمت کی تقسیم سے متعلق لوگوں کے سوال سے ہوا تھا اس کے بعد دوسرے مضامین کے علاوہ غزوۂ بدر کا بھی ذکر ہوا، اب دوبارہ اموالِ غنیمت اور جنگِ بدر کا مضمون بیان ہو رہا ہے۔

تسہیل: جان لو کہ تمہیں کفار سے جو چیز بھی مالِ غنیمت کے طور پر حاصل ہو اس کا پانچواں حصّہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور آپ کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتاری جس دن مومنوں اور کافروں کی جماعتیں آپس میں ٹکرائی تھیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (۴۱)

﴿تفسیر﴾

﴿۴۱﴾......غنیمت کا اطلاق اس مال پر ہوتا ہے جو دشمن سے بذریعہ جنگ حاصل ہو اور جو مال صلح اور رضامندی سے حاصل ہو جائے اسے ''فئی'' کہتے ہیں {۸۷} مالِ غنیمت اور مالِ فئی ہو یا کہ پوری کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے بارے میں قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ اس کا حقیقی مالک صرف اللہ ہے، مالکِ حقیقی اپنے پیغمبر علیہ السلام کے ذریعے فیصلہ فرماتا ہے کہ بندوں کے درمیان مال و دولت کیسے تقسیم کیا جائے، اسی لئے سورت کے آغاز میں بھی مال غنیمت کے بارے میں کئے گئے سوال کے جواب میں فرمایا گیا ''الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ'' (مالِ غنیمت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے) اور یہاں بھی ''لِلّٰهِ'' کا جلی عنوان اختیار کیا گیا ہے، یہ عنوان اختیار کر کے مجاہدین کو بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ تم

{۸۷} الغنیمة ما اصاب المسلمون منهم عنوة بقتال والفئی ما کان عن صلح بغیر قتال (المنار/ ۱۰/ ۵)

اپنے آپ کو مالِ غنیمت کا مالک نہیں سمجھتا اس کا حقیقی مالک تو اللہ ہے۔

مالِ غنیمت جہاد و قتال کا معاوضہ نہیں ہوتا اور نہ ہی جہاد کا مقصود ہوتا ہے، یہ تو ایک ضمنی اور زائد فائدہ ہوتا ہے جو حاصل ہو جائے تو فبھا ورنہ سچا مجاہد اس کے بارے میں سوچتا بھی نہیں، جہاد کا اصل مقصد رضاءِ الٰہی کا حصول اور اللہ کے دین کی سربلندی ہوتا ہے، اسلام نے یہ تصور دے کر زمانۂ جاہلیت کی اس غلط سوچ کی اصلاح کر دی ہے جس کے مطابق اہلِ عرب دشمن کے مال پر قبضے ہی کو جنگ کا حاصل اور مقصد سمجھتے تھے، اسلام نے اس غلط تصور کی اصلاح کے ساتھ ساتھ مالِ غنیمت میں بلا اجازت تصرف اور ذرا سی خیانت کو بھی بہت بڑا جرم قرار دیا اور اسے ''غلول'' کا نام دے کر اس پر شدید وعید فرمائی، یہ اسی اصلاح کا نتیجہ تھا کہ مجاہدین کا دامن ایسے مواقع پر بھی خیانت سے پاک رہتا تھا جب کوئی انسانی آنکھ ان کی نگرانی نہیں کر رہی ہوتی تھی۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ عربی لغت کے قواعد پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ''ما'' اور ''من شئی'' ان دو لفظوں کے لانے سے عموم پیدا ہو گیا اور میدانِ جنگ سے ملنے والی ہر چھوٹی بڑی چیز کے بارے میں یہ حکم ثابت ہو گیا کہ تقسیم سے پہلے اسے چھیڑنا جائز نہیں اگرچہ وہ سوئی اور اس کا دھاگہ ہی کیوں نہ ہو ''فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ'' قرآن کریم نے جاہلی تصورات اور معاملات میں اصلاح کا جو عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو جنگیں ہوتی تھیں ان کا مقصد ہی زر، زمین، شہرت اور عزت کے حصول کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا، جنگ کی کامیابی اور ناکامی کا اندازہ لوٹ کے مال کی قلت اور کثرت سے لگایا جاتا تھا، پھر یہ کہ جو مال بھی ہاتھ لگتا اس کا چوتھائی حصہ قبیلہ کے سردار کی ذاتی ملکیت میں چلا جاتا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ جنگ کا مقصد بدل دیا، پھر جہاد کے کچھ اصول وضع کیے جن کی خلاف ورزی کی کوئی مجاہد جرأت نہیں کر سکتا تھا، باقی رہا مالِ غنیمت تو اس کے بارے میں اصولی بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ یہ اللہ کی ملکیت ہے اور اس کی تقسیم میں یہ طے کر دیا کہ پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہوگا، پانچویں حصے کی تفصیل میں بتا دیا کہ اسے کون سے مصارف میں استعمال کیا جائے گا، ان مصارف میں سب سے پہلے اللہ کا حق ہے، ظاہر ہے اللہ ہر چیز سے بے نیاز ہے، اسے کسی بھی چیز کی حاجت نہیں...... اہلِ علم کہتے ہیں کہ ''اللہ کے حق'' سے مراد یہ ہے کہ اس ''خمس'' میں سے کچھ مال اشاعتِ اسلام، تعمیر کعبہ، دفاعِ امت وغیرہ جیسی دینی مصلحتوں کے لئے بھی خرچ کیا جائے گا۔ {۸۸} اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اللہ کا ذکر محض تعظیم اور برکت کیلئے ہے۔ {۸۹} یہ مصارف میں

{۸۸} أي صرف فيما يرضيه من مصالح الدين العامة كالدعوة الى الاسلام و عمارة الكعبة و كسوتها واقامة شعائره تعالىٰ (المنار/۱۰/۷)

{۸۹} والجمهور على ان ذكر الله تعالىٰ للتعظيم (ابی سعود/۳/۹۸)

بھی شامل نہیں ہے۔

﴿وَلِلرَّسُوْلِ﴾ غنیمت کے خمس میں رسول اللہ ﷺ کا جو حق تھا اس میں سے آپ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا نفقہ ادا فرماتے تھے اور چونکہ آپ کا حق منصب رسالت کی بناء پر تھا اس لئے آپ کی وفات کے بعد یہ حصہ خود بخود ختم ہوگیا۔{۹۰} جبکہ علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ آپ کو جو کچھ ملتا تھا وہ منصب رسالت کی بناء پر نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے ملتا تھا لہٰذا آپ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہوگا وہ اس حصے کا حقدار ہوگا۔{۹۱}

﴿وَلِذِی الْقُرْبٰی﴾ تیسرا حق نبی کریم ﷺ کے قرابت داروں یعنی بنو ہاشم اور بنو مطلب کا ہے۔{۹۲} تو یہ مکمل طور پر محروم رہ جائیں گے جبکہ دوسرے مستحق مسلمانوں کے ساتھ زکوٰۃ صدقہ وغیرہ مختلف مدات سے تعاون کیا جائے گا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب میں خمس کا ایک حصہ تقسیم کرتے ہوئے فرمایا:

﴿انهم لم یفارقونی فی جاهلیة و لا اسلام انما بنو هاشم و بنو المطلب شئی واحد و شبک بین أصابعه۔﴾{۹۳}

"نہ انہوں (بنو ہاشم اور بنو مطلب) نے جاہلیت میں میرا ساتھ چھوڑا اور نہ ہی اسلام میں، بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک ہی چیز ہیں، یہ فرماتے ہوئے آپ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کردیں"

یہی وہ باوفا لوگ تھے جنہوں نے قریش کے بائیکاٹ کے بعد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیا تھا اور "شعب ابی طالب" میں تین سال تک محصور رہے تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد ان کا حصہ بھی ساقط ہوگیا، اب انہیں فقر اور غربت کی وجہ سے تو دیا جاسکتا ہے مگر محض قرابت کی وجہ سے انہیں مالِ غنیمت میں سے کچھ نہیں ملے گا، گویا اب خمس کے مصارف میں صرف یتامیٰ، مساکین اور مسافر ہی رہ گئے ہیں۔{۹۴}

{۹۰} ولما بعد وفاته علیه الصلاة والسلام فسقط سهمه (روح المعانی/الجزء العاشر ۶/۵)

{۹۱} وقیل سهم الرسول لولی الامر بعده۔(ابو السعود/۳/۹۸)

{۹۲} المرید بهم بنو هاشم و بنو المطلب /روح المعانی/جلد۶/الجزء العاشر/۴، سهم لذوی القربی من بنی هاشم وبنی المطلب /الکشاف/۲/۲۰۹)

{۹۳} العاشر/۶/۴

{۹۴} فیقسم علی الیتامٰی والمساکین وابن السبیل (کبیر/۵/۴۸۵)

البتہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ جو فقراء وغرباء سرورِ دوعالم ﷺ کے ساتھ قرابت بھی رکھتے ہوں وہ دوسرے مصارف سے مقدم ہوں گے۔

﴿وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ چوتھائی حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کی معاشی ضروریات کی فراہمی اسلامی حکومت کے کارپردازوں کے ذمہ ہے اور اگر اسلامی حکومت نہ ہو تو امت کے خوشحال طبقہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ غریب اور ضرورت مند مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھیں۔

دو سوال:

یہاں ایک سوال تو یہ اٹھایا گیا ہے کہ پورے مالِ غنیمت میں سے خمس (پانچویں حصے) کے مصارف تو معلوم ہو گئے بقیہ چار حصے کہاں خرچ کیے جائیں گے؟

اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جب پانچویں حصے کے مصرف بتا دیئے گئے تو بقیہ چار حصوں کے بارے میں خود ہی یہ ثابت ہو گیا کہ وہ مجاہدین میں تقسیم ہوں گے۔{۹۵} یہ ایسے ہی ہے جیسے وراثت کی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا "وَوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ"{۹۶} یعنی جب کسی شخص کے وارث اس کے ماں باپ ہوں تو ماں کا تیسرا حصہ ہے، یہاں ماں کا حصہ بتایا گیا جس سے معلوم ہوا کہ بقیہ دو حصے والد کے ہوں گے۔ دوسرا سوال یہ کیا گیا کہ خمس کے جو مصارف ذکر کیے گئے ہیں کیا ان سب مصارف میں برابر تقسیم کرنا حضورِ اکرم ﷺ کے ذمہ لازم تھا؟

جمہور علماء کہتے ہیں کہ ان سب مصارف میں برابر تقسیم کرنا آپ کے ذمہ لازم نہیں تھا بلکہ صرف اتنا ضروری تھا کہ ان پانچ قسموں کے اندر رہتے ہوئے ان سب کو یا بعض کو اپنی صوابدید کے مطابق عطا فرمائیں، اس دعویٰ پر سیرتِ نبویہ سے کئی دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن سرِدست ہم اس روایت کے نقل پر اکتفا کرتے ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ حنین کی جنگ کے اختتام پر جب نبی کریم ﷺ نے مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو آپ نے عرب کے بعض سرداروں کو تقدیم الاسلام مجاہدین کے مقابلے میں زیادہ دیا، مثلاً اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو سو سو اونٹ عنایت فرمائے جس کی وجہ سے بعض نوجوانوں میں سرگوشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ایک شخص نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اللہ کی قسم اس تقسیم میں عدل نہیں کیا گیا یا یہ کہا کہ اس تقسیم میں اللہ کی رضا کو مدِنظر نہیں رکھا گیا، میں نے سنتے ہی قسم کھائی کہ نبی اکرم ﷺ کو ضرور خبر دوں گا، جب میں نے آپ کو بتایا تو آپ نے

{۹۵} قرطبی ۸/۷

{۹۶} النساء ۴/۱۱

فرمایا اللہ میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے انہیں مجھ سے زیادہ ستایا گیا مگر انہوں نے صبر کیا۔{۹۷} جیسے حضورِ اکرم ﷺ کو جملہ مصارف میں اپنی صوابدید کے مطابق تقسیم کرنے کا اختیار تھا یونہی آپ کے جانشین اور امیر المومنین کو بھی یہ اختیار حاصل ہوگا۔{۹۸}

﴿إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ﴾ اگر تم دل سے اللہ پر اور اس نصرت پر ایمان رکھتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن اپنے بندے پر اتاری تو پھر اس حکم کی بلا چوں و چرا تعمیل کرو جو تمہیں غنیمت کی تقسیم کے بارے میں دیا گیا ہے، جس شخص کو آسمانی حکم سننے کے بعد بھی اطمینان نہیں ہوتا اور وہ نکتہ چینی سے باز نہیں آتا تو اس کا یہ طرزِ عمل اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں ابھی تک ایمان راسخ نہیں ہوا۔

﴿يَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ فرقان کا معنی ہے فرق کرنے والی چیز، یہاں اس سے مراد غزوۂ بدر ہے، اس غزوہ کو "یوم الفرقان" سے اس لئے تعبیر کیا گیا کیونکہ اس کے نتائج نے حق اور باطل کے درمیان واضح فرق کر دیا تھا، ایک تو اللہ کی اس غیبی مدد کی وجہ سے جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی اور جسے ہر شخص نے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

دوسرے اس لئے کہ قریش کے لیڈروں نے خود ہی اس جنگ میں فتح اور شکست کو حق اور باطل کا معیار قرار دے دیا تھا، ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ انہوں نے غلافِ کعبہ پکڑ کر بھی اور میدانِ بدر میں بھی چلا چلا کر دعا کی تھی:

﴿اللهم انصر اعلى الجندين وأهدى الفئتين، وأكرم الحزبين و أفضل الدينين﴾{۹۹}

"اے اللہ دونوں لشکروں میں سے جو اعلیٰ ہے، دونوں جماعتوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہے، دونوں گروہوں میں سے جو معزز ہے اور دونوں دینوں میں سے جو افضل ہے اس کی مدد فرما"

اور کہنا چاہئے کہ قریش کی یہ دعا من وعن قبول ہوگئی۔

حکمت وہدایت:

۱......مالِ غنیمت ہو یا کوئی دوسری چیز سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے(۴۱)

۲......جہاد کا مقصد مالِ غنیمت کا حصول نہیں ہوتا بلکہ مقصدِ حقیقی اللہ کے حکم کی سربلندی ہوتا ہے۔

{۹۷} احکام القرآن لابنِ عربی ۲/۸۴۶

{۹۸} الامر فی الخمس مفوّض الی رأی الامام (کبیر/۵/۴۸۵)

{۹۹} تقدم تخریجه فی تفسیر آیت ۱۹

۳......مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے اس میں کسی بھی قسم کا تصرف کرنے کو غلول کہتے ہیں جو کہ خیانت کی بدترین صورت ہے۔

۴......سادات کے لئے صدقات تو حرام ہیں مگر مالِ غنیمت کے خمس میں سے کچھ ان کے لئے مخصوص کرنا ضروری ہے۔

۵......خمس کے مصارف میں برابر تقسیم کرنا ضروری نہیں بلکہ اس میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔

۶......ایمان کی وجہ سے انسان کے اندر ایسی قوت پیدا ہوتی ہے جو اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کرتی ہے (۴۱)

غزوۂ بدر میں اللہ کی غیبی تائید

﴿۴۲......۴۴﴾

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ

جس وقت تم تھے درلے کنارہ پر اور وہ پرلے کنارہ پر اور قافلہ نیچے اتر گیا تھا تم سے اور اگر تم آپس میں وعدہ

وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ

کرتے تو نہ پہنچتے وعدہ پر ایک ساتھ لیکن اللہ کو ڈالنا تھا ایک کام کو جو مقرر ہو چکا تھا تا کہ مرے جس کو مرنا ہے

مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٤٢﴾ إِذْ يُرِيكَهُمُ

قیامِ حجت کے بعد اور جیوے جس کو جینا ہے قیامِ حجت کے بعد اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ

جب اللہ نے وہ کافر دکھلائے تجھ کو تیری خواب میں تھوڑے اور اگر تجھ کو بہت دکھلا دیتا تو تم لوگ نامردی کرتے

وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٣﴾ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ

اور جھگڑا ڈالتے کام میں لیکن اللہ نے بچا لیا، اس کو خوب معلوم ہے جو بات ہے دلوں میں۔ اور جب تم کو دکھلائی وہ فوج

فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ

مقابلہ کے وقت تمہاری آنکھوں میں تھوڑی اور تم کو تھوڑا دکھلایا ان کی آنکھوں میں تا کہ کر ڈالے اللہ ایک کام جو مقرر ہو چکا تھا

تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٤٤﴾

اور اللہ تک پہنچتا ہے ہر کام۔

تسہیل: یاد کرو جب تم وادی کے قریب والے کنارے پر تھے اور کفار کا لشکر دور والے کنارے پر تھا اور تجارتی قافلہ تم

سے نیچے کی طرف تھا اور اگر تم اور تمہارے دشمن آپس میں لڑائی کی کوئی تاریخ طے کر لیتے تو وقتِ مقررہ پر پہنچنے میں تم میں ضرور اختلاف ہو جاتا، لیکن اللہ نے اس کی نوبت آنے ہی نہ دی تاکہ اللہ اس چیز کا فیصلہ فرما دے جس کا ہونا طے ہو چکا تھا تاکہ جسے برباد ہونا ہے وہ حجت دیکھنے کے بعد برباد ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے، بے شک اللہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے O یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے خواب میں آپ کو وہ لوگ کم دکھائے اور اگر زیادہ دکھا دیتا تو تم ہمت ہار جاتے اور دشمن سے جنگ کے بارے میں اختلاف کا شکار ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں بچا لیا، بے شک وہ دلوں کے حال سے باخبر ہے O اور وہ لمحات بھی یاد کرو جب ٹکراؤ کے وقت اللہ نے انہیں تمہاری نظروں میں اور تمہیں ان کی نظروں میں کم کر کے دکھایا تاکہ وہ کام ہو ہی جائے جس کا ہونا اللہ کے ہاں طے ہو چکا تھا اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۴۲﴾......گزشتہ صفحات میں تفصیل سے غزوۂ بدر کا ذکر آ چکا ہے، قرآنِ کریم چونکہ قصے کہانیوں کی نہیں بلکہ عبرت و نصیحت اور حکمت و ہدایت کی کتاب ہے اس لئے کسی بھی واقعہ کو تاریخی انداز میں تمام جزئیات کے ساتھ یکجا ذکر کرنے کے بجائے حسبِ موقع جھلکیوں کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے، یہ جھلکیاں ایسی ہوتی ہیں جو تعصب سے پاک دلوں اور دماغوں میں اترتی جاتی ہیں اور اپنے قاری کے ایمان میں اضافہ کرتی جاتی ہیں، ذرا اِسی جھلکی کو ملاحظہ فرمائیے جس کی طرف مذکورہ بالا آیات میں اشارہ ہے، صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کا لشکر وادی کے اس جانب تھا جو مدینہ کے قریب تھی اور مشرکین کا لشکر اس جانب تھا جو مدینہ سے دور تھی اور تجارتی قافلہ نیچے ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا، عام طور پر تو یہی کہا جاتا ہے کہ قریش کا تجارتی کاروان پہنچنے سے پہلے ہی مسلمانوں کا لشکر اس کا راستہ روکنے کے لئے بدر پہنچ چکا تھا اور ان کی موجودگی کا علم ہونے کے بعد ہی ابوسفیان نے ضمضم نامی قاصد کو مکہ روانہ کیا تھا مگر غزوات کے بارے میں تحقیق کرنے والے بعض جنگی ماہرین اس قول کو حقیقت سے دور قرار دیتے ہیں اس لئے کہ ''ضمضم'' اگر بدر سے روانہ کیا گیا ہوتا تو اسے بدر سے مکہ تک کے دو سو میل کے فاصلہ کو طے کرنے کیلئے کم از کم چار دن درکار تھے، چار دن اہلِ مکہ کو بنو بکر کے ساتھ مذاکرات میں صرف کرنے پڑے، انہوں نے کم از کم دو دن تیاریوں میں صرف کئے ہوں گے، تمام روایات متفق ہیں کہ مکی لشکر کو مکہ سے بدر تک دس دن لگے تھے، ان تمام کا حاصل بیس دن ہے، اگر مدنی لشکر ضمضم کی روانگی سے قبل ہی بدر میں موجود تھا تو پھر اس کے وہاں پر بیس دن رکے رہنے کا کیا سبب تھا؟ کہا گیا ہے

کہ مکی قافلہ راستہ بدل کر اور سمندر کے قریب سے ہو کر مکہ کی طرف بڑھ گیا تھا اور پھر آگے جا کر مکی لشکر کو اطلاع دی تھی کہ ان کے بدر جانے کی ضرورت نہیں، ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کے مطابق قافلہ وہیں نیچے قریب ہی موجود تھا۔ بدر سے ساحلِ سمندر بمشکل پندرہ میل ہے، ساحل کے ساتھ دو تین میل اونٹوں کے گزرنے کے لئے موزوں نہیں اگر قافلہ راستہ بدل بھی لیتا تو اصل راستہ سے بارہ میل سے زیادہ دور نہ جا سکتا تھا۔ قافلوں کی رفتار سست ہوتی ہے بارہ میل کا فاصلہ زیادہ نہ تھا، مدنی لشکر اس پر آسانی سے حملہ آور ہو سکتا تھا، اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جب مکی قافلہ بدر کے قریب سے گزرا تو اس وقت تک مدنی لشکر وہاں نہیں پہنچا تھا، ابوسفیان نے جو اونٹ کی لید اور اس میں مدینہ کا چارہ دیکھا تھا وہ لید اس گشت کے اونٹوں کی ہوگی جو حضور ﷺ نے اطلاع حاصل کرنے کے لئے چند روز پیشتر روانہ کئے تھے، ابوسفیان نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ وہاں پر لشکر کے ستّر اسّی اونٹوں کا کوئی ثبوت نہ تھا اور یہ کہ وہاں ایک دو اونٹ ہی آئے تھے اس لئے وہ قریب ہی پڑاؤ ڈال کر رک گیا تا کہ مکی لشکر کے آنے پر اس میں شامل ہو جائے، ایک روایت کے مطابق وہ لڑائی میں شامل تھا اور زخمی بھی ہوا تھا{۱۰۰} اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش نے ضمضم کے آنے اور واویلا کرنے پر ہی جنگ کی تیاری نہیں کی تھی بلکہ تجارتی کارواں کا شام روانہ ہونا اور ضمضم کا مکہ کے بازاروں میں برہنہ ہو کر حملے کی اطلاع دینا اور پھر مکی سورماؤں کا بدر کی جانب کوچ کرنا یہ سب اس جنگی منصوبے کی جزئیات تھیں جو قریشی سرداروں نے انتہائی سوچ بچار کے بعد ابوسفیان کی شام روانگی سے قبل ہی تیار کر لیا تھا۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

بہر حال حقیقت جو بھی ہو نفسِ واقعہ اس سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ ہی بدر میں مسلمانوں کو آسمانی نصرت کے حصول کی اہمیت و عظمت میں کوئی فرق پڑتا ہے۔

بدر میں مسلمانوں کا پڑاؤ ریتیلی جگہ پر تھا، ان کی تعداد بھی دشمن کے مقابلے میں کم تھی، اسلحہ اور سامانِ خورد و نوش کی بھی قلت تھی، سواریاں نہ ہونے کے برابر تھیں، کفار کا لشکر مادی اعتبار سے بہر صورت مسلمانوں پر فوقیت رکھتا تھا پھر یہ کہ وہ مسلمانوں کی افرادی قوت اور وسائل کو سامنے رکھ کر پوری تیاری کے ساتھ بدر میں آئے تھے جبکہ مسلمان زیادہ سے زیادہ چالیس افراد پر مشتمل ایک تجارتی کاروان کے تعاقب میں نکلے تھے اور اچانک مڈبھیڑ ہوگئی ایک ہزار جنگجوؤں کے لشکر سے۔

{۱۰۰} (غزوات رسول بریگیڈیر گلزار احمد) بریگیڈیر صاحب نے تحقیق کے بعد جو رائے پیش کی ہے اس کے تعلیم کرنے یا اس کی نفی کرنے پر کسی عقیدے یا عبادت کا انحصار نہیں ہے اس لیے اسے پیش کرنے یا اس میں غور کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (۴-۱-ش)

یہ واقعہ بظاہر تو اتفاقی طور پر پیش آیا تھا لیکن اس کائنات میں جتنے بھی اتفاقات وقوع پذیر ہوتے ہیں خالقِ کائنات کی نظر میں وہ اتفاقات نہیں ہوتے بلکہ ان کی تدبیر اور منصوبہ بندی بہت پہلے کی جا چکی ہوتی ہے اور ان میں جو حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں انسانی عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس واقعہ کو لے لیجئے جو میدانِ بدر میں اتفاقاً پیش آ گیا تھا، اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ غیر ارادی طور پر پیش نہ آتا بلکہ دونوں فریقوں نے خوب غور و فکر کے بعد اس کی تاریخ متعین کی ہوتی تو ممکن تھا کہ یہ واقعہ پیش ہی نہ آتا ﴿وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعٰدِ﴾ ''اور اگر تم اور تمہارے دشمن آپس میں لڑائی کی کوئی تاریخ طے کر لیتے تو وقتِ مقرر پر پہنچنے میں تم میں ضرور اختلاف ہو جاتا'' جبکہ باری تعالیٰ اسلام اور اہلِ اسلام کی عزت و نصرت اور شرک اور اہلِ شرک کی ذلت و رسوائی کے لیے اس معرکہ کا فیصلہ فرما چکے تھے، اس جنگ کے نتائج سے ہر کسی نے جان لیا کہ اللہ کی مدد مسلمانوں کے ساتھ ہے کہاں کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا مسلح لشکر اور کہاں تین سو تیرہ کہ جن کے پاس صرف ایک گھوڑا، اسّی اونٹ اور چند تلواریں تھیں۔

اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ کرشمہ اس لئے دکھایا تاکہ اسلام کے حق ہونے اور کفر و شرک کے باطل اور مردود ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہ جائے تاکہ جسے ہلاک اور تباہ ہونا ہے وہ حجت دیکھنے کے بعد ہلاک ہو، اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھنے کے بعد زندگی حاصل کرے، اس آیتِ کریمہ میں ''ہلاکت'' سے مراد کفر اور ''زندگی'' سے مراد ایمان ہے{۱۰۱} اہلِ ایمان کی غیبی نصرت اور معجزانہ فتح دیکھنے کے بعد مشرکین، اللہ کے حضور اپنے کفر و انکار پر کوئی عذر پیش نہیں کر سکیں گے اور سر کی آنکھوں سے حسی دلیل دیکھنے کے بعد مسلمانوں کے ایمان میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

﴿وَإِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ اللہ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے اقوال سنتا اور ان کے عقائد و اعمال جانتا ہے، اس پر کسی فریق کی کوئی چیز مخفی نہیں ہے، وہ ہر کسی کو اپنے علم و سمع کے مطابق جزا دیتا ہے۔

﴿۴۳﴾......اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے ایک خصوصی انعام کا ذکر ہے وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے مشرکین کو خواب میں دیکھا کہ ان کی تعداد بہت کم ہے، آپ نے اس بارے میں مسلمانوں کو بتایا تو ان کے دل مطمئن ہو گئے اور ان کے دل میں مشرکوں پر غالب آنے کی امید پیدا ہو گئی۔

﴿وَلَوْ أَرٰىكَهُمْ كَثِيرًا﴾ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں کفار زیادہ دکھا دیئے جاتے تو ممکن تھا کہ تم ہمت ہار جاتے

{۱۰۱} لیصدر کفر من کفر و ایمان من اٰمن عن وضوح بینة علی استعارة الهلاك والحیاة للكفر و الایمان (ابی سعود/۳/۱۰۰، استعارة الهلاك والحیاة للكفر والایمان/تفسیر منیر/۱۰/۱۷)

اوران کے ساتھ جنگ کے بارے میں اختلاف کا شکار ہو جاتے اس لئے کہ مسلمانوں کی جماعت میں کچھ لوگ ضعیف الایمان بھی تھے، بسا اوقات اس قسم کے چند افراد پوری جماعت کو متاثر کر دیتے ہیں۔

﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ کسی کے دل میں بزدلی اور خوف تھا تو اللہ اس سے بھی باخبر تھا اور اگر ایمان و توکل، صبر و شجاعت جیسے عظیم اوصاف تھے تو اللہ سے وہ بھی مخفی نہ تھے۔

﴿۴۴﴾......نہ صرف خواب میں مشرکین کی تعداد بہت کم دکھائی گئی بلکہ عین لڑائی کے وقت مسلمانوں نے دشمنانِ اسلام کے لشکر پر نظر دوڑائی تو بھی انہیں وہ بے حیثیت، تھوڑے اور حقیر دکھائی دیئے۔

﴿وَيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ﴾ دشمنوں کا بھی یہی حال تھا کہ وہ مسلمانوں کے لشکر کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے، ان کا مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا یا تو غرور اور تکبر کی بناء پر تھا{۱۰۲} کہ مسلمانوں کی تعداد واقعی تھوڑی تھی اور یا اس لئے کہ مسلمان جتنے بھی تھے مشرکوں کو اس سے بھی کم دکھائی دے رہے تھے حتیٰ کہ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد بس اتنی ہے کہ ان سب کے لئے ایک اونٹ کافی ہے{۱۰۳} ایک اونٹ سو آدمیوں کی خوراک سمجھا جاتا تھا، خود رسولِ اکرم ﷺ نے بھی قریش کے لشکر کا اندازہ اونٹوں ہی سے لگایا تھا، جب آپ کو بتایا گیا کہ قریش کے لئے روزانہ دس اونٹ ذبح کئے جاتے ہیں تو آپ نے اسی سے نتیجہ اخذ کیا کہ ان کی تعداد نوسو اور ہزار کے درمیان ہے۔

﴿لِيَقْضِيَ اللّٰهُ﴾ جس کام کا فیصلہ اللہ فرما چکے تھے اس کے لئے اسباب بھی مہیا فرما دیئے، ایک گروہ کو ظاہری وسائل واسباب پر گھمنڈ تھا جبکہ دوسرے کو اللہ کی مدد کا یقین تھا، مسلمانوں کو شجاعت اور ثابت قدمی سے نواز دیا گیا اور مشرکین کے دلوں کو خوف اور رعب سے بھر دیا گیا۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، وہ اگر چاہے تو قلت کو کثرت پر غالب کر دے، جس کام کے کرنے کا وہ فیصلہ فرمالیتا ہے اس کے لئے اسباب بھی مہیا فرما دیتا ہے، ہمیں اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے، کبھی بھی اس زعم میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم نتیجہ بھی ظاہر کر سکتے ہیں۔

حکمت وہدایت:

۱......غزوۂ بدر اللہ تعالیٰ کے معجزات میں سے ایک معجزہ اور سرورِ دوعالم ﷺ کی صداقت کے دلائل میں سے ایک

{۱۰۲} لما کان عندھم من الغرور و العجب (المنار/۱۰/۱۸)

{۱۰۳} قال ابو جھل انما اصحاب محمد اکلة جزور/ابی سعود/۳/۱۰۰، قرطبی/۸/۲۵

مضبوط دلیل تھی (۴۲)

۲......کفر، ہلاکت اور بربادی ہے جبکہ ایمان، زندگی اور آبادی ہے (۴۲)

۳......باری تعالیٰ اپنی قدرت کے دلائل ظاہر فرماتے رہتے ہیں تا کہ کافروں پر حجت قائم ہو جائے اور مومن علیٰ وجہ البصیرۃ نہ صرف ایمان پر قائم رہیں بلکہ ان کے ایمان میں اضافہ ہو (۴۲)

۴......دنیا میں اتفاقی طور پر جو واقعات پیش آتے ہیں وہ صرف انسان کے علم و خبر کے اعتبار سے اتفاقیہ ہوتے ہیں ورنہ انسانوں کے خالق و مالک کے نزدیک کوئی چیز اور واقعہ بھی اتفاقی نہیں ہے اس نے نظامِ عالم کی پہلے سے منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔

۵......اللہ تعالیٰ جس کام کا فیصلہ فرما لیتے ہیں وہ ہو کر رہتا ہے اور اس کے لئے وہ اسباب بھی مہیا فرماتے ہیں۔

ایک وضاحت

۶......یہاں دو سوال اٹھائے گئے ہیں، پہلا سوال یہ ہے کہ اللہ کے نبی کا خواب سچا ہوتا ہے، خواب اور حقیقت میں تضاد نہیں ہوتا، جبکہ یہاں حقیقت، خواب کے بالکل خلاف تھی، خواب میں مشرکین کم دکھائے گئے جبکہ ان کی تعداد زیادہ تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر کے خواب کے سچا ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن خواب میں کبھی تو کسی واقعہ اور معاملہ کی وہی صورت دکھائی جاتی ہے جو خارج میں ہوتی ہے اور کبھی رموز و اشارات پر اکتفاء کیا جاتا ہے جیسے غزوۂ احد سے پہلے حضورِ اکرم ﷺ نے گائے کا ذبح ہونا دیکھا اور اس کی تعبیر احد میں مسلمانوں کی شہادت کی صورت میں سامنے آئی، معرکۂ بدر سے پہلے مشرکین کی قلت کا دکھایا جانا اشارہ تھا مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی ذلت، شکست اور کمزوری کی طرف مگر مسلمانوں نے اس خواب کو اپنے ظاہر پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا کہ مشرکین کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں کم ہو گئی۔{۱۰۴}

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس مقام پر جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ''حق تعالیٰ بعض اوقات بعض واقعات کو نبی ﷺ سے بھی مخفی فرما دیتے ہیں (جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ کفار تھے تو زیادہ مگر آنحضرت ﷺ پر کم منکشف ہوئے) تو پھر غیرِ نبی کا کیا ذکر ہے اور اس شخص کا کیا کہنا جو اسے اپنے شیخ کے لئے جائز نہ سمجھے اور اس کے کشف و خواب پر جزم کرے اور یہ واقعہ تو خواب کا ہے لیکن ایسا ہی بیداری میں بھی ممکن ہے جیسا کہ اس کے بعد والی

{۱۰۴} واخبر برؤیاہ المسلمین فتشجّعوا للقاء المشرکین وحملوھا علی ظاھرھا۔(التحریر والتنویر ۲۲/۶)

آیت میں آرہا ہے{۱۰۵}

دوسرا سوال یہ ہوا کہ سورۂ آلِ عمران میں گزر چکا ہے ﴿يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ {۱۰۶} "مشرکین اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے" جبکہ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین کی نظروں میں کم کردیا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے قریش مسلمانوں کے لشکر کو قلت اور حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم اس چھوٹی سی جماعت کو کچل کر رکھ دیں گے لیکن مقابلہ شروع ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے لشکرِ اسلام کو بہت بڑا بنا کر دکھایا تاکہ دشمنانِ دین کے حوصلہ پست ہوجائیں، مسلمانوں کے لشکر کے زیادہ دکھائی دیئے جانے کی تین وجوہ ہوسکتی ہیں:

1......معجزانہ طور پر ان کا چھوٹا سا لشکر کفار کو بہت بڑا دکھائی دے رہا تھا۔

2......سپہ سالارِ اعظم ﷺ کی بہترین صف بندی کی وجہ سے۔

3......مجاہدین اپنی روحانی، معنوی اور اخلاقی برتری کی وجہ سے بت پرستوں کو ہلاکت خیز آندھی اور طوفان محسوس ہو رہے تھے۔

مجاہدین کے لیے ہدایات

﴿۴۵......۴۷﴾

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ

اے ایمان والو! جب بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم مراد پاؤ۔ اور حکم مانو اللہ کا

تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا

اور اس کے رسول کا اور آپس میں نہ جھگڑو پس نامرد ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا اور صبر کرو بیشک

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ

اللہ ساتھ ہے صبر والوں کے۔ اور نہ ہوجاؤ ان جیسے جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کو اور

النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

روکتے تھے اللہ کی راہ سے اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

{۱۰۵} تفسیر ماجدی ۲/۲۹۶

{۱۰۶} آلِ عمران/۳/۱۳

ربط: ماقبل سے ربط بالکل واضح ہے، مالِ غنیمت کی تقسیم، جہاد اور غزوۂ بدر کا ذکر ہورہا تھا، عین مناسب ہے کہ اس موقع پر قیامت تک آنے والے مجاہدین کو ایسی ہدایات دی جائیں جن پر عمل کرنا ان کی فتح کی ضمانت ثابت ہو۔

تسہیل: اے ایمان والو! جب تمہارا کفار کی کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو ان ہدایات کو ملحوظ رکھو، ایک تو ثابت قدم رہو، دوسرا یہ کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرو تا کہ تمہیں کامیابی حاصل ہو ○ تیسری یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، چوتھی یہ کہ آپس میں جھگڑا نہ کیا کرو ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، پانچویں یہ کہ ہر قسم کے حالات میں صبر کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ○ اور چھٹی یہ کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور نمود و نمائش کرتے ہوئے نکلتے ہیں اور انسانوں کو اللہ کی راہ پر چلنے سے روکتے ہیں، اللہ ان کے اعمال کا پوری طرح احاطہ کیے ہوئے ہے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۴۵﴾......اس سورۃ میں چھٹی بار اہلِ ایمان کو ﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ کے محبت بھرے الفاظ میں خطاب کیا جارہا ہے جس میں انہیں چھ ایسی ہدایات دی جارہی ہیں جن پر عمل کرتے ہوئے وہ فتوحات حاصل کر سکتے ہیں۔

ثبات:

کسی بھی جنگ میں کامیابی کیلئے ثباتِ قلب بھی ضروری ہے اور ثباتِ قدم بھی، بلکہ انسان کو ثابت قدمی بھی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کا دل اور اعصاب پختہ ہوں، اعصاب کی جنگ میں پختگی دکھانے والا ہی تیر و تفنگ اور گولہ بارود کی جنگ میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک موقع پر دشمن سے مقابلے کا انتظار کر رہے تھے یہاں تک کہ جب سورج ڈھل گیا تو آپ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ''اے لوگو! دشمن سے ٹکراؤ کی آرزو نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرو اور اگر ٹکراؤ ہو جائے تو صبر کرو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔{۱۰۷}

مومن کی ثابت قدمی کسی بھی حالت میں فائدے سے خالی نہیں، اسے شہادت حاصل ہو یا فتح اور کامیابی، دونوں صورتوں میں اللہ سے اجر و ثواب کی امید ہے۔

{۱۰۷} بخاری ۲/کتاب الجہاد، باب لاتمنوا لقاء العدو/ص ۴۲۴-۴۲۵

ذکرِ الٰہی:

ذکرِ الٰہی مومن کے لئے روحانی غذا اور ایسا مضبوط ہتھیار ہے جو اس کے دشمنوں کے پاس نہیں ہے، سچا مومن کسی بھی وقت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں ہوتا، میدانِ جنگ میں جبکہ انسان اپنی جان کے علاوہ ہر چیز کو بھول جاتا ہے، مومن اس وقت بھی غفلت کا شکار نہیں ہوتا، ذکرِ الٰہی سے آسمانی مدد حاصل ہوتی ہے اور قدم مضبوط ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں باری تعالیٰ نے متعدد ایسی جماعتوں اور افراد کا ذکر کیا ہے جنہوں نے عین اس وقت دعا کیلئے ہاتھ اٹھا دیئے جب ان کی جان خطرے میں تھی اور ظالم اور جابر دشمن سے ان کا مقابلہ ہونے والا تھا، سورۂ بقرہ میں ہے کہ جب اسرائیلی فوج کا ایک چھوٹا سا دستہ حضرتِ طالوت کی قیادت میں جالوت اور اس کے ظاہری شان و شوکت سے آراستہ لشکر کے مقابلہ کیلئے نکلا تو انہوں نے دعا کی:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

"اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما"

اسی طرح جب فرعون نے ایمان قبول کر لینے والے ساحرانِ مصر کے لئے پھانسی کی سزا کا اعلان کیا تو انہوں نے کہا:

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

"اور جس جرم کا تم ہم سے انتقام لینا چاہتے ہو صرف یہ ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر ایمان لے آئے جبکہ وہ ہم تک پہنچ گئیں، اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں اس حالت میں موت دینا کہ ہم مسلمان ہوں"

اللہ کا ذکر، نیت کی درستگی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے، مجاہد کے ذہن میں یہ بات مستحضر رہتی ہے کہ میری جنگ نہ مال و متاع کے لئے ہے نہ اپنی قوت و شجاعت کی دھاک بٹھانے کے لئے بلکہ یہ جنگ صرف اللہ کے حکم کی بالادستی اور اس کے ذکر کی بلندی کے لیے ہے۔

اطاعت:

جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے انہیں بجالانا اور جن سے منع کیا گیا ہے ان سے رک جانا مسلمان کی پہچان

{۱۰۸} البقرۃ۲/۲۵۰

{۱۰۹} الاعراف۷/۱۲۶

ہے، وہ صرف عقائد اور عبادات ہی میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ اس کا دائرۂ اطاعت بہت وسیع ہے حتیٰ کہ میدانِ جنگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حالتِ جنگ میں اطاعت کی یوں تو کئی صورتیں ہوسکتی ہیں لیکن ان میں سے اہم ترین صورت امیر کی اطاعت ہے، اطاعتِ امیر کا حکم اللہ اور اس کے پیغمبر نے دیا ہے اور اس کے بغیر جنگ میں کامیابی محال ہے۔

اختلاف سے اجتناب:

حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے اختلاف کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے اور اسے امت کیلئے رحمت قرار دیا گیا ہے، خود صحابہ کرام نے اپنے عظیم قائد ﷺ سے اختلاف کیا، نہ صرف مسجدِ نبوی کے صحن میں بلکہ بدر کے میدان میں بھی، آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ جب حضورِ اکرم ﷺ نے بدر کے ایک خاص مقام پر قیام فرمایا تو حضرت حباب ابنِ منذر نے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ سوال کیا کہ یارسول اللہ! اس مقام کا انتخاب اللہ کے حکم سے ہے یا جنگی چال اور تدبیر کے طور پر ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں یہ جنگی تدبیر کے طور پر ہے، اس پر انہوں نے کہا پھر یہ جگہ ٹھیک نہیں بلکہ وہ چشمہ جو دشمن کے قریب ہے ہمیں وہاں پڑاؤ ڈالنا چاہیے، چنانچہ ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے حضورِ اکرم ﷺ نے لشکر کو ایسا ہی کرنے کا حکم دیا۔

یہاں اس اختلاف سے منع کیا گیا ہے جو نفس پرستی پر مبنی ہو اور جو امت کی وحدت کو نقصان پہنچانے والا ہو، ویسے تو ہر گروہ اپنی خواہشات کو اصول پرستی کے خوبصورت پردے میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے مگر ان کی حقیقت زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی، ماضی قریب اور ماضی بعید میں مجاہدین کو سب سے زیادہ نقصان باہمی اختلافات ہی نے پہنچایا ہے، کئی بار ایسا ہوا کہ منزل دو چار قدم پر رہ گئی تھی اسی دوران قیادت و سیادت اور مالیات جیسے معاملات میں اختلاف ہو گیا جس نے منزل کو کوسوں دور کر دیا۔

﴿وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ ”اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی“ ظاہر ہے جب گھر میں اختلاف ہوگا تو دشمنوں کے دل سے رعب اور دبدبہ جاتا رہے گا۔

صبر:

دورانِ جنگ جن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑے ان پر صبر کرو، جنگ بہرحال جنگ ہوتی ہے کرکٹ اور ہاکی کا میچ نہیں ہوتا، اس میں بمباری ہوتی ہے، خون بہتا ہے، لاشیں گرتی ہیں اور بستیاں اجڑتی ہیں، ایسا فریق میدان میں

زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا جس کے اندر صبر کی صفت نہ ہو، مجاہدین کو یہ بات بہرحال ملحوظ رکھنی چاہیے کہ دشمن سے ان کا مقابلہ صرف گولہ بارود کے برسانے میں نہیں صبر کرنے میں بھی ہوگا، کہیں ایسا نہ ہو کہ صبر کرنے میں اللہ اور اس کے انبیاء کا دشمن ان سے سبقت لے جائے۔

اخلاص اور تواضع:

﴿۴۷﴾......چھٹی ہدایت جو مسلمانوں کو دی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہیں مشرکین کی مشابہت سے بچنا چاہئے، مشرکین کا ہر ہر قدم کبر و غرور، نمود و نمائش اور ظاہری وسائل کے اعتماد پر مبنی ہوتا ہے جبکہ مسلمانوں کے دامن میں توکل و اخلاص اور تواضع وانکساری جیسی صفات ہونی چاہئیں۔

قریش جب مکہ سے نکلے تھے تو ان کے ساتھ شراب و کباب اور رقص و سرود کا پورا سامان تھا، وہ اکڑتے ہوئے بدر کی طرف جا رہے تھے، وہ چاہتے تھے کہ دنیا ان کی قوت و طاقت کی نمائش دیکھے اور ان کی فتح کا چرچا پورے عرب میں عام ہو جائے۔

جب ابوسفیان بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے ابوجہل کو پیغام بھیجا تھا کہ اب جنگ کی ضرورت نہیں واپس آجاؤ، اس نے جواب دیا ''اللہ کی قسم! ہم واپس نہیں لوٹیں گے، ہم بدر کے چشموں تک پہنچ کر رہیں گے، وہاں ہم اونٹ ذبح کریں گے اور رنڈیوں سے گانے سنیں گے اور ہماری جرأت و بہادری کی داستانوں کی بازگشت پورے عالمِ عرب میں سنائی دے گی۔{۱۱۰}

﴿وَاللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ﴾ ''اللہ ان کے اعمال کا پوری طرح احاطہ کئے ہوئے ہے'' یہ احاطہ علم کے اعتبار سے بھی ہے اور غلبہ کے اعتبار سے بھی، اللہ ان کے سارے اعمال اور سازشوں سے باخبر بھی ہے اور ان کی شراتوں کی سزا دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے، وہ اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔

حکمت و ہدایت

مذکورہ آیات میں اللہ کی نصرت کے چھ اسباب بیان کئے گئے ہیں جن پر عمل کرنا مجاہدینِ اسلام پر واجب ہے یعنی:

☆......ثبات ☆......ذکر الٰہی ☆......اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت

☆......نزاع اور اختلاف سے اجتناب ☆......صبر ☆......نمود و نمائش اور کبر و غرور سے احتراز

{۱۱۰} تفسیر منیر ۱۰/۲۷

شیطان کی ریشہ دوانی اور منافقین کی ہرزہ سرائی

﴿۴۸......۴۹﴾

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي

اور جس وقت خوشنما کر دیا شیطان نے ان کی نظروں میں ان کے عملوں کو اور بولا کہ کوئی بھی غالب نہ ہوگا تم پر آج کے دن

جَارٌ لَّكُمْ ۖ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ إِنِّي أَرَىٰ

لوگوں میں سے اور میں تمہارا حمایتی ہوں پھر جب سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ الٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا میں

مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ ۚ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ

تمہارے ساتھ نہیں ہوں، میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے، میں ڈرتا ہوں اللہ سے اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔ جب کہنے لگے

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ غَرَّ هَٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ ۗ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۴۹﴾

منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے، یہ لوگ مغرور ہیں اپنے دین پر اور جو کوئی بھروسہ کرے اللہ پر تو اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

تسہیل: اور یاد کرو جب شیطان نے کفار کی نظروں میں ان کے اعمال مزین کر دیئے اور کہا آج لوگوں میں سے کوئی بھی تم پر غالب نہیں آسکتا اور میں تمہارے ساتھ ہوں، پھر جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو وہ یہ کہتے ہوئے الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا کہ میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے، میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں ○ اور اس وقت کا بھی ان کے سامنے ذکر کیجیے جب منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے کہتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے کیونکہ اللہ عزیز اور حکیم ہے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۴۸﴾......شیطان نے قریش کی عددی کثرت اور مادی قوت و طاقت کو بہت خوبصورت بنا کر پیش کیا اور انہیں باور کرا دیا کہ آج تم پر کوئی بھی غالب نہیں آسکتا۔

شیطان نے یہ ''عملِ تزیین'' (خوبصورت بنا کر پیش کرنے والا عمل) کیسے سرانجام دیا تھا؟ اس کے بارے میں دو قول ہیں ایک تو یہ کہ شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا تھا {۱۱۱} کہ اس وقت تم سرزمینِ عرب کی سب سے

{۱۱۱} ان الشیطٰن زیّن بوسوسته من غیر ان یتحول فی صورة الانسان۔ (کبیر ۵/۴۹۱)

بڑی طاقت ہو اور مسلمانوں سمیت کوئی بھی گروہ اور قبیلہ تمہارے سامنے آنے کی جرأت نہیں کر سکتا، سوال ہو سکتا ہے کہ اگر یہ وسوسہ تھا تو پھر اس جملے کا کیا مطلب ہے؟ ''وہ یہ کہتے ہوئے الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا کہ میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں''

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات بھی اس نے دل میں کہی تھی، اس کا یہ خطاب بھی اسی طرح کا تھا جیسے سورۂ حشر میں اس کا خطاب مذکور ہے:

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶﴾ {۱۱۲}

''ان کی مثال شیطان کی سی ہے، وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر! پھر جب وہ کفر کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے میرا تم سے کوئی تعلق نہیں، میں اللہ سے ڈرتا ہوں''

ظاہر ہے شیطان کسی کے سامنے آ کر نہ تو اسے کفر کی ترغیب دیتا ہے اور نہ ہی اس سے برأت ظاہر کرتا ہے بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ القاء اور وسوسہ کی صورت ہی میں ہوتا ہے جیسے ملائکہ اہلِ ایمان کو خیر کی ترغیب دیتے ہیں یونہی شیاطین کافروں اور فاجروں کو برائی پر آمادہ کرتے ہیں۔

دوسرا قول اس تزیین کے بارے میں یہ ہے کہ قریشی لشکر جب بدر کی طرف کوچ کی تیاری کر رہا تھا تو اسے بنو کنانہ کی جانب سے مکہ پر حملے کا اندیشہ تھا اس لئے کہ انہوں نے ان کا ایک بندہ قتل کر رکھا تھا جس کی دیت کا وہ مطالبہ کرتے رہتے تھے، اس موقع پر شیطان، سراقہ کنانی کی صورت میں آیا اور انہیں تسلی دی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور بنو کنانہ کی جانب سے مکمل تحفظ کی ضمانت دیتا ہوں، لیکن جب دونوں لشکر صف آرا ہوئے اور ابلیس نے فرشتوں کو مسلمانوں کی مدد کیلئے اترتے دیکھا تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ {۱۱۳}

﴿اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ﴾ شیطان کے دل میں اصل خوف تو فرشتوں کو دیکھ کر پیدا ہوا مگر اس نے ظاہر یہ کیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اگر اسے اپنے ظاہری معنی پر رکھا جائے تو یہ بھی کوئی بعید بات نہیں اس لئے کہ شیطان بہر حال اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی سے واقف ہے لیکن ایمان کے بغیر محض طبعی خوف نہ دنیا میں فائدہ دیتا ہے اور نہ آخرت میں نفع دے گا۔

﴿۴۹﴾......عین اس وقت جب شیطان مشرکین کو سبز باغ دکھا کر بے وقوف بنا رہا تھا تو منافقین اور ایسے کمزور مسلمان جن کے دلوں میں شکوک وشبہات کی بیماری پائی جاتی تھی وہ مسلمانوں کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ انہیں ان کے

{۱۱۲} الحشر/۵۹/۱۶

{۱۱۳} کبیر ۵/۴۹۱، الکشاف ۲/۲۱۶

دین نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے، یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم ہر طرح کی کمزوری کے باوجود اپنے سے طاقتور لشکر کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہے۔

﴿وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ اس حقیقت کو تو وہ جانتے ہی نہ تھے کہ جو اللہ پر توکل کرے اللہ اسے کافی ہو جاتا ہے، دشمنوں کی کثرت کے باوجود وہ اپنے بندوں کو غلبہ عطا کر دیتا ہے۔

﴿عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ اس لئے کہ اللہ سب پر غالب ہے اسے کوئی مغلوب نہیں کر سکتا، غالب ہونے کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

حکمت وہدایت

۱......انسانوں کو گمراہ کرنے کیلئے شیطان کے پاس جتنے بھی ہتھکنڈے ہیں ان میں مؤثر ترین ہتھکنڈا ''تزیین'' ہے یعنی کسی بھی عمل کو خوشنما بنا کر پیش کرنا، قریش پر بھی اس نے یہی ہتھیار استعمال کیا تھا، شیطان کے وساوس نے انہیں ایسا اندھا کر دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں انہیں کامیابی اور فوائد کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ (۴۸)

۲......منافقین، دینِ اسلام کی سچائی اور غلبے کے بارے میں ہمیشہ شکوک وشبہات کا شکار رہتے ہیں۔ (۴۹)

۳......اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ وہ ہر قسم کے پروپیگنڈے کے باوجود اللہ پر توکل اور اعتماد کریں۔ (۴۹)

کفار اور مشرکین کا انجام

﴿۵۰......۵۴﴾

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ

اور اگر تو دیکھے جس وقت جان قبض کرتے ہیں کافروں کی فرشتے مارتے ہیں ان کے منہ پر اور ان کے پیچھے اور کہتے ہیں

وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿۵۰﴾ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ

چکھو عذاب جلنے کا۔ یہ بدلہ ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں اور اس واسطے کہ اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر۔ جیسے

لِّلْعَبِيدِ ﴿۵۱﴾ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ

دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے کہ منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے، سو پکڑا ان کو اللہ نے ان کے گناہوں پر بیشک

بِذُنُوبِهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا

اللہ زور آور ہے سخت عذاب کرنے والا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں اس نعمت کو جو دی تھی اس نے کسی قوم

عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ

کو جب تک وہی نہ بدل ڈالیں اپنے جیوں کی بات اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ

ان سے پہلے تھے کہ انہوں نے جھٹلائیں باتیں اپنے رب کی، پھر ہلاک کر دیا ہم نے ان کو ان کے گناہوں پر اور ڈبو دیا ہم

وَ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

نے فرعون والوں کو اور سارے ظالم تھے۔

ربط: گزشتہ آیات کی طرح ان آیات میں بھی مشرکین کا ذکر ہے، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ذکر تھا ان کی زندگی کی حرکتوں کا اور اب ذکر ہے اس کیفیت اور منظر کا جو ان کی موت کے وقت ہوتا ہے۔

تسہیل: اور اگر آپ اس منظر کو دیکھتے جب فرشتے کفار کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے ان کی جان نکالتے ہیں تو آپ عجیب منظر دیکھتے، وہ ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اب جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو○ یہ عذاب تمہاری ان کرتوتوں کی وجہ سے ہے جو تم پہلے کر چکے ہو اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا○ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو قومِ فرعون اور ان کافروں کے ساتھ ہوا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، انہوں نے اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کیا تو اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا، بے شک اللہ قوی ہے اور سخت سزا دینے والا ہے○ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ کا دستور یہ ہے کہ جب وہ کسی قوم کو نعمت عطا فرماتے ہیں تو اسے اس نعمت سے اس وقت تک محروم نہیں فرماتے جب تک کہ وہ اپنے ذاتی اعمال کو نہ بدل ڈالیں، بے شک اللہ سننے والے اور جاننے والے ہیں○ ان کے معاملے میں بھی ہمارا وہی دستور کارفرما رہا جس دستور کے نتائج کا سامنا قومِ فرعون اور ان لوگوں کو کرنا پڑا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ہلاک اور فرعون والوں کو غرق کر دیا اور وہ سب ظالم تھے○

﴿تفسیر﴾

﴿۵۰﴾......اس آیت میں جو خطاب ہے وہ ہمارے آقا ﷺ سے بھی ہے اور قرآن کے ہر قاری اور سامع سے بھی ہے کہ وہ منظر بڑا عجیب اور شرمناک ہوتا ہے جب فرشتے مشرکین کی روحیں قبض کرتے ہیں، وہ ان کی جان نکالنے کے ساتھ ان کے چہرے اور پیٹھ پر تھپڑ بھی رسید کرتے ہیں، یہ پٹائی بے پناہ اذیت اور ذلت کا سبب بنتی ہے {۱۱۴} بدر

{۱۱۴} وانما خصوهما بالضرب لأن الخزى والنكال فى ضربهما اشد۔ (الكشاف ۲/۲۱۷)

کے مشرک مقتولوں کو بھی ذلت اور اذیت کے اس مرحلے سے گزرنا پڑا تھا۔

﴿۵۱﴾...... یہ مار پٹائی اور ذلت و رسوائی تمھاری ان کرتوتوں اور اعمالِ بد کی وجہ سے ہے جو تم دنیا میں کرتے رہے ہو، اگر کسی گناہ کے بغیر تمہیں سزا دی جاتی تو یہ ظلم ہوتا حالانکہ اللہ اپنے بندوں پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، حدیثِ قدسی میں رسول ﷺ اپنے مولیٰ سے ایک طویل روایت جس میں یہ الفاظ بھی ہیں، نقل فرماتے ہیں:

﴿یا عبادی إنّی حرمت الظلم علی نفسی و جعلت بینکم محرما فلا تظالموا یا عبادی إنما هی اعمالکم احصیها لکم فمن وجد خیرا فلیحمد الله و من وجد غیر ذلک فلا یلومنّ إلا نفسه﴾{۱۱۵}

''اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم حرام کیا ہے اور تمہارے درمیان بھی ظلم حرام کیا ہے لہٰذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو، اے میرے بندو! یہ تو بس تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں نے محفوظ کر رکھے ہیں، جو کوئی اپنے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا ذخیرہ دیکھے وہ اللہ کی تعریف کرے اور جو کوئی اس کے برعکس دیکھے تو وہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرے''

اگر اللہ تعالیٰ بدر میں جمع ہو جانے والے ان سورماؤں کو سزا نہ دیتا جنھوں نے مکہ کی سرزمین وسعت کے باوجود اہلِ ایمان پر تنگ کر دی تھی اور وہ مشرک اور مومن، ظالم اور مظلوم کے ساتھ ایک جیسا معاملہ کرتا تو یہ بہت بڑا ظلم ہوتا، یہ مساوات تو وہی کر سکتا ہے جو بہت بڑا ظالم ہو حالانکہ اللہ تو عادل ہے۔

﴿۵۲﴾......عرب کے مجرموں کے ساتھ اللہ نے وہی معاملہ کیا ہے جو ان سے پہلے دوسرے مجرموں کے ساتھ کر چکا ہے، جو قوم عقل و فہم سے کام نہ لے اور آیاتِ الٰہیہ کو مسلسل جھٹلاتی چلی جائے اللہ اسے ایسے پکڑتے ہیں کہ پھر انہیں کوئی چھڑا نہیں سکتا، صحیحین مسلم میں روایت ہے:

﴿انّ الله تعالیٰ لیملی للظالم حتی إذا اخذه لم یفلته﴾{۱۱۶}

''اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے حتّٰی کہ جب اسے پکڑتا ہے تو اسے کوئی چھڑا نہیں پاتا''

فرمانبرداروں کی نصرت اور نافرمانوں کو سزا دینا اس کی سنت ہے اور اللہ کی سنت کبھی بھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔

﴿۵۳﴾......خدمتِ کعبہ کی نسبت اور سیادتِ عرب کے منصب کے باوجود مشرکین کو عبرتناک انجام سے اس لئے دوچار کیا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو قوت و عزّت سعادت و سیادت، ثروت اور غنا عطا فرماتے ہیں تو ان نعمتوں کی بقا کے لئے بھی اس کے ہاں کچھ اصول اور ضابطے ہیں، جو قوم ان ضابطوں کا لحاظ کرتی ہے اسے ان نعمتوں سے

{۱۱۵} مسلم/۲۵۷۷

{۱۱۶} بخاری، الفتح ۴۶۸۶/۸، مسلم/۲۵۸۳

محروم نہیں کیا جاتا اور جو قوم ان کی خلاف ورزی کرتی ہے اس سے یہ نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔

بات تو چل رہی تھی غزوۂ بدر اور اس میں دشمنانِ دین کی ہلاکت کی لیکن درمیان میں احکم الحاکمین کی عظیم سنت بیان فرمادی جو اس دنیا میں بسنے والی ہر قوم اور ہر فرد میں جاری رہی ہے، انسان نے کبھی مال و اولاد کی وجہ سے اپنے آپ کو عزت و سیادت کا مستحق سمجھا، کبھی حسب نسب، رنگ اور زبان کی وجہ سے اور کبھی کسی مخصوص فرقے اور گروہ کے ساتھ تعلق کی وجہ سے نعمتوں کا حقدار جانا، اللہ تعالیٰ ان باطل خیالات کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انعاماتِ باری کا استحقاق قوم قبیلے، فرقے اور جماعت کی وجہ سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان کا تعلق اخلاق وصفات عقائد و اعمال اور معاملات سے ہے جب تک یہ باقی رہیں نعمتیں بھی باقی رہتی ہیں اور جب ان میں تبدیلی آجائے تو اللہ بھی اپنا معاملہ بدل دیتا ہے۔

اللہ کی رحمت کیوں نہیں آتی؟

حقیقت یہ ہے کہ حسنِ اخلاق، معاملات کی درستگی، مسلسل محنت اور جستجو کا انسان کی ترقی میں بہت بڑا دخل ہے، جن قوموں اور افراد نے ان چیزوں کو اہمیت دینے کے بجائے نسلی اور گروہی نسبت ہی کو کافی سمجھا وہ تنزّل کا شکار ہو کر رہیں، ایک زمانے میں یہود و نصاریٰ اللہ کے چہیتے ہونے کے گھمنڈ میں مبتلا رہے آج بعض مسلمان اس دھوکے کا شکار ہیں، وہ دیکھ رہے ہیں کہ عزت اور غلبہ، سعادت اور سیادت ان سے کب کی روٹھ چکی، ہر آنے والا دن ان کی ذلت کی نئی خبر لیکر طلوع ہوتا ہے وہ پھر بھی کسی معجزے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور اپنی کمزوریوں کی اصلاح کیلئے فکرمند نہیں ہوتے۔

دل ایمان اور یقین سے خالی ہیں، عقائد شرک کی ملاوٹ سے پاک نہیں، عبادات کا ظاہری ڈھانچہ باقی رہ گیا ہے جس میں روح اور جان نہیں، کسی بھی اسلامی ملک میں قیامِ عدل کی اطمینان بخش صورت نہیں، اخلاقی تنزّل کا یہ عالم ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ موازنہ میں شرم محسوس ہوتی ہے، معاملات سے سچائی اور امانت و دیانت یوں غائب ہوگئی ہے گویا کبھی تھی ہی نہیں، دنیا کی شدید محبت دلوں میں سما گئی ہے، اللہ کے دین اور قومی عزت و وقار کے تحفظ کے لئے مال و جان کی قربانی کے لئے کوئی بھی آمادہ نہیں، اپنی سرحدیں، سمندر اور چھاؤنیاں یہود و نصاریٰ کے حوالے کر کے خود مسلمان لہو و لعب کے لئے وقف ہو کر رہ گیا ہے۔

ذلت و انحطاط کے یہ سارے اسباب اختیار کرنے کے باوجود ہمیں شکوہ ہے کہ اللہ کی رحمت ہم پر کیوں نازل نہیں ہوتی، اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، ہمارے حالات اور اخلاق یکسر بدل گئے ہیں، اللہ کی نصرت کے

حصول اور اپنی ذلت کو عزت میں بدلنے کیلئے ہمیں اپنے احوال اور اعمال بدلنے ہوں گے اور اس تبدیلی میں سب سے موثر کردار قرآن ہی ادا کر سکتا ہے یعنی اسے پڑھنا، سمجھنا، اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا، اسے اجتماعی زندگی میں نافذ کرنا اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی پوری کوشش کرنا۔

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ عطا اور محرومی میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ اندھیرے میں تیر چلانے کی طرح نہیں ہے بلکہ سمع و علم پر مبنی ہے، وہ وسائل و اسباب دے کر سنتا اور جانتا رہتا ہے کہ اس قوم کا رویہ کیسا ہے، ظاہر اور باطن کیسا ہے، اخلاق اور معاملات کیسے ہیں، اسی سمع اور علم کی بناء پر اس قوم کو نوازنے یا راندۂ درگاہ کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

﴿۵۴﴾......کلامِ سابق کی تاکید کیلئے دوبارہ فرمایا جا رہا ہے کہ حال کے مجرموں کیساتھ بھی اللہ وہی معاملہ فرمائے گا جو ماضی کے مجرموں کیساتھ کر چکا ہے۔

آیت ۵۲ اور ۵۴ میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، فرق ہے تو بس یہ کہ اوپر والی آیت میں "كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ" تھا جبکہ اس آیت میں "كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ" ہے اور پر تھا "فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ" یہاں ہے "فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ" اُس آیت کا اختتام ہوا تھا اللہ کی سخت سزا کے ذکر پر جبکہ اِس آیت کے اختتام پر دونوں قوموں کے مشترکہ جرم کا ذکر ہے، یعنی ظلم، قریش ہوں یا آلِ فرعون، دونوں ظالم تھے، دونوں نے کفر اور معصیت کا ارتکاب کرتے ہوئے اپنے اوپر بھی ظلم کیا اور ایذاء اور زیادتی کے ذریعے دوسروں پر بھی ظلم کیا، اس ظلم نے دونوں کو ہلاکت کا مستحق بنا دیا، مشرکینِ عرب پر جو عذاب آیا وہ قتل اور سلبِ نعمت تک محدود رہا جبکہ آلِ فرعون، قومِ عاد اور دوسری بعض اقوام کو نیست و نابود کر دیا گیا۔

حکمت وہدایت

۱......جیسے جان کنی کے وقت عذاب کا دیا جانا ثابت ہے یونہی عذابِ قبر بھی برحق ہے (۵۰)

۲......کفار اور مشرکین دنیا میں کیسی ہی خوشحالی اور عزت کی زندگی بسر کر رہے ہوں ان کا انجام کسمپرسی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں (۵۰)

۳......جیسے جرم کے بغیر کسی کو سزا دینا ظلم ہے یونہی مجرم اور نیک کیساتھ ایک جیسا سلوک کرنا بھی ظلم ہے (۵۱)

۴......نیک اور بد کو ایک ہی نظر سے دیکھنے والا "ظلّام" (بہت بڑا ظالم) ہے جبکہ باری تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

۵......نعمتوں کی بقا اور ان سے محرومی کے بارے میں ازل سے اللہ کی طے شدہ سنت چلی آرہی ہے اور زمان و مکان اور

چہروں کی تبدیلی سے اس کی سنت تبدیل نہیں ہوتی (۵۲)

۶......کوئی بھی قوم اور فرد محض حسب نسب اور فرقہ وارانہ تشخص کی وجہ سے اللہ کی نعمتوں کا حقدار نہیں ٹھہرتا جب تک کہ وہ اپنے اندر استحقاق والی صفات پیدا نہ کرے (۵۲)۔

۷......اللہ کا دائمی دستور یہ ہے کہ وہ ظالموں سے اپنی نعمتیں چھین لیتا ہے اور ان پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے (۵)

۸......کفر وشرک ہو یا گناہ اور بندوں پر زیادتی، یہ سب ظلم کے دائرے میں آتے ہیں، ظلم کی جو بھی صورت ہو یہ حقیقت میں اپنے اوپر ظلم ہوتا ہے لیکن انسان سمجھتا نہیں۔

وعدہ خلاف قوموں کے ساتھ معاملہ

﴿۵۵......۵۹﴾

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٥﴾ الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ

بدتر سب جانداروں میں اللہ کے ہاں وہ ہیں جو منکر ہوئے پھر وہ نہیں ایمان نہیں لاتے۔ جن سے تو نے معاہدہ کیا ہے ان میں سے،

يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿٥٦﴾ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم

پھر وہ توڑتے ہیں اپنا عہد ہر بار اور وہ ڈر نہیں رکھتے۔ سو اگر کبھی تو پائے ان کو لڑائی میں تو ان کو ایسی سزا دے کہ دیکھ کر بھاگ جائیں

مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ

ان کے پچھلے تاکہ ان کو عبرت ہو۔ اور اگر تجھ کو ڈر ہو کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف اسی طرح پر کہ ہو جاؤ

سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿٥٨﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾

تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغاباز۔ اور یہ نہ سمجھیں کافر لوگ کہ وہ بھاگ نکلے، وہ ہرگز تھکا نہ سکیں گے ہم کو۔

ربط: سابقہ آیات کی طرح ان آیات میں بھی ''ظالموں'' ہی کا ذکر ہے۔

تسھیل: بے شک اللہ کے نزدیک مخلوق میں سے بدترین لوگ وہ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے ○ ان کا حال یہ ہے کہ آپ ان سے کئی بار عہد لے چکے ہیں پھر بھی وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ عہد شکنی سے بالکل نہیں ڈرتے ○ پس اگر آپ جنگ میں ان پر قابو پائیں تو انہیں ایسی مار ماریں کہ جو ان کے علاوہ ہیں وہ تتر بتر ہو جائیں تاکہ ان لوگوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں ○ اور اگر آپ کو کسی قوم کی جانب سے عہد شکنی کا اندیشہ ہو تو آپ انہیں وعدہ ختم ہونے کی اطلاع دے کر برابر ہو جائیں، یقیناً اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ○ کافر لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ بچ گئے بے شک وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۵۵﴾......دواب، دابۃ کی جمع ہے، زمین پر چلنے پھرنے والی ہر چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

عام محاورے میں یہ لفظ خاص طور پر چوپائے جانور کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

یہ آیت اور اگلی آیات یہود کے بارے میں نازل ہوئیں{۱۱۷} جن میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت کو ویسے ہی پہچانتے تھے جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے تھے اس کے باوجود محض ضد اور عناد کی بناء پر وہ کفر وانکار پر اڑے رہے۔

دوسرا گروہ ان میں ایسے لوگوں کا تھا جو تقلیدِ جامد میں تھا، ان کے سامنے سب سے بڑی حجت اور دلیل اپنے ضدی رہنماؤں کا قول اور فعل تھا۔

قرآن نے ان لوگوں پر "شَرَّ الدَّوَآبِّ" کا اطلاق کیا ہے یعنی یہ لوگ اگرچہ شکل وصورت کے اعتبار سے انسان ہیں مگر حقیقت میں چوپائے ہیں بلکہ چوپاؤں سے بھی بدترین ہیں اسلئے کہ چوپاؤں کے اندر انسان کے لئے بہت سارے فوائد پوشیدہ ہیں، انسان ان سے سواری اور بار برداری کا کام بھی لیتا ہے اور ان کے دودھ، گوشت، چمڑے، ہڈیوں، خون، بالوں بلکہ گوبر تک سے فائدہ اٹھاتا ہے جبکہ ان بدخصلت یہودیوں سے عالمِ انسانی کو سوائے نقصان کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

﴿فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ پہلے جملے میں ان کے کفر کا بیان تھا اور یہاں مستقبل کے حوالے سے بتایا جا رہا ہے کہ ان کے ایمان لانے کی کوئی اُمید نہیں ہے،{۱۱۸} ظاہر ہے یہ پیشنگوئی مخصوص کفار کے بارے میں ہے سب کے بارے میں نہیں ہے اور وہ مخصوص کفار یہود ہیں جن کی شرارتوں اور خباثتوں سے عالمِ انسانی نے ہمیشہ نقصان ہی اٹھایا ہے۔

آقا ﷺ کی بصیرت

﴿۵۶﴾......مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلا کام تو یہ کیا کہ مہاجرین اور انصار یعنی مکی اور مدنی مسلمانوں کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم فرمادیا، اس رشتے نے نہ صرف مکی مسلمانوں کا معاشی اور رہائشی مسئلہ حل کر دیا بلکہ اس کی بناء پر ایک نئی قومیت بھی وجود میں آئی جو وطنی اور قومی عصبیتوں سے قطعاً پاک تھی۔

{۱۱۷} قال مجاهد: نزلت فی یهود المدینة۔(تفسیر المراغی ۱۰/۱۹)

{۱۱۸} ای اصرّوا علی الکفر ولجّوا فیه، فلا یتوقّع منهم الایمان۔(الکشاف ۲/۲۱۸)

دوسرا کام آپ نے یہ کیا کہ ''مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کا ایک عام اجلاس طلب کیا، یہ اجلاس آنحضور ﷺ کے ذاتی خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ کے والد کے گھر پر ہوا، امام بخاری کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اس اجلاس میں تجویز پیش کی کہ مدینہ کے لوگوں میں باہمی تنازعات کے خاتمہ اور کسی بیرونی حملہ آور کی حوصلہ شکنی کیلئے مدینہ کی ایک ریاست قائم کی جائے، یہ ریاست ایک کنفیڈریشن ہو جس کے تمام یونٹوں کو بڑی حد تک خودمختاری حاصل ہو، کسی جرم کے بارے میں سزا کے خلاف ریاست کے سربراہ سے اپیل کی جاسکے گی، سربراہِ مملکت کو جنگ یا امن کے دنوں میں کسی مہم کیلئے افراد کے قطعی انتخاب کا اختیار ہوگا، سماجی تحفظ کے لئے بھی ایک مضبوط نظام قائم کیا گیا، خون بہا کی صورت میں بھاری رقم متعین کی گئی جو اس صورت میں ادا کرنا ضروری تھی جب قتل کے مجرم کو سزائے موت نہ دی جائے، دشمن سے جنگی قیدیوں کی رہائی کیلئے فدیہ بھی مقرر کیا گیا۔

معاہدے کی تمام دفعات پر اتفاق رائے کے بعد انہیں ضبطِ تحریر میں لایا گیا، یہ معاہدہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے جو کسی سربراہِ مملکت نے جاری اور نافذ کیا ہے، یہ تاریخی دستاویز ''میثاق النبی'' کے عنوان سے معروف ہے۔{۱۱۹}

اس معاہدے کی مختلف دفعات میں سے صرف چند ملاحظہ فرمائیں جو خاص طور پر یہود سے متعلق تھیں۔

۱۔مسلمانوں کی جنگوں میں ان کی مالی اعانت کرنا ہر یہودی پر واجب ہوگا۔

۲۔یہود اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے گروہ اور افراد کے ساتھ صلح اور نصیحت پر عامل رہیں گے اور صلح و نصیحت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی درمیان میں نہ آنے دیں گے۔

۳۔شرکائے معاہدہ میں سے کوئی فرد یا جماعت، قریشِ مکہ کو اپنے ہاں پناہ نہ دے گی اور نہ قریشِ مکہ کے کسی حلیف کی حمایت کرے گی۔

۴۔اس معاہدہ کے پابند افراد اور گروہ، باہمی اختلاف اور تنازعات کا مقدمہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے پیش کریں گے۔

اس معاہدہ کا ایک ایک لفظ ہمارے آقا ﷺ کی ایمانی بصیرت اور دور اندیشی کی گواہی دیتا ہے، معاہدے پر دستخط کے باوجود یہود درپردہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے، غزوۂ بدر میں ان کا مالی تعاون اور ہمدردی قریش کے ساتھ تھی، غزوۂ خندق کے موقع پر کفر و شرک کی جس آندھی اور طوفان نے مدینہ کو چاروں طرف سے

{۱۱۹}اس معاہدے کا متن ڈاکٹر حمید اللہ کی عربی کتاب ''مجموعة الوثائق السیاسیه فی العهد النبوی والخلافة الراشده'' جس کا اردو ترجمہ ''سیاسی وثیقہ جات از عہدِ نبوی تا خلافتِ راشدہ'' کے نام سے مجلسِ ترقیِ ادب لاہور نے شائع کیا ہے، میں دیکھا جاسکتا ہے۔

گھیر لیا تھا اسے اٹھانے میں یہود کا ہاتھ تھا، اندرونِ مدینہ ان کی شرارتوں کا سلسلہ جاری رہا، مسلمانوں کو آپس میں لڑانے اور رسول ﷺ کی زندگی کا چراغ گل کرنے کی کوششیں بھی ان پر عائد ہونے والی فردِ جرم کا حصہ ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں یہود کی انہی عہد شکنیوں کی طرف اشارہ ہے۔

﴿لَا يَتَّقُوْنَ﴾ وہ نہ تو اللہ سے ڈرتے ہیں{۱۲۰} اور نہ ہی مسلمانوں کے انتقام سے ڈرتے ہیں{۱۲۱} کہ ایک نہ ایک دن وہ ان کی خیانتوں اور عہد شکنیوں سے تنگ آکر ان کے ساتھ جنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

﴿۵۷﴾......اس آیت میں اشارہ ہے کہ یہود کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ کا ہونا ناگزیر ہے اور مسلمانوں کو پیشگی تیار کیا جا رہا ہے کہ جنگ ہونے کی صورت میں مارِ آستین بننے والے دشمنوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ کریں اور انہیں ایسی عبرتناک سزا دیں جس سے نہ صرف وہ اپنی شرارتوں سے باز آجائیں بلکہ ان کے انجامِ بد کو دیکھ کر دوسرے دشمنوں کے حوصلے بھی پست ہو جائیں اور انہیں مسلمانوں کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہو۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ﴾ آیت کے اختتام پر بتایا جا رہا ہے کہ جنگ اپنی ذات کے اعتبار سے نہ اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں پسندیدہ ہے اور نہ ہی کسی مادی مقصد کے حصول کیلئے لڑی جاتی ہے بلکہ قتل وقتال کا راستہ مجبوراً اختیار کیا جاتا ہے تاکہ فتنہ وفساد کا قلع قمع کر دیا جائے اور بندگانِ خدا کے راستے سے ان رکاوٹوں کو ہٹا دیا جائے جو دینِ اسلام پر عمل کرنے میں مشکلات پیدا کرتی ہیں۔

یہ بنیادی فرق ہے اسلامی جہاد اور کفار کی جنگوں کے درمیان، جہاد کا مقصد اللہ کے دین کی سربلندی اور فتنہ وفساد کا خاتمہ ہوتا ہے جبکہ دشمنانِ دین کی لڑائیوں کا مقصد مال و دولت کا حصول، اپنی حدودِ سلطنت کی توسیع اور شہرت وناموری ہوتا ہے۔

﴿۵۸﴾......اگر بعض قرائن سے ظاہر ہو کہ ہمارا مخالف فریق عہد شکنی پر تلا ہوا ہے تو مسلمانوں پر یہ لازم نہیں کہ وہ ہر صورت میں معاہدہ باقی رکھیں بلکہ اسے اطلاع دے کر معاہدے سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔

﴿عَلٰى سَوَآءٍ﴾ (برابر ہو جائیں) دونوں فریقوں کو معاہدہ ختم ہو جانے کا علم ہو جائے، نہ دھوکہ ہو نہ خیانت، دشمنوں کو مسلمانوں پر یہ الزام لگانے کا موقع نہ ملے کہ وہ وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اور اگر دوسرے فریق کی جانب سے عہد شکنی کا محض اندیشہ نہ ہو بلکہ وہ کھلم کھلا معاہدہ کی خلاف ورزی کریں تو پھر

{۱۲۰} لا یتقون اللہ تعالیٰ فیہ۔(روح المعانی ۶/جزء ۱۰/۳۲)

{۱۲۱} ای لا یخافون الانتقام۔(قرطبی ۸/۳۱)

انہیں اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ﴾ (بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا) ایک چلا ہوا محاورہ یہ ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے، یہ کسی کافر کا قول ہی ہوسکتا ہے ورنہ اسلام تو محبت اور جنگ میں بھی سب کچھ کی اجازت نہیں دیتا، اللہ کو خیانت کرنا پسند نہیں ہے اگر چہ کفار کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت میمون بن مہران رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جن میں مسلمان اور کافر برابر ہیں:

۱......جس کیساتھ معاہدہ کرو اسے پورا کرو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر! کیونکہ عہد تو اللہ کیلئے ہے۔

۲......جس کے ساتھ تمہاری قرابت ہو اس کیساتھ صلہ رحمی کرو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر ہو۔

۳......جو تمہارے پاس امانت رکھوائے اسکی امانت ادا کرو خواہ وہ مسلم ہو یا کافر ہو۔{۱۲۲}

حضرت سلیم بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور رومیوں کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا تھا جب مدتِ معاہدہ ختم ہونے کا وقت قریب آیا تو حضرت معاویہ لشکر لیکر چل کھڑے ہوئے، پروگرام یہ بنایا کہ سرحد کے قریب پہنچ جاؤں گا، اور مدتِ معاہدہ ختم ہوتے ہی حملہ کردوں گا، اچانک انہوں نے دیکھا کہ ایک شیخ سواری دوڑاتے ہوئے آرہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ''الله اکبر! الله اکبر! وفاء لاغدر''.

الله اکبر! ایفاء کرو عہد شکنی نہ کرو، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو اسے چاہیے کہ نہ تو اس کی کوئی گرہ کھولے اور نہ ہی باندھے حتّٰی کہ مدّت ختم ہوجائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس قوم کو معاہدہ ختم کئے جانے کی اطلاع کردے۔{۱۲۳}

﴿۵۹﴾......ایسے لوگ بھی تھے جو خیانت، بدعہدی، ظلم اور زیادتی کے مرتکب تو ہوئے تھے مگر ابھی تک وہ عذاب سے بچے ہوئے تھے ان کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ وہ کبھی بھی گرفت میں نہیں آئیں گے یا یہ کہ وہ اللہ کو عاجز کرسکتے ہیں۔

قرآن چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے نہ معلوم کن کن نظریات کی تردید کرتا رہتا ہے، اسی جملے (یہ اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے) کی روشنی میں مذاہبِ عالم کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ایسے مذاہب بھی

{۱۲۲} بیہقی بحوالہ التفسیر المنیر ۱۰/۴۵

{۱۲۳} ابوداؤد/۲۷۵۹، ترمذی/۱۵۸۰

تھے بلکہ آج بھی ہیں جن کا خدا تھک بھی جاتا ہے، اسے نیند بھی آجاتی ہے اور اسے عاجز بھی کیا جاسکتا ہے۔

حکمت وہدایت

۱......وہ لوگ جو ایمان سے محروم ہیں وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں (۵۵)

۲......بار بار عہد شکنی یہود کی بہت پرانی عادت ہے (۵۶)

۳......اللہ کی سنت یہ ہے کہ جو قوم اور فرد ظلم اور فتنہ وفساد میں منہمک ہو جائے اسے توبہ کی توفیق نہیں ہوتی (۵)

۴......یہ بھی جنگی سیاست اور تدبیر کا ایک حصہ ہے کہ دشمن پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ دوسرے مخالفین کو عبرت حاصل ہو جائے (۵۷)

۵......خیانت اور عہد شکنی ہر صورت میں حرام ہے خواہ مسلمان کیساتھ معاملہ درپیش ہو یا کافر کے ساتھ (۵۸)

۶......اگر دشمن کی جانب سے خیانت کا خوف ہو تو مسلمان اسے اطلاع دے کر معاہدہ ختم کر سکتے ہیں (۵۸)

یہاں سوال اٹھایا گیا ہے کہ محض خیانت کے خوف اور اندیشہ کی وجہ سے معاہدہ ختم کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ خوف ایک ظنی چیز ہے جبکہ معاہدہ یقینی ہے اور اصول یہ ہے کہ یقین، گمان سے ساقط نہیں ہوتا۔

اس سوال کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہاں خوف، یقین کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ظن یقین کے معنی میں آیا ہے، اللہ فرماتے ہیں:

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ {۱۲۴} ''وہ جو کہ اپنے رب سے ملاقات کا یقین رکھتے ہیں''

دوسرا جواب یہ ہے کہ جب خیانت کے آثار ظاہر ہو جائیں تو ہمارے لئے معاہدہ کا ختم کرنا جائز ہوگا اس لئے کہ آثار ظاہر ہونے کے باوجود اگر ہم نے معاہدہ باقی رکھا تو یہ اپنے آپ کو جان بوجھ کر ہلاکت میں ڈالنے والی بات ہوگی، گویا یہ ایک ایسا موقع ہے کہ مجبوری کی بناء پر ظن سے یقین کو ساقط کیا جاسکتا ہے۔

یہ اسلام ہی ہے جس میں اتنی نزاکتوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے ورنہ دوسری قوموں، تہذیبوں اور معاشروں میں اتنی باریکیوں کو کون ملحوظ رکھتا ہے۔

یہ قیل وقال اس صورت میں ہے جب خیانت کا محض اندیشہ ہو لیکن اگر دشمن کی جانب سے عہد شکنی یقینی طور پر ثابت ہو جائے تو پھر اسے معاہدہ سے دستبرداری کی اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں جیسا کہ اہل مکہ نے جب کھلے

{۱۲۴} البقرۃ/۲/۴۶

عام عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو ہمارے آقا علیہ السلام مکہ کی طرف لشکر لے کر روانہ ہو گئے تھے۔

۷...... ہر دُشمنِ دین کا اللہ کے عذاب کی گرفت میں آنا یقینی ہے، کسی کا وقتی طور پر چھوٹ جانا ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جانے کی دلیل نہیں ہے۔(۵۹)

جنگی تیاری کا حکم اور اہلِ ایمان کی باہمی محبت

﴿۶۰......۶۴﴾

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ

اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے

وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ

دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر ان کے سوا، جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو گے

اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى

اللہ کی راہ میں وہ پورا ملے گا تم کو اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا۔ اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو تُو بھی جھک اسی طرف اور

اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ

بھروسہ کر اللہ پر بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا۔ اور اگر وہ چاہیں کہ تجھ کو دغا دیں تو تجھ کو کافی ہے اللہ، اسی نے تجھ

اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ

کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا۔ اور الفت ڈالی ان کے دلوں میں، اگر تُو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا، نہ الفت

بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ

ڈال سکتا ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے الفت ڈالی ان میں، بیشک وہ زور آور ہے حکمت والا۔ اے نبی! کافی ہے تجھ کو اللہ

مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾

اور جتنے تیرے ساتھ ہیں مسلمان۔

تسہیل: جہاں تک ممکن ہو کفار کے ساتھ مقابلہ کے لیے جنگی سامان اور پلے ہوئے گھوڑے تیار رکھو، جن سے تمہارا رعب اور خوف اللہ کے دُشمنوں، اپنے دُشمنوں اور ان کے علاوہ ایسے دُشمنوں پر قائم رہے گا جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے اور تم جو بھی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ قطعاً بے انصافی نہیں ہو گی ○ اور اگر وہ صلح پر مائل ہوں تو آپ بھی صلح پر آمادہ ہو جائیں اور انجام کو اللہ پر چھوڑ دیجیے، بلاشبہ

اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے○ اور اگر وہ آپ کو دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہوں تو اللہ آپ کے لیے کافی ہے، وہی ہے جس نے اپنی غیبی مدد اور مسلمانوں کے ذریعے آپ کی تائید کی○ اور وہی ہے جس نے اہلِ ایمان کے دلوں میں محبت ڈال دی، اگر آپ وہ سب خرچ کر دیتے جو اس دنیا میں ہے تو بھی آپ ان کے دلوں میں محبت پیدا نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ اللہ ہی تھا جس نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت ڈال دی کیونکہ وہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے○ اے میرے نبی! آپ کے لیے اور ان مومنوں کے لیے جو آپ کی اتباع کرتے ہیں، اللہ ہی کافی ہے○

﴿تفسیر﴾

﴿۶۰﴾......اسلام نہ تو رہبانیت کا مذہب ہے اور نہ ہی نظریاتی گورکھ دھندے میں الجھانے والا کوئی فلسفہ ہے، یہ تو ایک زندہ مذہب ہے جو زندگی کے سارے معاملات میں دخیل ہے، جب یہ داخلی اور خارجی، ملکی اور بین الاقوامی، معاشی اور سیاسی، عائلی اور اجتماعی، تمام معاملات میں دخل دے گا تو اس کا باطل نظاموں سے ٹکراؤ یقینی ہے، جتنے بھی باطل نظام ہیں وہ ایسے مذاہب کو تو برداشت کر سکتے ہیں جو انسان کو غاروں، جنگلوں، مندروں، گرجاؤں اور اپنے گھروں میں بیٹھ کر روحانی ترقی کا راستہ دکھاتے ہوں لیکن ایسے مذہب کو برداشت نہیں کر سکتے جو زندگی کے ہر میدان میں ان کے مقابلے میں آ کھڑا ہو، جب مقابلہ ہوگا تو جنگ بھی ہوگی، قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ دشمن سے غافل نہ ہوں اور جہاد کے لیے ہر قسم کا ساز و سامان جو ان کے بس میں ہے، فراہم رکھیں، جنگی تیاری کے سلسلے میں وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، کل اگر سیف و سناں، گھوڑوں اور اونٹوں کا فراہم کرنا ارشادِ باری تعالیٰ کی تعمیل تھی تو آج توپوں، ٹینکوں، جہازوں، آبدوزوں اور مختلف قسم کے گولہ و بارود کی تیاری اور خریداری کو قرآنی ہدایات پر عمل قرار دیا جائے گا۔{۱۲۵}

جب مسلمان معنوی تیاری کے ساتھ مادی تیاری کو بھی اہمیت دیں گے تو اللہ کے دشمنوں پر ان کی ہیبت طاری ہوگی اور انہیں یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ انسانوں کے دینِ فطرت قبول کرنے میں رکاوٹیں کھڑی کریں، یا یہ کہ وہ عالمِ اسلام کو تر نوالہ سمجھ کر جب چاہیں اس پر حملہ کر دیں۔

﴿مِن قُوَّةٍ﴾...... قرآن نے مسلمانوں کو ''قوت'' کی فراہمی پر زور دیا ہے اور ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے: ''ألا

{۱۲۵} قال اصحاب المعانی الاولیٰ ان یقال ان هذا عام فی کل ما یتقوی به علی حرب العدو وکل ما هو آلة للغزو والجهاد فهو من جملة القوة (کبیر ۱۵/۱۹۴)

إنّ القوّة الرمی"{۱۲۶}

یعنی "رمی" جنگی طاقت کا بنیادی ستون ہے، رمی کا لفظی معنی پھینکنا ہے لیکن اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہو سکتا ہے جس کے ذریعے دُشمن کو نشانہ بنایا جائے خواہ وہ کمان سے چلایا گیا تیر ہو یا بندوق، توپ، ٹینک اور طیارے سے پھینکا گیا گولہ بارود ہو۔

قربان جائیے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی خاک پر کہ آپ نے ایسا لفظ استعمال فرمایا جس کی تازگی کئی صدیاں گزرنے کے باوجود برقرار ہے۔

﴿لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ﴾ تمہاری جنگی تیاریوں اور مادی طاقت کو دیکھ کر وہ دُشمن بھی خوفزدہ ہو جائیں گے جنہیں تم جانتے ہو اور وہ بھی ضرور مرعوب ہوں گے جنہیں فی الحال تم نہیں جانتے۔{۱۲۷} یا جن کی عداوت مخفی ہے{۱۲۸} مگر اللہ ان سب کو جانتا ہے...... ان سے مراد کون لوگ ہیں؟ بنو قریظہ، اہلِ روم، اہلِ فارس، منافقین...... یہ سب اقوال تفسیروں میں منقول ہیں۔{۱۲۹}

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ﴾ سامانِ حرب کی فراہمی، اسلحہ سازی اور جنگ کرنے کے لیے مال کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے جنگی تیاری کا حکم دینے کے بعد اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے اس کا پورا پورا صلہ تمہیں دیا جائے گا اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، کسی کے اجر میں کمی کرنا بھی ظلم ہے اور نیک اور بد کے ساتھ یکساں سلوک کرنا بھی ظلم ہے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ اس ظلم کی نفی فرمائی ہے، یہاں بھی اس کی نفی کی گئی ہے، لیکن اگر سیاق وسباق کو دیکھتے ہوئے یہاں یہ معنی کیا جائے کہ جنگی تیاری پر مالی خرچ کرنے کی صورت میں دُشمن تم پر ظلم نہیں کر سکیں گے تو یہ معنی بھی بے جا نہیں ہوگا، جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات کے سوا کچھ نہیں، جب تک مسلمان دُشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے مادّی اور روحانی دونوں اعتبار سے مضبوط نہیں ہوں گے، اس کے ظلم وستم کا شکار رہیں گے، سورۂ بقرہ کی اس آیت سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ{۱۳۰} "اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو"

{۱۲۶} مسلم أمارة، ۱۶۷/ابوداؤد، جهاد، ۲۳، ۲۴/ ترمذی، تفسیر، سورة ۸

{۱۲۷} لاتعرفهم باعیانهم (روح المعانی ۳۸/۶، بیضاوی ۱۱۹/۳)

{۱۲۸} لاتعلمون الآن عداوتهم (المنار ۵۴/۱۰)

{۱۲۹} دیکھیے روح المعانی ۳۸/۶، ابی سعود ۱۰۹/۳، قرطبی ۴۰/۸

{۱۳۰} البقرة ۱۹۵/۲

اسلام اور عالمِ اسلام کے دفاع کے لیے خرچ نہ کرنا اور دُشمن کو بلا روک ٹوک چڑھ دوڑنے کا راستہ فراہم کرنے سے بڑی ہلاکت کیا ہوسکتی ہے؟

﴿۶۱﴾......اگر دُشمن صلح پر آمادہ ہوں تو اے میرے حبیب ﷺ! آپ کو بھی معاہدۂ صلح کا اختیار ہے۔{۱۳۱}

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾...... چونکہ احتمال یہ ہے کہ کہیں دُشمن صلح کے پردے میں دھوکہ نہ دینا چاہتا ہو اس لیے حکم دیا جارہا ہے کہ امکانی تدابیر اختیار کرنے کے بعد آپ اللہ پر بھروسہ کریں، اللہ سمیع بھی ہے علیم بھی ہے، وہ دُشمنانِ دین کی گفتگو کو سنتا اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے ارادوں کو جانتا ہے۔

ہمارے آقا صلی ﷺ کی سیرتِ طیبہ گواہی دیتی ہے کہ جب بھی دُشمنوں نے صلح پر آمادگی ظاہر کی آپ نے ان کی درخواست کا مثبت انداز میں جواب دیا۔

﴿۶۲﴾......سابقہ آیت کے مضمون ہی کو صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اگر بالفرض دُشمنوں نے آپ کو دھوکہ دینا چاہا تو ان کے مقابلے میں اکیلا اللہ آپ کے لیے کافی ہوجائے گا۔

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ﴾ اس سے پہلے بھی اللہ آپ کی مدد کرچکا ہے بلاواسطہ بھی اور اسباب کے واسطہ سے بھی{۱۳۲} یہ اللہ ہی تو تھا جس نے مہاجرین اور انصار کے دلوں میں ایمان کی عظمت اور آپ کی محبت ڈال دی اور پھر وہ آپ پر سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔

﴿۶۳﴾......حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جن کے دل قبولِ ایمان سے پہلے ایک دوسرے کے لیے بغض و عداوت سے بھرے ہوئے تھے، انتقام در انتقام کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہتا تھا، کبوتر کے انڈوں سے شروع ہونے والی جنگِ بعاث ۱۲۰ سال تک جاری رہی تھی، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ایک دوسرے سے اتنی محبت کرنے لگیں گے کہ حقیقی بھائیوں کی محبت بھی ہیچ رہ جائے گی، مگر پوری دنیا نے یہ معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قریشی اور اموی، عجمی اور عربی، فارسی اور رومی شیر و شکر بن گئے، ان کی وحدت کی بنیاد ایمان تھا اور محبوبِ کبریاء ﷺ کی محبت تھی۔

﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ﴾ اللہ اپنے حبیب ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر آپ پوری دنیا کا مال و متاع، سونا اور چاندی بھی خرچ کردیتے تو ان کے دلوں میں وہ محبت پیدا نہیں ہوسکتی تھی جو محض ایمان کی بنیاد پر

{۱۳۱} یقول: ان مالوا...... فمل الیها۔ (قرطبی ۸/۴۰، ابنِ کثیر ۲/۴۲۵، کبیر ۵/۵۰۰)

{۱۳۲} هوالذی ایدک بامداده من عنده بلاواسطة......الخ۔(روح المعانی ۶/۴۰، ابی سعود ۳/۱۱۰) احدهما: مایحصل من غیر واسطة......والثانی مایحصل بواسطة......الخ۔(کبیر ۵/۵۰۱)

اللہ نے پیدا فرمادی، حقیقت میں دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو دلوں کو قریب کرنے، ایثار، احسان، محبت اور اخوت جیسے جذبات پیدا کرنے میں ایمان کا مقابلہ کرسکتی ہو۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ’’رشتے ٹوٹ سکتے ہیں، احسان کا انکار کیا جاسکتا ہے مگر جن دلوں میں اللہ محبت ڈال دے انہیں کوئی چیز ایک دوسرے سے دور نہیں کرسکتی۔‘‘ {۱۳۳}

سورۂ آلِ عمران میں بھی اس محبت کا ذکر ہے، فرمایا:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا {۱۳۴}

’’اپنے اوپر اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈالی پھر تم اس کے فضل سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔‘‘

حدیث میں بھی اس تالیفِ قلبی کا ذکر ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ غزوۂ حنین کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿یا معشر الانصار، ألم أجد کم ضلالاً فھداکم اللہ بی، وعالّة فأغناکم اللہ بی وکنتم متفرّقین فألّفکم اللہ بی؟﴾ {۱۳۵}

’’اے انصار کی جماعت! کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم گمراہ تھے، اللہ نے تمہیں میرے ذریعے ہدایت دے دی؟ تم تنگدست تھے، اللہ نے میری برکت سے تمہیں خوشحالی عطا فرمائی؟ تم جدا جدا تھے اللہ نے میری صحبت سے تمہارے دلوں میں الفت پیدا فرمادی؟‘‘

﴿اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ اگر آپ اللہ کے ساتھ اپنا تعلق درست رکھیں گے اور اس پر اعتماد کریں گے تو دشمنوں کا مکروفریب، شرارتیں اور سازشیں آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے اس لیے کہ اللہ ہر چیز پر غالب ہے، بڑی سے بڑی طاقت اور چالاک سے چالاک دشمن بھی اس کے حکم پر غالب نہیں آسکتا...... وہ اپنے احکام اور افعال میں حکیم ہے، اس کا کوئی فیصلہ اور فعل حکمت سے خالی نہیں۔

﴿۶۴﴾...... اے میرے پیغمبر! آپ کے لیے بھی اللہ کافی ہے اور ان ایمان والوں کے لیے بھی اللہ کافی ہے جو آپ

{۱۳۳} مصنف عبدالرزاق، مستدرک حاکم، بحوالہ المنار: ۱۰/۶۱

{۱۳۴} آل عمران ۳/۱۰۳

{۱۳۵} بخاری، مغازی، ۵۶/ مسلم، زکاۃ، ۱۴۹

کی اتباع کرتے ہیں۔{۱۳۶}

ایمان والوں کی شان یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے لیے اللہ کو کافی سمجھیں، جیسا کہ غزوہ حمراء الاسد کے موقع پر جب مشرکین نے یہ افواہ اُڑائی کہ ہم بہت بڑا لشکر جمع کر کے دوبارہ مسلمانوں پر حملہ آور ہوا چاہتے ہیں تو انہوں نے قلتِ تعداد اور زخمی ہونے کے باوجود جواب دیا تھا: "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" (ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔)

دوسرا معنی یہ کیا گیا ہے کہ اللہ آپ کو کافی ہو جائے گا اور وہ ایمان والے کافی ہو جائیں گے جو آپ کی اتباع کرنے والے ہیں۔{۱۳۷}

گویا اس آیت میں بھی وہی مضمون آیا ہے جو آیت ۶۲ کے آخر میں ہے کہ "اللہ نے اپنی غیبی مدد اور مسلمانوں کے ذریعے آپ کی تائید کی۔"

حکمت وہدایت

۱......زمانے کے تقاضوں اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے جنگی تیاری اور سازوسامان کی فراہمی واجب ہے۔(۶۰)

۲......قیامت تک مسلمانوں کے دُشمن پیدا ہوتے رہیں گے جنہیں بہتر طور پر اللہ ہی جانتا ہے۔(۶۰)

۳...... مسلمانوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ کمزوری، کمینے دُشمن کو ظلم کی دعوت دیتی ہے اور مادی قوت و طاقت، جدید ٹیکنالوجی تک رسائی اور اسلحے کی فراہمی اس کی حوصلہ شکنی کا باعث ہوتی ہے۔ کاش! طاؤس ورباب، کرکٹ اور ہاکی، شہوت اور شہرت، مفادات اور خواہشات کے جال میں اُلجھے ہوئے مسلمان کو اپنی اس ذلت کا احساس ہو جائے جس کا سامنا عالمی سطح پر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اسے کرنا پڑ رہا ہے، اور دُشمن یہ بات سمجھ گئے ہیں کہ مسلمان صرف لمبی زندگی اور سامانِ عیش کی فراوانی چاہتا ہے خواہ اس کے لیے اسے پستی کی آخری سیڑھی تک ہی کیوں نہ اُترنا پڑے اور اس کے ذہن سے یہ بات نکل گئی ہے کہ عزت کی زندگی کے چند دن ذلت والی طویل زندگی سے کہیں بہتر ہوتے ہیں۔

۴......اللہ کی راہ میں مختلف مصارف پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے ان میں سے بہترین مصرف جہاد ہے۔(۶۰)

۵......فی ذاتہٖ جنگ مطلوب نہیں، اصل مقصد تو فتنہ وفساد کا خاتمہ ہے لہٰذا اگر دُشمن صلح پر آمادہ ہوں تو مسلمانوں کو بھی اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔(۶۱) حدیبیہ میں جاہل دُشمن کی جانب سے کڑی شرطوں کے باوجود رسول اللہ ﷺ

{۱۳۶} اللّٰه کافیك و کافی اتّباعك من المؤمنین۔ (کبیر ۵/۵۰۳، قرطبی، ۸/۴۴)

{۱۳۷} کفاك اللّٰه و کفاك اتباعك من المؤمنین۔(کبیر ۵/۵۰۳)

نے معاہدۂ صلح فرمایا تھا اور اس کے نتائج مسلمانوں کے حق میں بہت اچھے نکلے تھے، یونہی آپ نے اہلِ خیبر اور اہلِ نجران کے ساتھ بھی مصالحت فرمائی تھی۔

۶...... جن انسانوں کا اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے اللہ تعالیٰ دشمنوں کے مکر و فریب سے خود ان کی حفاظت فرماتا ہے۔(۶۲)

۷...... صحابہ کرام کے درمیان شدید محبت کا ہونا نبی اکرم ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھا، کئی صدیاں گزرنے اور مادیت پرستی کے باوجود آج بھی اہلِ اسلام کے دل میں حضورِ اکرم ﷺ کی محبت کے چراغ کا روشن ہونا بھی آپ کا ایک معجزہ ہے۔

۸...... جو خلوص، مضبوطی اور دوام ایمانی رشتے اور اسلامی محبت میں ہے وہ دنیا کے کسی اور تعلق میں نہیں ہے۔(۶۳)

۹...... مال و دولت سے وہ محبت پیدا نہیں ہوسکتی جو محبت کلمہ طیبہ کی برکت سے پیدا ہوتی ہے۔

۱۰...... آیت ۶۲ میں اللہ کے کافی ہونے ﴿حَسْبُكَ اللّٰهُ﴾ کا وعدہ اس صورت میں ہے جب دشمن دھوکہ دینے کی کوشش کرے اور آیت ۶۴ میں کافی ہونے کا وعدہ عام حالات میں ہے لہٰذا اسے تکرار پر محمول نہیں کیا جائے گا۔{۱۳۸}

ترغیبِ قتال

﴿۶۵...... ۶۶﴾

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا

اے نبی شوق دلا مسلمانوں کو لڑائی کا، اگر ہوں تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں دو سو پر اور اگر ہوں تم

مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

میں سو شخص تو غالب ہوں ہزار کافروں پر اس واسطے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اب بوجھ ہلکا کر دیا اللہ نے تم پر سے

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا

اور جانا کہ تم میں سستی ہے، سو اگر ہوں تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں دو سو پر اور اگر ہوں تم میں

مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

ہزار تو غالب ہوں دو ہزار پر اللہ کے حکم سے اور اللہ ساتھ ہے ثابت قدم رہنے والوں کے۔

{۱۳۸} الآیۃ لا یلزم منہ التکرار لان المعنی فی الآیۃ الاولی ان ارادوا خداعک کفاک اللہ امرھم والمعنی فی [illegible] ھذہ الآیۃ عام فی کل [illegible] (۱۳۸)

تسہیل: اے پیغمبر ﷺ! آپ مومنوں کو جہاد کی ترغیب دیجیے، اگر تمہارے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آ جائیں گے اور اگر اس قسم کے سو مجاہدین ہوں گے تو ہزار کافروں پر بھاری ثابت ہوں گے، اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو بصیرت سے محروم ہیں ٥ اب اللہ نے اس میں تمہارے لیے آسانی پیدا کر دی ہے اور جان لیا کہ تم میں کچھ کمی ہے تو اب حکم یہ ہے کہ اگر تمہارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دوسو پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر انہیں غلبہ حاصل ہوگا اور اللہ کی مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ٥

﴿تفسیر﴾

﴿۶۵﴾...... اللہ تعالیٰ حکم دے رہے ہیں اپنے پیغمبر ﷺ کو کہ آپ کفار کے شر اور فساد کو دفع کرنے اور حق وانصاف کا بول بالا کرنے کے لیے اہلِ ایمان کو جنگ کی ترغیب دیجیے، مسلمانوں کو صرف راتوں کے راہب ہی نہیں دنوں کے مجاہد بھی ہونا چاہیے، چونکہ اللہ کی مدد سچے مسلمانوں کے ساتھ ہے اس لیے اگر وہ تعداد میں تھوڑے بھی ہوں گے تو بھی دشمن پر غالب آ جائیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے حالات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔

﴿بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ﴾ قلت کو کثرت پر اس لیے غلبہ حاصل ہوگا کہ وہ کثرت ایسی ہے جو بصیرت سے محروم ہے، بظاہر بصیرت اور جنگ میں غلبہ کے درمیان کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن حقیقت میں ان دونوں میں گہرا تعلق ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت عطا کیا ہے وہ جنگ کی حکمت بھی جانتا ہے اور اس کے وسائل اور مقاصد سے بھی باخبر ہے، اس کے مولیٰ نے اسے بتا دیا ہے کہ جنگ میں کامیابی کے لیے مادی اور معنوی دونوں قسم کی قوت کا ہونا ضروری ہے، اموال کی فراہمی، جسمانی ورزش، جدید اسلحہ اور سامانِ حرب تک رسائی اور جاسوسی کے مؤثر نظام جیسے امور کا تعلق مادّی قوت کے ساتھ ہے اور اللہ سے دعا، اس پر یقین اور اعتماد، صبر و ثبات، شہادت کا شوق اور کثرت سے ذکرِ الٰہی کا تعلق معنوی قوت سے ہے۔

مؤمن کے پیشِ نظر، نہ دولت و شہرت ہے اور نہ ہی کسی قسم کے مادی وسائل پر غاصبانہ قبضہ، وہ تو صرف اللہ کے حکم کی سربلندی اور ظلم و زیادتی کے خاتمہ کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے، یہ بصیرت اسے ظاہری اور باطنی اعتبار سے انتہائی مضبوط بنا دیتی ہے اور اس کے دل کو یقین سے بھر دیتی ہے اور وہ عددی اعتبار سے کمزور ہونے کے باوجود طاقتور دشمن سے ٹکرا جاتا ہے۔

﴿۶۶﴾...... پہلے حکم یہ دیا گیا کہ دس مسلمانوں کو دوسو کفار کا مقابلہ کرنا چاہیے لیکن بعد میں آسانی پیدا کر دی گئی اور

فرمادیا گیا کہ دس کا مقابلہ اگر بیس کے ساتھ ہو تو انہیں بھاگنے کی اجازت نہیں لیکن دُشمن کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہو تو مسلمانوں کو جنگ سے دستبردار ہونے کی رخصت ہے اگر چہ عزیمت یہی ہے کہ وہ ڈٹ جائیں، شہید ہونا قبول کرلیں مگر راہِ فرار اختیار نہ کریں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عزیمت پر عمل کرنے والے تھے، آپ جنگِ موتہ کو دیکھ لیجیے، جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں حضورِ اکرم ﷺ نے تین ہزار کا لشکر ملکِ شام کی طرف روانہ کیا، دُشمن کی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی، مسلمانوں کو اتنی بڑی تعداد کا اندازہ نہ تھا، ایک کا چھیاسٹھ سے مقابلہ تھا، بعض مجاہدین کی رائے یہ تھی کہ اتنے بڑے لشکر کے مقابلے میں نہیں آنا چاہیے لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر لوگوں کی ہمت بڑھائی کہ ''اے میری قوم! اللہ کی قسم جس شہادت کو تم ناپسند سمجھ رہے ہو حقیقت میں تم اسی کی تلاش میں نکلے ہو، ہم کفار سے جنگ، تعداد، طاقت اور کثرت کی بنیاد پر نہیں کرتے بلکہ ہم تو لوگوں سے جنگ اس دین کی بنیاد پر کرتے ہیں جس کے ذریعے اللہ نے ہمیں عزت عطا فرمائی ہے لہٰذا چلو، دو کامیابیوں میں سے ایک کامیابی تو تمہیں ضرور ملے گی یا دُشمن پر غلبہ یا اللہ کے راستہ کی شہادت۔'' اس پر لوگوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! ابنِ رواحہ نے صحیح کہا ہے، چنانچہ مسلمانوں نے اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر کا مقابلہ بڑی جرأت اور ثابت قدمی سے کیا۔{۱۳۹}

آپ جنگِ یرموک کے حالات کا مطالعہ کیجیے جب چوبیس ہزار صحابہ نے دو لاکھ سے زائد کفار کا مقابلہ کرتے ہوئے ستر ہزار رومیوں کو مردار کیا تھا۔

﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ قرآنِ کریم میں ''اذن'' کا لفظ اجازت، ارادہ، مشیت، توفیق، سنتِ الٰہیہ اور تقدیر وغیرہ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے، یہاں اسے مشیت کے معنی میں بھی لیا گیا ہے، اور توفیق کے معنی میں بھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ {۱۴۰}

''کتنی ہی بار ایسا ہو چکا ہے کہ چھوٹی سی جماعت اللہ کی توفیق سے بڑی جماعت پر غالب آ گئی۔''

﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ایمان والوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ نصرت اور غلبہ کے لیے صرف مسلمان ہونا کافی نہیں ہے چند دوسرے اوصاف کا ہونا بھی ضروری ہے جن میں سے اہم ترین صبر اور ثابت قدمی ہے، یہ ایسا وصف ہے جس کی طرف مسلمانوں کو قرآنِ کریم میں بار بار متوجہ کیا گیا ہے، اسی سورت میں ہم پڑھ چکے ہیں:

{۱۳۹} تفصیل کے لیے دیکھیے حیاۃ الصحابہ تالیف مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ۔ (حصہ اوّل/صفحہ ۳۹۴)

{۱۴۰} البقرۃ ۲/۲۴۹

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِیۡتُمۡ فِئَةً فَاثۡبُتُوۡا {۱۴۱} ''اے ایمان والو! جب کفار کی کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدم رہو۔''

سورۂ صف میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ۝ {۱۴۲} ''بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

حکمت وہدایت

۱...... ہر زمان اور ہر مکان میں مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینا اور اس پر اُبھارنا واجب ہے۔ (۶۵)

۲...... سچے مؤمن کا سینہ حکمت وبصیرت کے نور سے روشن جبکہ کافر اس سے محروم ہوتا ہے، اس کی محرومی کے تین پہلو بالکل نمایاں ہیں:

(الف) ہدف کے اعتبار سے...... کافر کی نظر میں اصل زندگی دنیا کی ہے، آخرت کی اس کے دل میں کوئی اہمیت نہیں جبکہ مومن کی سوچ یہ ہے کہ حقیقی زندگی تو بس آخرت کی ہے، یہ سوچ اس کے لیے جان کا قربان کر دینا آسان کر دیتی ہے۔

(ب) وسائل کے اعتبار سے...... کافر کا سارا اعتماد مادی وسائل پر ہوتا ہے جبکہ مسلمان اللہ پر توکل کرتا ہے، حتی المقدور تیاری کے بعد اس کے ہاتھ بارگاہِ الوہیت میں اُٹھ جاتے ہیں۔

(ج) جذبات اور بواعث کے اعتبار سے...... کافر کا دل نورِ ایمان اور اللہ کی محبت اور معرفت سے خالی ہوتا ہے، اس لیے میدانِ جنگ میں اس پر بزدلی چھا جاتی ہے جبکہ مؤمن کا دل معرفت اور محبت کی برکت سے مضبوط ہوتا ہے اور محبوبِ حقیقی سے وصال کا شوق اسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

۳...... اگر دُشمن کی تعداد مسلمانوں کے برابر ہو یا ان سے دو گنا ہو تو بھی مقابلہ سے گریز کرنا جائز نہیں۔ (۶۶)

ایک سوال ذہن میں اُٹھتا ہے جس کا جواب مفتیانِ کرام کو ضرور تلاش کرنا چاہیے وہ یہ کہ کیا فرار کے جواز اور عدمِ جواز کے لیے تعداد ہی واحد معیار ہے یا اس میں اسلحہ کا بھی کوئی دخل ہے؟ آج صورت یہ ہے کہ زمینی، فضائی اور بحری

{۱۴۱} الانفال ۸/۴۵

{۱۴۲} الصف/۶۱/۴

طاقت سے لیس اور مہلک ہتھیاروں سے مسلح پچاس یا سو افراد ایک لاکھ بلکہ کئی لاکھ نہتے انسانوں پر بھاری ثابت ہوتے ہیں، ان نہتے انسانوں کو ڈٹے رہنے کا حکم دینے کا نتیجہ لاشوں کے انبار اور ذلت آمیز شکست کے سوا کچھ نہیں، کیا کوئی عقلمند سوچ بھی سکتا ہے کہ توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کا مقابلہ گدھوں اور خچروں پر سوار ہو کر غلیلوں یا بندوقوں سے کیا جا سکتا ہے؟۔ "كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ" {۱۴۳} جیسی آیات پڑھ کر خون گرمانے والے خطباء یہ نہیں سوچتے کہ جس جماعت کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی اس جماعت کا دشمن بھی تیر و تفنگ ہی استعمال کر رہا تھا، ہیلی کاپٹر اور ہائیڈروجن بم اس کے پاس نہیں تھے، دورِ حاضر کے مسلمان دشمنانِ اسلام سے مقابلے کے حوالے سے تین گروہوں میں تقسیم ہیں:

ایک گروہ تو ان ماڈرن مسلمانوں کا ہے جو ہر شعبے میں مغرب کی بالادستی کو فکری اور عملی طور پر قبول کر چکے ہیں اور جنہیں جہاد کا نام سن کر الرجی ہو جاتی ہے۔

دوسرا گروہ ان اہلِ ایمان کا ہے جو جہاد کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود عملی طور پر کوئی قدم اُٹھانے کے لیے تیار نہیں۔

تیسرا گروہ ان جوشیلے نوجوانوں کا ہے جو سنجیدہ تیاری اور نظم کی پابند جماعت کے بغیر چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں ہر ملک میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا امیر اور اپنا اپنا منشور ہے، انہیں اگر کافر ہاتھ نہ لگیں تو یہ آپس ہی میں ٹکرا کر شوقِ جہاد پورا کر لیتے ہیں۔

۴.....اللہ کی نصرت اور تائید ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر و ثبات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

۵.....صبر، بزدلی، کمزوری اور بے بسی کا نام نہیں ہے یہ تو اعلیٰ ترین صفت ہے جو مجاہدوں اور بہادروں کو عطا کی جاتی ہے۔

۶.....نفس اور شیطان کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی صبر ضروری ہے اور کفار اور مشرکین کو شکست دینے کے لیے بھی صبر ضروری ہے۔

{۱۴۳} سورۂ بقرۃ ۲۴۹

جنگی قیدی اور ان کا فدیہ

﴿۶۷......۷۱﴾

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ

نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو جب تک خوب خون ریزی نہ کرلے ملک میں، تم چاہتے ہو

الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ

اسباب دنیا کا اور اللہ کے ہاں چاہیے آخرت اور اللہ زور آور ہے حکمت والا۔ اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا

فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ

اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اسلینے میں بڑا عذاب۔ سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں ملا حلال ستھرا اور ڈرتے رہو

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٦٩﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ

اللہ سے بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔ اے نبی! کہہ دے ان سے جو تمہارے ہاتھ میں ہیں قیدی، اگر

إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ

جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ نیکی تو دیگا تم کو بہتر اس سے جو تم سے چھن گیا اور تم کو بخشے گا اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٧٠﴾ وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ

اور اگر چاہیں گے تجھ سے دغا کرنی سو وہ دغا کر چکے ہیں اللہ سے اس سے پہلے، پھر اس نے ان کو پکڑوا دیا اور اللہ سب کچھ

وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٧١﴾

جاننے والا حکمت والا ہے۔

تسہیل: کسی نبی کے لیے مناسب نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ میدانِ جنگ میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے، تم دنیا کا مال و اسباب چاہتے ہو جبکہ اللہ کے پیشِ نظر تمہاری آخرت کی کامیابی ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے ○ اگر وہ فیصلہ نہ ہوتا جو اللہ کی طرف سے پہلے ہی لکھا جا چکا تھا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کی وجہ سے تمہیں بڑی سزا کا سامنا کرنا پڑتا ○ پس جو کچھ تم نے کافروں سے لیا ہے اس کے کھانے کی تمہیں اجازت ہے اس لیے کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور بڑا مہربان ہے ○ اے میرے پیغمبر! آپ کے قبضے میں جو قیدی ہیں ان سے فرما دیجیے کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں خیر کا جذبہ دیکھے گا تو تمہیں اس سے کہیں بہتر عطا کرے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا، اللہ بہت بخشنے والا اور از حد رحم فرمانے والا ہے ○

اور اگر بالفرض یہ آپ سے خیانت کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے یہ اللہ سے بھی خیانت کر چکے ہیں اسی لیے اللہ نے انہیں بطور سزا کے آپ کے قابو میں دے دیا اور اللہ علیم وحکیم ہے O

﴿تفسیر﴾

شانِ نزول

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا اور فرمایا: ''اللہ نے انہیں تمہارے قابو میں دے دیا ہے تو ان کے بارے میں مجھے مشورہ دو کہ کیا کرنا چاہیے؟'' حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: ''یارسول اللہ! ان سب کی گردن اُڑا دی جائے۔'' حضورِ اکرم ﷺ نے ان سے اعراض فرمایا اور دوبارہ اپنی اپنی رائے پیش کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ''اے لوگو! اللہ نے انہیں تمہارے قابو میں دے دیا ہے اور یہ مت بھولو کہ کل تک وہ تمہارے بھائی تھے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ کھڑے ہو کر وہی کچھ کہا جو پہلے کہہ چکے تھے مگر ان کی رائے قبول نہ کی گئی، جب تیسری بار آقا ﷺ نے مشورہ دینے کے لیے فرمایا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! ہمارا خیال یہ ہے کہ انہیں معاف کر دیا جائے اور ان سے فدیہ قبول کر لیا جائے۔'' ان کی رائے سن کر آقا کے چہرے پر چھائی ہوئی غم کی کیفیت ختم ہوگئی۔ چنانچہ آپ نے ان قیدیوں کو معاف کرتے ہوئے ان سے فدیہ قبول فرمالیا۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾ {۱۴۴}

''اگر پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بات لکھی ہوئی نہ ہوتی، تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس بارے میں تمہیں کوئی بڑی سزا ہوتی''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بدر کے دن جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! یہ آپ ہی کی قوم اور خاندان کے افراد ہیں، اگر آپ ان سے فدیہ قبول کرتے ہوئے انہیں زندہ رہنے دیں تو ممکن ہے اللہ انہیں توبہ کرنے کی توفیق دے دے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آپ کو جھٹلایا اور وطن سے بے وطن کیا لہٰذا آپ اُنھیں اور ان کی گردنیں اُڑا دیں۔'' حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

{۱۴۴} ابنِ کثیر ۳۲۸/۲، مسند احمد ۲۴۳/۳

''یارسول اللہ! آپ اس وقت ایسی وادی میں مقیم ہیں جس میں خشک لکڑیاں بہت ہیں، مناسب ہوگا کہ پوری وادی میں آگ لگادی جائے اور انہیں اس میں ڈال دیا جائے۔'' یہ سب کچھ سن کر رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے اور آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر آپ حجرۂ مبارکہ میں چلے گئے، آپ کے جانے کے بعد کسی نے کہا کہ آپ حضرت ابوبکر کی رائے پر عمل کریں گے، کسی نے حضرت عمر اور کسی نے عبداللہ بن رواحہ کا نام لیا، کچھ دیر کے بعد آپ تشریف لائے اور فرمایا کہ ''اللہ بعض لوگوں کے دل نرم فرما دیتا ہے حتیٰ کہ وہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتے ہیں اور اللہ بعض لوگوں کے دلوں کو سخت کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں، اے ابوبکر! آپ کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سی ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۱۴۵}

''جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہوگا اور جس نے نافرمانی کی تو آپ غفور رحیم ہیں''

اسی طرح اے ابوبکر! آپ کی مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ {۱۴۶}

''اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو تُو غالب اور حکمت والا ہے۔''

اور اے عمر! آپ کی مثال موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ جنہوں نے کہا تھا:

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيْمَ {۱۴۷}

''اے اللہ! ان کے مالوں کو تباہ کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ دردناک عذاب کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔''

اور اے عمر! آپ کی مثال نوح علیہ السلام کی ہے جنہوں نے بارگاہِ ایزدی میں دعا فرمائی تھی:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا {۱۴۸}

''اے اللہ! زمین پر کافروں میں سے کسی بشر کو زندہ نہ چھوڑ۔''

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی رہا نہ ہوگا، الا یہ کہ فدیہ دے یا اس کی گردن اُڑائی جائے۔ ابنِ مسعود کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ''حضور ماسوائے سہل بن بیضاء کے کیونکہ وہ اسلام کی توہین کیا کرتا تھا۔'' اس پر حضور ﷺ خاموش ہو گئے، ابنِ مسعود فرماتے ہیں کبھی اس دن سے زیادہ مجھ پر خوف طاری نہ ہوا تھا، میں یہ سمجھتا تھا

{۱۴۵} الابراہیم/۳۶

{۱۴۶} المائدۃ/۱۱۸

{۱۴۷} یونس/۸۸

{۱۴۸} نوح /آیت ۲۶

کہ ابھی آسمان سے مجھ پر پتھر برسنے لگیں گے، یہاں تک کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ماسوائے سہل بن بیضاء کے......''
اس پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُوْنَ لَهٗٓ أَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ {۱۴۹}

''نہیں مناسب نبی کو کہ اس کے ہاتھ میں قیدی ہوں جب تک کہ زمین میں اچھی طرح خونریزی نہ ہو جائے''

آیات کی تفسیر سے قبل ایک اور پہلو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ غزوۂ بدر اسلام میں سب سے پہلا غزوہ تھا، اس وقت تک جہاد، مالِ غنیمت اور قیدیوں کے بارے میں تفصیلی احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ مالِ غنیمت کے متعلق پہلی شریعتوں میں حکم یہ تھا کہ اس سے نفع اُٹھانا جائز نہیں، غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو خلافِ توقع فتح حاصل ہوئی، مالِ غنیمت بھی ہاتھ آیا اور ستر مشرک سرداروں کو بھی مسلمانوں نے گرفتار کرلیا، سپہ سالارِ اعظم ﷺ نے اپنی سنت اور عادت کے مطابق صحابہ سے مشورہ کیا تو کسی نے ان قیدیوں کو قتل کرنے اور کسی نے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا حکم دیا، یہ اختلاف حلال اور حرام کا نہیں صرف مستحب اور غیر مستحب کا تھا، اللہ کے نزدیک پہلی صورت زیادہ پسندیدہ تھی کیونکہ ایک تو اس وقت کے مخصوص حالات میں متکبروں اور منکروں کے گروہ پر کاری ضرب لگانے کی ضرورت تھی تاکہ وہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کے قابل نہ رہیں۔ دوسرا اس پر عمل کرنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا کہ مسلمانوں کے نزدیک سب سے اہم چیز ایمان ہے، خونی رشتے، نسبی قرابتداریاں اور مالی فوائد اس کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے جبکہ فدیہ لینے سے بظاہر یہ ثابت ہوتا تھا کہ ان کی نظر مالی مفادات پر ہے اور یہ ایسی چیز تھی جس کا صحابہ کرام جیسی عظیم جماعت میں ہونا اللہ کو پسند نہ تھا، اس لیے کہ اس جماعت کو قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے آئیڈیل اور نمونہ بننا تھا۔

اب آیئے آیات کی تفسیر سے ایمانی نور حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

﴿۶۷﴾......نہ تو اللہ کے نبی کے لیے یہ بات مناسب ہے اور نہ ہی جنگ کی مصلحت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ دُشمن کو اچھی طرح ذلیل وخوار {۱۵۰} کرنے اور اس کی صفوں میں خونریزی {۱۵۱} سے پہلے اسے قید کرنے کے بارے میں سوچا جائے، اس لیے کہ اگر میدانِ جنگ میں دُشمن کے ساتھ نرمی کی جائے گی تو وہ اسے مسلمانوں کی

{۱۴۹} ابنِ کثیر ۲/۴۲۸-۴۲۹، روح المعانی ۶/۴۹، ترمذی ۲/۱۳۹ باختصار۔
{۱۵۰} یعنی یذلّ الکفر۔(کشاف ۲/۲۲۳)، حتّٰی یذلّ الکفر۔(روح المعانی ۶/۴۸)
{۱۵۱} ای یکثر القتل ویبالغ فیہ۔ (ابی سعود ۳/۱۱۳)، ای یبالغ فی قتل اعدائہ۔ (نظم الدرر ۳/۲۴۴)

کمزوری پر محمول کرے گا، کمینے دُشمن کا علاج یہ ہے کہ پوری قوت کے ساتھ اس پر حملہ کر کے اس کی اکڑی ہوئی گردن توڑ دی جائے اور اس پر ایسا خوف طاری کر دیا جائے کہ وہ دھما چوکڑی بھول جائے۔

اگر غزوۂ بدر میں مشرکین کو گرفتار کرنے کے بجائے ان کے قتل پر زیادہ توجہ دی جاتی تو ان کی عددی قوت اور بھی کم ہو جاتی اور انہیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی دوبارہ جرأت نہ ہوتی۔

اگر قرآن دُشمنوں کی گردن توڑنے اور انہیں قتل کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ توریت میں اس سے بھی زیادہ سخت احکام آئے ہیں، جب دُشمن کے شہر پر قبضہ ہو جائے تو توریت کہتی ہے:

''جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دیوے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکیوں اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لیے لے۔'' {۱۵۲}

''لیکن ان قوموں کے شہروں میں سے جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دے گا تو کسی ذی روح کو زندہ نہ رہنے دے۔''

توریت کتابِ عدد کی آیت ۷ سے ۳۵ تک جو مضمون ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ''موسیٰ علیہ السلام نے مدیانیوں پر قبضے کے بعد ان کے گھروں اور چھاؤنیوں کو آگ سے پھونک دیا، سارے لڑکوں اور شادی شدہ عورتوں کو مار ڈالا اور کنواریوں کو سرداروں کے لیے رکھ لیا جن کی تعداد بتیس ہزار تھی۔''

﴿تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا﴾ مشرک قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہاری نظر دنیاوی مفادات پر ہے جبکہ اللہ تمہاری آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اور یہ بھلائی تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب عارضی فوائد کو نظر انداز کر دیا جائے، اللہ کی رضا اور دین کی سربلندی کے لیے اگر خون بھی بہانا پڑے تو اس سے دریغ نہ کیا جائے۔

﴿وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ اللہ خود بھی غالب ہے اور اپنے فرمانبردار بندوں کو بھی غالب دیکھنا چاہتا ہے، وہ حکیم ہے اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں، مؤمنوں کو بھی چاہیے کہ وہ حکمت کو اپنا سرمایہ سمجھیں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو حکمت کے خلاف ہو، بدر میں اگر مسلمان کافروں کا خوب خون بہاتے تو انہیں غلبہ بھی حاصل ہوتا اور ان کا یہ عمل جنگی حکمتِ عملی کے بھی عین مطابق ہوتا۔

﴿۶۸﴾...... اگر اللہ کی طرف سے وہ حکم نہ ہوتا جو لوحِ محفوظ میں پہلے ہی لکھا جا چکا تھا تو تم نے مال کے بدلے قیدیوں کو چھوڑنے کا جو فیصلہ کیا اس پر تمہیں اللہ کی طرف سے بڑی سزا کا سامنا کرنا پڑتا، یہ کون سا فیصلہ تھا جو اللہ کی طرف

{۱۵۲} استثناء: ۲۰-۱۳، ۱۴

سے ہو چکا تھا؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

(۱)......اجتہادی غلطی پر سزا نہیں دی جائے گی اس لیے کہ اجتہادی غلطی کرنے والے کے سامنے بھی جواز کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے جیسے اصحابِ بدر کا خیال تھا کہ قیدیوں کو اگر رہا کر دیا جائے تو ممکن ہے ان میں سے بعض کو اللہ قبولِ اسلام کی توفیق دے دے چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور یہ کہ ان سے لیے جانے والا فدیہ مسلمانوں کی معاشی حالت درست کرنے اور جہاد کی تیاری میں کام آئے گا۔

(۲)......اہلِ بدر کے بارے میں لوحِ محفوظ میں یہ لکھا جا چکا تھا کہ انہیں عذاب نہیں دیا جائے گا اس لیے کہ ان سب کی مغفرت کا فیصلہ اللہ فرما چکے۔

(۳)......سورۂ انفال کی آیت ۳۳ میں یہ بات گزر چکی کہ جب تک حضورِ اکرم ﷺ موجود رہیں گے اور لوگ استغفار کرتے رہیں گے، اللہ مشرکوں کو بھی عذاب نہیں دے گا تو اگر آپ کے وجودِ مسعود اور مشرکوں کے توبہ واستغفار کی وجہ سے مشرک عذاب سے محفوظ رہ سکتے ہیں تو اہلِ ایمان کو ان دو چیزوں سے فائدہ کیوں نہیں حاصل ہوگا۔{۱۵۳}

(۴)......ترمذی میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مالِ غنیمت ہم سے پہلے کسی اُمت کے لیے حلال نہیں تھا۔{۱۵۴}

بدر کے موقع پر جب مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے حالانکہ ابھی تک ان کے لیے مالِ غنیمت حلال نہیں کیا گیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ مالِ غنیمت کے حلال ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کا یہ اقدام ایسا گناہ تھا کہ اس پر عذاب آ جانا چاہیے تھا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا تھا کہ اس اُمت کے لیے مالِ غنیمت حلال کیا جائے گا اس لیے مسلمانوں کی اس خطاء پر عذاب نازل نہیں کیا گیا۔{۱۵۵}

ان کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں اور ان میں کوئی تضاد بھی نہیں لہٰذا سارے ہی مراد لیے جا سکتے ہیں۔

﴿۶۹﴾......اگرچہ تمہارا قیدیوں کے بدلے فدیہ لینا اللہ کے حکم اور اس کی اجازت کے بغیر تھا لیکن چونکہ لوحِ محفوظ میں اسے تمہارے لیے حلال کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا اس لیے مالِ غنیمت ہو یا فدیہ سب کے استعمال کی تمہیں اجازت

{۱۵۳} تفسیر مظہری/۵/۱۶۹

{۱۵۴} ترمذی تفسیر سورۃ ۸/ مسلم جہاد ۴۲/ مسند احمد ۲/۲۱۲

{۱۵۵} تفسیر مظہری ۵/۱۶۹

دی جاتی ہے، یہ تمہارے لیے حلال بھی ہے اور اپنی ذات کے اعتبار سے پاک بھی ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اللہ کے حکموں کی مخالفت کرنے میں اس سے ڈرتے رہو، صرف اسی مال کو اپنے استعمال میں لانا جس کی تمہیں اجازت دی جائے، حرام اور ناپاک مال کے قریب بھی نہ جانا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ اس کے غفور ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ فدیہ لینے کی صورت میں تم سے جو غلطی ہوئی اسے معاف کر دیا جائے اور اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ تم مشرکین سے لے چکے ہو اسے تمہارے لیے حلال کر دیا جائے۔

شانِ نزول

﴿۷۰﴾......: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قریش نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے اور فدیہ کی ادائیگی کے لیے ایک وفد بھیجا، ہر قوم اپنے قیدیوں کو چھڑا کر لے گئی، جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فدیے کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! میں تو مسلم تھا۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آپ کے اسلام کے بارے میں صحیح علم اللہ کو ہے، اگر معاملہ اسی طرح ہے جس طرح تم کہتے ہو تو اللہ تمہیں جزا دے گا جہاں تک ظاہر داری کا تعلق ہے تو تم ہمارے خلاف تھے لہٰذا آپ اپنا، اپنے دو بھتیجوں نوفل بن حارث بن عبدالمطلب اور عقیل بن ابی طالب بن عبدالمطلب کا فدیہ دیں، نیز اپنے حلیف عتبہ بن عمر بنی حارث بن فہر کے بھائی کا فدیہ بھی دیں۔'' اس پر انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس ان لوگوں کا فدیہ کہاں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ مال کہاں ہے جو آپ نے اور ام الفضل نے دفن کیا تھا اور آپ نے اسے کہا تھا کہ اگر میں سفر میں مر گیا تو یہ مال جو دفن کیا گیا ہے بنی فضل عبداللہ اور قثم کا ہوگا، اس پر انہوں نے کہا: ''خدا کی قسم! میں جانتا ہوں کہ آپ رسولِ خدا ہیں، یہ تو وہ راز ہے جو میرے اور اُمِ فضل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' لہٰذا آپ لوگوں نے مجھ سے جو چوبیس اوقیہ مال لیا ہے اسے فدیہ کی رقم میں حساب کر لیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا، وہ تو مالِ غنیمت تھا جو اللہ نے ہمیں تم سے دلوا دیا۔ اس پر حضرت عباس نے اپنا، اپنے دو بھتیجوں کا اور اپنے حلیف کا بھی فدیہ دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْۤ اَیْدِیْكُمْ﴾ {۱۵۶}

اس آیت میں قیدیوں پر یہ بات واضح کی گئی کہ اگر تمہارے دل میں واقعی ایمان، اخلاص اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا جذبہ ہوگا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں دیا جائے گا اور تم سے کفر و شرک وغیرہ کی

{۱۵۶} ابن کثیر ۲/۴۳۱

صورت میں جتنے بھی گناہ ہوئے وہ سب معاف کر دیئے جائیں گے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اظہارِ اسلام کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں اس وعدہ کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کیونکہ مجھ سے صرف بیس اوقیہ سونا فدیہ میں لیا گیا تھا جبکہ اس وقت میرے بیس غلام مختلف جگہوں میں کاروبار کر رہے ہیں اور کسی کا کاروبار بیس ہزار درہم سے کم کا نہیں ہے اور اس پر مزید انعام یہ کہ مجھے حاجیوں کو زمزم پلانے کی خدمت مل گئی ہے جو میرے نزدیک اتنا بڑا انعام ہے کہ میں سارے اہلِ مکہ کے اموال کو اس کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا ہوں۔{۱۵۷}

﴿۷۱﴾......اے ہمارے پیغمبر! اگر یہ لوگ زبان سے اظہارِ اسلام کے ذریعہ آپ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں تو آپ پریشان نہ ہوں یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، کیونکہ یہ تو اللہ کے ساتھ بھی خیانت کر چکے ہیں، انہوں نے میثاقِ ازل میں اپنے ربّ کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا مگر دنیا میں اس قول و قرار کو بھلا دیا، اسی طرح اللہ نے اپنی توحید اور قدرت پر جو عقلی اور تکوینی دلائل قائم کیے ہیں انہیں نظر انداز کرتے ہوئے یہ کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے اور سمجھنے لگے کہ کوئی بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا لیکن اللہ نے آپ کو قدرت دی اور وہ بدر کے میدان میں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئے، اگر انہوں نے دوبارہ خیانت اور عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو انہیں کسی نہ کسی صورت میں دوبارہ اللہ کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ ان کی نیتوں اور خیانت پر مبنی تدبیروں کو جانتا ہے اور اس کی ہر تدبیر اور کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

حکمت و ہدایت

۱......جہاد کے بارے میں امتِ مسلمہ کے قائدین کو یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ دشمنوں کو قیدی بنانے اور پھر انہیں فدیہ لے کر یا فدیہ کے بغیر چھوڑنے کا اس وقت تک فیصلہ نہ کریں جب تک دشمن کو خوب خوفزدہ نہ کر دیں۔(۶۷)

تیس سے زیادہ قرآنی آیات ہیں جنہیں ''موافقاتِ عمر'' میں سے شمار کیا گیا ہے{۱۵۸} یعنی جو رائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیش کی اسی سے ملتا جلتا حکم اللہ نے نازل فرما دیا...... یہ آیتِ کریمہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔

۲......قیدیوں کو چھوڑنے کے بارے میں قدرے تفصیلی حکم سورۂ محمد میں آیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{۱۵۷} روح المعانی ۶/۵۳

{۱۵۸} وهذه الآية إحدى موافقات الوحي لرأي عمر، وقد بلغت بضعا وثلاثين۔ (تفسیر منیر ۱۰/۷۵)

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا {۱۵۹}

''جب تمہارا کافروں سے مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں اُڑا دو، حتیٰ کہ جب تم خوب خونریزی کر چکو تو انہیں مضبوطی سے باندھ لو پھر اس کے بعد یا تو ان پر احسان کر دو یا تاوان لے کر چھوڑ دو یہاں تک کہ لڑائی ختم ہو جائے''

اس آیتِ کریمہ میں قیدیوں کے بارے میں مسلمانوں کو چار اختیارات دیئے گئے ہیں:

(۱) سب کو قتل کر دیا جائے (۲) غلام بنا لیا جائے (۳) تاوان لے کر چھوڑ دیا جائے (۴) تاوان لیے بغیر بطور احسان رہا کر دیا جائے......

پانچویں صورت بھی بعض حضرات نے لکھی ہے وہ یہ کہ مسلمان قیدیوں کے ساتھ تبادلہ کر لیا جائے۔

لیکن اگر جنگ کسی ایسے دُشمن سے ہو جس کے ساتھ مسلمانوں نے قیدیوں کو قتل نہ کرنے اور غلام نہ بنانے کا معاہدہ کر رکھا ہو (جیسا کہ آج کل جو ممالک اقوامِ متحدہ کے رکن ہیں انہوں نے اس معاہدے پر دستخط کر رکھے ہیں) تو اس صورت میں قیدیوں کو نہ تو قتل کرنے کی اجازت ہوگی اور نہ ہی غلام بنانے کی۔

۳......مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کے فوائد پر نظر رکھیں۔(۶۷)

۴......اجتہادی خطا اللہ کے نبی سے بھی ہو سکتی ہے جس کے جواز میں تو کوئی شک نہیں ہوتا البتہ اسے زیادہ سے زیادہ خلافِ اولیٰ کہہ سکتے ہیں، جیسے یہاں پر کفار کا قتل بھی جائز تھا اور انہیں تاوان کے بدلے رہا کرنا بھی جائز تھا، آپ نے دوسری صورت اختیار فرمائی جبکہ اللہ کے نزدیک بعض مصلحتوں کی بناء پر پہلی صورت زیادہ بہتر تھی۔(۶۸)

۵......اس اُمت کے لیے مالِ غنیمت نہ صرف حلال بلکہ انتہائی پاکیزہ مال ہے۔(۶۹)

۶......اسلام، دُشمن کو اس لیے قید نہیں کرتا کہ اس کا استحصال کرے یا اس کی بے بسی و کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس سے انتقام لے بلکہ اسلام قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دیتا ہے، اگلی سطروں میں ہم جو حدیث نقل کرنے والے ہیں وہ اگرچہ غلاموں کے بارے میں ہے لیکن اگر غلاموں کے یہ حقوق ہو سکتے ہیں جن کا شمار انسانی تاریخ کے سب سے مظلوم طبقہ میں ہوتا ہے تو کیا قیدیوں کے یہ حقوق نہیں ہوں گے؟

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کے بارے میں فرمایا یہ تمہارے بھائی ہیں، اللہ نے ان کو تمہارا محکوم اور ماتحت بنایا ہے تو اللہ جس کے ماتحت کسی کو کر دے اسے چاہیے کہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے اور اسے کسی ایسے کام کا حکم نہ دے جو اس کے لیے بہت بھاری ہو اور اگر

{۱۵۹} محمد، ۴/۴۷

ایسے کام کا اسے حکم دے تو اسے چاہیے کہ وہ خود اس کام میں اس کی مدد کرے۔{۱۶۰}

۷...... جن قیدیوں کے دل میں نورِ فطرت جگمگا رہا ہو، کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کفر سے توبہ کر کے اسلام قبول کرلیں۔(۷۰)

۸...... حضورِ اکرم ﷺ عدل اور مساوات کے علمبردار اور ہر حال میں قانون کی پابندی کرنے والے انسان تھے، جب قیدیوں سے تاوان لینے کا فیصلہ ہو گیا تو آپ نے بعض صحابہ کی سفارش اور درخواست کے باوجود حقیقی چچا سے بھی کوئی رعایت نہیں فرمائی۔

۹...... دل میں بھلائی کا جذبہ رکھنا بھی انتہائی فضیلت والا عمل ہے، اللہ اس کا صلہ ضرور عطا فرماتا ہے۔(۷۰)

۱۰...... خیر کا اطلاق ایمان اور قرآن پر بھی ہوتا ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ حقیقی خیر تو بس یہی ہیں۔(۷۰)

۱۱...... انسان اللہ کے لیے جو کچھ دیتا ہے اسے اس کا عوض ضرور دیا جاتا ہے۔(۷۰)

۱۲...... بڑے سے بڑا مکار، دھوکہ باز اور خائن نہ تو اللہ کی تدبیر کو شکست دے سکتا ہے اور نہ ہی بھاگ کر کہیں چھپ سکتا ہے۔(۷۱)

۱۳...... جو لوگ اللہ کے دین کی دعوت اور انسانوں کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں، ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔(۷۱)

اہلِ ایمان کی قسمیں اور ان کے احکام

﴿۷۲......۷۵﴾

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا

جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور لڑے اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے جگہ دی

وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم

اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا، تم کو ان کی رفاقت سے

مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ

کچھ کام نہیں جب تک وہ گھر نہ چھوڑ آئیں اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں دین میں تو تم کو لازم ہے

{۱۶۰} بخاری، ایمان، ۲۲، عتق ۱۵، ادب ۴۴/ مسلم، ایمان ۳۸، ۳۹، ۴۰

إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٧٢﴾ وَالَّذِينَ

ان کی مدد کرنی مگر مقابلہ میں ان لوگوں کے کہ ان میں اور تم میں عہد ہو اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے۔

كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿٧٣﴾

اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اگر تم یوں نہ کرو گے تو فتنہ پھیلے گا ملک میں اور بڑی خرابی ہوگی۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ

اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور لڑے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی

آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٧٤﴾ وَالَّذِينَ

اور ان کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان، ان کے لئے بخشش ہے اور روزی عزت کی۔ اور جو ایمان لائے

آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ

اس کے بعد اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے تمہارے ساتھ ہو کر سو وہ لوگ بھی تمہی میں ہیں اور رشتہ دار آپس میں

بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٧٥﴾

حقدار زیادہ ہیں ایک دوسرے کے اللہ کے حکم میں، تحقیق اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔

ربط: سورۂ انفال میں کفار کے ساتھ صلح اور جنگ، قیدیوں کے معاملات، مالِ غنیمت اور فدیہ کے مسائل بیان کرنے کے بعد آخری چار آیات میں مہاجر اور غیر مہاجر مسلمانوں اور کفار کی وراثت وولایت کے احکام بیان کیے جا رہے ہیں۔

تسہیل: وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے مہاجرین کو رہنے کی جگہ دی اور ان کی مدد کی یہ دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے کے وارث ہوں گے اور جن لوگوں نے ایمان تو قبول کیا لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی ان سے تمہارا وراثت کا کوئی تعلق نہیں، وراثت کا تعلق نہ ہونے کے باوجود اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے مگر اس قوم کے مقابلے میں مدد کرنا لازم نہیں ہوگا جس کے ساتھ تمہارا صلح کا معاہدہ ہو چکا ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے ○ اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، اگر تم اس حکم پر عمل نہیں کرو گے تو ملک میں بڑا فتنہ اور فساد برپا ہو جائے گا ○ اور وہ لوگ جنہوں نے ایمان قبول کیا پھر ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد بھی کیا اور جن لوگوں نے انہیں رہنے کی جگہ بھی دی اور ان کی مدد بھی کی یہی لوگ سچے مؤمن ہیں ان کے لیے مغفرت اور عزت کا رزق

ہے ٥اور جولوگ ہجرتِ نبوی کے بعد ایمان لائے پھر انہوں نے ہجرت کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد میں بھی حصہ لیا تو وہ بھی تمہی میں سے شمار ہوں گے اور جو آپس میں رشتہ دار ہیں وہ اللہ کے حکم کی رو سے ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حقدار ہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے ٥

تفسیر

﴿۷۲﴾......حضورِ اکرم ﷺ کے مبارک زمانہ میں مسلمانوں کی چار قسمیں تھیں:

(۱)......جنہوں نے غزوۂ بدر سے پہلے ہجرت کی، انہیں "المهاجرون الاوّلون" (اوّلین مہاجر) کہا جاتا ہے، بعض حضرات نے صلحِ حدیبیہ تک ہجرت کرنے والوں کو بھی انہی میں شمار کیا ہے۔

(۲)......وہ اہلِ مدینہ جنہوں نے ایمان قبول کیا اور مہاجروں کو ٹھکانہ فراہم کیا۔

(۳)......وہ مؤمن جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔

(۴)......وہ مسلمان جنہوں نے صلحِ حدیبیہ کے بعد ہجرت کی۔

زیرِ نظر آیاتِ کریمہ میں بالترتیب تین قسم کے مسلمانوں کا ذکر ہے:

(۱) اولین مہاجر: یہ وہ سعادت مند گروہ تھا جسے اس وقت قبولِ ایمان کی سعادت حاصل ہوئی جب ایمان قبول کرنا گویا عرب وعجم کی دُشمنی مول لینا تھا، پھر جب ایمان کی خاطر ترکِ وطن کی ضرورت پیش آئی تو یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مدینہ چلے گئے، ہجرت کے علاوہ انہوں نے اپنے اموال اور جانوں کے ذریعہ جہاد میں بھی حصہ لیا۔

(۲) انصار: جنہوں نے رسولِ اکرم ﷺ اور مہاجرین کو مدینہ میں پناہ دی، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نہ ہجرت سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا اور نہ ہی پہلی اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑتی۔

(۳) تیسرا گروہ ان ایمان والوں کا تھا جنہیں مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کی توفیق نہ ہوئی اور وہ مکہ ہی میں مقیم رہے۔ ظاہر ہے کہ مکہ اس وقت دار الحرب تھا اور وہاں مشرکوں کی حکومت تھی۔

ان میں سے پہلے دو گروہوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ ایک دوسرے کے وارث {۱۶۱} یہاں اس کا معنی بعض مفسرین نے وارث {۱۶۲} اور بعض نے دوست اور مددگار {۱۶۳} امعنی کیا ہے) ہوں گے اس لیے کہ مہاجرین اور

{۱۶۱} اولیاء ولی کی جمع ہے

{۱۶۲} ای فی المیراث۔ (نظم الدرر ۳/۲۴۹، ابی سعود ۳/۱۱۵)

{۱۶۳} المراد الولایۃ بالنصرۃ والمظاهرۃ۔ (روح المعانی ۶/۵۵)

انصار کے حقوق، مصلحتیں اور اہداف مشترک تھے، ان کے درمیان رسول اللہ ﷺ نے رشتۂ مواخات قائم فرمادیا تھا، یہ رشتہ یوں تو دوقومی نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوا تھا لیکن اس میں خونی اور نسبی رشتے والے سارے تقاضے ملحوظ رکھے گئے تھے یعنی وراثت، دیت اور دوسرے معاوضوں میں اس کے افراد ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے، قرآن نے مہاجرین اور انصار کو ایک دوسرے کی نصرت، میراث، دیت اور تمام معاوضوں کی ادائیگی میں ایک دوسرے کا ولی قرار دیا۔

ہجرت اور اسلام کو ولایت اور وراثت کا مدار قرار دینے کی وجہ سے نہ تو غیر مہاجر کو مہاجر کی وراثت میں حصہ ملتا تھا اور نہ غیر مسلم، مسلمان کا وارث بن سکتا تھا اگر چہ ان میں باہمی قرار بتداری ہی کیوں نہ ہو، یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ سے ہجرت کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض تھا، مدینہ کی طرف ہجرت کیے بغیر ایمان قبول کرنے والوں کو اسلامی معاشرے کا ممبر شمار نہیں کیا جاتا تھا، اسی تیسرے گروہ کے بارے میں فرمایا گیا کہ ''ان سے تمہارا وراثت کا کوئی تعلق نہیں۔''

یہ حکم اس وقت تک تھا جب تک کہ مکہ مکرمہ فتح نہیں ہوگیا، فتحِ مکہ کے بعد ہجرت کا حکم ختم ہوگیا اور جب ہجرت کا حکم ختم ہوگیا تو ترکِ ہجرت کرنے والوں سے تعلق نہ رکھنے کا حکم بھی ختم ہوگیا۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہوا بلکہ عارضی طور پر اس پر عملدرآمد روک دیا گیا تھا، اگر بالفرض کسی ملک اور شہر میں ویسے حالات ہی پیدا ہوجائیں جو مکہ مکرمہ میں تھے اور وہاں اسلامی فرائض کی ادائیگی ممکن نہ رہے تو وہاں سے ہجرت کرنا فرض ہوجائے گا اور بلاعذر ہجرت نہ کرنے والے کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو مکہ کے غیر مہاجر کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

﴿وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ﴾ یہ لوگ جنہوں نے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی اور دارالحرب ہی میں رہنے کو ترجیح دی ہے ان کے ساتھ وراثت کا لین دین تو نہیں ہوگا لیکن چونکہ ان کے مسلمان ہونے میں کوئی شک نہیں لہٰذا اگر انہیں اسلام کی وجہ سے ستایا جاتا ہو، اپنے عقائد بدلنے پر مجبور کیا جارہا ہو اور اسلامی شعائر کی بے حرمتی کی جارہی ہو اور وہ اس سلسلے میں آزاد فضا میں سانس لینے والے مسلمانوں سے مدد کے طلبگار ہوں تو ان کی امداد کرنا مسلمانوں پر واجب ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کسی ایسی حکومت کے خلاف تعاون کے طلبگار نہ ہوں جس سے ہمارا ترکِ جنگ کا معاہدہ ہوچکا ہو، باقی رہا ان پر ہونے والا ظلم وستم تو اس کے وہ خود ذمہ دار ہیں، اللہ کی زمین بہت وسیع ہے وہ چاہتے تو اپنی اور اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے اسلامی مملکت کی طرف ہجرت کرسکتے تھے مگر انہوں نے اپنے مادی اور خاندانی مفادات کی

حفاظت کو ترجیح دی لہٰذا ان چند افراد کی خاطر نہ تو عہد شکنی کی جاسکتی ہے اور نہ ہی اجتماعی مفادات کو قربان کیا جاسکتا ہے، صلحِ حدیبیہ کے وقت ایسا ہی بلکہ اس سے کمتر واقعہ پیش آیا تھا مگر حبیبِ خدا ﷺ نے اپنے اوپر عہد شکنی کا الزام لینا گوارا نہ فرمایا۔

ہم اس واقعہ کو کمتر اس لیے قرار دے رہے ہیں کیونکہ زیرِ بحث آیت میں معاہدہ پا جانے کے بعد کے حالات کا ذکر ہے جبکہ حدیبیہ میں ابھی معاہدہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے محض مذاکرات ہو رہے تھے اور شرائطِ صلح طے کی جا رہی تھیں جن میں سے ایک شرط مشرکین نے یہ بھی رکھی تھی کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ چلا گیا تو آپ اسے دوبارہ ہمارے حوالے کر دیں گے، مسلمانوں کو اس شرط پر اعتراض تھا۔ یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ حضرت ابو جندل بن سہیل رضی اللہ عنہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے گرتے پڑتے یہاں پہنچ گئے، سہیل جو کہ مشرکین کی طرف سے مذاکرات کے لیے آئے تھے انہوں نے ابو جندل کی واپسی کا مطالبہ کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابھی تو ہم نے تحریر بھی مکمل نہیں کی۔'' اس نے جواب دیا اگر ایسا ہے تو پھر میں کسی بات پر آپ سے معاملہ کرنے پر تیار نہیں، آپ نے فرمایا: ''میرے کہنے سے انہیں اجازت دے دو۔'' اس نے کہا میں آپ کے کہنے سے بھی اجازت نہیں دے سکتا، آپ نے فرمایا کہ اچھا! جو تمہارا جی چاہے کرو۔ اس نے کہا مجھے کچھ نہیں کرنا ہے، یہ سب سن کر ابو جندل بولے: ''مسلمانو! میں مسلمان ہو کر آیا ہوں اور پھر مشرکوں کو واپس کیا جا رہا ہوں، کیا تم لوگ دیکھتے نہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' انہوں نے اللہ کی راہ میں سخت تکلیفیں اُٹھائی تھیں مگر آپ نے انہیں صبر کی تلقین کرتے ہوئے واپس جانے کا حکم دیا۔ {۱۶۴}

اس واقعہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اجتماعی مفاد اور معاہدے کی پابندی کو ابو جندل کی شخصی مصیبت پر ترجیح دی، مسلمانوں کا یہی وہ کردار تھا جس نے ان کے لیے فتوحات کے دروازے کھول دیئے اور ان کے جانی دُشمن بھی ان کے حسنِ اخلاق اور مضبوطیٔ کردار کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ پہلے یہ قانون بتایا گیا کہ اگر غیر مہاجر مسلمان اپنی اسلامی برادری سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں تو ان کی مدد کرنا واجب ہوگا بشرطیکہ اس تعاون کا اثر اس معاہدے پر نہ پڑتا ہو جو مسلمانوں نے کسی دوسری قوم کے ساتھ کیا ہو، اب تنبیہ کی جا رہی ہے کہ عہد شکنی کا ہرگز ارتکاب نہ کرنا اس لیے کہ تمہارے سارے اعمال اور حرکات پر اللہ کی نظر ہے، قرآن اور اسلامی قوانین کا یہ وہ انداز ہے جو اسے قانون کی تمام کتابوں سے ممتاز کرتا ہے، ترقی یافتہ اور قانون پسند معاشروں میں پولیس، فوج اور سرکار کی نظر میں آ جانے کا خوف تو

{۱۶۴} بخاری، ج ۲، ص ۱ ۷۰ بتغیر و اختصار

ہوتا ہے مگر خدائی کیمروں کی زد میں آجانے کا ڈر نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ نیویارک میں صرف چند منٹ کے لیے بجلی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس متمدن شہر (بلکہ ملک) میں بسنے والا ہر شخص چور اور عزت کا ڈاکو ہے، سینکڑوں گھر اور دکانیں لٹ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں خواتین کو وحشت و بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔

قرآن اپنے قاری کے ذہن میں یہ یقین بٹھا دیتا ہے کہ روشنی ہو یا اندھیرا، دن ہو یا رات، آبادی ہو یا صحراء، ہر جگہ اور ہر وقت بصیر و خبیر کی نظر تمہاری نگرانی کر رہی ہوتی ہے، یہ یقین اسے خیانت، عہد شکنی، دھوکہ دہی اور جھوٹ سے بچائے رکھتا ہے اگرچہ معاملہ کافر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب مشرک حکومت کے ساتھ خیانت اور وعدہ خلافی جائز نہیں تو اسلامی مملکت میں پُرامن طریقے سے رہنے والے ذمیوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

﴿۷۳﴾...... جیسے مسلمان ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں یونہی کفار آپس میں ایک دوسرے کے وارث سمجھے جائیں گے {۱۶۵} اور تقسیمِ وراثت کا جو بھی قانون ان کے ہاں رائج ہے ان کی وراثت کے معاملہ میں اسی کا لحاظ کیا جائے گا، اسلامی قوانین ان پر ٹھونسنے کی ہرگز کوشش نہیں کی جائے گی، اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ دنیا بھر کے کافر باہمی اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے مقابلے میں ایک ملت اور جماعت ہیں، وہ سارے کے سارے ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں۔ {۱۶۶}

جس وقت یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اس وقت حجاز میں کافروں کے دو ہی گروہ تھے مشرکین اور یہود! مذہبی اعتبار سے ان میں بُعد المشرقین تھا لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں جس طرح یہود، مشرکین کے ساتھ تعاون کرتے رہے وہ تاریخ کے کسی بھی طالب علم سے مخفی نہیں، پھر شام کے عیسائی بھی اہلِ ایمان کی عداوت میں یہود اور مشرکین کے ساتھ شامل ہو گئے، آج جتنے بھی غیر مسلم ممالک مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں ان سب کے درمیان اختلافات کی وسیع خلیج حائل ہے، جنگِ عظیم اوّل اور دوم میں وہ ایک دوسرے کے کروڑوں شہریوں کو قتل کر چکے ہیں لیکن جب کبھی کسی اسلامی ملک پر چڑھائی کا فیصلہ ہوتا ہے وہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وراث نہیں ہو سکتے

{۱۶۵} والکفار بعضهم اولیاء بعض۔ (قرطبی ۵۶/۸) ظاهره إثبات الموالاة بينهم۔ (کشاف ۲۲۷/۲)

{۱۶۶} قوله: والّذين كفروا...... يدلّ على ان الكفار فى الموارثة مع اختلاف مللهم كاهل ملة واحدة۔ (کبیر ۵۱۸/۵)

اس لیے کہ اس بارے میں واضح حدیث موجود ہے۔ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

﴿لایتوارث اھل ملتین ولایرث مسلم کافرا ولا کافر مسلما.﴾ {۱۶۷}

''دو الگ الگ ملتوں سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے، نہ مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے نہ ہی کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے۔''

یہ ارشاد فرمانے کے بعد آپ نے یہ آیتِ کریمہ پڑھی:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ {۱۶۸}

''اور کافر آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ملک میں فتنہ ہوگا اور زبردست فساد ہو جائے گا''

﴿اِلَّا تَفْعَلُوْهُ﴾ اگر تم اس حکم پر عمل نہیں کرو گے تو ملک میں بڑا فتنہ وفساد برپا ہوگا...... اے مسلمانو! اگر تم کفار کے مقابلے میں ملتِ واحدہ بن کر ایک دوسرے کی مدد نہیں کرو گے تو زمین فتنہ وفساد سے بھر جائے گی اس لیے کہ کفار کے اتحاد اور تمہارے افتراق وانتشار کی وجہ سے جاہلیت، اسلامی سوسائٹی پر غالب آجائے گی اور اس غلبے کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ انسان خدا پرستی چھوڑ کر نفس پرستی اور نجانے کون کون سی پرستش میں مبتلا ہو جائے گا۔

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس جملے کا تعلق ان تمام احکام کے ساتھ ہے جو اس سے پہلے ذکر کیے گئے ہیں۔ {۱۶۹} مثلاً یہ کہ مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے ولی ہیں، اس وقت مہاجر اور غیر مہاجر ایک دوسرے کے وارث تو نہیں ہو سکتے لیکن دونوں کے درمیان مذہبی معاملات میں تعاون کا تعلق باقی رہنا چاہیے لیکن تعاون کے جوش میں کسی بھی قوم کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کی خلاف ورزی جائز نہیں، کفار کی شخصی ولایت اور وراثت کے معاملہ میں مسلمانوں کو دخل نہیں دینا چاہیے، یہ جتنے احکام بھی ذکر کیے گئے ہیں ان پر عمل کرنا قیامِ عدل کا ذریعہ بنتا ہے اور انہیں نظر انداز کرنا عدل کی بنیادوں کو منہدم کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے جب عدل نہیں ہوگا تو فتنہ وفساد کو پنپنے کا موقع ملے گا۔

﴿۷۴﴾...... دنیا میں وراثت اور ولایت کے احکام بیان کرنے کے بعد اب آخرت کے اعتبار سے مہاجرین اور انصار کی فضیلت بیان کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے کمالِ ایمان کی گواہی دیتے ہوئے ان کے لیے مغفرت

{۱۶۷} ابوداؤد، فرائض، ۱۰/ترمذی، فرائض، ۱۶

{۱۶۸} الانفال ۸/۷۳

{۱۶۹} ای ما أمرتم به من التواصل بینکم ومن قطع العلائق بینکم وبین الکفار۔ (ابی سعود ۳/۱۱۶، ما امرتم به من ھاتین الأیتین من ایجاب الموالاۃ...... الخ۔ (احکام القرآن للجصاص ۳/۷۶)

اورعزت والے رزق کا وعدہ فرما رہے ہیں۔

﴿۷۵﴾......اس آیتِ کریمہ میں چوتھی قسم کے اہلِ ایمان کا ذکر ہے، یہ وہ لوگ تھے جنہیں ایمان لانے اور ہجرت کرنے کی سعادت اس وقت حاصل ہوئی جب جور و جفا کی آندھی تھم چکی تھی اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے قوت اور شوکت سے نواز دیا تھا، ان کے بارے میں قرآن اور حدیث میں جو کچھ آیا ہے اس کے مطابق یہ لوگ دنیاوی احکام کے اعتبار سے انہی مسلمانوں میں شمار ہوں گے جو ان سے پہلے ایمان لا چکے اور ہجرت اور جہاد میں حصہ لے چکے تھے لیکن اخروی اجر و ثواب اور فضیلت کے اعتبار سے دونوں میں نمایاں فرق رہے گا۔ آیتِ کریمہ میں "فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ"{۱۷۰} کے جو الفاظ ہیں یہ بعد والوں پر پہلوں کی فضیلت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، دوسرے مقامات پر دونوں گروہوں کے درمیان تفاوت کو صراحۃً بیان فرمایا گیا ہے، مثلاً سورۂ حدید میں ہے:

لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ{۱۷۱}

"تم میں سے جن لوگوں نے فتحِ مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور قتال میں حصہ لیا ان کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑا ہے جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جہاد میں حصہ لیا اور اللہ تعالیٰ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔"

﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ﴾ ارحام "رحم" کی جمع ہے، عورت کے اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں بچے کی نشو و نما ہوتی ہے پھر اس کا اطلاق تمام رشتہ داروں پر ہونے لگا اس لیے کہ عام طور پر ان سب کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ ایک ہی "رحم" سے ہوتا ہے۔ علماءِ میراث کی اصطلاح میں اگرچہ ﴿اولوا الارحام﴾ کا لفظ ان رشتہ داروں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کے ساتھ رشتہ ماں کے واسطہ سے ثابت ہوتا ہے جیسے ماموں، خالہ، نانی، نواسہ، بھانجا وغیرہ، لیکن قرآن نے یہ لفظ تمام رشتہ داروں کے لیے استعمال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایمان، ہجرت اور جہاد کی بناء پر آپس میں جو ولایت ہے وہ اپنی جگہ لیکن جہاں تک تقسیمِ وراثت کا تعلق ہے اس کی بنیاد قرابت پر ہوگی۔

مہاجرین اور انصار کے درمیان تقسیمِ میراث کا حکم عارضی تھا، سورۂ انفال کی اس آخری آیت میں وراثت کا ایک جامع ضابطہ بیان فرما کر عارضی حکم کو منسوخ کر دیا گیا۔{۱۷۲} قرابتدار اگر کافر حربی ہو تو اس کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعلق

{۱۷۰} قوله: "فاولئك منكم" يدلّ على ان مرتبة هؤلآء دون مرتبة المهاجرين السابقين۔ (كبير ۱۵/۵۱۹)

{۱۷۱} الحديد ۵/۱۰

{۱۷۲} هذه الآية ناسخة له...... فلايحصل الارث إلابسبب القرابة۔ (كبير ۱۵/۵۲۰)

اورتعاون جائز نہیں جیسا کہ سورۂ ممتحنہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ﴾ {۱۷۳}

''اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ تعاون سے منع فرماتا ہے جنہوں نے دین کی وجہ سے تمہارے ساتھ جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا۔''

اور اگر وہ حربی نہ ہو تو اس کے ساتھ صلہ رحمی اور حسنِ سلوک تو کیا جاسکتا ہے مگر اختلافِ مذہب کی وجہ سے اسے وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

قرابت کو بنیاد بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قریب اور دور کے تمام رشتہ داروں کو وراثت میں حصہ دیا جائے گا بلکہ قریبی رشتہ داروں کو ترجیح دیتے ہوئے دور کے رشتہ داروں کو محروم کردیا جائے گا۔

قریبی رشتہ داروں میں سے بعض کے حصے تو قرآنِ کریم نے خود متعین کردیئے ہیں جن کو علمِ میراث کی اصطلاح میں ''ذوی الفروض'' کہا جاتا ہے، ان کو دینے کے بعد جو مال بچ جائے وہ میت کے عصبات یعنی جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے گا یعنی عصبہ قریب کو بعید پر مقدم رکھتے ہوئے بعید کو محروم کردیا جائے گا اور اگر عصبات میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہو تو پھر مالِ میراث ''ذوی الارحام'' میں تقسیم کیا جائے گا اور ذوی الارحام کی وضاحت اوپر کی جاچکی ہے۔

﴿فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾ اللہ کی کتاب سے مراد اللہ کا حکم ہے {۱۷۴} جو اس نے اپنے بندوں پر دینِ فطرت میں لکھ دیا ہے اور وہ حکم یہی ہے کہ والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک واجب ہے، فطرتِ سلیمہ کا تقاضا بھی یہی ہے اور قانونِ شریعت بھی یہی ہے کہ نسبی قرابت کا لحاظ رکھا جائے اور قریب کو بعید پر ترجیح دی جائے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿ابدأ بنفسک فتصدق علیها فان فضل شیٔ فلأهلک فإن فضل شی عن أهلک فلذی قرابتک فان فضل عن ذی قرابتک شیٔ فهٰکذا فهٰکذا﴾ {۱۷۵}

''ابتداء اپنی ذات سے کرو اور اس پر خرچ کرو، اگر کچھ بچ جائے تو اپنے اہل وعیال کے حقوق ادا کرو، اگر اس میں سے کچھ بچ جائے تو قرابت داروں کے ساتھ نیکی کرو، اگر اس میں سے بھی کچھ بچ جائے تو پھر دوسرے مستحقین کی طرف توجہ دو۔''

{۱۷۳} الممتحنۃ ۶۰/۹

{۱۷۴} کان معناه فی الحکم الذی بینه الله تعالیٰ فی کتابه۔ (کبیر ۵/۵۲۰) أی فی حکم الله۔ (ابنِ کثیر ۲/۴۳۶)۔ ای فی حکمه۔ (ابی سعود ۳/۱۱۶، روح المعانی ۶/الجزء العاشر ۵۷)

{۱۷۵} مسلم، زکاۃ، ۴۱/ نسائی، زکاۃ، ۶۰، بیوع ۸۴

﴿إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ اس پوری سورت میں اللہ تعالیٰ نے جتنے احکام نازل فرمائے ہیں خواہ وہ جہاد وقتال سے تعلق رکھتے ہوں یا میراث کی تقسیم اور تربیتِ اخلاق سے ان کا تعلق ہو، یہ سب اس کے علمِ محیط پر مبنی ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ انسانوں کی دینی اور دنیاوی تمام مصلحتوں سے خوب باخبر ہے۔

حکمت وہدایت

۱......دارالاسلام میں بسنے والے مسلمان ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہوتے ہیں۔(۷۲)

۲......کمالات اور درجات کے اعتبار سے اہلِ ایمان میں فرق ہوتا ہے۔(۷۲)

۳......ایمان میں سب سے کامل اور مرتبے کے اعتبار سے سب سے افضل مسلمان وہ تھے جنہیں ایمان، ہجرت اور جہاد میں سبقت کا شرف حاصل ہوا، اسی طرح وہ انصار جنہوں نے مہاجرین کو پناہ دی، ایمان قبول کیا اور جہاد میں حصہ لیا۔(۷۲)

۴......مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں ان کے ساتھ تعاون ساری دنیا کے مسلمانوں پر واجب ہے لیکن اگر وہ ایسے کفار کے مقابلے میں تعاون کا مطالبہ کریں جن کے ساتھ اسلامی مملکت کا معاہدہ ہو چکا ہو تو تعاون جائز نہیں ہوگا۔(۷۲)

۵......معاہدہ اگرچہ مشرک اور کافر کے ساتھ ہو، اس کی پاسداری ضروری ہے اگرچہ اس کی وجہ سے بعض مسلمانوں کو نقصان ہی کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔(۷۲)

۶......مسلمانوں کے مقابلے میں ساری دنیا کے کافر ایک ہی ملت ہیں اگرچہ ان کے عقائد مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔(۷۳)

۷......جب مسلمان آپس میں ولایت ونصرت کے بجائے کفار سے اپنے تعلقات مضبوط کریں گے تو انہیں پستی اور ذلت سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

۸......جمہور کی رائے یہ ہے کہ کفار ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں اگرچہ ان کا مذہب مختلف ہو مثلاً یہودی، عیسائی کا اور ہندو، سکھ کا وارث بن سکتا ہے۔(۷۳)

۹......قرابتداری کے بغیر ایمان اور ہجرت ونصرت کی بنیاد پر وراثت کی تقسیم ایک عارضی حکم تھا اب نسبی تعلق اور سسرالی رشتہ داری کے بغیر ایک دوسرے کا وارث بننا جائز نہیں۔(۷۵)

سُورَةُ التَّوبَةِ
مَدَنِيَّةٌ

سورۂ توبہ کے اہم مضامین

سورۂ توبہ مدنی ہے اور اس میں ۱۲۹ آیات اور ۱۶ رکوع ہیں، اسے سورۂ برأۃ بھی کہا جاتا ہے، اس سورت کا پہلا لفظ ہی ''برأۃ'' ہے۔ یہ سورت ۹ ہجری میں اس وقت نازل ہوئی جب رسولِ اکرم ﷺ رومیوں کی سرکوبی کے لیے نکلے تھے، اس غزوہ کو غزوۂ تبوک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ غزوہ سخت گرمی کے زمانے میں پیش آیا تھا، سفر بھی بہت طویل تھا، پھل پکے ہوئے تھے جو کہ عربوں کا اہم ذریعۂ معاش تھے اور مقابلہ ایک ایسی سلطنت سے تھا جسے اپنے وقت کی سپر پاور ہونے کا دعویٰ تھا، مختصر یہ کہ یہ غزوہ اہلِ ایمان کے لیے بڑی ابتلاء اور ان کے صدق و اخلاص کا امتحان تھا، اس کے ذریعے مومنوں اور منافقوں کے درمیان امتیاز بھی ہوگیا، حقیقت میں سورۂ توبہ کے بنیادی ہدف دو ہی ہیں ایک...... مشرکین اور اہلِ کتاب کے ساتھ جہاد کے احکام بیان کرنا، دوسرے......غزوۂ تبوک کے پس منظر میں اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق کے درمیان فرق واضح کردینا۔

جہاں تک احکامِ جہاد کا تعلق ہے تو تمہید کے طور پر ان معاہدات سے برأت کا اعلان کیا گیا جو مسلمانوں نے مشرکین کے ساتھ کیے تھے، ان کے لیے انتہائی مدت چار ماہ مقرر کردی گئی، یوں ہی مشرکوں کو بیت اللہ کا حج کرنے سے بھی منع کردیا گیا کیونکہ یہ لوگ کئی بار عہد شکنی کے مرتکب ہوچکے تھے اور اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے یہود کے ساتھ گٹھ جوڑ کرتے چلے آرہے تھے۔ مشرکوں سے برأت کا اعلان کرنے کے بعد اہلِ کتاب کے ساتھ بھی قتال کی اجازت دی گئی ہے کہ مکروفریب، عہد شکنی، منافقت اور جھوٹ ان کی فطرت میں رچ بس چکا تھا۔ یہود کا قبیلہ بنو قریظہ ہو یا بنو نضیر اور بنو قینقاع، انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا، تقریباً بیس آیات میں ان کے باطنی خبث اور دسیسہ کاریوں کو طشت از بام کیا گیا ہے اور مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ ''اہلِ کتاب میں سے جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ ہی روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین کو قبول کرتے ہیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہوکر جزیہ دیں''

جہاں تک اس سورت کے ہدف کا تعلق ہے تو منافقوں کی علامات اور بدباطنیوں کو اس انداز میں بیان کیا گیا کہ وہ سب کے سامنے ذلیل اور رسوا ہوکر رہ گئے، اسی لیے اس سورت کا ایک نام ''سورۃ الفاضحہ'' بھی ہے یعنی ''رسوا کرنے والی سورت'' اس سورت کے نزول سے قبل انہوں نے اپنے آپ کو اسلام کے زبانی دعوے کے پردے میں

چھپا رکھا تھا لیکن اس سورت نے ان کے باطن کو یوں ظاہر کیا کہ ہر کسی نے جان لیا کہ کون منافق ہے اور کون مخلص مؤمن ہے، منافقوں کی کمزوریوں اور عیوب کو نمایاں کرنے کا ظاہری سبب غزوۂ تبوک بنا، جہاد تو ویسے بھی جان کو جوکھوں میں ڈالنے والی عبادت ہے جبکہ غزوۂ تبوک میں مادی اعتبار سے اپنے وقت کی سب بڑی فوج کے ساتھ مقابلہ تھا اور وہ بھی شدید گرمی اور فقر و فاقہ کے دنوں میں، اس غزوہ کے پسِ منظر میں منافقوں سے جو حرکتیں سرزد ہوئیں ان کا اندازہ ذیل کی چند جھلکیوں سے لگایا جا سکتا ہے، یہ جھلکیاں سورۂ توبہ کی بعض آیات ہی سے ماخوذ ہیں:

☆ اللہ نے پیشگوئی فرمادی تھی کہ ''منافق قسمیں کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو آپ کے ساتھ ضرور (تبوک کی طرف) نکل پڑتے'' چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب حضورِ اکرم ﷺ تبوک سے واپس آئے تو منافقوں نے جھوٹے اعذار پیش کیے۔

☆ سوائے چند کے باقی تمام مخلص مسلمان فوراً غزوۂ تبوک میں شرکت کے لیے تیار ہوگئے جبکہ منافقوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے مدینہ میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔

☆ اللہ نے فرمایا کہ ان منافقوں کا جہاد میں نہ نکلنا ہی بہتر تھا، اگر بالفرض وہ شرکت کرتے تو مسلمانوں کے درمیان فتنہ وفساد پھیلانے کے سوا کچھ بھی نہ کرتے۔(۹:۴۷)

☆ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے مضحکہ خیز عذر پیش کر کے اپنے لیے استثناء حاصل کرنے کی کوشش کی، مثال کے طور پر جد بن قیس نام کے ایک صاحب کہنے لگے ''یارسول اللہ! میں دل کا بڑا کمزور ہوں جبکہ رومیوں کی عورتیں گورے رنگ کی ہوتی ہیں، مجھے ڈر ہے کہ اگر میں جہاد میں گیا تو انہیں دیکھ کر فتنہ میں مبتلا ہو جاؤں گا''۔(۹:۴۹)

☆ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے بغض اور حسد کے سوا کچھ نہیں ہے۔(۹:۵۰)

اگر مسلمانوں کو فتح حاصل ہو یا مالِ غنیمت ہاتھ آئے تو پریشان ہو جاتے ہیں اور اگر اس کے برعکس کسی حادثے یا مصیبت کا سامنا کرنا پڑ جائے تو انہیں بے پناہ خوشی ہوتی ہے۔

☆ وہ قسمیں کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ اے مسلمانو! ہم تم میں سے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔(۹:۵٦)

☆ ان کی نظریں صرف مال پر ہوتی ہیں اگر مل جائے تو خوش ہوتے ہیں، اگر محروم رہیں تو اللہ کے نبی پر بھی طعنہ زنی سے باز نہیں آتے۔

☆ چونکہ حضور ﷺ ہر کسی کی بات سن لیا کرتے تھے اس لیے وہ آپ کے بارے میں کہتے تھے کہ آپ تو ''نرے کان'' ہیں۔(۹:۶۱)

☆ آپ ﷺ کی زندگی میں انہیں مستقل یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کا پول کھول دے اور ان کے قلبی راز فاش کر دے۔(۹:۶۴)

☆ ایک دوسرے کو برائی کا حکم دینا، نیکی سے روکنا اور بخل کرنا ان کی نمایاں صفات میں سے ہیں۔(۹:۶۷)

☆ ان منافقین کی صفات اور اعمال، ماضی کے کفار جیسے ہیں۔(۹:۶۹)

☆ ان کے دل، اللہ کی محبت، اس کے ذکر و شکر اور اس کی عظمت سے یکسر خالی ہیں، ظاہر ہے جس کے دل میں اللہ کی عظمت نہیں ہوگی اس کے لیے معصیت اور نافرمانی بہت آسان ہو جائے گی۔(۹:۶۷)

منافقوں کو کفار کے ساتھ تشبیہ دینے کے بعد قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ ابراہیم، اصحابِ مدین اور قومِ لوط کا ذکر کیا گیا ہے۔

☆ دسویں پارہ کے آخر تک منافقوں ہی کا تذکرہ ہوا ہے اور ان کے بارے میں اللہ نے یہاں تک فرمادیا ہے کہ اے میرے پیغمبر! ''اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں تو بھی اللہ ان کی ہرگز مغفرت نہیں کرے گا، اور یہ بھی فرمادیا کہ اگر ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو آپ اس کی نمازِ جنازہ ادا نہ فرمائیں۔(۹:۸۴)

منافقوں کے ساتھ ساتھ اللہ نے ان مخلص مسلمانوں کا بھی تذکرہ فرمایا ہے جن میں سے کوئی بڑھاپے، کوئی شدید بیماری اور کوئی سامانِ جہاد نہ ہونے کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہ کر سکا ان لوگوں کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ جہاد میں شرکت نہ کر سکنے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ آتے تھے اس لیے فرمایا گیا کہ مخلصین کی اس جماعت پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

دسویں پارہ کے آخر میں مخلص اہلِ ایمان کے علاوہ ان منافقوں کا تذکرہ تھا جنہوں نے مالی وسائل اور سواری کی استطاعت رکھنے کے باوجود غزوۂ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی، گیارہویں پارہ کی ابتداء میں بھی اہلِ نفاق کا تذکرہ ہے، اللہ نے اپنے نبی کو تبوک سے واپسی پر راستہ ہی میں اطلاع دی تھی کہ جب آپ مدینہ پہنچیں گے تو منافق آپ کے سامنے مختلف قسم کے اعذار پیش کریں گے کہ ہم انتہائی سخت مجبوریوں کی بناء پر آپ کے ساتھ غزوہ میں شریک نہ ہو سکے ورنہ ہم نے تو جانے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور منافقوں نے قسمیں کھا کھا کر آپ کو اپنی سچائی کا

یقین دلانے کی کوشش کی، آپ ﷺ نے مروّت اور شرافت کی بناء پر حقیقت کو جانتے ہوئے بھی خاموشی اختیار فرمائی اور انہیں جھوٹا قرار نہیں دیا، منافقوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے مخلص مسلمانوں کی صفات بیان فرمائی ہیں، اور ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں، اور جھوٹ بول کر غلط کو صحیح قرار دینے کی کوشش نہیں کرتے، درمیان میں پھر منافقوں کا ذکر آیا ہے جنہوں نے اسلام کو ضرر پہنچانے، کفر کے فروغ اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے لیے ''مسجدِ ضرار'' تعمیر کی تھی اور حضور اکرم ﷺ سے اس کے افتتاح کی درخواست کی تھی مگر اللہ نے اپنے نبی کو اس مسجد میں کھڑا ہونے سے منع فرما دیا۔ چنانچہ اس مسجد کو آپ کے حکم سے جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ مسجدِ ضرار کے مقابلے میں مسجدِ قبا کا اور اہلِ نفاق کے مقابلے میں ان اہلِ ایمان کا تذکرہ ہے جو اپنے مال اور اپنی جانیں حصولِ جنت کے لیے اللہ کی راہ میں وقف کر چکے ہیں، ان اہلِ ایمان کی نو (۹) ایسی صفات ذکر کی گئی ہیں جو ہر مؤمن کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے یعنی توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کاموں کا حکم دینے والے، بُری باتوں سے منع کرنے والے اور اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے۔ (۹:۱۱۲)

غزوۂ تبوک میں شرکت سے جو لوگ محروم رہ گئے تھے ان میں تین ایسے مخلص مسلمان بھی تھے جن کے اخلاص اور ایمان میں کسی کو شک نہیں تھا، یعنی حضرت کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارۃ بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہم، ان تینوں نے کوئی عذر نہیں تراشا بلکہ صاف صاف اعتراف کر لیا کہ پیچھے رہ جانے میں سراسر ہماری اپنی غلطی، سستی اور کاہلی کو دخل تھا، ان کے معاملہ کو الگ رکھا گیا تھا، یہاں تک کہ پچاس دن تک ان کا بائیکاٹ بھی کیا گیا لیکن پھر انہیں سچ بولنے کی وجہ سے ایسا نوازا گیا کہ ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان وحی کے ذریعہ سے کیا گیا، یہ اعلان ان کے لیے اتنی بڑی بشارت تھا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت کعب بن مالک سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''جب سے تمہیں تمہاری والدہ نے جنا ہے آج سے زیادہ بہتر اور مبارک دن تم پر نہیں آیا۔'' ان حضرات کی قبولِ توبہ کا ذکر آیت ۱۱۷-۱۱۸ میں ہے۔ اگلی آیات میں اہلِ ایمان کو چار اہم باتوں کی تاکید کی گئی ہے:

پہلی یہ کہ وہ خفیہ اور علانیہ تقویٰ کو لازم پکڑے رکھیں۔ دوسری یہ کہ وہ اہلِ نفاق سے دور رہتے ہوئے صرف سچوں کی صحبت اختیار کریں، تیسری یہ کہ وہ رزق کی تنگی اور کشادگی میں اللہ کے رسول کو اپنے اوپر ترجیح دیں، چوتھی بات حقیقت میں اللہ کی طرف سے وعدہ ہے کہ ہر قسم کی عبادت اور اطاعت کا اللہ کی طرف سے اجر مل کر رہے گا اور یہ کہ اللہ

کے دین کے لیے جس قدر مشقت اٹھائی جائے گی اتنا ہی اجر و ثواب عطا ہوگا۔ (۱۲۱-۹:۲۰)

جہاد کی فضیلت اور اہمیت کے باوجود حکم دیا گیا ہے کہ سارے ہی مسلمانوں کو جہاد میں نہیں چلے جانا چاہیے بلکہ کچھ لوگوں کو حضور ﷺ کی خدمت میں موجود رہنا چاہیے تاکہ آپ سے دین کی سمجھ حاصل کریں۔ (۹:۱۲۲)

اسلام کو اپنی دعوت کی ابتداء میں جیسے دشمنوں کی طاقت توڑنے کے لیے جہاد کی ضرورت تھی یونہی ان بنیادوں کی بھی ضرورت تھی جن پر اسلامی مملکت کی عمارت کھڑی کی جاسکے، اس مقصد کے لیے شرعی احکام کے نزول کا سلسلہ مستقل جاری تھا اور حضور اکرم ﷺ ایسے افراد کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھے جو مستقبل کے مدرّس، مربی، معلّم، قاضی، حاکم، عامل اور منتظم بن سکیں، اس لیے حکم دیا گیا کہ مسلمانوں کی معتد بہ تعداد کو مدینہ میں ہی رہنا چاہیے تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرسکیں، اسلامی مملکت کی ضروریات سے قطع نظر فی ذاتہٖ بھی علمِ دین حاصل کرنا بہت بڑا عمل ہے، اس لیے حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرمادیتا ہے'' {۱} یہ بھی آپ ہی کا ارشادِ گرامی ہے کہ ''ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ثابت ہوتا ہے'' {۲}

جہاد کے لیے ایک اہم اصول یہ بتایا گیا ہے کہ الاقرب فالاقرب کے ضابطہ کے تحت جہاد کیا جائے، یعنی قریب کے کفار سے جہاد کرتے ہوئے اس کا دائرہ دور تک وسیع کیا جائے۔ (۹:۱۲۳)

سورۂ توبہ کی آخری آیات میں دوبارہ منافقین کی مذمت کی گئی ہے کہ ان حرماں نصیبوں کو قرآن سے بھی کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ فکر و عمل کے اعتبار سے ان کی نجاست ہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اس سورت کی آخری آیت میں اللہ نے ہمارے آقا ﷺ کی تعریف بیان فرمائی ہے اور آپ کے لیے اپنے اسماءِ حسنیٰ میں سے دو نام منتخب فرمائے ہیں یعنی رؤف اور رحیم۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ اپنی اُمت بلکہ ساری انسانیت کے حق میں بے حد شفیق اور مہربان تھے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں میں سے یہ دو نام آپ کے سوا کسی کے لیے بھی جمع نہیں فرمائے۔

{۱} بخاری علم، ۱۰، خمس، ۷، اعتصام، ۱۰/مسلم، امارۃ، ۱۷۵، زکاۃ، ۹۸، ۱۰۰

{۲} ترمذی، علم، ۱۹/ابنِ ماجہ، مقدمہ، ۱۷

مشرکین سے برأت کا اعلان

﴿۱......۵﴾

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ

صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی، ان مشرکوں کو جن سے تمہارا عہد ہوا تھا۔ سو پھرلو

اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲

اس ملک میں چار مہینے اور جان لو کہ تم نہ تھکا سکو گے اللہ کو اور یہ کہ اللہ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ

اور سنا دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی لوگوں کو دن بڑے حج کے کہ اللہ الگ ہے

الْمُشْرِكِيْنَ ۙ ەۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ

مشرکوں سے اور اس کا رسول، سو اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر نہ مانو تو جان لو کہ تم

غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ

ہرگز نہ تھکا سکو گے اللہ کو اور خوشخبری سنا دے کافروں کو عذاب دردناک کی۔ مگر جن مشرکوں سے

الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْــًٔـا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ

تم نے عہد کیا تھا پھر انہوں نے کچھ قصور نہ کیا تمہارے ساتھ اور مدد نہ کی تمہارے مقابلہ میں کسی کی،

عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ

سو ان سے پورا کردو ان کا عہد ان کے وعدہ تک بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے۔ پھر جب گزر جائیں

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ

مہینے پناہ کے تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں،

كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ

پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ تو چھوڑدو ان کا راستہ

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

تسہیل: جن مشرکوں سے تم نے مدت کی تعیین کے بغیر معاہدے کر رکھے تھے ان سے اللہ اور اس کا رسول دستبردار

ہوتے ہیں٥ تو اے مشرکو! تمہیں اس سرزمین میں چار ماہ چلنے پھرنے کی اجازت ہے، مگر یہ یاد رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے اور یہ بھی کہ اللہ کافروں کو یقیناً رسوا کریں گے٥ اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حجِ اکبر کے دن سرِ عام اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول تمام مشرکوں سے بری الذمہ ہیں لہٰذا اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم نے اعراض کیا تو خوب جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے، اور اے میرے پیغمبر! آپ ان کافروں کو المناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے٥ البتہ ایسے مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے اسے پورا کرنے میں کوئی کمی نہ کی اور نہ ہی تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے معاہدے کو معینہ مدت تک پورا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ متقین کو پسند کرتا ہے٥ جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان عہد شکن مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ انہیں مارو، پکڑو، ان کا محاصرہ کرو اور ان کی تاک میں گھات کی جگہ بیٹھو، لیکن اگر یہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ غفور رحیم ہے٥

تفسیر

مکہ کی تیرہ سالہ زندگی مشرکین کے ظلم و ستم اور مسلمانوں کے صبر و تحمل سے عبارت تھی، مدینہ ہجرت کرنے کے باوجود ان کی ایذاء دہی اور شرارتوں کا سلسلہ جاری رہا، ۶ھ ہجری میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جب مسلمانوں نے عمرہ کا ارادہ کیا تو انہیں مکہ میں داخل نہ ہونے دیا گیا، مشرکین کا یہ طرزِ عمل زمانۂ قدیم سے مکہ کی چلے آنے والی روایت کے بالکل خلاف تھا کیونکہ کسی بھی زائر کو زیارتِ کعبہ سے نہیں روکا جاتا تھا اگرچہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، حدیبیہ میں دونوں فریقوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس میں ہٹ دھرمی کی وجہ سے مشرکوں نے ایسی شرطیں لگا دیں جنہیں تسلیم کرنا بظاہر ناممکن تھا مگر آقا ﷺ نے خداداد بصیرت، صلح و سلامتی کی محبت اور اشاعتِ دین کی خاطر یہ شرطیں تسلیم فرمالیں۔ اس معاہدہ کے نتیجے میں قبیلۂ خزاعہ مسلمانوں اور قبیلہ بنو بکر مشرکوں کا حلیف بن گیا، معاہدہ کے باوجود مشرکوں نے عہد شکنی کی اور مسلمانوں کے حلیف کے خلاف بنو بکر کی کھلے عام مدد کی۔

ان کی عہد شکنی ہی کی وجہ سے مسلمانوں نے لشکر کشی کرتے ہوئے مکہ فتح کرلیا، اب تک کے تجربات سے ثابت ہوگیا تھا کہ مشرکوں سے ایفاءِ عہد کی توقع رکھنا عبث ہے، ویسے بھی جزیرۃ العرب کو بت پرستوں کے ناپاک وجود سے خالی کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا، اس پسِ منظر میں ۹ھ میں سورۂ برأت نازل ہوئی جس میں مشرکوں کو چار گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے ان سے برأت کا اعلان کردیا گیا، فتح مکہ کے بعد مسلمان اس پوزیشن میں تھے کہ اگر وہ چاہتے تو

بیک جنبشِ قلم سارے دُشمنوں کو تہ تیغ بھی کر سکتے تھے اوران سب کے لیے ایک ہی حکم جاری بھی کر سکتے تھے مگر ایسانہیں کیا گیا بلکہ سب کے لیے جدا جدا حکم نازل ہوا۔

پہلا گروہ قریشِ مکہ کا تھا جنہوں نے حدیبیہ کا معاہدہ خودتوڑ دیا تھا، وہ اگر چہ اب کسی مزید مہلت کے مستحق نہیں تھے مگر چونکہ یہ زمانہ حرمت والے مہینوں کا تھا جن میں جنگ کی اجازت نہیں اس لیے ان کے متعلق وہ حکم آیا جو آیت نمبر۵ میں مذکور ہے جس کا حاصل یہ تھا کہ حرمت والے چار مہینے گزرنے کے بعد عہد شکنی کرنے والوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ یا تو جزیرۃ العرب سے نکل جائیں یا مسلمان ہو جائیں ورنہ ان سے جنگ کی جائے۔

دوسرا گروہ وہ تھا جس کا ذکر آیت نمبر۴ میں آیا ہے، ان کے ساتھ خاص مدت کے لیے معاہدہ کیا گیا تھا اور وہ اس پر قائم بھی رہے، تفسیروں میں بنوضمرہ اور مدلج کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان سے نو مہینے کے لیے معاہدہ کیا گیا تھا اور انہوں نے عہد شکنی کا بھی ارتکاب نہیں کیا چنانچہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ مدتِ معاہدہ کی تکمیل کریں۔

تیسرا اور چوتھا گروہ وہ تھا جن کے ساتھ یا تو سرے سے کوئی معاہدہ ہی نہیں ہوا تھا یا ہوا تو تھا لیکن اس کی مدت متعین نہیں کی گئی تھی، ان دونوں گروہوں کا حکم پہلی دو آیتوں میں مذکور ہے، وہ یہ کہ انہیں چار ماہ تک مکہ میں رہنے کی اجازت ہے، اس کے بعد ان کے لیے بھی وہی حکم ہوگا جو پہلے گروہ کے لیے ذکر ہوا۔

﴿۱﴾......تیسرے اور چوتھے گروہ کے بارے میں اعلان کیا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اس معاہدہ سے بری ہیں جو مشرکین سے ہوا تھا، یہاں براۃ کی نسبت اللہ اور اس کے رسول کی طرف اس لیے کی گئی ہے کیونکہ یہ ایک نیا شرعی حکم تھا جو نازل ہوا تھا۔ {۳}

حدیث میں آتا ہے کہ حج کی فرضیت کا حکم نازل ہونے کے بعد ۹ھ میں حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر مکّہ مکرمہ روانہ کیا، ان کی روانگی کے بعد سورۂ توبہ کی یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کو بلا بھیجا اور ان سے فرمایا کہ سورۂ براۃ کی ابتدائی آیات اور ان کے احکام وہاں لے کر جائیں اور قربانی کے روز جب سب لوگ منیٰ میں جمع ہوں یہ اعلان کر دیں کہ:

''جنت میں کوئی کافر داخل نہیں ہوگا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکتا اور کوئی شخص برہنہ ہو کر طواف نہیں کر سکتا اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کا کوئی معاہدہ ہو تو طے شدہ میعاد تک اس کی پابندی کی جائے گی۔''

{۳} کبیر ۵/ ۵۲۳

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی پر روانہ ہوئے اور راستہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جا ملے، انہوں نے پوچھا کہ امیر ہو یا مامور، کہنے لگے مامور ہوں، پھر دونوں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حج کے انتظامات میں مشغول ہو گئے، جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کے حکم اور ہدایت کے مطابق ان سب باتوں کا اعلان کیا۔ {۴}

﴿۲﴾......مشرکین سے خطاب کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں چار ماہ تک مکہ کی سرزمین پر چلنے پھرنے کی اجازت ہے، اس عرصہ میں تم سے کوئی تعرّض نہیں کیا جائے گا، یہ مہلت انہیں اس لیے دی گئی تھی کہ وہ اپنے بارے میں اطمینان سے فیصلہ کر سکیں، چاہیں تو اسلام قبول کر لیں ورنہ جزیرۃ العرب سے نکل جائیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، یہاں ذرا سی دیر رُک کر اگر ہم اہلِ ایمان اور اہلِ شرک کے درمیان موازنہ کریں تو دونوں کے کردار میں واضح فرق دکھائی دے گا۔ بت پرستوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں توحید پرستوں پر مکہ کی زمین تنگ کر دی تھی، آبائی دین میں واپس آنے کے لیے انہیں جبر و قہر کا نشانہ بنایا جاتا تھا، نہ اللہ کی عبادت کی اجازت تھی نہ مکہ سے ہجرت کی، لیکن فتحِ مکہ کے بعد رؤف رحیم پیغمبر ﷺ نے نہ صرف ان کے سارے مظالم معاف فرما دیئے بلکہ تبدیلِ مذہب کے لیے بھی ان پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا گیا اور ان میں سے ہر ایک کو اجازت دے دی گئی کہ وہ جہاں جانا چاہتا ہے چلا جائے۔

﴿ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ ﴾ ان چار مہینوں کا آغاز ۹ھ کے ماہِ ذی الحجہ کی دس تاریخ سے ہوا اور اختتام ۱۰ھ کے ربیع الثانی کی دس تاریخ پر ہوا۔ {۵}

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ﴾ اگر تم بت پرستی اور مسلمانوں کی عداوت و مخالفت پر قائم رہے تو جان لو کہ تم بھاگ کر بچ نہیں سکتے، تم جہاں بھی ہو گے اللہ مسلمانوں کو تمہارے اوپر مسلط کر دے گا اور تمہیں دنیا اور آخرت میں ذلیل و رسوا کر کے رہے گا۔

﴿۳﴾......دوبارہ مشرکین سے برأت کا اظہار کیا جا رہا ہے، پہلی اور دوسری برأت میں فرق یہ ہے کہ پہلے جملے میں برأت کے ثابت ہونے کی خبر دی گئی تھی اور دوسرے جملے میں بتایا جا رہا ہے کہ جو حکم ثابت ہو چکا اس کا تمام انسانوں کو

{۴} ترمذی/ ۳۰۹۱، سیرت ابنِ ہشام ۳/ ۵۰، نبی رحمت/ ۴۹۸

{۵} وابتداء هذا الاجل يوم الحج الاكبر وانقضاءه الى عشر من شهر ربيع الآخر، قرطبی ۸/ ۶۲، ای من ايام الحج فيكون آخرها عاشر شهر ربيع الآخر۔ (نظم الدرر ۳/ ۲۶۶)

بتانا واجب ہے۔ {۶}

﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ﴾ حجِ اکبر سے مراد حج ہے، اس کے مقابلہ میں عمرہ کو حجِ اصغر کہتے ہیں۔ {۷}

یومِ حج کی اصطلاح یومِ عرفہ کے لیے ہے جبکہ دس ذوالحجہ کو "یوم النحر" (قربانی کا دن) کہتے ہیں۔ {۸}

حضرت مخرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: "یوم الحج الاکبر یوم عرفه" {۹} (حجِ اکبر کا دن یومِ عرفہ ہے) عوام میں یہ مشہور ہے کہ جمعہ کے دن کا حج، حجِ اکبر اور عام دنوں میں ادا کیے جانے والا حج، حجِ اصغر ہوتا ہے تو اس کی کوئی اصل نہیں۔

﴿۴﴾...... چار ماہ کی مہلت ایسے لوگوں کو دی گئی جن کے ساتھ یا تو کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا یا ہوا تو تھا مگر اس کی کوئی مدت متعین نہیں کی گئی تھی، اب اس گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کے ساتھ معاہدہ ہوا، پھر وہ اپنے معاہدہ پر قائم رہا، نہ تو اس نے مسلمانوں کے خلاف کسی خفیہ جوڑ توڑ میں حصہ لیا اور نہ ہی خود میدان میں آنے کی حماقت کی، ان کے بارے میں مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ان کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو تکمیل تک پہنچاؤ۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ بے شک اللہ اہلِ تقویٰ یعنی وعدہ پورا کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

﴿۵﴾...... اس آیتِ کریمہ میں مشرکین کے پہلے گروہ کا ذکر ہے جن کا ماضی ظلم وستم اور حال عہد شکنی سے عبارت تھا، حدیبیہ کے مقام پر انہوں نے دس سال کا معاہدہ کیا تھا اور اس معاہدہ میں انہوں نے جاہلانہ ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے اپنی تمام شرائط منوالی تھیں، وہ دس سال تک تو انتظار کیا کرتے پورے دو سال بھی انتظار نہ کر سکے۔ ۶ھ کے آخر میں معاہدہ ہوا تھا اور تقریباً ۸ھ کے آغاز میں انہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کر لیا، یہ وہ گروہ تھا جو اپنے ماضی اور حال کی بناء پر کسی قسم کی رو رعایت کا حقدار نہیں تھا، لیکن جب برأت اور قتال کا حکم نازل ہوا، اس وقت حرمت والے مہینوں کا آغاز ہو چکا تھا، اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ فی الحال تو اپنی تلواریں میان میں رکھو جب "اشھرِ حرم" گزر جائیں تو ان مشرکوں کے ساتھ وہی کچھ کرو جو برسرِ پیکار اور دھوکہ باز دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے اور وہ تمام امور جن کا جنگی مصلحت تقاضا کرتی ہے۔

{۶} تلك اخبار بثبوت البرأة وهذه اخبار بوجوب الاعلام بماثبت۔ (کشاف ۲/ ۲۴۳)

{۷} هذا هو الحج الاکبر لان العمرة تسمى الحج الاصغر (کبیر ۵/۵۲۶)

{۸} لثبت الحج فى اليوم التاسع من ذى الحجّة وهو يوم عرفة والنحر اليوم العاشر منه (احکام القرآن للجصاص ۳/ ۷۷)

{۹} بحواله قرطبی ۸/۶۷

(۱)﴿فَاقْتُلُوْا﴾ یعنی یہ دشمن حل یا حرم جہاں بھی تمہیں ملیں انہیں قتل کرو کیونکہ معاہدہ ختم ہونے اور تمہاری طرف سے دی گئی مہلت کی مدت گزر جانے کے بعد تم حالتِ جنگ میں ہو۔

(۲)﴿وَخُذُوْهُمْ﴾ انہیں پکڑ کر قیدی بنالو، قیدی بنا لینے کے بعد حالات کو دیکھ کر اور باہمی مشورہ سے ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

(۳)﴿وَاحْصُرُوْهُمْ﴾ ان کے قلعوں، محلات اور مکانوں کا محاصرہ کیا جائے حتیٰ کہ یہ ہتھیار ڈالنے اور صلح کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

(۴)﴿وَاقْعُدُوْا لَهُمْ﴾ ہر گزرگاہ اور مکان میں ان کی تاک میں گھات لگا کر بیٹھو تا کہ ان کے دلوں میں تمہارا خوف اور رعب پیدا ہو جائے، تمہارے ایسا کرنے سے تین میں سے ایک نتیجہ ضرور برآمد ہوگا، یا تو یہ اسلام قبول کرلیں گے یا جزیرۃ العرب سے بھاگ جائیں گے اور یا پھر قتل کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

﴿فَاِنْ تَابُوْا﴾ اگر یہ کفر وشرک سے باز آجائیں اور کلمہ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جائیں۔

﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ پانچ وقت کی فرض نماز ادا کریں جو کہ اسلام کے ارکان میں سے سب سے بڑا رکن ہے اور جس کی فرضیت میں امیر اور غریب، تندرست اور بیمار، مقیم اور مسافر سب برابر ہیں۔

﴿وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ اور زکوٰۃ دیں جو کہ اسلام کے اجتماعی کفالتی نظام کا ایک اہم حصہ ہے، جس کے ذریعہ فقراء اور غرباء کی مشکلات حل کی جاتی ہیں۔

﴿فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ تو پھر تم انہیں آزادی سے زندگی بسر کرنے دو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اللہ چونکہ غفور ہے اس لیے ان کی گزشتہ زندگی کے تمام گناہوں بشمول کفر وشرک معاف کردے گا اور وہ رحیم بھی ہے اس لیے وہ ان توبہ کرنے والوں پر بھی ویسے ہی رحم کرے گا جیسے قدیم اہلِ ایمان پر رحم کرتا ہے۔

حکمت وہدایت

۱......سورۂ توبہ کے سوا قرآنِ کریم کی تمام سورتوں کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ہوتا ہے، سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھے جانے کی وجہ بعض صحابہ کرام سے یہ منقول ہے کہ اس سورت کے بارے میں احتمال یہ ہے کہ یہ علیحدہ سورت نہ ہو بلکہ سورۂ انفال کا جزء ہو، کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ پر جب قرآنِ کریم نازل ہو رہا تھا

تو جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری سورت شروع ہوتی تو اس سے پہلے بسم اللہ بھی نازل ہوتی تھی جس سے سمجھ لیا جاتا تھا کہ پہلی سورت ختم اور دوسری سورت شروع ہو رہی ہے لیکن سورۂ توبہ جو کہ نزول کے اعتبار سے آخری سورتوں میں سے ہے، اس کی ابتداء میں نہ تو بسم اللہ نازل ہوئی اور نہ ہی رسولِ اکرم ﷺ نے کاتب کو اس کے لکھنے کا حکم دیا حتیٰ کہ آپ کا انتقال ہو گیا، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں قرآنِ کریم کو کتابی صورت میں جمع کیا گیا تو اس کے شروع میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ سے صحابہ کرام کو خیال ہوا کہ ممکن ہے یہ مستقل سورت نہ ہو بلکہ کسی دوسری سورت کا جزء ہو، چونکہ مضامین کے اعتبار سے سورۂ انفال کے ساتھ اس کی زیادہ مناسبت تھی اس لیے اسے انفال کے بعد جگہ دی گئی جبکہ ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ اسے انفال سے پہلے رکھا جاتا اس لیے کہ سورۂ توبہ کی آیات سو سے زائد جبکہ انفال کی آیات سو سے کم ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے بھی یہی تھی {۱} (قرطبی ۸/۶۱) کیونکہ سورۂ انفال کا جزء ہونے کی صورت میں یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ انفال کی آیات پہلے اور توبہ کی اس کے بعد نازل ہوئیں۔

۲...... حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے بسم اللہ نہ لکھنے کا نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ امان ہے جبکہ سورۂ برأت میں عہدِ امان ختم کرنے کا اعلان ہے۔ {۱۰}

۳...... جو شخص سورۂ انفال کی تلاوت کرتے ہوئے سورہ توبہ تک پہنچے اسے بِسْمِ اللّٰهِ نہیں پڑھنی چاہیے، البتہ اگر کوئی شخص تلاوت کا آغاز سورۂ توبہ کی ابتداء یا درمیان سے کرے تو اسے بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنی چاہیے۔

۴...... مسلمانوں اور کفار کے درمیان معاہدات کا ہونا جائز ہے جبکہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کا ضرر سے بچنا یا انہیں کسی نفع کا حاصل ہونا یقینی ہو۔ (۱)

۵...... اسلام اپنے پیروکاروں کو عہد کی پاسداری اور احترام کا سبق دیتا ہے اگرچہ وہ عہد کسی کافر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

۶...... اگر معاہدہ ختم کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو علی الاعلان اس کا اظہار ضروری ہے، دھوکہ دے کر دُشمن پر اچانک حملہ کر دینا بزدلی بھی ہے اور غیر شریفانہ فعل بھی۔ (۱)

۷...... اللہ جسے پکڑنا چاہے وہ اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا، دنیا میں اگر وہ اپنے کسی باغی کو مہلت دے دے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آخرت میں بھی بچ جائے گا۔ (۲)

۸...... اہلِ تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں، اللہ کے پسندیدہ کام کرنا اور ناپسندیدہ سے بچنے کا نام تقویٰ ہے۔ (۴)

{۱۰} قال ابن عباس سألت علیا رضی اللہ عنہ...... قال لأن بسم اللہ الرحمن الرحیم امان وھذہ السورة نزلت بالسیف ونبذ العھود. (کبیر ۵/۵۲۲)

۹......اگر دُشمنوں سے جنگ چھڑ جائے تو پھر بزدلی نہیں دکھانی چاہیے بلکہ ہر وہ حربہ اختیار کرنا چاہیے جس سے دُشمن کو نقصان پہنچے اور وہ مرعوب ہو جائے۔(۵)

۱۰......قرآن کسی بھی انسان کو مایوس نہیں کرتا بلکہ ان کے سامنے توبہ اور اُمید کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔

۱۱......کسی غیر مسلم کے مسلمان ہو جانے پر اعتماد تین چیزوں پر موقوف ہے، توبہ، اقامتِ صلوٰۃ اور ادا ءِ زکوٰۃ۔(۵)

۱۲......مشرکینِ عرب سے اس وقت تک قتال واجب ہے جب تک کہ وہ اسلام قبول نہ کرلیں۔(۵)

۱۳......جو بھی کافر ایمان قبول کرلے اس کا خون، مال اور آبرو محفوظ ہو جاتی ہے۔(۵)

۱۴......امام شافعی رحمہ اللہ آیت ۵ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تارکِ صلوٰۃ کو قتل کیا جائے گا۔{۱۱}

امام جصّاص حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ ایسے لوگوں کے ساتھ قتال سے منع کرتی ہے جو نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کے قائل ہوں۔{۱۲} البتہ اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں کہ جو شخص نماز کو کمتر چیز سمجھتے ہوئے چھوڑ دے وہ کافر ہو جائے گا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے تارکِ نماز کے بارے میں یہ ہے کہ اسے جیل میں ڈال دیا جائے اور اس کی پٹائی لگائی جائے حتیٰ کہ وہ نمازی بن جائے۔

مشرکین کے لیے امان اور اسبابِ برأت

﴿۶......۱۰﴾

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ

اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دیدے یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا، پھر پہنچا دے اس کو

اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ

اس کی امن کی جگہ، یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔ کیونکر ہووے مشرکوں کے لئے عہد اللہ کے نزدیک

عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ

اور اس کے رسول کے نزدیک مگر جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا مسجدِ حرام کے پاس، سو جب تک وہ تم سے

{۱۱} احتجّ الشافعی رحمہ اللہ بھذہ الآیۃ علی ان تارك الصلاۃ یقتل۔ (کبیر ۵/ ۵۲۸)

{۱۲} دلّ علی ان المعنی المزیل للقتل ھو اعتقاد الایمان بشرائطہ وفعل الصّلوۃ والزکوۃ/ احکام القرآن للجصّاص ۳/ ۸۲

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۷ كَيْفَ وَاِنْ

سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو، بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے۔ کیونکر رہے صلح اور اگر وہ تم پر

يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ

قابو پائیں تو نہ لحاظ کریں تمہاری قرابت کا اور نہ عہد کا، تم کو راضی کردیتے ہیں اپنے منہ کی بات سے

وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۸ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا

اوران کے دل نہیں مانتے اور اکثر ان میں بدعہد ہیں۔ بیچ ڈالے انہوں نے اللہ کے حکم تھوڑی قیمت پر، پھر روکا

قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ

اس کے رستہ سے، برے کام ہیں جو وہ لوگ کر رہے ہیں۔ نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا اور نہ عہد کا

هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۱۰

اور وہی ہیں زیادتی پر۔

تسہیل: اور اگر ان مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ کی درخواست کرے تو آپ اسے پناہ دے دیجیے تاکہ وہ اطمینان سے اللہ کا کلام سن لے پھر اسے ایسی جگہ پہنچا دیجیے جہاں اسے امن حاصل ہو، یہ پناہ اور امن اس لیے مناسب ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو علمِ حقیقی سے محروم ہیں ○ اللہ اور اس کے رسول کے ہاں مشرکوں کا عہد کیسے معتبر ہوسکتا ہے جبکہ وہ بار بار عہد شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجدِ حرام کے پاس عہد لیا تھا، پھر انہوں نے خلافِ عہد کوئی حرکت نہیں کی، تو یہ جب تک عہد پر قائم رہیں تم بھی عہد کی پاسداری کرو، اللہ تعالیٰ یقیناً اہلِ تقویٰ سے محبت رکھتا ہے ○ عہد شکنی کرنے والوں کے عہد کا اب کیسے اعتبار کیا جاسکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر انہیں کبھی تمہارے اوپر غلبہ حاصل ہو جائے تو وہ تمہارے معاملہ میں نہ تو قرابتداری کا لحاظ کریں گے اور نہ ہی کسی قول وقرار کا، وہ تمہیں صرف باتوں سے خوش کرنا چاہتے ہیں جبکہ ان کے دلوں میں عہد و پیمان کی کوئی اہمیت نہیں، ان میں سے اکثر بدعہد ہیں ○ وہ اللہ کے احکام پر دنیا کے حقیر مال و متاع کو ترجیح دیتے ہیں پھر یہ دوسروں کو بھی اللہ کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں، بلاشبہ انتہائی برے کام ہیں جو یہ کرتے ہیں ○ یہ لوگ کسی مؤمن کے بارے میں نہ رشتوں کا لحاظ رکھتے ہیں نہ ہی قول وقرار کا، یہی ہیں جو شرارتوں میں حد سے تجاوز کرچکے ہیں ○

تفسیر

﴿۶﴾ ...... پہلے حکم دیا گیا تھا کہ مشرکین کو جہاں بھی پاؤ انہیں قتل کرو، یہاں سے استثناء کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ

ایسے مشرک جو ایمان اور قرآن کی حقیقت سمجھنے کے لیے امان کے طلبگار ہوں انہیں مہلت دے دو حتیٰ کہ ان کے لیے کلام اللہ کا سننا، اس میں غور و تدبر کرنا اور دین کی حقیقت کا سمجھنا آسان ہو جائے، اس لیے کہ جہاد کا ہدف زیادہ سے زیادہ انسانوں کا خون بہانا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد فتنہ و فساد کا خاتمہ ہے تاکہ اللہ کی عبادت اور اشاعتِ اسلام کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

﴿ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ﴾ چونکہ قبولِ اسلام کے لیے جبر جائز نہیں، اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس مشرک کو ایسی جگہ پہنچانے کا انتظام بھی کریں جہاں وہ اپنے آپ کو محفوظ اور مطمئن سمجھے تاکہ وہ مکمل آزادی سے کفر پر باقی رہنے یا اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر سکے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ﴾ اللہ کا کلام سننے اور دین کی حقیقت سمجھنے کے لیے مہلت دینا اس لیے ضروری ہے کہ یہ مشرک ایسی قوم ہیں جو نہ کتاب کی حقیقت جانتے ہیں اور نہ ہی ایمان کے بارے میں انہیں خبر ہے، دین کی دعوت ان تک نہیں پہنچ سکی، اپنی جہالت اور قوم پرستی کی وجہ سے وہ ایمان جیسی عظیم نعمت سے محروم رہے، اس لیے جب وہ خود طلب رکھتے ہوں تو انہیں فہمِ دین کا موقع فراہم کرنا ضروری ہے۔

ہمارے آقا ﷺ کی پوری زندگی اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ آپ سب سے زیادہ لوگوں کے ایمان قبول کرنے کے حریص تھے۔ جہاد پر جانے والے لشکروں کو بھی یہ تلقین فرماتے تھے کہ مخالفین کو سب سے پہلے ایمان کی دعوت دی جائے، اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں تو ان پر تلوار نہ اُٹھائی جائے۔

﴿۷﴾...... گزشتہ آیات میں مشرکین سے معاہدات سے برأت کا اعلان کیا گیا تھا، یہاں اس کی حکمت بتائی جا رہی ہے کہ یہ اللہ کے باغی ایسے بد اخلاق، بدفطرت اور بغض و عناد رکھنے والے ہیں کہ ان سے ایفاءِ عہد کی اُمید رکھنا ہی غلط ہے۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ﴾ ان بدعہدوں میں سے ان لوگوں کا استثناء کیا جا رہا ہے جو وفاءِ عہد پر قائم رہے، نہ تو انہوں نے دھوکہ دیا اور نہ ہی مسلمانوں کے خلاف ہونے والی کسی کارروائی میں حصہ لیا۔

اس آیت کے ضمن میں تفاسیر میں دو قبائل کے نام آتے ہیں۔ بنو کنانہ اور بنو ضمرہ {۱۳} یہ آخر تک اپنے عہد پر قائم رہے تھے، ان کے بارے میں مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جب تک یہ سیدھے رہیں تم بھی سیدھے رہو کیونکہ بدعہدی مسلمانوں کا نہیں منافقوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔

{۱۳} قیل انهم بنو کنانة و بنو ضمرة (کبیر ۵/ ۵۳۱)

﴿الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ مسجدِ حرام سے مراد پورا حرم ہے، ان لوگوں کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر معاہدہ ہوا تھا اور حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں شامل ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ آیت ۷ کی طرح آیت ۴ کے آخر میں بھی وفاءِ عہد کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اہلِ تقویٰ سے محبت کرتا ہے، اس تاکید اور تکرار سے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جا رہی ہے کہ وعدہ کی پاسداری کرنا بھی تقویٰ کے باب سے ہے اگرچہ معاہد کافر اور مشرک ہی کیوں نہ ہو۔

﴿۸﴾...... بار بار کے آزمائے ہوئے ان وعدہ شکن انسانوں کے قول وقرار کا اعتبار کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر انہیں تمہیں زک پہنچانے کا موقع ہاتھ آ جائے تو نہ یہ عہد و پیمان کا لحاظ کرتے ہیں نہ خونی رشتوں کا، لیکن جب مغلوب ہوں تو میٹھی میٹھی باتوں سے تمہیں خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ جب وہ سخن سازی کر رہے ہوتے ہیں تب بھی ان کے دلوں میں بغض وعداوت اور انکار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

﴿وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ﴾ ان کی اکثریت ایسی ہے جو اپنے مادی مفادات کی خاطر معاہدے کی زنجیروں کو توڑ کر صدق ووفاء کی حدود سے باہر نکل جاتی ہے۔{۱۴}

﴿۹﴾...... جھوٹ اور عہد شکنی کا سبب یہ ہے کہ ایسے لوگ دنیا کے حقیر سے مال ومتاع اور خواہشات کو اللہ کے احکام پر ترجیح دیتے ہیں چنانچہ وہ خود بھی صراطِ مستقیم سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

﴿۱۰﴾...... دنیا کی محبت اور کفر وشرک میں مبالغہ کی وجہ سے اہلِ ایمان کے بارے میں وہ نہ تو قرابتداری کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ ہی قول وقرار کا، ان کے نزدیک ایمان اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی وجہ سے مومن کسی بھی رو رعایت کا حقدار نہیں رہتا۔

حکمت وہدایت

۱...... اگر کوئی کافر دینِ اسلام کی حقیقت سمجھنے کے لیے دار الاسلام میں آنا چاہے تو اسے اجازت دے دینی چاہیے۔

۲...... جو شخص ہم سے تعلیمِ دین کی درخواست کرے ہم پر اس کی مدد کرنا واجب ہے۔

۳...... اگر کوئی شخص ویزا لیکر اسلامی مملکت میں داخل ہو تو اس کے خون اور مال وجان کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہے اگرچہ وہ حربی مشرک ہی کیوں نہ ہو۔

{۱۴} لأن أكثرهم خارجون من قيود العهود والمواثيق متجاوزون لحدود الصدق والوفاء (تفسير المراغي ۱۰/۶۳)

۴......مقصد اور ضرورت کے پورا ہونے کے بعد اسلامی حکومت پر لازم ہے کہ وہ کافر کی بحفاظت وطن واپسی کا انتظام کرے اور اسے بلا ضرورت دار الاسلام میں قیام کی اجازت نہ دے۔

۵......قرآن اپنے حروف اور معانی سمیت اللہ کا کلام ہے۔

۶......دین میں صرف تقلید کافی نہیں بلکہ دلائل کی روشنی میں اس کی حقانیت سمجھنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

۷......اپنے دشمنوں میں بھی اگر کچھ لوگ عہد و پیمان پر قائم ہوں تو ان کا لحاظ کرنا چاہیے اور ان کے ساتھ عہد شکنی کرنے والوں جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔

۸......جو لوگ باطل کو حق پر اور اللہ کی آیات پر دنیا کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں وہ ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

۹......جو لوگ حد سے تجاوز کرنے کے عادی ہو جائیں ان سے ہر بد اخلاقی اور زیادتی کا امکان ہوتا ہے اس لیے کہ ان کی فطرت خراب ہو جاتی ہے۔

مشرکین کا حکم

﴿۱۱......۱۵﴾

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ

سو اگر توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیتے رہیں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں حکم شریعت میں

الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَیْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں حکموں کو جاننے والے لوگوں کے واسطے۔ اور اگر وہ توڑدیں اپنی قسمیں

عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ

عہد کرنے کے بعد اور عیب لگائیں تمہارے دین میں تو لڑو کفر کے سرداروں سے، بے شک ان کی

لَآ اَیْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا

قسمیں کچھ نہیں، تاکہ وہ باز آئیں۔ کیا نہیں لڑتے ایسے لوگوں سے جو توڑیں اپنی قسمیں اور فکر میں رہیں کہ

اَیْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ

رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے چھیڑ کی تم سے کیا ان سے ڈرتے ہو؟ سو اللہ کا ڈر چاہیے تم کو زیادہ،

اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ

اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ لڑو ان سے تا عذاب دے اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں اور رسوا کرے اور تم کو

يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

ان پر غالب کرے اور ٹھنڈے کرے دل مسلمان لوگوں کے۔ اور نکالے ان کے دل کی جلن

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾

اور اللہ توبہ نصیب کرے گا جس کو چاہے گا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

تسہیل: اگر یہ کفروشرک سے توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اورزکوٰۃ ادا کریں تو یہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور ہم ایسے لوگوں کے لیے تفصیل سے احکام بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں O اور اگر یہ لوگ معاہدہ کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور دینِ اسلام پر طعن و تشنیع کریں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو تاکہ یہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں O کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کروگے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور اللہ کے رسول کو مکہ سے نکالنے کی تدبیریں کیں اور چھیڑ چھاڑ کی ابتداء بھی انہوں نے کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو O تم ان سے جنگ کرو، اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں تمہارے ہاتھوں سزا دے گا اور انہیں ذلیل ورسوا کرے گا اور تمہیں ان پر غلبہ عطا فرمائے گا اور اہلِ ایمان کے سینوں میں ٹھنڈک پیدا کردے گا O اور ان کے دلوں سے غیظ وغضب دور کردے گا اور اللہ جسے چاہے گا توبہ کی توفیق دے دے گا اور اللہ علیم وحکیم ہے O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۱﴾......مشرکین کو دو راستے دکھائے جارہے ہیں، پہلا راستہ کفروشرک سے توبہ کا ہے، اگر وہ عقیدۂ توحید پر ایمان لے آئیں، نماز قائم کریں اور صاحبِ نصاب ہونے کی صورت میں زکوٰۃ ادا کریں تو وہ اہلِ ایمان کے بھائی ہیں، دینی اخوت عالمِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی خاص عطا ہے، اگر واقعی دلوں میں ایمان راسخ ہوجائے تو اس اخوت پر انسان سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے، اہلِ کفروشرک اس اخوت سے محروم ہیں، تمامتر کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود آج بھی مسلمانوں میں دینی اخوت کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہے، اہلِ کفر مسلمانوں کو باہم لڑا کر اس اخوت کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیتِ کریمہ اہلِ قبلہ کے خون ایک دوسرے پر حرام کرتی ہے۔{۱۵}

{۱۵} قال ابن عباس رضی اللہ: حرّمت ھذہ دماء أھل القبلة (قرطبی ۸/۷۰۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''تمہیں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے، جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا اس کی نماز کا کوئی اعتبار نہیں''۔{۱۶}

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو بار بار اکٹھا ذکر کرنے کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منکرینِ زکوٰۃ کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں ایسی دو چیزوں کے درمیان فرق نہیں کرنے دوں گا جنہیں اللہ کے رسول نے جمع فرمایا ہے۔{۱۷}

﴿۱۲﴾......اگر یہ توبہ بھی نہ کریں اور اپنی قسموں اور معاہدات کا لحاظ بھی نہ کریں بلکہ اس کے بجائے قرآن کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنائیں، اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ پر ناروا تنقید کریں اور اسلام اور مسلمانوں کی اہانت اور تحقیر کریں تو پھر اے مسلمانو! تم کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو۔

''کفر کے علمبرداروں'' سے قریش کے سردار بھی مراد لیے گئے ہیں{۱۸} اور فارسیوں، رومیوں اور مرتدین پر بھی اس حکم کا اطلاق کیا گیا ہے۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مشرکینِ عرب ہیں{۱۹} جو عہد شکنی بھی کرتے تھے اور طعنہ زنی بھی، اور اس حکم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کسی بھی زمانے میں ہوں اور اس جرم کا ارتکاب کریں تو ان سے بھی قتال کیا جائے گا۔

﴿اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ﴾ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں، یہ محض تمہیں دھوکہ دینے کے لیے زبان سے وعدے کرتے ہیں مگر ان کے دل میں وفاء کا عزم نہیں ہوتا۔ سورۂ فتح میں ان کے بارے میں ارشادِ باری ہے:

''وہ اپنی زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔''{۲۰}

﴿لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ﴾ جہاد کا مقصد نہ مال ودولت کا حصول ہے نہ ملک گیری کی ہوس، نہ شہرت، نہ جوشِ انتقام بلکہ اس کی تہ میں انسانیت کے لیے انتہائی خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے، سب سے بڑا مقصد یہ ہے

{۱۶} حوالۂ مذکورہ

{۱۷} بخاری/۲/کتاب الاعتصام/باب ۲۸

{۱۸} المراد بالأئمة رؤساء المشركين- (بيضاوى ۳/۱۳۳)

{۱۹} والصحيح ان الآية عامة وان كان سبب نزولها مشركى قريش فهى عامة لهم ولغيرهم- (ابن كثير/۲/۴۴۶)

{۲۰} يقولون بالسنتهم ماليس فى قلوبهم- (الفتح/۴۸/۱۱)

کہ سارے کے سارے انسان حاکمِ حقیقی کے سامنے سر جھکا دیں کیونکہ اس میں ساری انسانیت کے تحفظ، عالمی امن اور فلاح کا راز پوشیدہ ہے، جو لوگ اسلام قبول کرنا نہیں چاہتے وہ کم از کم اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں، لہٰذا اس قسم کے لوگ اگر اپنی غلط روش سے باز آ جائیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تلوار نیام میں ڈال لیں۔

یہ ایسی حکمت ہے جو اسلامی جہاد کو دنیا کی تمام جنگوں سے ممتاز کرتی ہے۔

﴿۱۳﴾...... مسلمانوں کو ان لوگوں کے ساتھ قتال کی ترغیب دی جا رہی ہے جنھوں نے تین ایسے جرائم کا ارتکاب کیا جن کی وجہ سے وہ کسی رعایت کے حقدار نہیں۔

(۱) عہد شکنی۔

(۲) رسول اللہ ﷺ کو وطن سے بے وطن کرنے کا ارادہ۔

(۳) جنگ کی ابتداء۔

سوال یہ ہے کہ اس سے یہود مراد ہیں یا مشرکین؟ تفسیروں میں دونوں کا ذکر آیا ہے۔{۲۱}

جن تین جرائم کا ذکر ہوا وہ بھی دونوں سے صادر ہوئے تھے، یہود سے مسلمانوں نے بقاء باہمی کے اصول کے تحت جو معاہدہ کیا تھا وہ بار بار اس کی خلاف ورزی کرتے رہے، انہوں نے حضور اکرم ﷺ کو مدینہ سے نکال دینے کا عزم کرتے ہوئے کہا تھا:

﴿لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ﴾ {۲۲} ''عزت والا ذلیل کو مدینہ سے نکال باہر کرے گا''

جنگی کاروائیوں کی ابتداء بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔

لیکن جو مضمون چلا آ رہا ہے اسے دیکھا جائے تو یہ آیت مشرکین پر زیادہ صادق آتی ہے، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حدیبیہ میں دس سال کے لیے پُرامن طریقے سے رہنے کا معاہدہ کیا تھا مگر دو سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ انہوں نے اس معاہدہ کی کھلے عام خلاف ورزی کرتے ہوئے بنوبکر کا ساتھ دیتے ہوئے بنوخزاعہ پر چڑھائی کر دی جو کہ مسلمانوں کے حلیف تھے۔

یہی سنگدل انسان تھے جنہوں نے ہمارے آقا ﷺ کو قید میں ڈالنے یا قتل کرنے یا مکہ سے نکال دینے کی تدبیریں کیں۔

{۲۱} کبیر/۵/۵۳۵، روح المعانی/۶/۸۹۔ وقیل هم الیهود۔(بیضاوی ۳/۱۳۴)

{۲۲} المنافقون/۶۳/۸

پھر یہی وہ جنگجو تھے جنہوں نے تجارتی کارواں کے بچ جانے کے باوجود قسمیں کھائی تھیں کہ ہم اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کا قلع قمع نہ کردیں۔

﴿ اَتَخْشَوْنَهُمْ ﴾ مسلمانوں کی جماعت میں منافق بھی گھسے ہوئے تھے جو کفار کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے لیکن ظاہر ہے منافق اس لائق نہ تھے کہ ان سے خطاب کیا جاتا اس لیے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ ''کیا تم ان مشرکین سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے'' جو سچا مومن ہو اس کے دل میں اللہ کا خوف ہر چیز سے زیادہ ہوتا ہے بلکہ وہ اللہ کے سوا کسی سے ڈرتا ہی نہیں، طبعی طور پر تو وہ کسی خوفناک درندے اور خطرناک انسان سے ڈر سکتا ہے لیکن اس کے دل میں حقیقی خوف صرف اللہ کا ہوتا ہے، یہی چیز مسلمان کو بہادر بناتی ہے۔

﴿۱۴﴾......اے مؤمنو! تم کفر کے ان سرغنوں سے قتال کرو، تمہارے قتال کے ذریعے اللہ انہیں سزا بھی دینا چاہتا ہے اور ذلیل وخوار بھی کرنا چاہتا ہے، کل کے مظلوموں اور کمزوروں کے ہاتھوں گرفتار ہونے، ان سے شکست کھانے اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بڑھ کر کیا ذلت ہوگی؟

﴿ وَيَشْفِ صُدُوْرَ ﴾...... مشرکین کی وعدہ خلافیوں اور مظالم کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں رنج والم کے جو جذبات پائے جاتے تھے ان سے شفا حاصل ہوگی۔

﴿۱۵﴾......اور جو غیظ وغضب پایا جاتا تھا وہ جاتا رہے گا۔

﴿ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ ﴾ اللہ نہ تو کسی کو قبولِ ایمان پر مجبور کرتا ہے اور نہ ہی توبہ کرنے پر، بلکہ قبولِ توبہ وہدایت کے لیے بھی اس کا ایک نظام ہے جو بندوں میں کارفرما ہے، اسی نظام کے تحت بعض خوش نصیبوں کو توفیقِ توبہ مل جاتی ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی احکام اور فیصلے ہیں وہ علم اور حکمت پر مبنی ہیں، وہ حال کے تقاضوں اور مصلحتوں کو بھی جانتا ہے اور مستقبل کے تقاضوں کو بھی، وہ ہر شخص کے ظاہر کو بھی جانتا ہے اور باطن کو بھی، اسے یہ بھی علم ہے کہ کس شخص کے اندر کتنی طلب ہے، اسی کے مطابق وہ ہدایت کے فیصلے فرماتا ہے۔

حکمت وہدایت

۱......باری تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑے رحیم وکریم ہیں اسی لیے وہ اپنے نافرمان بندوں کو بھی بار بار توبہ کی ترغیب دیتے ہیں۔(۱۱)

۲......اسلامی اخوت کا رشتہ تین چیزوں سے ثابت ہوتا ہے، توحید، اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ۔(۱۱)

۳......اخروی کامیابی میں بھی یہ تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص دنیا سے اس حال میں جدا ہوا کہ وہ خالص اللہ کی عبادت کرتا ہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو، نماز قائم کرتا ہو اور زکوۃ ادا کرتا ہو تو وہ دنیا سے اس حال میں جائے گا کہ اللہ اس سے راضی ہوگا''۔{۲۳}

۴......اگر کوئی مسلمان دین پر طعن و تشنیع کرے تو وہ مرتد ہو جائے گا۔(۱۲)

۵......امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ دینِ اسلام پر ناروا تنقید کرنے سے ذمّی کا عہد ٹوٹ جاتا ہے اور وہ واجب القتل ہو جاتا ہے جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ صرف تنقید سے عہد نہیں ٹوٹتا البتہ وہ تعزیر اور سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔{۲۴}

۶......اگر اسلامی مملکت میں رہنے والا کوئی غیر مسلم ہمارے آقا ﷺ کو گالی دے یا آپ کا مذاق اڑائے تو اکثر علماء کے نزدیک وہ قتل کا مستحق ہو جاتا ہے جبکہ اس میں بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعزیر کے قائل ہیں۔

۷......جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے ایسا اسلوبِ بیان اختیار کرنا جائز ہے جو جذبات میں ہلچل مچا دے۔(۱۳)

۸......سچا مؤمن اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، اللہ کے ڈر کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور گناہ چھوڑ دیے جائیں۔(۱۳)

۹......دشمن، درندے، سانپ، موت اور حادثے وغیرہ کا خوف، طبعی خوف کہلاتا ہے اور اس خوف کا ہونا کمالِ ایمان کے منافی نہیں۔

۱۰......کفر و شرک کے مقابلے میں شجاعت کا اظہار کمالِ ایمان کی علامت ہے اور بزدلی، ضعفِ ایمان کی دلیل ہے۔(۱۳)

۱۱......اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اعلیٰ درجے کے مومن تھے اس لیے کہ ان کے دلوں میں دین کے لیے بے پناہ حمیت اور شجاعت پائی جاتی تھی۔(۱۳)

۱۲......جہاد کے نتیجے میں کافر ذلیل و رسوا ہوتے ہیں، اہلِ ایمان کے دل صاف ہوتے ہیں اور گمراہوں کو توبہ کی توفیق مل جاتی ہے۔(۱۵)

{۲۳} ابنِ ماجہ، مقدمہ صفحہ۸

{۲۴} احکام القرآن للجصاص ۸۵

اہلِ ایمان کا امتحان

﴿۱۶﴾

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ چھوٹ جاؤ گے اور حالانکہ ابھی معلوم نہیں کیا اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا ہے اور نہیں پکڑا

مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾

انہوں نے سوا اللہ کے اور اس کے رسول کے اور مسلمانوں کے کسی کو بھیدی، اور اللہ کو خبر ہے جو تم کر رہے ہو۔

ربط: گزشتہ آیات میں جہاد کی ترغیب تھی اور یہاں بتایا جا رہا ہے کہ مختلف آزمائشوں کے ذریعے مجاہد اور مجاور کو جدا جدا کر دینا اللہ کی سنت ہے۔

تسہیل: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ابھی تک ان لوگوں کو ظاہر ہی نہیں کیا جو تم میں سے مجاہد ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو اپنا قلبی دوست نہیں بناتے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۶﴾...... اے مسلمانو! کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اللہ کا محبوب اور جنت کا حقدار بننے کے لیے زبانی کلامی دعویٰ ایمان کافی ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے آزمائشیں آئیں گی جن سے سچے اور جھوٹے، مومن اور منافق، مجاہد اور نکمّے کا فرق ظاہر ہو جائے گا، یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کون ہیں وہ لوگ جنہوں نے خفیہ طور پر کفار سے دوستی لگا رکھی ہے اور کون ہیں جن کے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اہلِ ایمان کے سوا کسی کے لیے جگہ نہیں۔

﴿وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ﴾ لفظی معنی ہے ''ابھی تک اللہ نے جانا ہی نہیں'' ظاہر ہے اللہ کا علم محیط ہے، کوئی بھی چیز اس کے علم سے باہر نہیں، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ مخلص اور منافق کو نہ جانتا ہو، اس لیے اہلِ علم کہتے ہیں کہ یہاں حقیقت میں علم کی نہیں معلوم اور موجود کی نفی ہے۔{۲۵}

اس لیے کہ کسی چیز کے بارے میں اللہ کا عدمِ علم اس کے عدمِ وجود کی دلیل ہے، اس کائنات میں جو کچھ ہے اس کا علم باری تعالیٰ کو حاصل ہے اور جب اللہ فرمائے کہ مجھے اس چیز کا علم نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز موجود ہی نہیں ہے، جو لوگ مومن اور مجاہد ہونے کے مدعی تھے ان پر ابھی تک ایسی آزمائشیں نہیں آئیں تھیں جن میں ثابت قدم رہنے

{۲۵} ذکر العلم والمراد منه المعلوم، کبیر/۶/۸، ونفی العلم، والمراد نفی المعلوم۔ (روح المعانی/۶/۹۳)

سے ان کا مجاہد ہونا ثابت ہوتا۔{۲۶} جب ایک چیز کا وجود ہی نہیں تو اس کے ساتھ علمِ الٰہی کا فعلی تعلق بھی نہیں ہوگا۔

یہی مضمون سورۂ عنکبوت کے آغاز میں بھی آیا ہے:

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۝ {۲۷}

’’کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صرف اپنے آپ کو مومن کہنے سے وہ چھوٹ جائیں گے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا؟ حالانکہ ہم نے انہیں بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے تھے، اللہ یہ ضرور معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان میں سے سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں‘‘

﴿ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَةً ﴾ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسے حضورِ اکرم ﷺ کی اتباع لازم ہے یونہی اہلِ ایمان کی اتباع بھی لازم ہے، اجماعِ امت سے ہٹ کر چلنے والے گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ سے بھی اجماع کی اہمیت اور اس کا شرعی حجت ہونا ثابت ہوتا ہے، اس آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ:

’’جو کوئی ہدایت کا راستہ واضح ہونے کے بعد رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا اور مومنین کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ کی پیروی کرے گا تو ہم اسے کرنے دیں گے جو کچھ وہ کرتا ہے اور پھر اسے ہم جہنم میں ڈال دیں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے‘‘

﴿ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ اللہ کو تمہارے ان اعمال کی بھی خبر ہے جو تم کر رہے ہو اور ان اعمال کی بھی خبر ہے جو تم بعد میں کرو گے لیکن اس کی سنت یہی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو مختلف طریقوں سے آزماتا ہے تاکہ کھرا اور کھوٹا الگ الگ ہو جائے اور دنیا والوں کو بھی پتہ چل جائے کہ مخلص کون ہے اور منافق کون ہے، امتحان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امتحان کے بغیر اللہ کو کسی انسان کی حقیقت اور اس کے اعمال کی خبر نہیں ہوتی۔

حکمت و ہدایت

۱......وہی لوگ مومن کہلانے کے حقدار ہیں جو ہر قسم کی ابتلاؤں میں ثابت قدم رہتے ہیں۔(۱۶)

۲......مومن کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہوتا ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے علاوہ کسی کو بھی قلبی دوست نہیں بناتا۔(۱۶)

۳......ہر مجاہد مخلص نہیں ہوتا اور نہ ہی قتال اپنی ذات کے اعتبار سے مطلوب ہے، اصل یہ ہے کہ جو کچھ کیا جائے وہ رضاءِ الٰہی کے لیے کیا جائے۔(۱۶)

{۲۶} کشاف/۱/۴۴۸

{۲۷} العنکبوت/۲۹/۱-۲

مساجد کی تعمیر اور جہاد فی سبیل اللہ

﴿۱۷.....۲۲﴾

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ

مشرکوں کا کام نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں اور تسلیم کررہے ہوں اپنے اوپر کفر کو،

اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ

وہ لوگ خراب گئے، ان کے عمل اور آگ میں رہیں گے وہ ہمیشہ۔ وہی آباد کرتا ہے مسجدیں اللہ کی

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى

جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور قائم کیا نماز کو اور دیتا رہا زکوٰۃ اور نہ ڈرا سوائے اللہ کے

اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ

کسی سے سو امیدوار ہیں وہ لوگ کہ ہوویں ہدایت والوں میں ۔ کیا تم نے کردیا حاجیوں کا پانی پلانا

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

اور مسجد حرام کا بسانا برابر اس کے جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور لڑا اللہ کی راہ میں

لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

یہ برابر نہیں ہیں اللہ کے نزدیک اور اللہ رستہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔ جو ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے

هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً

اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے ان کے لئے بڑا درجہ ہے اللہ کے ہاں اور

عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ

وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ خوشخبری دیتا ہے ان کو پروردگار ان کا اپنی طرف سے مہربانی کی

وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اور رضامندی کی اور باغوں کی کہ جن میں ان کو آرام ہے ہمیشہ کا۔ رہا کریں ان میں مدام،

عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾

بیشک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

ربط: سورۃ کی ابتداء سے یہاں تک مشرکین ہی کا ذکر چل رہا ہے جنہیں بڑا ناز تھا کہ ہم کعبہ کے متولی اور خادم ہیں،

انہیں بتایا جارہا ہے کہ بت پرستی کی وجہ سے تمہیں اس خدمت سے ہمیشہ کے لیے معزول کیا جارہا ہے، ویسے بھی یہ جزوی نیکی، حقیقی نیکی کے قائم مقام نہیں ہوسکتی۔

تسہیل: مشرک اس قابل نہیں ہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کا انتظام کریں جبکہ صورت یہ ہے کہ وہ خود اپنے کفریہ عقائد کا اقرار کرتے ہیں، ان کے سارے اعمال ضائع ہوگئے، یہی ہیں وہ لوگ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے O مساجدِ الٰہی کو آباد کرنا صرف انہی لوگوں کی شان ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، ان لوگوں کے بارے میں امید ہے کہ یہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے O کیا تم حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کے انتظام کو اس شخص کے عمل کے برابر قرار دیتے ہو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہو؟ نہیں ہرگز نہیں! اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں ہوسکتے، اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا اس لیے یہ موٹی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی O جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی رضا کے لیے انہوں نے اپنے مال اور جان سے جہاد کیا، اللہ کے نزدیک ان کا درجہ بہت بڑا ہے اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں O ان کا رب انہیں خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسے باغات کی جن میں ان کے لیے دائمی نعمت ہوگی O ان میں یہ ہمیشہ رہیں گے، بلاشبہ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے O

تفسیر

﴿۱۷﴾......مشرکین کو مسجدِ حرام کی تولیت، خدمت اور وہاں حاضر ہوکر اپنے انداز میں عبادت کرنے پر بڑا فخر تھا، حجاجِ کرام اور مسجدِ حرام کی مختلف خدمات کے سلسلے میں ان کے درمیان مسابقت کا جذبہ بھی دکھائی دیتا تھا، یہاں واضح کردیا گیا کہ مشرکین کو مسجدِ حرام تو کیا روئے زمین پر واقع کسی بھی مسجد میں عبادت، اس کی تعمیر اور تولیت کا حق نہیں جبکہ صورت یہ ہے کہ ان کا قول وعمل ان کے کفر کی گواہی دیتا ہے، وہ بت پرستی کرتے ہیں، بعث وجزا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، بیت اللہ کا ننگے ہوکر طواف کرتے ہیں اور قدم قدم پر زمانۂ جاہلیت کے افعال اور رسوم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ معاملہ صرف مشرکینِ مکہ کا نہیں دنیا بھر کے کافروں کا یہی حال ہے لہٰذا کافر کو مساجد کے انتظامات کا حق اس طرح نہیں دیا جاسکتا کہ اس کی اجازت کے بغیر مسجد میں عبادت ہی نہ ہوسکے۔

﴿اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ چونکہ ایمان کے بغیر کوئی بھی عمل قبول نہیں ہوتا اگرچہ وہ بظاہر کتنا نیک ہی کیوں نہ ہو اس لیے کافروں کے سارے اعمال ضائع ہوجائیں گے۔

﴿۱۸﴾...... مساجد کی تعمیر، ان کے انتظام وانصرام اوران میں عبادت کا حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو کامل ایمان رکھنے کے ساتھ اس کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں یعنی نماز سارے واجبات اور آداب کے ساتھ قائم کرتے اور اپنے اموال کی پوری پوری زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ایک اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، وہ جانتے ہیں کہ نفع اور نقصان اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔

﴿فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ﴾ جن لوگوں کے اندر یہ صفات پائی جاتی ہیں انہیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے پسندیدہ اعمال کی توفیق بھی دے گا! ور وہ اس منزل تک بھی پہنچ جائیں گے جو ہر مومن کی منزل ہے یعنی اللہ کی رضا اور جنت الفردوس!

قرآن کا انداز دیکھئے کہ جولوگ رضاءِ الٰہی کے حصول کی بظاہر ساری شرطیں پوری کرتے ہیں انہیں بھی منزل تک پہنچنے کی صرف امید دلائی جاتی ہے، جزم اور یقین والا انداز اختیار نہیں کیا جاتا تاکہ وہ کہیں گھمنڈ کا شکار نہ ہوجائیں، ویسے بھی مومن کو ہروقت ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں شیطان اسے راہِ راست سے ہٹا نہ دے یا اس کی عبادت میں دکھاوا نہ آجائے، خوف اور امید کا یہ اجتماع کمالِ ایمان کی دلیل ہے۔

بعض حضرت کی رائے یہ ہے کہ یہاں ''عسیٰ'' (امید) کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور یہ ظن اور امید کے معنی میں نہیں بلکہ یہ قطعیت اور یقین کے معنی میں ہے، اسے ہم شاہانہ اندازِ گفتگو بھی کہہ سکتے ہیں، بادشاہ جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں تو یونہی کہا کرتے ہیں ''امید ہے تمہیں نوازا جائے گا''۔

﴿۱۹﴾...... ان آیات میں اس مضمون کی تکمیل ہے جو پہلی دو آیتوں میں بیان ہوا ہے یعنی مسجدِ حرام اور دیگر مساجد میں عبادت اور ان کا انتظام سنبھالنے کا حق صرف مسلمانوں کو حاصل ہے اور ایمان اور جہاد ان چیزوں سے کہیں زیادہ افضل ہیں جن پر مشرک فخر کرتے ہیں یعنی مسجدِ حرام کی خدمت اور حاجیوں کو پانی پلانا وغیرہ، مشرکین اپنی ان خدمات پر بڑا فخر کرتے تھے حتیٰ کہ اسلام، ہجرت اور جہاد کو بھی ان کے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ بدر کے دن گرفتار ہوگئے تو انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر تمہیں اسلام، ہجرت اور جہاد میں ہم سے سبقت حاصل ہوگئی ہے تو کیا ہوا ہم مسجد حرام کی تعمیر کرتے، حاجیوں کو پانی پلاتے اور قیدیوں کو چھڑاتے ہیں'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ﴾ {۲۸}

{۲۸} تفسیر ابن کثیر/۲/۴۴۹

اس آیت کے ذریعے ان لوگوں کا ذہن صاف کر دیا گیا جو جزوی نیکی کو اصل مقصود سے بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے، کسی بھی نیک عمل کا اللہ کے نزدیک اس وقت تک اعتبار نہیں ہو سکتا جب تک اصل مقصود کا تحفظ نہ ہو، تمام اعمال کی مقبولیت کا مدار ایمان پر ہے، اگر ایمان نہیں تو بڑے سے بڑا عمل رب العلمین کی بارگاہ میں پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔

مشرکین کی تردید کے ساتھ قیامت تک آنے والے ان مسلمانوں کے سامنے بھی حقیقت واضح کر دی گئی جو مساجد کی تعمیر اور حاجیوں کی خدمت جیسے اعمال کو جہاد سے بھی افضل سمجھتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں چند صحابہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے منبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ اگر میں اسلام قبول کر لینے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے کے علاوہ کوئی بھی عمل نہ کروں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں، دوسرے صاحب نے کہا میری نظر میں تو سب سے بڑا عمل مسجدِ حرام کی تعمیر ہے جبکہ تیسرے صاحب نے جہاد فی سبیل اللہ کو تمام اعمال سے افضل عمل قرار دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم رسول اللہ ﷺ کے منبر کے پاس اپنی آوازیں بلند نہ کرو، مناسب یہ ہے کہ نمازِ جمعہ کے بعد خود رسولِ کریم ﷺ سے دریافت کر لیا جائے۔ چنانچہ جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمادی ﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ﴾ {۲۹}

یہ وضاحت ہم کئی جگہ کر چکے ہیں کہ ''آیت نازل فرمادی'' کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے سوال کے جواب میں یہ آیت کریمہ تلاوت فرمادی جو کہ حقیقت میں پہلے ہی نازل ہو چکی تھی۔

﴿لَا يَسْتَوٗنَ﴾ یقیناً حجاجِ کرام کی خدمت اور مسجدِ حرام کی دیکھ بھال بھی نیک اعمال میں سے ہیں لیکن اجر و ثواب کے اعتبار سے ایمان اور جہاد کے برابر نہیں ہو سکتے۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ظالم قوم کو حق و عدل اور افضل عمل کی ہدایت اور توفیق نہیں ملتی، ظلم اور شرک کی وجہ سے وہ نورِ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں اور یہ محرومی عدل کا فیصلہ کرنے کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

{۲۹} مسلم/۲/کتاب الأمارة/ باب فضل الشهادة فى سبيل الله، صفحه ۱۳۴، مسند احمد/۴/۲۶۹

﴿۲۰﴾......اس میں کوئی شک نہیں کہ حاجیوں کو سیراب کرنا اور مسجدِ حرام کی تعمیر نیک اعمال میں سے ہیں لیکن اوّل تو کفر وشرک کی وجہ سے ان پر کوئی ثواب مرتب نہیں ہوتا، پھر یہ کہ جن حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں ان میں جو فضیلت ایمان کے بعد ہجرت اور جہاد کی تھی وہ کسی دوسرے عمل کی کہاں ہوسکتی تھی، اس لیے کہ اہلِ ایمان بھی جو اعمال کرتے ہیں ان کی فضیلت اور افضیلت میں حالات اور ضروریات کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ کفر کی یلغار کی وجہ سے مسلمانوں کا وجود تک خطرے میں ہو، اگر کوئی شخص، ملک یا جماعت یہ سمجھتی ہے کہ کفر کی یلغار روکنے اور اہلِ اسلام کی حفاظت کے بجائے مساجد کی تزیین وآرائش اور حاجیوں کی راحت رسانی کے انتظامات ہی سب سے افضل اعمال ہیں تو ہم واضح طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے دین کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔

﴿وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ جن لوگوں کے اندر یہ تین صفات (ایمان، ہجرت اور جہاد) پائی جاتی ہیں وہی لوگ کامیاب ہیں اور جو لوگ ان صفات سے محروم ہیں وہ ناکام ہیں اگرچہ وہ مسجدِ حرام اور مسافرانِ حرم کی خدمت جیسے عظیم عمل ہی میں مصروف کیوں نہ ہوں۔

﴿۲۱-۲۲﴾......جو لوگ ان تین صفات سے متصف ہوں گے ان کے لیے تین بشارتیں ہیں:

(۱) اللہ کی خصوصی رحمت۔

(۲) کامل رضا، جس کے بعد ناراضگی کا اندیشہ باقی نہ رہے گا۔

(۳) ابدی نعمتوں کے باغات۔

﴿اَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ ہجرت اور جہاد معمولی عمل نہیں ہیں، وطن اور اہل وعیال سے جدائی اور مال وجان کی قربانی وہی شخص دے سکتا ہے جس کا دل ایمانِ کامل کے نور سے منوّر ہو، چونکہ اس کا ایمان وعمل اعلیٰ درجہ کا ہے اس لیے اسے اجر بھی بہت بڑا دیا جائے گا۔

حکمت وہدایت

۱......دنیا میں مشرکین نیکی کے جو بھی کام کرتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی ثواب نہیں ہوگا۔ (۱۷)

۲......مساجد کی تعمیر، تولیت اور ان میں عبادت کا حق ان لوگوں کو حاصل ہے جن کے اندر یہ چار صفات پائی جاتی ہوں، ایمان، اقامتِ صلوٰۃ، اداءِ زکوٰۃ اور اللہ کا خوف (۱۸)

۳......مساجد کے خدام اور معماروں کی شان یہ ہے کہ ان کے دل میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو یعنی ان کا دامن ہر

قسم کے شرک سے پاک ہو، وہ نہ تو کسی کو نافع سمجھتے ہوں اور نہ ہی ضار سمجھتے ہوں۔(۱۸)

۴......مشرک اور کافر کو مسجد کا متولی بنانا تو جائز نہیں لیکن مکینک، راج مستری، پلمبر اور مزدور کے طور پر وہ مسجد کے تعمیراتی کاموں میں حصہ لے سکتا ہے، یونہی اگر وہ اپنے سرمائے سے مسلمانوں کے لیے مسجد تعمیر کروادے یا اسے بنانے کے لیے چندہ دے تو اس کا قبول کرنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس سے کسی دینی یا دنیوی نقصان یا مسجد پر قبضہ کر لینے کا خطرہ نہ ہو۔{۳۰}

۵......مسجد کے ظاہری درو دیوار کی تعمیر، حفاظت اور صفائی، ضروریات کا انتظام اور وہاں ذکر و عبادت کے لیے حاضری یہ سب عمارتِ مسجد کے مفہوم میں داخل ہیں۔

۶......مسجد سے تعلق اور محبت اور وہاں حاضری ایمان کی علامت ہے، رسولِ اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ:
جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کی حاضری کا پابند ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''إنّما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ''{۳۱}

۷......مساجد کی تعمیر انتہائی فضیلت والا عمل ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جو شخص اللہ کی رضا کے لیے مسجد تعمیر کرے گا اللہ اس کے لیے جنت میں گھر تعمیر کرے گا''{۳۲}

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ ''جو شخص اللہ کے لیے مسجد تعمیر کرے گا اگر چہ وہ چڑیا کے گھونسلے کے برابر ہو جسے وہ انڈے دینے کے لیے بناتی ہے، تو اللہ اس کے لیے جنت میں گھر تعمیر کرے گا''{۳۳}

تعمیر کی طرح مساجد کی صفائی اور انہیں معطر رکھنے کی ترغیب بھی احادیث میں دی گئی ہے۔

۸......فضول باتیں اور دنیاوی قصے کہانیاں مسجد کے آداب اور مقصد کے خلاف ہیں۔

{۳۰}المراد بالعمارۃ الممنوعۃ عن المشرکین الولایۃ علیھا...... اذا لم یکن فی ذلک ضرر دینی ولاسیاسی۔ (المراغی/۱۰/۷۴)

{۳۱}ترمذی ۲/صفحہ ۱۴۰/ کتاب التفسیر/سورۃ ۸، ابن ماجہ صفحہ ۵۸، باب لزوم المساجد وانتظار الصلوٰۃ۔

{۳۲}بخاری/صلاۃ، باب ۶۵، مسلم، مساجد، باب ۲۴، زھد، باب ۴۴، ترمذی، صلاۃ، باب ۱۸۹

{۳۳} مسند احمد/۱/۲۳۵

۹......ایمان کے ساتھ جہاد ایسا عمل ہے کہ کوئی دوسرا نیک عمل اس وقت اس کے برابر نہیں ہوسکتا جبکہ جہاد کی ضرورت ہو۔(۱۹)

۱۰......کسی عمل کا دوسرے عمل سے افضل ہونا حالات اور ضروریات کے تابع ہوتا ہے، وہ عمل جو مخصوص حالات میں کسی دوسرے عمل سے افضل ہے، ضروری نہیں کہ حالات بدلنے کے بعد بھی افضل رہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے، اسی لیے کسی حدیث میں جہاد کو کسی میں ذکر اللہ کو اور کسی میں بھوکوں کو کھانا کھلانے کو سب سے افضل عمل قرار دیا گیا ہے۔

۱۱......گناہوں سے انسان کی عقل خراب ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ اچھے کو برا اور برے کو اچھا اور مومن اور کافر کو مساوی سمجھنے لگتا ہے۔(۱۹)

۱۲......ایمان والوں کے درجات میں بڑا تفاوت ہوتا ہے اور درجات کی بلندی کا مدار کثرتِ عمل پر نہیں بلکہ حسنِ عمل اور اخلاص پر ہے، یہ وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ایک چھوٹا سا عمل دسیوں بڑے اعمال پر بھاری ثابت ہوتا ہے۔

۱۳......آخرت میں مومن کو مادی اور روحانی دونوں قسم کی نعمتوں سے نوازا جائے گا، جنت کے باغات، نہریں اور چشمے، پھل اور پھول، حوریں اور غلام، جسمانی نعمتیں ہیں اور رحمت اور رضوان روحانی نعمتیں ہیں، ان دو میں سے بھی رضوان اعلیٰ ترین نعمت ہے اس لیے کہ اللہ کی رحمت ان پر بھی نازل ہوتی ہے جن سے وہ راضی ہوتا ہے اور ان پر بھی نازل ہوتی ہے جن سے وہ راضی نہیں ہوتا جبکہ رضوان کے حقدار اس کے محبوب اور مقرب بندے ہوتے ہیں، اسی سورت کی آیت ۷۲ میں باری تعالیٰ اہلِ ایمان کے لیے جسمانی نعمتیں ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ أَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ ”اور اللہ کی رضا سب سے بڑی چیز ہے یہی عظیم کامیابی ہے“

لیکن رضاءِ الٰہی کے نعمتِ عظمیٰ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جسمانی نعمتوں کا انکار کردیا جائے یا انہیں ہلکا بنا کر پیش کیا جائے......ایسے جاہلوں کی بھی کمی نہیں جو معاذ اللہ حور وغلمان کا واضح طور پر مذاق اڑاتے ہیں اور اللہ کے نیک بندوں پر پھبتیاں کستے ہیں کہ ان کے رکوع وسجود اور عبادت وطاعت محض حور وقصور کے لیے ہیں۔

دوستی اور تعلق کی بنیاد

﴿۲۳.....۲۴﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا

اے ایمان والو! مت پکڑو اپنے باپوں کو اور بھائیوں کو رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو ایمان سے

الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ

اور جو تم میں ان کی رفاقت کرے سو وہی لوگ ہیں گنہگار۔ تُو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے

اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا

اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے

وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو، تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے

وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ

اور لڑنے سے اس کی راہ میں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم اور اللہ رستہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔

ربط: سورت کے آغاز میں مشرکوں سے برأت اور قطع تعلقی کا اعلان کیا گیا پھر آیت ۱۶ میں بتایا گیا کہ سچا مومن اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی کو اپنا دوست نہیں بناتا، یہاں بتایا جا رہا ہے کہ مومن کی دوستی کی بنیاد نسب اور خاندان پر نہیں بلکہ ایمان پر ہوتی ہے۔

تسہیل: اے ایمان والو! اگر تمہارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیتے ہیں تو تم انہیں اپنے ولی نہ بناؤ اور تم میں سے جو کوئی انہیں ولی بنائیں گے وہ اپنے اوپر ظلم کریں گے ○ اے میرے حبیب! آپ ان سے فرما دیجیے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں اگر یہ سب کچھ تمہیں اللہ سے، اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرما دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ○

﴿تفسیر﴾

﴿۲۳﴾......اے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والو! اگر تمہارے آباء اور ابناء ایمان کے مقابلے میں کفر و شرک عزیز رکھتے ہیں تو پھر تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم انہیں اپنا ولی، سرپرست اور قلبی دوست نہ بناؤ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور کفار کی محبت ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتی، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دل سے ان کی طبعی محبت کو بھی نکال دیا جائے اس لیے کہ یہ غیر اختیاری چیز ہے اور یہ مطلب بھی نہیں کہ ان کے ساتھ کوئی بھی بھلائی نہ کی جائے کیونکہ اسلام کا فرشتہ داروں کے حقوق بھی ادا کرنے کا حکم دیتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دل میں ان کی ایسی محبت نہ ہو جو اسلام کی محبت پر غالب آجائے۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ﴾ اسلام قبول کر لینے کے باوجود اگر کوئی کافروں سے ایسی محبت رکھے گا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ ان کے کفر پر راضی ہے تو وہ ظالم قرار پائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ''ظالم'' کو مشرک کے معنی میں لیا ہے یعنی یہ بھی انہی جیسا مشرک شمار ہوگا اس لیے کہ کفر پر رضا کفر ہے جیسے فسق پر رضا فسق ہے۔{۳۴}

ایک دوسری آیتِ کریمہ سے بھی اس مضمون کی تائید ہوتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ کا مفہوم ہے:

''اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ دوستی لگانے سے منع کرتا ہے جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی کی اور تمہیں گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی اور جو انہیں دوست بناتے ہیں وہ ظالم ہیں۔''{۳۵}

﴿۲۴﴾......اس آیتِ کریمہ میں وہ سارے تعلقات اور ساری پرکشش چیزیں اللہ نے بیان فرمادی ہیں جو عام طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں اور یہ مجموعی طور پر آٹھ ہیں لیکن انہیں چار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی اقارب، جمع کیے ہوئے اموال، تجارت اور رہائش گاہیں، ان سب کی محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

اقارب میں آباء، ابناء، اخوان، ازواج اور خاندان کا ذکر کیا گیا ہے، سلیم الفطرت اولاد اپنے آباء سے نہ صرف

{۳۴} قال ابن عباس: یرید مشرکاً مثلھم لأنہ رضی بشرکھم والرّضا بالکفر کفر، کما انّ الرّضا بالفسق فسق۔ (کبیر ۱۶/۱۷)

{۳۵} الممتحنة/۶۰/۹

محبت کرتی ہے بلکہ ان پر فخر کرتی ہے خصوصاً عربوں میں یہ چیز بہت زیادہ تھی، حد یہ کہ وہ حج جیسی عظیم عبادت کے موقع پر بھی منیٰ میں جمع ہو کر اپنے آباء واجداد کے کارنامے ہی بیان کرتے تھے یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا اور اس نے انہیں سمجھایا:

''جب تم حج کے اعمال سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کیا کرو جیسے تم اپنے آباء کو یاد کرتے ہو بلکہ ان سے بھی زیادہ'' {۳۶}

بیٹوں سے آباء سے بھی زیادہ محبت ہوتی ہے کیونکہ وہ دل کے ٹکڑے، امیدوں کے مرکز اور خاندان اور معاشرے میں عزت وافتخار کا باعث ہوتے ہیں، اللہ نے انسان کے لیے اولاد کو فتنہ بھی قرار دیا ہے اور باعثِ زینت بھی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا {۳۷} ''مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں''

سرورِ دو عالم ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ انسان اولاد کی خاطر حزن والم کا سامنا کرتا ہے، بخل اور بزدلی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔{۳۸}

بھائی، بھائی کا بازو ہوتا ہے، اسے اس سے تقویت حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا:

سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ {۳۹} ''ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرا بازو مضبوط کر دیں گے''

بیوی کی محبت بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے، دونوں کو ایک دوسرے سے سکون ملتا ہے اور ان میں سے کوئی بھی دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، سورۂ روم میں ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ {۴۰}

''اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس ہی سے بیویاں پیدا کر دیں اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی، اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں''

{۳۶} البقرۃ/۲/۲۰۰

{۳۷} الکہف ۱۸/۴۶

{۳۸} ابن ماجہ/۳۶۶۶، مستدرک حاکم ۳/۱۶۴

{۳۹} القصص ۲۸/۳۵

{۴۰} الروم ۳۰/۲۱

جہاں تک قبیلے اور خاندان کا تعلق ہے، اس کی محبت کی بنیاد باہمی تعاون اور خاندانی روابط پر ہے بالخصوص قبائلی نظام میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے (یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسلام خاندانی سسٹم کی بقا کا قائل ہے جبکہ مغربی طرزِ زندگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں)۔

مال اور تجارت جو کہ حصولِ مال کا ذریعہ ہیں ان کی محبت بھی انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، چونکہ باری تعالیٰ نے ایک خاص مدت تک دنیا کو قائم رکھنے اور مختلف اطراف میں اسے ترقی دینے کا فیصلہ فرما رکھا ہے اس لیے انسان کے دل میں مال کی حرص اور اپنی تجارت وصنعت کو بڑھانے کا جذبہ پیدا کر رکھا ہے، یہ جذبہ اسے ہر دم سرگرمِ عمل رکھتا ہے مکانات اور محلات کی محبت بھی کم وبیش ہر انسان کے اندر پائی جاتی ہے اس لیے کہ رہائش گاہ انسان کو راحت واطمینان فراہم کرتی ہے اور اس کی بناوٹ اور تزیین وآرائش ظاہر پرست سوسائٹی میں اس کی عزت وتکریم میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔

باوجودیکہ ان آٹھوں چیزوں کی محبت انسانی فطرت کا حصہ ہے، قرآن پاک اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ اگر کبھی ایسا مرحلہ آجائے کہ ان چیزوں کی محبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت وطاعت اور جہاد فی سبیل اللہ سے ٹکراتی ہو تو تم ان سب چیزوں کو ٹھکرا دینا اور حبِ خدا، حبِ رسول اور جہاد کے تقاضوں کو سارے تعلقات، ساری محبتوں اور ساری لذتوں پر ترجیح دینا، یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں، اگر ناممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ کبھی بھی ہمیں اس کا حکم نہ دیتا کیونکہ وہ انسان کو ایسی چیز کا مکلّف نہیں کرتا جو اس کے بس میں نہ ہو، مسلمانوں کی تاریخ ایسے انسانوں کے تذکرہ سے بھری پڑی ہے جنہوں نے اس حکم پر سو فیصد عمل کر کے دکھا دیا، خود اللہ تعالیٰ نے ان مبارک انسانوں کے ایثار ومحبت کی گواہی دی ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ {۴۱} ''وہ لوگ جو صاحبِ ایمان ہیں وہ اللہ کی محبت میں بڑے سخت ہوتے ہیں''

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ایمان کی واقعی حلاوت محسوس ہوتی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ:

''جس شخص کے اندر تین صفات پائی جائیں وہ اپنے دل میں ایمان کی حلاوت محسوس کرتا ہے، پہلی یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے ہر چیز سے زیادہ محبت رکھتا ہو، دوسری یہ کہ وہ جس سے بھی محبت رکھے صرف اللہ کے لئے محبت

{۴۱} البقرۃ۲/۱۶۵

رکھے، تیسری یہ کہ اسے کفر میں جانا اتنا ہی ناپسند ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا ناپسند ہوتا ہے۔" {۴۲}

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کسی کا ایمان کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسے اپنے والد، اپنی اولاد غرضیکہ سارے انسانوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ ہو۔ {۴۳}

علماء نے ان احادیث کو ایمانِ کامل پر محمول کیا ہے یعنی نفسِ ایمان تو ہر کلمہ گو کے اندر پایا جاتا ہے مگر کمالِ ایمان اسی کو حاصل ہوگا جو کائنات کی ہر چیز سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھے گا۔

﴿فَتَرَبَّصُوْا﴾ آیت کے اختتام پر بڑی شدید وعید ہے ان لوگوں کے لئے جو دوسری چیزوں کی محبت کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں۔

صاحبِ کشاف فرماتے ہیں کہ یہ آیت بڑی سخت ہے شاید تمہیں اس سے زیادہ سخت آیت قرآن میں نہ ملے۔ {۴۴}

امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں بڑی سخت دھمکی ہے اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اس کی زد میں آنے سے بچنے والے ہیں۔ {۴۵} فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلے میں دوسری چیزوں کی محبت کو ترجیح دیتے ہو تو پھر تم اللہ کے عذاب کا انتظار کرو...... سرورِ دوعالم ﷺ کے مبارک زمانے میں صرف منافقین کے اندر یہ بیماری پائی جاتی تھی، مسلمان اس بیماری سے محفوظ تھے، آج کس قلم سے لکھا اور کس زبان سے کہا جائے کہ مسلمانوں کی اکثریت اس بیماری میں مبتلا ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اس سے بچے ہوئے ہیں اور کیسے بچیں گے جب کہ ان کی اکثریت گناہوں میں غرق ہے اور دین کی حدود سے تجاوز کرچکی ہے اور ایسوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ "اور اللہ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا" "فاسق" کا اطلاق کافر اور منافق پر بھی ہوتا ہے اور گناہ گار پر بھی، لغت میں "فسوق" کا معنی ہے کھجور کا اپنے چھلکے سے باہر نکل آنا۔ {۴۶}

شریعت کی اصلاح میں حدودِ شریعت سے نکل جانے، گناہ اور کفر کے ارتکاب کو فسوق کہا جاتا ہے کیونکہ فاسق بھی

{۴۲} بخاری / الفتح ۱ / ۲۱، مسلم / ۴۳

{۴۳} بخاری / الفتح / ۱ / ۱۵، مسلم / ۴۴

{۴۴} وهذه آية شديدة لاترى أشدّ منها۔ (الكشاف / ۲ / ۲۴۵)

{۴۵} وفي الآية شديد عظيم وقلّ من يتخلّص منه۔ (بيضاوى ۲ / ۱۲۷)

{۴۶} فسق الرطب إذا خرج عن قشره۔ (المفردات / صفحه ۳۸۰)

خیر سے باہر نکل آتا ہے، بدعہد کو بھی فاسق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے عہد کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔

حکمت وہدایت

۱......کفار سے قلبی محبت اور موالات جائز نہیں، اگر چہ وہ کتنے ہی قریبی رشتے دار کیوں نہ ہوں (۲۳)

۲......کفر وشرک کے باوجود صلہ رحمی اور حسنِ سلوک جائز ہے، حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سوال کیا ''یا رسول اللہ! میری والدہ بڑی رغبت سے میرے پاس آئی ہیں کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں! تمہیں اس کی اجازت ہے'' {۴۷}

۳......جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور ایمان والوں کا دشمن ہو اس سے قلبی محبت رکھنا اپنے اوپر ظلم ہے (۲۳)

۴......مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور جہاد فی سبیل اللہ سے محبت رکھنے کے ساتھ ان تمام عقائد، کیفیات، احوال، اعمال اور شخصیات سے بھی محبت رکھے جو اللہ کی نظر میں محبوب ہیں (۲۴)

۵......انسان کے دل میں طبعی محبت تو دوسری چیزوں اور شخصیات کی بھی ہو سکتی ہے لیکن ضروری ہے کہ شرعی محبت ہر شے سے زیادہ اللہ اور اس کے محبوب کی ہو البتہ ایسے نیک بندوں کی کمی نہیں جن کے دلوں میں طبعی محبت بھی سب سے زیادہ اللہ اور اس کے پیغمبروں کی ہوتی ہے۔ وہ مجازی محبت جس کا سبب سوائے عقل کے فتور، حیوانیت کے غلبے اور شہوت کی شدت کے کچھ نہیں ہوتا اس میں مبتلا ہونے والوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے تن، من، دھن اور خونی رشتوں کو بھول جاتے ہیں تو اس ذات کی محبتوں کا کیا حال ہوتا ہوگا جو ذات ہر جمال و کمال اور حسن و احسان کا سرچشمہ ہے اور جس کے حسن واحسان کی جھلک ہر لحظہ اور ہر چیز میں دکھائی دیتی ہے۔

۶......حقیقی محبت ہر اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو فرائضِ شرعیہ کو ادا کرے اور گناہوں سے اپنا دامن بچا کر رکھے...... کثرت سے قرآن مجید کی تلاوت اور اس میں تدبّر بھی حصولِ محبت و معرفت میں اکسیر کا درجہ رکھتا ہے، یہی تاثیر کثرتِ ذکر میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے کہ جب زبان سے کسی کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے تو اس کی محبت دل میں بیٹھ جاتی ہے۔

۷......جو لوگ شریعت کی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں وہ محبت اور ہدایت سے محروم رہتے ہیں (۲۴)

۸......اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اتباع اور اطاعت کی جائے، فرمانِ باری تعالیٰ

{۴۷} بخاری /الفتح ۱۰/ ۵۹۸۹

ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ {۴۸} ”فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا“

۹...... جب انسان محبتِ الٰہیہ میں کامل ہو جاتا ہے تو پھر اس کی ساری محبتیں محبتِ الٰہیہ کے تابع ہو جاتی ہیں پھر وہ جس کسی سے محبت کرتا ہے اللہ ہی کے لیے کرتا ہے اور جس سے بغض رکھتا ہے اللہ کے لئے رکھتا ہے۔

۱۰...... جہاد فی سبیل اللہ افضل ترین عمل ہے کیونکہ یہ وہ عمل ہے جو اللہ کے حکم اور اس کے دیے ہوئے نظام کی سربلندی کا ذریعہ بنتا ہے، اس میں مال بھی لگتا ہے اور جسم و جان کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے جبکہ اس ساری جدوجہد میں نہ نمود و نمائش کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور نہ زمین پر قبضہ مقصود ہوتا ہے۔

غزوۂ حنین

﴿۲۵......۲۷﴾

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ

مدد کرچکا ہے اللہ تمہاری بہت میدانوں میں اور حنین کے دن جب خوش ہوئے تم اپنی

فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ

کثرت پر پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے اور تنگ ہوگئی تم پر زمین باوجود اپنی فراخی کے

مُّدْبِرِيْنَ ۚ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ

پھر ہٹ گئے تم پیٹھ دے کر۔ پھر اتاری اللہ نے اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر

جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾

اور اتاریں فوجیں کہ جن کو تم نے نہیں دیکھا اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے منکروں کی۔

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

پھر توبہ نصیب کرے گا اللہ اس کے بعد جس کو چاہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ربط: پہلے ان لوگوں کو تنبیہ تھی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور جہاد کے مقابلے میں دوسرے روابط اور مادی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں اور دشمن کی قوت و کثرت سے مرعوب ہونے کی وجہ سے میدانِ جنگ میں آنے سے گھبراتے

{۴۸} آلِ عمران ۳/۳۱

ہیں، یہاں بتایا جارہا ہے کہ اگر تم اللہ کی طرف رجوع اور اس پر اعتماد کرو گے اور دین کو دنیا پر ترجیح دو گے تو اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی جیسا کہ دوسرے غزوات کے علاوہ غزوۂ حنین میں ہوا تھا جب مسلمانوں نے اپنی کثرت پر ناز کیا تو شکست کھا گئے اور جب اللہ کی طرف رجوع کیا تو ان کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے۔

تسہیل: اللہ تعالیٰ متعدد مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے اور حنین کا دن تو تمہیں یاد ہی ہوگا جب تمہیں اپنی کثرت پر بڑا ناز تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئےO پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسے لشکر اتارے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے اور سچائی کا انکار کرنے والوں کو سزا دی اور یہی سزا ہے سچائی کا انکار کرنے والوں کیO سزا کے بعد اللہ جسے چاہے گا توبہ کی توفیق عطا کر دے گا کیونکہ اللہ بڑا غفور رحیم ہےO

غزوۂ حنین پر ایک نظر

مکہ اور اس کے اردگرد جو قبائل آباد تھے ان میں قریش کے بعد سب سے طاقتور قبیلہ ہوازن شمار ہوتا تھا اور ان دونوں قبیلوں کے درمیان رقابت اور مقابلہ کا جذبہ پہلے سے موجود تھا، جب مکہ فتح ہوگیا اور قریش نے اپنی شکست تسلیم کر لی تو قبیلۂ ہوازن آگے بڑھا اور اس کے دل میں یہ خواہش شدت سے پیدا ہوئی کہ حجاز کے نقشے پر ابھرنے والی جس جماعت کو قریش شکست نہیں دے سکے اس کی بیخ کنی کا سہرا ہمارے سر بندھ جائے تو عرب میں ہماری شجاعت کا سکہ جم جائے گا۔

ھوازن کے سردار عوف بن مالک نے اعلانِ جنگ کیا اور ثقیف، نسر، جشم سعد بن بکر جیسے قبائل نے ہر طریقے سے ساتھ دینے کا اعلان کیا، ان سب نے مل کر مسلمانوں کی طرف پیش قدمی کا پروگرام بنایا اور اپنا مال و متاع، مویشی اور زیورات، عورتیں اور بچے سب کچھ ساتھ لے لیا تاکہ ان کی عزت و ناموس اور حفاظت کا احساس ان کے اندر پامردی اور شجاعت پیدا کرے۔

اس معرکہ میں درید بن صمہ بھی شریک تھا جو ایک تجربہ کار بوڑھا تھا اور اس کی حکمت و بصیرت کا بڑا چرچا تھا، ان کا لشکر طائف کے قریب ''اوطاس'' نامی وادی میں اترا، حالت یہ تھی کہ اونٹوں کی بلبلاہٹ، گدھوں، خچروں کی چیخ و پکار، بکریوں کے ممیانے اور بچوں کے رونے چلانے سے لشکر کے اندر ایک شور برپا تھا، مالک بن عوف نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کی کہ جب تمہارا مسلمانوں سے آمنا سامنا ہو تو تلواروں کے نیام توڑ دینا اور ایک ساتھ پوری طاقت سے حملہ کر دینا۔

جب سپہ سالارِ اعظم ﷺ کو قبیلۂ ہوازن کی تیاری اور روانگی کا علم ہوا تو آپ بارہ ہزار کا لشکر لیکر ان کے مقابلے کے لئے نکلے، ان میں دس ہزار مہاجر اور انصار تھے جبکہ دو ہزار مکہ کے نومسلم تھے بلکہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، جتنی تعداد مجاہدین کی غزوۂ حنین کے لئے جمع ہوئی اتنی تعداد کسی بھی غزوۂ میں نہ تھی، اپنی کثرتِ تعداد کو دیکھ کر مسلمان کہنے لگے کہ آج ہم قلت کی وجہ سے شکست نہیں کھا سکتے، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صفوان بن امیہ سے کچھ زرہیں اور ہتھیار مستعار لئے اور ہوازن اور ان کے حواریوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لئے تشریف لے چلے۔

جب مسلمان وادئ حنین میں پہنچے تو شوال ۸ھ کی دس تاریخ تھی مسلمانوں کے وادی میں اترنے سے پہلے ہی دشمن کے مسلح سپاہی تنگ راستوں اور گھاٹیوں میں مورچے بنا چکے تھے، مسلمانوں کو دیکھتے ہی انہوں نے درید بن صمۃ کی تجویز کے مطابق ایک ساتھ مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور انہیں اپنے تیروں پر رکھ لیا، تیر اندازی میں ان کی مہارت پورے عرب میں مسلم تھی۔

مسلمان ذہنی طور پر اس حملے کے لئے تیار نہ تھے، تیروں کی بارش دیکھ کر وہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے، کسی کو کسی کی خبر نہ تھی، صورتحال تقریباً ویسی تھی جیسی غزوۂ احد میں تھی، جب رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ سے مسلمان سراسیمہ ہو گئے تھے اور ان کے قدم اکھڑ گئے تھے، یہی وہ وقت تھا جب رسول اللہ ﷺ کی شجاعت اور استقامت نکھر کر سامنے آئی آپ نے اللہ سے دعا فرمائی:

﴿ یارب ائتنی بماوعدتنی ﴾ {۴۹} "اے میرے رب! تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا فرما دے"

پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا، جن کی آواز بڑی زوردار اور بلند تھی کہ لوگوں کو آواز دو ﴿ یا معشر الانصار یا اصحاب الشجرة ﴾ "اے انصار کی جماعت! اے حدیبیہ میں درخت کے نیچے بیعت کرنے والو!" اس آواز نے جذبات میں ہلچل سی مچادی اور ہر طرف سے لبیک لبیک کی صدا سنائی دینے لگی جن کے کانوں میں یہ آواز پڑی وہ اونٹوں سے کود پڑے اور اپنی تلوار اور ڈھال لیکر رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے، آپ کی مبارک زبان پر کبھی یہ جملہ آجاتا "الیّ عباد اللہ الی أنا رسول اللہ" (اللہ کے بندو میری طرف آؤ میں اللہ کا رسول ﷺ ہوں) اور کبھی آپ یہ رجز پڑھتے۔ {۵۰}

{۴۹} ابی سعود ۳/۱۳۷

{۵۰} بحوالہ تفسیر منیر ۱۰/۱۵۹

﴿أنا النبی لا کذب أنا ابن عبدالمطلب﴾ {۵۱} ''میں نبی ہوں جھوٹا نہیں ہوں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں'' جب سو یا اس کے قریب لوگ آپ کے پاس جمع ہو گئے تو انہوں نے دشمن سے مقابلہ شروع کر دیا رسول اللہ ﷺ اپنے دستہ کے ساتھ بلندی پر تشریف لائے، جب مسلمانوں کی شجاعت، پھرتی اور شمشیر زنی کو دیکھا تو فرمایا: ﴿ألآن حمی الوطیس﴾ ''اب تنور گرم ہو گیا ہے'' اس کے بعد آپ نے کچھ کنکریاں لے کر کفار کی طرف پھینک دیں اور فرمایا: ﴿أللّٰھمّ أنجز ماوعدتنی إنھزموا ورب الکعبة﴾ {۵۲}

حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں برابر دیکھتا رہا کہ دشمن کی تیزی ماند پڑ رہی ہے اور وہ پسپا ہوتے نظر آ رہے ہیں، اس کے بعد مسلمانوں نے کفار کو گرفتار اور مالِ غنیمت پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، سب کچھ شمار کیا گیا تو پتہ چلا کہ غلاموں اور باندیوں کی تعداد چھ ہزار تھی، اونٹ چوبیس ہزار، بکریاں چالیس ہزار سے زیادہ اس کے علاوہ چار ہزار اوقیہ چاندی بھی اس میں شامل تھی، یہ سب سے بڑا مالِ غنیمت تھا جو اب تک مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔

آیات کا پسِ منظر سمجھنے کے بعد آیئے ایک نظر ان کی تفسیر پر بھی ڈال لیں۔

﴿تفسیر﴾

﴿۲۵﴾...... یوں تو اللہ تعالیٰ نے بے شمار مقامات پر مسلمانوں کی مدد کی تھی اور یہ سب مقامات مسلمانوں کو اچھی طرح یاد تھے اہلِ ایمان کا قافلہ ایسی تنگ اور جان لیوا گھاٹیوں سے بارہا گزرا تھا جن سے بحفاظت نکل آنا اللہ کی نصرت کے بغیر ممکن ہی نہ تھا اور یہ نتیجہ تھا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور جہاد کو قرابتداروں، خاندان، اموال اور مساکن پر ترجیح دینے کا، اگر مومنوں میں یہ جذبہ ایثار نہ ہوتا تو اللہ کی مدد نازل نہ ہوتی۔

غزوۂ حنین تو بہت قریب کا واقعہ تھا اس میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار اور کافر صرف چار ہزار تھے، اپنی کثرت کو دیکھ کر بعض مسلمانوں کی زبان سے اس قسم کے جملے نکل گئے کہ جب ہم تعداد میں بہت تھوڑے تھے تو ہمیں شکست نہ ہوئی آج جبکہ ہماری تعداد کافروں سے تین گنا زیادہ ہے تو ہمیں کیسے شکست ہو سکتی ہے؟ گویا معنوی اور روحانی نصرت سے ان کی نظر ہٹ گئی اور مادی اسباب پر ان کی نظر جم گئی چنانچہ تنبیہ اور تربیت کے لئے انہیں ہلکا سا جھٹکا دیا گیا اور سمجھا دیا گیا کہ غیبی نصرت کے بغیر مادی اسباب تمہارے کسی کام نہیں آ سکتے۔

﴿۲۶﴾...... جب تربیت ہو چکی تو اللہ نے ان پر سکینہ اتار دیا...... سکینہ اس حالت کا نام ہے جو سکون و اطمینان سے حاصل ہوتی ہے، دشمن کے ناگہانی حملے کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار، اضطراب اور افراتفری تھی خود رسولِ

{۵۱} باب قول اللہ تعالیٰ ویوم حنین ...... الخ (بخاری ۲/۷/۲۱)

{۵۲} مسلم/کتاب الجهاد/باب ۷۶-۷۷

کریم ﷺ کو ان کے انتشار اور فرار سے بے حد صدمہ پہنچا تھا، پھر ایسا ہوا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زبان سے نبی کریم ﷺ کی پکار سنتے ہی ان کے دلوں سے خوف جاتا رہا اور حیرت و اضطراب کے بجائے ان کے سینوں میں سکینہ نے قرار پکڑ لیا اور وہی شجاعت و پامردی ان کے اندر لوٹ آئی جو ان کی پہچان تھی۔

﴿وَ اَنۡزَلَ جُنُوۡدًا﴾ سکینہ کے ساتھ اللہ نے فرشتوں کے ایسے لشکر بھی اتار دیئے جو ظاہری آنکھوں سے تو نظر نہیں آتے تھے مگر ان کی موجودگی کے اثرات دلوں میں محسوس ہوتے تھے۔

﴿۲۷﴾...... یہ قرآن کا انداز ہے کہ وہ کافروں، فاسقوں، فاجروں اور اللہ کے نافرمانوں کو توبہ کا رستہ دکھاتا رہتا ہے اور ان کے دل میں اللہ کی رحمت اور امیدِ مغفرت کا چراغ روشن کرتا رہتا ہے، قبیلہ ہوازن اور ثقیف نے جب مسلمانوں کے ہاتھوں اللہ کے عذاب کا مزہ چکھ لیا تو زندہ رہ جانے والوں کو سمجھایا گیا کہ ضروری نہیں کہ تمہیں کفر پر موت آئے بلکہ تم میں ایسے بھی ہیں جنہیں توبہ کی توفیق دے دی جائے گی اور ان کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اس لئے کہ اللہ غفور رحیم ہیں وہ توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں اور نیک عمل کرنے والوں پر رحم فرماتے ہیں۔

قرآنِ کریم کا یہ ارشاد گرامی بہت جلد حقیقت بن کر سامنے آ گیا، حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اسلام پر بیعت کی اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! آپ انسانوں میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ حسنِ سلوک کرنے والے ہیں، ہمارے اہلِ خانہ اور اولاد کو گرفتار کر لیا گیا ہے، ہمارے اموال چھین لئے گئے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کون کون ہیں، مجھے سب سے زیادہ وہ بات پسند ہے جو سچی ہو، اب یہ بتاؤ کہ تمہاری اولاد اور تمہاری عورتیں تمہیں زیادہ محبوب ہیں یا تمہارا مال و اسباب''؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتے، ان کا جواب سن کر آپ کھڑے ہو گئے اور آپ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے قبیلۂ ھوازن کے بارے میں فرمایا ''یہ لوگ مسلمان ہو کر آئے ہیں اور ہم نے انہیں اختیار دیا ہے لیکن یہ اپنی اولاد اور بیویوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتے اس لئے اگر کسی کے پاس کچھ قیدی ہوں اور وہ خوش دلی سے دینا چاہے تو اس کا راستہ کھلا ہوا ہے اور اگر وہ اپنا حق چھوڑنا نہیں چاہتا تو ہمیں دے دے یہ اس کا ہمارے ذمہ قرض ہوگا جب اللہ ہمیں عطا فرمائے گا تو ہم اس کا بدلہ دے دیں گے'' مجاہدین نے سنتے ہی عرض کیا ''رضینا و سلمنا'' ہم راضی ہیں اور اپنے حق سے دستبردار ہوتے ہیں'' آپ نے فرمایا ''ہمیں معلوم نہیں کہ تم میں سے کون راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے، اس وقت تم لوگ واپس جاؤ اور اپنے سرداروں سے کہو کہ وہ مشورہ کے بعد صحیح صحیح معاملہ سے ہمیں آگاہ کریں۔ {۵۳}

{۵۳} بخاری ۲/صفحہ ۶۱۸، باب قول اللہ تعالیٰ ویوم حنین......الخ

بشکریہ اطلس القرآن اردو

حکمت وہدایت

۱......توکل کرنے والوں اور ایمان کی خاطر قربانی دینے والوں کو اللہ مایوس نہیں کرتا اور ایسی جگہ ان کی مدد کرتا ہے جہاں ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا (۲۵)

۲......اپنی ذات، افراد کی کثرت اور ظاہری اسباب پر ناز کرنا جائز نہیں یہ وہ چیز ہے جو انسان کو اللہ کی مدد سے محروم کر دیتی ہے (۲۵)

۳......مومن کا یقین ہے کہ غلبہ اللہ کی مدد سے حاصل ہوتا ہے قوت وکثرت سے نہیں (۲۵)

۴......اللہ اپنی طرف رجوع کرنے والوں کے دلوں پر شدید خوف اور پریشانی کی حالت میں سکینہ نازل فرماتا ہے جس کی برکت سے دلوں سے اللہ کے سوا ہر کسی کا ڈر نکل جاتا ہے (۲۶)

۵......فرشتوں کا وجود برحق ہے اور سچے مومنوں کی نصرت کے لئے ان کا نازل ہونا بھی یقینی ہے (۲۶)

۶......بعض اوقات اللہ اپنے نیک بندوں کے ذریعے مجرموں کو سزا دیتا ہے (۲۶)

۷......ہر کافر اور مشرک اور بڑے سے بڑے گناہ گار کے لئے توبہ کا دروازہ قیامت تک کھلا ہوا ہے (۲۷)

مشرکین کو ممانعت

﴿۲۸﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ

اے ایمان والو! مشرک جو ہیں سو پلید ہیں سو نزدیک نہ آنے پائیں مسجد الحرام کے اس

بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ ۚ

برس کے بعد اور اگر تم ڈرتے ہو فقر سے تو آئندہ غنی کردیگا تم کو اللہ اپنے فضل سے اگر چاہے،

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٨﴾

بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

ربط: سورت کی ابتداء سے جس اعلانِ برأت کا ذکر چلا آ رہا ہے یہاں اس سلسلہ کی آخری ہدایت ہے۔

تسہیل: اے ایمان والو! یہ مشرک بالکل ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد انہیں مسجدِ حرام کے قریب پھٹکنے بھی نہ دو اور اگر تمہیں ان کے نہ آنے سے فقر وفاقہ کا اندیشہ ہو تو اللہ پر توکل کرو، وہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تم کو مستغنی

کردے گا، بے شک اللہ علیم وحکیم ہےo

﴿تفسیر﴾

﴿۲۸﴾......اے ایمان والو! مشرک ناپاک ہیں اس لئے کہ ان کے عقائد فاسد اوران کے دل ودماغ میں خباثت پائی جاتی ہے{۵۴} پیشاب، پاخانہ، شراب اور مردار کی نجاست اپنی جگہ مگر سب سے سخت نجاست کفروشرک کی نجاست ہے، مادی نجاستوں سے بچنے والا مشرک ظاہری طور پر پاک ہوسکتا ہے مگراس کا باطن پاک نہیں ہوسکتا جب تک وہ شرکیہ نظریات سے توبہ نہ کرے۔

مسجدِ حرام سے مراد صرف وہ عمارت نہیں ہے جو بیت اللہ کے گرد تعمیر شدہ ہے بلکہ اس سے مراد پورا حرمِ مکہ ہے{۵۵} جوکئی مربع میل رقبہ پر مشتمل ہے گویا اس آیتِ کریمہ میں ۱۰ھ{۱} کے بعد حدودِ حرم میں مشرکین کا داخلہ ممنوع ٹھہرادیا گیا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ سال سے مشرکوں کو حج کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اپنے اس دعویٰ پر وہ دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ جس وقت موسمِ حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعے برأت کا اعلان کیا گیا تو اس میں یہی کہا گیا تھا: "لایحجن بعد العام مشرک" {۵۶} قریب نہ جانے کا مطلب یہ بھی ہونا چاہیے کہ مشرکوں کو حج وعمرہ کی اجازت نہیں۔

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً﴾ جب کفار اور مشرکین کو حدودِ حرم میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تو مسلمانوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ ان کے نہ آنے سے ہماری تجارت ٹھپ ہوکررہ جائے گی کیونکہ باہر سے آنے والے سامانِ تجارت لے کرآتے تھے اور واپس جاتے ہوئے ضرورت کی چیزیں مکّہ سے خرید کرلے جاتے تھے، تجارتی اور معاشی خسارے کے اندیشوں میں مبتلا مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ اگر آمد کا ایک راستہ بند ہوا تو اللہ تمہارے لئے کوئی دوسرا راستہ کھول دے گا کیونکہ وہ مادی اسباب کا محتاج نہیں، وہ جب کسی کام کا ارادہ کرلے تو وہ ہوکررہتا ہے خواہ وہ کسی بھی طریقے سے ہو۔

﴿إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ﴾ اللہ تمہارے حال کو بھی جانتا ہے اور مستقبل میں فقر یا غنا کے جوحالات تمہیں پیش آنے

{۵۴} لخبث بواطنهم ولفساد عقائدهم/روح المعانی/۶، الجزء العاشر/۱۱۱

{۵۵} انّ المراد بالمسجد الحرام:الحرم، الکشاف/۲/۲۴۸

{۱}قرطبی/۸/۹۸

{۵۶} بخاری...... کتاب الصلاۃ/باب ۱۰، ابوداؤد/مناسک/باب ۶۶

والے ہیں ان سے بھی وہ باخبر ہے۔

﴿حَكِيمٌ﴾ اس کے ہر امر اور نہی میں کوئی نہ کوئی حکمت پائی جاتی ہے، اس نے اگر مدتِ معاہدہ ختم ہونے کے بعد مشرکین کے ساتھ قتال کا حکم دیا ہے تو اس میں بھی حکمت ہے اور اگر اس نے انہیں حدودِ حرم میں قدم رکھنے سے منع کیا ہے تو اس میں بھی حکمت ہے۔

حکمت وہدایت

۱......معنوی نجاست، ظاہری نجاست سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔(۲۸)

۲......مشرکین کو حدودِ حرم میں داخل ہونے اور حج وعمرہ کرنے کی اجازت نہیں۔(۲۸)

۳......احناف کے نزدیک امیر المؤمنین کی اجازت سے کافر دنیا کی کسی بھی مسجد میں حتی کہ مسجدِ حرام میں بھی داخل ہوسکتا ہے، وہ اپنے موقف پر جو دلائل پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک، قبیلۂ ثقیف کا واقعہ ہے، فتحِ مکہ کے بعد جب ان کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو مسجدِ حرام میں ٹھہرایا حالانکہ یہ لوگ اس وقت کافر تھے، صحابہ کرام نے عرض بھی کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ نجس قوم ہے مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد کی زمین پر ان کی نجاست کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔{۵۷}

اس روایت سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قرآنِ کریم میں مشرکین کو ان کے جسم یا لباس کے ناپاک ہونے کی وجہ سے نجس نہیں کہا گیا بلکہ ان کے دل ودماغ میں کفر وشرک کی نجاست کی وجہ سے انہیں نجس کہا گیا۔

دوسری دلیل حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ کسی مشرک کو مسجد کے پاس جانے کی اجازت نہیں سوائے اس کے کہ وہ کسی مسلمان کا غلام یا کنیز ہو تو اسے بوقتِ ضرورت داخل ہونے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔{۵۸}

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین کی ممانعت کی وجہ ان کی معنوی نجاست اور حرم پر ان کے غلبہ کا اندیشہ ہے، اگر اس کا سبب ظاہری نجاست ہوتی تو غلام اور لونڈی کو ہرگز اجازت نہ دی جاتی، یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اگر ظاہری نجاست ممانعت کا سبب ہے تو اس میں مشرک کی کیا تخصیص ہے؟ ظاہری ناپاکی کی حالت میں تو مسلمان کو بھی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

{۵۷} احکام القرآن للجصاص/۳/۸۸

{۵۸} حوالہ مذکورہ صفحہ ۸۹

۴......اسبابِ رزق کے بارے میں فکر مند ہونا توکّل کے منافی نہیں اگر چہ رزق کے خزانے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں لیکن اس نے انہیں اسباب سے معلّق کیا ہے اور اسباب کا اختیار کرنا توکل کی نفی نہیں کرتا، اس پر بہت واضح دلیل رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا ''اگر تم اللہ پر توکل کرو جیسا کہ اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں ویسے ہی رزق دے گا جیسے وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے، وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔{۵۹}

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ طلبِ رزق میں نکلنا توکّل کے خلاف نہیں۔

۵......اس آیت کے ضمن میں علماء نے کفار کے داخلے اور وہاں اقامت پر بحث کرتے ہوئے اسے تین قسموں پر تقسیم کیا ہے:

1: حرمِ مکی......اس کے بارے میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

2: سرزمینِ حجاز......یعنی طول میں عدن سے عراق تک اور عرض میں جدہ سے حدودِ شام تک کے علاقے میں امامِ وقت کی اجازت سے کافر کو صرف تین دن کے لئے داخل ہونے کی اجازت دی جاسکتی ہے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا:

﴿لأخرجنّ الیھود والنّصارٰی من جزیرة العرب فلاأترک فیھا إلّامسلما﴾{۶۰}

''میں جزیرۃ العرب سے یہود و نصارٰی کو نکال کر رہوں گا اور یہاں مسلمانوں کے علاوہ کسی کو رہنے کی اجازت نہیں دوں گا''

یہ رسالت مآب ﷺ کا عزم تو تھا مگر عہدِ نبوت میں اس کی تکمیل نہ ہو سکی، حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو مختلف فتنوں کے خلاف چومکھی جنگ لڑنا پڑی جس کی وجہ سے وہ اس مسئلہ پر توجہ نہ دے سکے۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے یادگار دورِ خلافت میں اس حکم کو نافذ فرمایا اور جزیرۃ العرب کی سرزمین کو یہود و نصارٰی سے پاک کر دیا، آج بڑے دکھ اور انتہائی شرمندگی کے ساتھ ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں دسیوں مقامات پر یہود و نصارٰی بھرپور قوت و طاقت کے ساتھ موجود ہیں اور ان کی قائم کردہ چھاؤنیوں اور ہوائی اڈوں سے اڑنے والے جنگی جہاز عالمِ اسلام کے مختلف ممالک پر گولہ بارود کی بارش برساتے رہتے ہیں، تف ہے ہماری قیادت پر جس کی مرضی اور چاہت سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

{۵۹} ترمذی/۲۳۴۴، البیھقی فی شعب الایمان/۲/۳۸

{۶۰} مسلم جلد ۲/کتاب الجهاد/حدیث رقم ۶۳

3: دنیا بھر کے اسلامی ممالک میں امان اور ویزہ لیکر کافر داخل بھی ہو سکتے ہیں اور قیام بھی کر سکتے ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں کی اجازت سے مساجد میں بھی داخل ہو سکتے ہیں۔{۶۱}

اہلِ کتاب کے ساتھ قتال کا حکم اور ان کے عقائد

﴿۲۹......۳۳﴾

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَ

لڑو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ حرام جانتے ہیں

رَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ

اس کو جس کو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا

يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿٢٩﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ

ان لوگوں میں سے جو کہ اہل کتاب ہیں، یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہوکر۔

عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ

اور یہود نے کہا کہ عزیر، اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح، اللہ کا بیٹا ہے، یہ باتیں کہتے ہیں

يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّىٰ

اپنے منہ سے، ریس کرنے لگے اگلے کافروں کی بات کی، ہلاک کرے ان کو اللہ کہاں سے

يُؤْفَكُونَ ﴿٣٠﴾ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ

پھرے جاتے ہیں۔ ٹھہرالیا اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا اللہ کو چھوڑکر اور مسیح مریم کے

وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا

بیٹے کو بھی اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک معبود کی، کسی کی بندگی نہیں

لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣١﴾ يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا

اس کے سوا، وہ پاک ہے ان کے شریک بتلانے سے۔ چاہتے ہیں کہ بجھادیں روشنی اللہ کی

نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٣٢﴾

اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کئے اپنی روشنی کے اور پڑے برا مانیں کافر۔

{۶۱} التفسیر المنیر/۱۰/صفحہ ۱۷۱

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ
اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر
كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾
اور پڑے برا مانیں مشرک۔

ربط: مشرکینِ مکہ سے جہاد و قتال کے حکم کے بعد اہلِ کتاب سے جہاد اور پھر ان کے باطل عقائد کا بیان ہے اور یہ گویا غزوۂ تبوک کی تمہید ہے جو اہلِ کتاب کے مقابلہ میں پیش آیا اور جس کا ذکر عنقریب آیا چاہتا ہے۔

تسہیل: ان اہلِ کتاب کے ساتھ جنگ کرو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے انہیں حرام بھی نہیں سمجھتے اور نہ ہی وہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ تمہارے ماتحت ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دینے کے لئے آمادہ نہ ہو جائیں O یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کے کی ہوئی باتیں ہیں، یہ بھی ان کافروں جیسی باتیں کرتے ہیں جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں، اللہ انہیں تباہ کرے یہ کہاں بھٹکتے پھر رہے ہیں O انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابنِ مریم کو رب بنا رکھا ہے حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں جس کے علاوہ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں، وہ ان سب سے پاک ہے جنہیں یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں O یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں جبکہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ہر صورت میں اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا اگرچہ کافروں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے O وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت کا سامان اور سچا دین کر اس لئے بھیجا ہے تاکہ اس دین کو سارے ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ بات کتنی بھی بری کیوں نہ لگے O

﴿تفسیر﴾

﴿۲۹﴾...... ویسے تو اہلِ کتاب کا اطلاق ہر اس جماعت پر ہو سکتا ہے جو کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتی ہو لیکن قرآنِ کریم میں یہ اصطلاح یہود و نصاریٰ کے لئے استعمال ہوتی ہے کیونکہ جزیرۃ العرب میں یہی دو فرقے تھے جو آسمانی تعلیمات پر ایمان رکھنے کے دعویدار تھے۔

جن اہلِ کتاب کے ساتھ قتال کا حکم دیا جا رہا ہے ان کی چار سلبی صفات بیان کی گئی ہیں:

(1)......وہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اس لئے کہ انہوں نے عبادت کے طور طریقوں اور اشیاء کو حلال اور حرام قرار دینے کا اختیار اپنے مشائخ اور علماء کو دے رکھا ہے جبکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اسے ''شرک فی الربوبیت'' کہا جاتا ہے ان میں ایسے بھی ہیں جو حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام کو اللہ کے بیٹے کہتے ہیں گویا ''شرک فی الالوہیت'' بھی ان کے اندر پایا جاتا ہے۔

(2)......وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ وہ آخرت کی محض روحانی زندگی کے قائل ہیں جبکہ مسلمان ایسی زندگی کے قائل ہیں جو جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوگی، ویسے بھی ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں اخروی زندگی کا ذکر اس وضاحت اور شد و مد کے ساتھ نہیں ہے جس شد و مد کے ساتھ اس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے ہمارے دور کے جو یہود و نصاریٰ ہیں ان میں سے بعض تو کھلے عام آخرت کا انکار کرتے ہیں اور بعض انکار تو نہیں کرتے لیکن ان کا دنیا کی زندگی میں انہماک دیکھ کر یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اخروی زندگی کے قائل نہیں۔

(3)......جن چیزوں کو اللہ اور اس کے پیغمبر نے حرام ٹھہرایا ہے انہیں حرام نہیں سمجھتے، اس بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں ایک تو یہ کہ وہ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جو ہماری شریعت میں حرام ہیں۔{۶۲}

حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ تو اپنی شریعت کی اتباع کرتے تھے اور نہ ہی شریعتِ اسلام کی اتباع کرتے تھے، حسبِ ضرورت تورات اور انجیل میں تحریف کر لیتے تھے اور مختلف تاویلوں کے ذریعے حرام کو حلال ثابت کر لیتے تھے، لیکن ہمارے زمانے کے اہلِ کتاب تاویلوں سے بھی بے نیاز ہو چکے ہیں۔

(4)......اور نہ ہی وہ دینِ حق کو قبول کرتے تھے، اس میں بھی مفسرین کے دو قول ہیں، ایک تو یہ کہ وہ دینِ اسلام کو قبول نہیں کرتے جو کہ کامل اور مکمل دین ہے، دوسرا یہ کہ اصل دین جو ان کے لئے آسمان سے نازل ہوا تھا وہ اس پر عمل نہیں کرتے اور جسے انہوں نے دین سمجھ رکھا ہے وہ حقیقت میں ان کے مذہبی رہنماؤں کے اجتہادات اور ذاتی خواہشات کا ملغوبہ ہے۔

﴿مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ جو چار سلبی صفات اوپر مذکور ہیں وہ اہلِ کتاب سے بڑھ کر مشرکین میں پائی جاتی تھیں خصوصیت کے ساتھ اہلِ کتاب کا ذکر ایک تو ان کے شرف و مرتبہ کی بناء پر ہے، دوسرے اس لئے بھی کہ مشرکینِ عرب جزیہ کے حکم سے مستثنیٰ ہیں، انہیں جزیہ دے کر بھی جزیرۃ العرب میں رہنے کی اجازت نہیں اس لئے کہ قیامت تک کے لئے جزیرۃ العرب کو توحید کا مرکز قرار دے دیا گیا ہے۔

{۶۲}لایحرمون ماحرم فی القرآن و سنّۃ الرسول (کبیر/۶/۲۵)

﴿اَلْجِزْيَةَ﴾ جزیہ سے مراد وہ رقم ہے جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا سے ان کے مال و جان کی حفاظت کے بدلے وصول کرتی ہے۔{۶۳}

جزیہ کو کفر و شرک پر قائم رہنے کا معاوضہ قرار دینا کسی طور پر درست نہیں جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت میں رہنے کی اجازت بہت سے ان لوگوں کو بھی ملتی ہے جن سے جزیہ نہیں لیا جاتا، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، معذور اور مذہبی پیشوا، اگر جزیہ اسلام کا بدلہ ہوتا تو ان سے بھی لیا جانا چاہیے تھا۔{۶۴}

جزیہ حقیقت میں ان قومی خدمات کا معاوضہ ہوتا ہے جن سے اہلِ اسلام کی طرح غیر مسلم بھی استفادہ کرتے ہیں، اسلامی مملکت ذمیوں کے مال، جان، آبرو اور داخلی خطرات اور خارجی حملوں سے ان کی حفاظت کرتی ہے، حفاظت کی ذمہ داری مسلمان سپاہی پوری کرتے ہیں ذمیوں سے یہ خدمت نہیں لی جاتی، اس کے بدلے ان سے صرف جزیہ وصول کیا جاتا ہے۔

مال جان اور آبرو کی حفاظت کے علاوہ بوقتِ ضرورت بیت المال سے غیر مسلموں کی کفالت بھی کی جاتی ہے مسلمان زکوٰۃ اور صدقات کے ذریعے بیت المال کو مضبوط کرتے ہیں، اگر غیر مسلموں کو جزیہ کے ذریعہ اس میں اپنا حصہ ڈالنے کے لئے کہا جائے تو اسے ظلم کہنا بجائے خود ظلم ہوگا۔

جزیہ کی شرح ۲ درہم سالانہ سے لے کر ۴۸ درہم سالانہ تک ہے، عورتیں، بچے، بیمار، معذور، بوڑھے، بے روزگار، مذہبی طبقہ (مثلاً پادری، جوگی) غلام وغیرہ مستثنیٰ تھے، صرف کاروباری آدمیوں پر لگایا جاتا تھا وہ بھی اگر صلحی جزیہ ہے تو اس کی مقدار معین نہیں، ورنہ یوں معمولاً امراء سے تقریباً ایک روپیہ ماہوار یعنی بارہ روپے سالانہ، متوسط طبقہ والوں سے آٹھ آنے ماہوار یعنی چھ روپے سالانہ اور ادنیٰ طبقے سے چار آنے ماہوار یعنی تین روپے سالانہ اور درمیانِ سال میں اگر کوئی مر جاتا تو اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے،{۶۵} روم و ایران کے باشندوں کو مسلمانوں کی رعایا بننے کے بعد جزیہ کی جو رقم دینی پڑتی تھی وہ ان محصولوں سے کہیں کم تھی جو ان لوگوں کو پہلی حکومتوں کو دینی پڑتی تھیں، رومی شہنشاہی ہو یا ایرانی بادشاہت، دونوں میں ٹیکسوں کی اتنی بھرمار تھی کہ اہلِ ملک اپنی حکومت پر غیر ملکی حکومت کو ترجیح دینے لگے۔

{۶۳} وھی ماقرر علیھم فی نظر سکنا ھم فی بلاد الاسلام آمنین/نظم الدرر، ۲۹۹/۳

{۶۴} بیان القرآن/ ۱۰۶/۴، معارف القرآن ۳۶۱/۴

{۶۵} اسلامی معاشیات، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے جزیہ کی جو شرح لکھی ہے یہ چاندی کی اس قیمت کے اعتبار سے ہے جو ان کے زمانے میں تھی، ہمارے دور میں چاندی کی قیمت میں چونکہ اضافہ ہو چکا اس لئے اس کا اثر جزیہ کی مقدار پر بھی لازماً پڑے گا۔

جزیہ اور مقدارِ جزیہ کے بارے میں بڑی طویل بحثیں تفسیر کی کتابوں میں ہمیں ملتی ہیں لیکن ہمارے دور میں جبکہ دنیا کے کسی بھی خطے میں کامل طور پر اسلامی قوانین نافذ نہیں ہیں ان بحثوں کا کوئی فائدہ نہیں سوائے اس کے کہ ہم ایک مفروضے کے طور پر کہہ سکیں کہ اگر کبھی اسلامی قانون نافذ ہوا تو فلاں امام کے نزدیک جزیہ کی مقدار یہ ہوگی اور فلاں کے نزدیک یہ ہوگی، اس وقت مسلمانوں کی جو صورتحال ہے اسے دیکھتے ہوئے خالص اسلامی حکومت کے قیام اور مسلمانوں کے اتحاد کو خوبصورت خواب ہی کہا جاسکتا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ وہ لیڈر شپ ہے جو ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے ہم پر مسلط ہے۔

﴿عَنْ يَدٍ﴾ جزیہ کی ادائیگی میں دو شرطیں لگائی گئیں، ان میں سے ایک دینے والوں کے لئے ہے اور دوسری لینے والوں کے لئے ہے، دینے والوں کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ جزیہ دینے کی قدرت اور طاقت رکھتے ہوں چنانچہ ان کے فقیروں اور بیروزگاروں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔{٦٦}

لینے والوں کے حق میں جو شرط ہے اس کی طرف "هم صاغرون" میں اشارہ ہے یعنی ذمی کافر تمہاری بالادستی اور اپنی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے جزیہ ادا کریں۔{٦٧}

﴿۳۰﴾......بعض یہودی حضرت عزیز کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، عزیر یا عزرا مشہور یہودی کاہن تھا غالباً ۴۵۸ق م میں فوت ہوا، یہودیوں کے عقائد کے مطابق اس کا مقام حضرت موسیٰ اور ایلیاء کے برابر ہے، یہودی اور غیر یہودی تمام مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ جس تورات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا تھا اور اسے مقدس تابوت میں رکھا تھا وہ عمالقہ یا بخت نصر کے حملے میں گم ہوگئی تھی کیونکہ جب تابوت کو کھولا گیا تو اس میں صرف دو تختیاں تھیں جن میں دس وصیتیں تحریر تھیں جیسا کہ سفرِ ملوک میں درج ہے، بعد میں اسے عزیر نے کلدانی رسم الخط میں تحریر کیا جس میں کچھ عبرانی الفاظ بھی شامل تھے برٹش انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ انہوں نے تلف شدہ اسناد کو بھی لکھا اور ان کے علاوہ ستر جعلی اسناد بھی تحریر کیں۔

اہلِ کتاب کے ہاں ''ابن اللہ'' (اللہ کا بیٹا) لاڈلے اور چہیتے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس معنی میں عزیر کے لئے لفظ ''ابن'' کا استعمال قابلِ اعتراض نہیں لیکن یہودیوں میں ایسے گروہ کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا جو اسی معنی میں عزیر کو ابن اللہ کہتے ہوں جس معنی میں عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو کہتے تھے کیونکہ بعض نصاریٰ جو حضرت

{٦٦} عن غنى ولذلك لم تجب الجزيه على الفقير العاجز (ابى سعود ۲/ ۱۴۰)

{٦٧} اى توخذ منهم على الصغار والذل (كشاف /۲، صفحه ۲۵۰)

عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے وہ یہودی الاصل تھے۔

جہاں تک نصاریٰ کا تعلق ہے ان کے ہاں اقانیم ثلاثہ کا قاعدہ معروف ہے جس کی وضاحت وہ اب، ابن اور روح القدس کے نام سے کرتے ہیں، یہ مشرقی کیتھولک کے عقائد ہیں اور عموماً تمام پروٹسٹنٹ بھی اس کے قائل ہیں شاذونادر افراد ہی اس کے خلاف ہوں گے، حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان کے قدماء اس عقیدے سے نا آشنا تھے اور رفعِ عیسیٰ کے تین سو سال بعد ''تثلیث'' کے عقیدہ کا اعلان کیا گیا جبکہ یہ لفظ انجیل میں موجود نہیں اور نہ ہی عہدِ قدیم میں کوئی ایسی آیت ہے جس میں تثلیث کی تصریح کی گئی ہو، ان اقانیمِ ثلاثہ کی پیدائش کے بارے میں بھی ان کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے اور ان کی تشریح کے بارے میں بھی، ان میں سے بعض کا نظریہ یہ ہے کہ الٰہ میں جو تین صفات ہیں ان کا نام اب، ابن اور روح القدس ہے، ان سے مراد قدرت، حکمت اور محبت ہے یا ان سے مراد تین اعلیٰ افعال ہیں یعنی تخلیق، حفاظت اور کنٹرول۔ {۶۸}

﴿ذٰلِكَ قَوۡلُهُمۡ بِاَفۡوَاهِهِمۡ﴾ ان کے پاس اپنے دعویٰ پر کوئی بھی دلیل نہیں سوائے اس کے کہ ان کے بڑوں کے منہ سے یہ بات نکل گئی اور انہوں نے اسے عقیدہ کا درجہ دے دیا۔

﴿يُضَاهِـُٔوۡنَ﴾ اسے قرآن کا اعجاز نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے کہ نبی ﷺ کی مبارک زبان سے ایسے تاریخی حقائق بیان ہو رہے ہیں جو اچھے خاصے اصحابِ خبر ونظر سے بھی اوجھل تھے، قرآن بتا رہا ہے کہ عیسائی ابنیت اور تثلیث کے جس عقیدے کے قائل ہیں یہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے بلکہ دوسری قوموں میں بھی یہ عقیدہ رہا ہے، ہمارے قدیم مفسرین اس سلسلہ میں مشرکین کی مثال دیتے رہے ہیں کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے لیکن مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ ہندو بھی تین اقانیم کے قائل ہیں یعنی برہما، وشنو اور وسیقا۔

قدیم مصری تثلیث کے اجزا اوزوریس، ایزیس اور موریس (ابن) فرعونی بت پرستی کے اصل الاصول تھے، ایران کے پارسی عناصرِ اربعہ (جس میں سب سے بڑا عنصر آگ تھا) کی عبادت کرتے تھے یونانی بھی مثلث الاقانیم آلہہ کے قائل تھے۔

علاوہ ازیں چینیوں، جاپانیوں، ہندوستانیوں، فارسیوں اور رومیوں کے ہاں ابنیت کا عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے، مصر کے فرعون اپنے آپ کو سورج دیوتا کا اوتار کہتے تھے، ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان موجود تھے، شاہانِ ایران کا دعویٰ تھا کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے، چینی اپنے شہنشاہ کو آسمان کا بیٹا تصور

{۶۸} فی ظلال القرآن ۲/ ۵۳۸

کرتے تھے۔

﴿قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ﴾ اللہ انہیں تباہ وبرباد کرے یہ توحید کے سیدھے سادھے راستے کو چھوڑ کر کفر وشرک کی کن تاریک وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں، حضرت مسیح اور عزیر علیہما السلام نے انسانوں کی طرح زندگی گزاری، وہ کھاتے پیتے، سوتے جاگتے تھے اور سارے بشری تقاضے پورے کرتے تھے، ان کے مخلوقِ خدا اور عاجز انسان ہونے میں کسی صحیح العقل کو شک ہی نہیں ہوسکتا تھا مگر اسے نظر وفکر کا بحران اور انسانی تاریخ کا المیہ کہنا چاہئے کہ دنیا میں بسنے والے کروڑوں انسانوں نے انہیں خدا کے منصب کا حقدار ٹھہرا لیا، حیرت بالائے حیرت یہ کہ جنہیں خدا اور ابنِ خدا کہا گیا وہ خود بندہ خدا ہونے میں عزت محسوس کرتے تھے قرآن کی گواہی ہے اور سو فیصد سچی گواہی ہے:

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ {۶۹}

”نہیں عار محسوس کرتے عیسیٰ ابن مریم اور نہ مقرب فرشتے، اللہ کے بندہ ہونے میں“

سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ {۷۰}

”مسیح مریم کے بیٹے، اللہ کے رسول کے سوا کچھ نہ تھے ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے اور اس کی والدہ صدیقہ تھیں، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے، دیکھیے ہم ان کے لئے کیسے آیات کو واضح کرتے ہیں، پھر دیکھئے انہیں کہاں سے دھوکا لگتا ہے۔“

﴿۳۱﴾...... ”احبار“ حبر کی جمع ہے، اہلِ کتاب کے عالم کو کہا جاتا ہے اور ”رھبان“ راھب کی جمع ہے عیسائیوں کے ہاں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ہر طرف سے کٹ کر اپنے آپ کو صرف عبادت کے لئے وقف کردے، ان کے ہاں ترکِ دنیا کا نام رہبانیت تھا اور اسے وہ انتہائی فضیلت والا عمل سمجھتے تھے۔

یہودیوں نے اپنے علماء کو اور عیسائیوں نے اپنے راہبوں کو رب بنا رکھا تھا، انہیں حکم تو یہ دیا گیا تھا کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں، اطاعتِ مطلقہ کا حق اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے اس میں وہ کسی کو شریک نہ کریں، قانون سازی اور حلال وحرام قرار دینے کا اختیار صرف معبودِ حقیقی کو حاصل ہے، یہ حق کسی دوسرے کو تفویض کرنا شرک ہے اور یہود ونصاریٰ کھلے عام اس شرک کا ارتکاب کررہے تھے۔

{۶۹} النساء/۴/۱۷۲

{۷۰} المائدۃ/۵/۷۵

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں جب نبی کریم ﷺ کی دعوت مجھ تک پہنچی تو میں شام کی طرف بھاگ گیا، عدی زمانہ جاہلیت میں عیسائی بن گئے تھے چنانچہ ان کی بہن اپنی قوم کے افراد کے ساتھ گرفتار ہو کر آئی تو حضورِ اکرم ﷺ نے اس کے ساتھ انتہائی کریمانہ سلوک کیا اور اسے دادودہش سے نوازا یہ اپنے بھائی کے پاس واپس گئی اور اسے قبول اسلام اور مدینہ حاضر ہونے کی ترغیب دی چنانچہ وہ مدینہ آئے، یہ اپنے قبیلے طیٔ کے سردار تھے اور ان کے والد حاتم طائی کی سخاوت بہت مشہور ہے اس لئے ان کی آمد کا لوگوں میں بڑا چرچا ہوا، جب یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ آئے تو ان کے گلے میں چاندی کی صلیب تھی اور اس وقت اللہ کے نبی ﷺ یہ آیتِ کریمہ پڑھ رہے تھے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

عدی نے سوال کیا کہ عیسائی احبار ورھبان کی عبادت نہیں کرتے، قرآن میں ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ احبار ورھبان اگر حرام کو حلال اور حلال کو حرام کہہ دیں تو عیسائی ان کی اتباع کرتے ہیں؟ عدی نے جواب دیا ایسا تو وہ کرتے ہیں، آپ نے فرمایا یہی تو ان کی عبادت ہے۔{۷۱} اس کے بعد آپ نے اسلام کی دعوت عدی نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

علامہ آلوسیؒ روح المعانی میں لکھتے ہیں کہ ''مفسرین کی اکثریت کہتی ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ احبار ورھبان کو واقعی معبود سمجھتے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اوامر ونواہی میں ان کی اطاعت کرتے تھے۔{۷۲}

﴿۳۲﴾......اہلِ کتاب کا جرم صرف یہ نہیں کہ انہوں نے اپنے دین کا حلیہ بگاڑ دیا ہے بلکہ ان کا جرم یہ بھی ہے کہ وہ اس دینِ حق کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں جو حضرت محمد ﷺ لیکر مبعوث ہوئے ہیں جبکہ اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا چنانچہ یہ دین اپنی ذات کے اعتبار سے مکمل ہو کر رہا اور اس کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ {۷۳} المائدہ ۳/۵/ ''آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا ہے''

اور یہ دین پوری دنیا پر غلبے کے اعتبار سے بھی مکمل ہو کر رہے گا چاہے اس دنیا پر اس کا یہ غلبہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے اور اس کے غلبے کو روکنے کے لئے دنیا بھر کے کافر کیوں نہ جمع ہو جائیں مگر جو فیصلہ اللہ کے ہاں

{۷۱} ترمذی ۲/صفحہ ۱۴۰، فی تفسیر سورۃ التوبۃ

{۷۲} بان اطاعوھم فی تحریم ما احل اللہ تعالیٰ وتحلیل ماحرمہ سبحانہ/روح المعانی الجزء العاشر ۱۲۲/۶

طے پاچکا وہ نافذ ہوکر رہے گا، سچے اہلِ ایمان کو نصف النہار میں سورج کے وجود سے بھی زیادہ اس بات کا یقین ہے کہ زمین میں بسنے والے تمام انسانوں کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہے۔

﴿۳۳﴾......اللہ نے اپنے رسول کو دنیا میں بھیجا ہی اس لئے تھا کہ وہ سچے دین کو سارے ادیان پر غالب کردے جہاں تک دلیل اور برھان کے اعتبار سے غلبے کا تعلق ہے، اس امر سے کوئی بھی انصاف پسند انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دینِ اسلام کو سارے ادیان پر غلبہ حاصل ہے، آسمانی کتاب اور تعلیمات کی حفاظت کے اعتبار سے دیکھیں یا عقائد وعبادات، معاملات اور اخلاق، حدود اور احکام کی جامعیت اور اعتدال کے پہلو سے غور کریں، ہر اعتبار سے اسلام کا پلڑا ادیانِ عالم کے مقابلے میں بھاری دکھائی دیتا ہے۔

اور اگر غلبے سے مراد نظامِ زندگی کے اعتبار سے اور سیاست کے میدان میں غلبہ لیا جائے تو رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے میں ایک دفعہ تو یہ کام ہو چکا جب دینِ حق کے مقابلے میں سارے دین لرزہ براندام تھے اور انشاء اللہ اس دنیا کے خاتمہ سے پہلے دوبارہ یہ کام ہوگا اور پوری شان وشوکت کے ساتھ ہوگا، دینِ اسلام کے آفتاب کے مقابلے میں دوسرے ادیان کے ٹمٹماتے ہوئے سارے چراغ بجھ جائیں گے۔

بعض کم فہم لوگ امریکہ اور برطانیہ کے غلبے کو عیسائیت کے غلبے سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ عالمی طاقتوں کے غلبے میں عیسائیت کے عقائد اور تعلیمات کا کوئی دخل ہے اور نہ ہی ان طاقتوں کو یہ غلبہ عیسائیت پر عمل کے نتیجے میں حاصل ہوا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ دجالی طاقتیں ہیں جنہوں نے عالمی نظام کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے، ان میں نام نہاد یہودی اور عیسائی بھی ہیں اور منافق اور بے مذہب بھی ہیں، یہ کبھی کبھار مذہب کا نام ضرور لیتے ہیں اور گرجا اور کلیسا میں حاضری بھی دیتے ہیں لیکن عملی طور پر ان کی پوری زندگی مذہبی حدود وقیود سے بغاوت سے عبارت ہے۔

حکمت وہدایت

۱......اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہ رکھنے والے اہلِ کتاب کا بھی وہی حکم ہے، جو مشرکین کا حکم ہے، اگر وہ ہم سے قتال کریں تو ہم بھی ان کے ساتھ قتال کریں گے، سورۃ البقرۃ میں گزر چکا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۷۴﴾

”اللہ کے راستے میں ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرو، جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا“

{۷۴}البقرۃ/۲/۱۹۰

۲......وہ ایمان جو ٹھوس بنیادوں پر قائم نہ ہو وہ سعادت اور نجات کے لئے کافی نہیں (۲۹)

۳......اللہ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے انہیں حلال سمجھنا کفرِ صریح ہے (۲۹)

۴......اہلِ کتاب سے جزیہ لینا جائز ہے، جزیہ کفر و شرک پر قائم رہنے کا عوض نہیں ہوتا بلکہ اس تحفظ اور قومی خدمات کا معاوضہ ہوتا ہے جو اسلامی حکومت غیر مسلموں کو فراہم کرتی ہے۔

۵......جزیہ کی مقدار امیر اور غریب کے اعتبار سے مختلف ہے۔

۶......جزیہ کی مقدار اس ٹیکس سے کہیں کم تھی جو اسلام سے قبل دنیا کی متمدن حکومتیں اپنے شہریوں سے وصول کر رہی تھیں اس لئے جزیہ کی ادائیگی کو غیر مسلموں نے خوش دلی سے قبول کر لیا تھا۔

۷......عورتوں، بچوں، غلاموں، بیماروں، بوڑھوں، معذوروں، بے روزگاروں اور مذہبی رہنماؤں سے جزیہ وصول نہیں کیا جاتا۔

۸......جزیہ کی وصولی کا سلسلہ اسلام سے قبل روم اور ایران میں بھی جاری تھا، اسلام نے یہ کیا کہ اس نظام میں ظلم کی جو بھی صورتیں تھیں وہ خارج کر دیں۔

۹......جن لوگوں کو ذمہ دے دیا جائے اور جن سے جزیہ وصول کیا جائے ان کی جان، آبرو اور مال کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے۔

۱۰......دینِ حق صرف اسلام ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ {۷۵} "بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"

یہی وہ دین ہے جو اپنے پیروکاروں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی کامل اطاعت کا حکم دیتا ہے۔

۱۱......اپنے غلط عقائد کی وجہ سے یہود و نصاریٰ کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں (۳۰)

۱۲......قرآن کے یہود و نصاریٰ کے غلط عقائد ذکر کرنے سے ثابت ہوا کہ نقلِ کفر، کفر نہیں ہے۔

۱۳......قرآن کی صداقت کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ مذاہب عالم کے ایسے عقائد اور معاملات کی خبر دیتا ہے جن کا علم گہرے مطالعہ اور تحقیق کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ (۳۰)

۱۴......متعین فرد پر تو لعنت کرنا جائز نہیں مگر کفر و فسق میں مبتلا جماعتوں پر عمومی لعنت جائز ہے۔

۱۵......اللہ کے سوا کسی دوسرے کی اطاعتِ مطلقہ اور اسے حلال اور حرام کا مختار سمجھنا شرک فی الربوبیت ہے (۳۱)

{۷۵} آل عمران/۳/۱۹

۱۶......اہلِ علم ونظر براہِ راست اللہ کا کلام اور رسولِ اکرم ﷺ کی احادیث دیکھ کر اس پر عمل کرتے ہیں، اور ناواقف عوام اہلِ علم سے پوچھ کر انہی احکام پر عمل کرتے ہیں، اور وہ اہل علم جو درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے وہ بھی اجتہادی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اتباع کرتے ہیں، یہ اتباع خود قرآنِ کریم کے حکم کے مطابق ہے اور حق تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ {۷۶} یعنی اگر تم خود اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے واقف نہیں تو اہلِ علم سے پوچھ کر عمل کیا کرو۔

۱۷......نورِ اسلام کو بجھانے کیلئے ابتداء ہی سے یہود ونصاریٰ اور مشرکین کا آپس میں گٹھ جوڑ رہا ہے آپ رومیوں اور فارسیوں کو دیکھ لیجئے جن کے درمیان صدیوں پرانی عداوت تھی لیکن جونہی جزیرۃ العرب میں اسلام غالب ہوا رومی اور فارسی، یہودی اور عیسائی، مشرک اور مجوسی سب ایک ہو گئے۔

آپ صلیبی جنگوں کا مطالعہ کر لیجئے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کے لئے کونسا ستم ہے جو صلیبیوں نے نہیں ڈھایا۔

آپ اپنے موجودہ حالات پر سرسری نظر ڈال لیجئے، کیا دنیا بھر کا کفر مسلمانوں کے خلاف متحد دکھائی نہیں دیتا؟

۱۸......ایسا وقت ضرور آئے گا جب روئے زمین پر بسنے والے سارے انسان اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں گے۔

حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ زمین پر کوئی ایسا کچا اور پکا گھر نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے جو کہ عزیز کو عزت دے گا اور ذلیل کو ذلیل کر دے گا۔{۷۷}

۱۹......حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت کثرتِ دلائل اور معجزات کی بناء پر تمام انبیاء سے ممتاز ہے بالخصوص آپ کو جو دینِ حق عطا کیا گیا وہ اپنی خصوصیات کی بناء پر تمام ادیان پر غالب آنے کی صلاحیت رکھتا ہے، یہی وہ دین ہے:

☆ جس کی کتاب من وعن محفوظ ہے ☆ جسے لانے والے پیغمبر کی سیرت جزئیات سمیت محفوظ ہے ☆ یہ فطرت کے سارے جائز تقاضوں کو پورا کرتا ہے ☆ اس کی عبادات سادہ اور قابلِ عمل ہیں ☆ یہ کسی مخصوص قبیلے کا نہیں ساری انسانیت کا دین ہے ☆ یہ کامل اور مکمل دین ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے کیلئے ہدایات ہیں ☆ یہ دین مساواتِ عامہ کا حامی ہے ☆ یہ نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں کے بھی تمام حقوق کا محافظ ہے۔

{۷۶} النحل/۱۶/۴۳

{۷۷} مسند احمد/۴/۱۰۳

بگڑے ہوئے مشائخ اور علماء

﴿۳۴......۳۵﴾

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ ٱلۡأَحۡبَارِ وَٱلرُّهۡبَانِ لَيَأۡكُلُونَ

اے ایمان والو! بہت سے عالم اور درویش اہل کتاب کے کھاتے ہیں مال لوگوں کے ناحق

أَمۡوَٰلَ ٱلنَّاسِ بِٱلۡبَٰطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِۗ وَٱلَّذِينَ يَكۡنِزُونَ

اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور جو لوگ گاڑھ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو

ٱلذَّهَبَ وَٱلۡفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرۡهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٖ ﴿۳۴﴾

خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں، سو ان کو خوشخبری سنا دے عذاب دردناک کی۔ جس دن کہ آگ دہکائیں گے

يَوۡمَ يُحۡمَىٰ عَلَيۡهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكۡوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمۡ وَجُنُوبُهُمۡ وَظُهُورُهُمۡۖ

اس مال پر دوزخ کی پھر داغیں گے اس سے ان کے ماتھے اور کروٹیں اور پیٹھیں (کہا جائے گا) یہ ہے

هَٰذَا مَا كَنَزۡتُمۡ لِأَنفُسِكُمۡ فَذُوقُواْ مَا كُنتُمۡ تَكۡنِزُونَ ﴿۳۵﴾

جو تم نے گاڑھ کر رکھا تھا اپنے واسطے، اب چکھو مزا اپنے گاڑھنے کا۔

ربط: یہود و نصاریٰ کے رؤساء کا تکبر، سرکشی اور جھوٹے دعاوی ذکر کرنے کے بعد ان کے اندر پائی جانے والی شدید قسم کی حرص و طمع کے بارے میں بتایا جارہا ہے۔

تسہیل: اے ایمان والو! بہت سارے علماء اور مشائخ کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اموال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، آپ انہیں المناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے ۝ جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا لہٰذا اپنی جمع شدہ دولت کا مزہ چکھو ۝

تفسیر

﴿۳۴﴾...... یہود کے علماء اور نصاریٰ کے مشائخ اور درویشوں کے بارے میں ایمان والوں کو بتایا جارہا ہے کہ ان میں ایسوں کی کمی نہیں جو مختلف حیلوں، تدبیروں اور باطل طریقوں سے لوگوں سے اموال ہتھیا لیتے ہیں، اس مقصد کے

حصول کے لیے انہوں نے مختلف صورتیں اختیار کر رکھی تھیں۔

عیسائیوں کے پادری مخصوص رقم لے کر عوام و خواص میں نجات کے پروانے تقسیم کرتے تھے جس کی صورت یہ تھی کہ جس مرد یا عورت کو اپنے گناہوں پر ندامت ہوتی وہ خلوت میں پادری کو داستانِ گناہ سناتا تاکہ وہ اسے بخش دے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جسے پادری بخش دے اسے اللہ بھی بخش دیتا ہے، پادری اپنا معاوضہ وصول کر کے اس گناہگار کو رسید لکھ دیتا تاکہ وہ حشر میں اللہ کو دکھا کر جنت میں داخل ہو سکے۔

ان میں قبروں اور عبادت گاہوں کے مجاور بھی تھے جن کی خدمت میں بھولے بھالے عوام ہدیے اور نذرانے پیش کرتے تھے، یہ مجاور نذرانے وصول کر کے مال و دولت کے انبار لگا لیتے تھے جبکہ غریب عوام کو دو وقت کی روٹی بھی بمشکل میسر آتی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان مجاوروں کی زر پرستی دیکھ کر فرمایا: ”تم نے میرے باپ (ربّ) کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا دیا ہے۔“ یہ بھی فرمایا کہ ”تم اوروں کو تو زیرے اور سونف پر بھی عشر کا حساب بتاتے ہو لیکن خود دوسروں کے مال ہڑپ کر جاتے ہو۔“

ان میں ایسے زر پرست مفتی بھی تھے جو بادشاہوں، سرمایہ داروں اور وڈیروں کے لیے مختلف حیلوں سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ثابت کر دیتے تھے، بعض احکام کو بدل دیتے تھے اور بعض کو چھپا دیتے تھے، سورۂ انعام میں ان سے کہا گیا:

”آپ ان سے دریافت فرمائیے کہ جو کتاب موسیٰ لائے تھے اسے کس نے اتارا؟ وہ کتاب جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی تم نے اسے ورق ورق بنا رکھا ہے، اس میں سے کچھ ورق تو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ چھپا جاتے ہو۔“ {۷۸}

علاوہ ازیں ان میں جو بااختیار تھے وہ مجبور انسانوں سے رشوت لیتے تھے، قوم یا مذہب کے اختلاف کی بناء پر مخالفین کے اموال ہڑپ کرنا جائز سمجھتے تھے، سود خوری کی بیماری تو ان سب میں عام تھی، ناجائز تعویذ گنڈے کا کاروبار بھی عروج پر تھا...... آہ! کیسے کہا جائے کہ آج مسلمانوں میں بھی یہ جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ باطل طریقے سے اموال ہتھیانے کے ساتھ وہ لوگوں کو حق کی اتباع سے روکتے تھے، جس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ وہ اسلامی عقائد اور عبادات میں شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے اور دوسری صورت یہ تھی کہ وہ قرآنِ کریم اور صاحبِ خلقِ عظیم ﷺ کو تنقید کا نشانہ بناتے تھے تاکہ لوگوں کو ان سے متنفر کیا جائے،

{۷۸} الانعام: ۶/ ۹۱

ہمارے زمانے کے دُشمنانِ اسلام بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ اہلِ کتاب کے علماء اور مشائخ کی جن بیماریوں کا اوپر ذکر ہوا ان کا حقیقی سبب حبِّ مال اور دنیا کی شدید حرص تھی اس لیے آیتِ مذکورہ میں ان لوگوں کی شدید مذمت کی گئی ہے جو مال کی محبت میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، وہ دولت کے انبار لگاتے چلے جاتے ہیں مگر انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

لغت میں کـنـز کا معنی ہے تہہ بہ تہہ مال جمع کر کے رکھ چھوڑنا{۷۹} سونا، چاندی اور مالِ کثیر پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کنز وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے......اور جس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز نہیں ہے۔{۸۰}

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو مسلمان بے حد پریشان ہو گئے۔ انہوں نے کہا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم میں سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بعد اپنی اولاد کے لیے مال چھوڑ جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں تم لوگوں کی پریشانی دور کرتا ہوں چنانچہ وہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! اس آیتِ کریمہ سے آپ کے اصحاب بہت پریشان ہو گئے ہیں، اس کا صحیح مفہوم بتایئے تاکہ ان کی پریشانی دور ہو، آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے تاکہ تمہارے بقیہ اموال پاک کر دیئے جائیں اور تقسیمِ میراث کا حکم اس لیے دیا ہے تاکہ تمہارے بعد بھی اموال باقی رہیں۔'' یہ جواب سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا، پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں اس بہترین چیز کے بارے میں نہ بتاؤں جسے واقعی سنبھال کر رکھنا چاہیے؟''

''وہ نیک خاتون جسے شوہر دیکھے تو اسے خوشی ہو، وہ جب اسے کسی کام کے لیے کہے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ گھر سے غائب ہو تو حفاظت کرے۔'' {۸۱}

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص اپنے اموال سے حقوقِ واجبہ ادا کرتا ہے وہ اس وعید کا مستحق نہیں جو آیت میں مذکور ہے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب وسنت میں زہد وقناعت والی زندگی کو پسند کیا گیا ہے اور کسبِ مال

{۷۹} الکنز جعل المال بعضه علی بعض/ المفردات: ۴۴۲

{۸۰} ابن کثیر: ۲/ ۴۶۱

{۸۱} ابوداؤد/ جلد ۱، ۲۴۱-۲۴۲، باب فی حقوق المال۔

میں اعتدال کی ترغیب دی گئی ہے اس لیے کہ مال ایک فتنہ ہے خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو مال کو مقصدِ زندگی بنا کر اس کی پرستش شروع کر دیتے ہیں، حلال اور حرام کا فرق بھول جاتے ہیں، حقوقِ واجبہ ادا نہیں کرتے، اللہ کے ذکر اور عبادت سے غافل ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر کبر و غرور کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔

﴿۳۵﴾...... مال و دولت کے ان پجاریوں کو قیامت کے دن ان کے جمع کردہ مال کے ذریعے عذاب دیا جائے گا جس کی صورت یہ ہوگی کہ سونے چاندی کو آگ میں تپایا جائے گا پھر اس کے ذریعے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا، ان اعضاء کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ فقراء کو دیکھ کر ان سرمایہ داروں کے ماتھے پر بل پڑ جاتے تھے پھر وہ پہلو بدل لیتے تھے اور غریبوں سے اظہارِ نفرت کے لیے پیٹھ موڑ کر چل پڑتے تھے۔

﴿هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ﴾ ان کے جسموں کو داغتے ہوئے فرشتے کہیں گے یہ اس کی سزا ہے جو تم اپنے لیے جمع کیا کرتے تھے لہٰذا اپنے جمع کردہ مال کا عذاب چکھو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جسے اللہ نے مال عطا کیا ہو پھر وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے، قیامت کے دن یہ مال گنجے سانپ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا جس کی دو آنکھیں ہوں گی اور اسے اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا، وہ اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑے گا اور کہے گا: ’’میں تیرا مال ہوں، تیرا خزانہ ہوں۔‘‘ {۸۲}

اس کے بعد آپ نے یہ آیتِ کریمہ پڑھی:

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ {۸۳}

’’قیامت کے دن وہ مال ان کے گلے میں طوق بنا کر ڈالا جائے گا جس کے بارے میں وہ بخل کیا کرتے تھے۔‘‘

حکمت و ہدایت

۱......علماءِ سوء لوگوں کے اموال ناجائز طریقوں سے ہتھیا لیتے ہیں اور اپنی عزت و وجاہت اور دکانداری کی حفاظت کے لیے انہیں راہِ حق پر چلنے سے روکتے رہتے ہیں۔(۳۴)

۲......علماءِ سوء اور سرمایہ دار طبقہ عوام کے استحصال کے لیے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیتا ہے۔(۳۴)

{۸۲}بخاری، زکوٰۃ/ ۳، تفسیر، سورۃ ۳، مسند احمد، ۱/ ۳۷۷، نسائی زکوٰۃ/ ۶

{۸۳}آلِ عمران ۳/ ۱۸۰

۳......ناجائز طریقے سے کسی کا مال کھانا ہر کسی کے لیے حرام ہے۔(۳۴)

۴......اس طریقے سے مال کا جمع کرنا حرام ہے کہ اس کی زکوٰۃ اور حقوقِ واجبہ ادا نہ کیے جائیں۔(۳۴)

۵......جس مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے وہ ''کنز'' میں شمار نہیں ہوتا اگرچہ وہ کروڑوں کی تعداد میں کیوں نہ ہو۔

۶......اگرچہ شریعت میں مالِ کثیر جمع کرنے سے منع کیا گیا لیکن جن لوگوں کی نظر میں دین اور ایمان کی اہمیت زیادہ ہے وہ قدرِ ضرورت پر اکتفاء کرتے ہیں اور تموّل کی دوڑ میں کسی سے مقابلہ نہیں کرتے اس لیے کہ تکثیرِ مال، تکثیرِ حرص کا سبب بنتا ہے اور حرص کے مضر اثرات سے نہ روح اور دل محفوظ رہتے ہیں نہ جسم و جان۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ عام طور پر کثرتِ مال تکبر، سرکشی، نمود و نمائش، اسراف اور غفلت جیسے گناہوں کا سبب بنتا ہے۔ ترمذی کی ایک روایت میں نبی کریم ﷺ نے مال کو اپنی اُمت کے لیے فتنہ قرار دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿لکل امة فتنة و فتنة أمتي المال.﴾{۸۴} ''ہر اُمت کے لیے کوئی خاص فتنہ تھا اور میری اُمت کے لیے خاص فتنہ مال ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک قول منقول ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ''مال میں کوئی خیر نہیں۔'' سوال کیا گیا: ''کیوں؟'' فرمایا: ''اس لیے کہ لوگ حلال و حرام کا لحاظ کیے بغیر مال جمع کرتے ہیں۔'' سوال ہوا: ''اگر کوئی اس کا لحاظ رکھے پھر کیا خرابی ہے؟'' فرمایا: ''اس کا حق ادا نہیں کیا جاتا۔'' عرض کیا گیا: ''اگر کوئی حق بھی ادا کرے تو؟ فرمایا: ''مال سے کبر و غرور پیدا ہوتا ہے۔'' سوال ہوا: ''اگر کوئی شخص کبر و غرور سے بچا رہے تو؟'' فرمایا: ''یہ اللہ کے ذکر سے غافل کر دیتا ہے۔'' عرض کیا گیا: ''اگر کسی کو ذکر سے غافل نہ کرے تو؟'' فرمایا: ''قیامت کے دن مالداروں کا حساب بڑا طویل ہوگا۔''{۸۵}

۷......قیامت کے دن نیک اور بُرے اعمال مختلف صورتوں میں بدل جائیں گے جیسا کہ وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ اژدھے کی صورت اختیار کر لے گا، یونہی عبادت اور ذکرِ الٰہی جنت کی نعمتوں میں بدل جائیں گے۔

{۸۴} ترمذی ۲/ ۵۹ باب ماجاء ان فتنة هذه الامة في المال

{۸۵} الفتنة و آثارها المدمّرة ص ۷۱-۷۲

اللہ کی تقویم اور مشرکین سے قتال کا حکم

﴿۳۶......۳۷﴾

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کے حکم میں جس دن اس نے پیدا کئے تھے آسمان اور زمین

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ

ان میں چار مہینے ہیں ادب کے، یہی ہے سیدھا دین سو ان میں ظلم مت کرو اپنے اوپر اور لڑو سب مشرکوں سے

فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ ۚ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا

ہر حال میں جیسے وہ لڑتے ہیں تم سب سے ہر حال میں اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے ڈرنے والوں کے۔

يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٦﴾ إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ

یہ جو مہینہ ہٹادینا ہے سو بڑھائی ہوئی بات ہے کفر کے عہد میں، گمراہی میں پڑتے ہیں اس سے کافر،

فِي الْكُفْرِ ۖ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا

حلال کر لیتے ہیں اس مہینہ کو ایک برس اور حرام رکھتے ہیں دوسرے برس تاکہ پوری کرلیں گنتی ان مہینوں کی

عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ ۗ وَاللَّهُ

جو اللہ نے ادب کیلئے رکھے ہیں پھر حلال کر لیتے ہیں جو مہینہ کہ اللہ نے حرام کیا، بھلے کر دیئے گئے ان کی نظر میں ان کے

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

برے کام اور اللہ راستہ نہیں دیتا کافر لوگوں کو۔

ربط: مشرکین اور اہلِ کتاب سے جنگ کا حکم دینے کے بعد مشرکین کی مختلف قباحتوں میں سے ایک خاص قباحت کا ذکر کیا جارہا ہے جو تقویمِ الٰہی کے حوالے سے تھی، وہ بظاہر چاروں محترم مہینوں کے احترام کا دعوٰی کرتے تھے مگر حسبِ ضرورت ان میں ردّو بدل بھی کر لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ مہینے اپنی اصل جگہ سے ہٹ چکے تھے۔

تسہیل: جس دن سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اس کے نزدیک قمری مہینوں کی تعداد کتابِ الٰہی میں بارہ ہے ان میں چار مہینے حرمت والے ہیں، یہی سیدھا دین ہے، تو تم ان مہینوں کی بے حرمتی کر کے اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور تم بھی سارے مشرکوں سے جنگ کرو جیسے وہ تم سارے مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ اللہ اہلِ تقوٰی کے ساتھ ہے ○ مہینوں میں ردّو بدل کرنا کفر میں ایک اضافہ ہے جس کے ذریعے کافروں کو گمراہ کیا جاتا

ہے، وہ حرمت والے مہینے کو کسی سال حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال حرام کر لیتے ہیں تا کہ اللہ نے جن مہینوں کو حرام کیا ہے ان کی گنتی بھی پوری کر لیں اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حلال بھی ٹھہرا لیں، ان کے لیے ان کی بداعمالیوں کو مزین کر دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو ہدایت نہیں دیتا O

﴿تفسیر﴾

﴿۳۶﴾......اصل مقصود سے پہلے یہ حقیقت تمہید کے طور پر بیان کی جا رہی ہے کہ قمری مہینوں کی اصل تعداد بارہ ہے جو نوشتۂ الٰہی میں موجود ہے اور اس دن سے جاری وساری ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پیدا فرمایا تھا۔ یہ اللہ کا بنایا ہوا کیلنڈر ہے جو دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب بتاتا رہتا ہے اور اس کیلنڈر سے ہر کوئی مستفید ہو سکتا ہے خواہ وہ اَن پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ، شہری ہو یا دیہاتی۔

﴿مِنۡهَاۤ اَرۡبَعَةٌ حُرُمٌ﴾ وہ خدائی کتاب جس میں اس کائنات کے متعلق تمام قوانین درج کر دیے گئے ہیں اس میں یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ قمری مہینوں میں سے چار مہینے حرمت وعظمت والے ہوں گے۔{۸۶} ان میں عبادت کا ثواب بھی زیادہ ہوگا اور گناہ کا عذاب بھی سخت ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ وہ بعض مقامات اور اوقات کو دوسرے مقامات اور اوقات پر فضیلت دے، اسی نے بلدِ حرام کو سارے شہروں پر، یومِ جمعہ، یومِ عرفہ اور ذوالحجہ کے دس ایام کو تمام دنوں پر اور رمضان اور حج کے مہینوں کو بقیہ مہینوں پر فضیلت عطا کی ہے۔ نبوت و رسالت کی بناء پر بعض افراد کو تمام انسانوں پر اس نے عظمت بخشی ہے۔

حرمت والے چار مہینوں میں قتال کا حرام ہونا نہ صرف حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے ثابت ہے بلکہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی ان کی حرمت پر متفق ہیں، اہلِ عرب کا بھی ان کی حرمت پر اتفاق تھا۔{۸۷}

﴿ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ﴾ یہی سیدھا اور فطری دین ہے جس میں کوئی کجی اور خلافِ فطرت بات نہیں ہے۔ اس دین میں جس قمری جنتری کا اعتبار کیا گیا ہے وہ فطرت کے عین مطابق ہے، عبادات کی ادائیگی میں اس جنتری کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، نہ بے وقت کی نماز کا اعتبار ہے اور نہ ہی بے وقت کے حج اور روزے کا اعتبار ہے، اللہ تعالیٰ نے مہینوں کی جو ترتیب بنائی ہے اور عبادت کے اوقات کی جو تعیین فرمائی ہے اس کی خلاف ورزی یا اس میں کمی بیشی کج فہمی

{۸۶} أی منها اربعة فرض الله احترامها۔ (تفسیر المراغی ۱۰/۱۱۴)

{۸۷} حوالہ مذکورہ

کی علامت ہے۔

﴿فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِيۡهِنَّ اَنۡفُسَكُمۡ﴾ ان چاروں مہینوں میں ان کی حرمت کے خلاف کوئی بھی کام کرنا خود اپنے اوپر ظلم ہے، اس لیے کہ ان مہینوں کو محترم ٹھہرانے میں اللہ کا کوئی مفاد نہیں بندوں ہی کا مفاد ہے۔

اہلِ علم کہتے ہیں کہ ویسے تو سارا سال گناہوں سے بچنا چاہیے لیکن ان چاروں مہینوں میں گناہوں سے بچنے اور نیکی کے کرنے کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، ایسا کرنے سے بقیہ مہینوں میں بھی معاصی سے بچنا اور نیکیوں کا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔{۸۸}

﴿وَقَاتِلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ كَآفَّةً﴾ چاروں مہینوں کی عظمت اور حرمت اپنی جگہ لیکن اگر دُشمنانِ اسلام تم پر حملہ کردیں تو پھر تمہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی پوری پوری اجازت ہے۔ تمہیں چاہیے کہ متحد ہو کر ان کے خلاف جنگ کرو جیسا کہ وہ سب متحد ہو کر تمہارے خلاف جنگ کرتے ہیں۔{۸۹}

دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خاندان اور قبیلے، رشتے اور قرابت کے فرق کے بغیر تم مشرکوں سے من حیث الجماعت جنگ کرو کیونکہ وہ بھی تمہارے خلاف جنگ کرتے ہوئے کسی قسم کی قرابت اور دوستی کا لحاظ کیے بغیر من حیث الجماعت ہی جنگ کرتے ہیں۔{۹۰}

﴿وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ﴾ یہ حقیقت ذہن نشین کرلو کہ اللہ کی مدد اور معیّت انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کی نافرمانی سے بچتے اور اس کی طے کردہ حدود و قیود کا لحاظ رکھتے ہیں۔

﴿۳۷﴾...... پہلی آیتِ کریمہ تو بطور تمہید تھی، اب اس آیت میں اہلِ عرب کی اس جاہلانہ رسمِ بد کو بیان کیا جارہا ہے جس کی وجہ سے اللہ کے بنائے ہوئے کیلنڈر میں عظیم تغیر پیدا ہو گیا تھا اور روزوں اور حج جیسی عبادات، جن کا مخصوص مہینوں اور ایام میں ادا کرنا ضروری ہے اپنے وقت سے ہٹ چکی تھیں، اس رسمِ بد کی دو صورتیں ہمارے مفسرین نے بیان کی ہیں۔

پہلی صورت یہ تھی کہ عرب کے جہلاء قمری سال کو شمسی سال کے برابر رکھنے کے لیے ہر تین سال بعد ایک مہینہ کا اضافہ کردیتے تھے کیونکہ شمسی سال، قمری سال سے گیارہ دن زیادہ ہوتا ہے۔ ہر تیسرے سال کے خاتمے پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا تھا، اس کبیسہ سے مقصد ان کا صرف یہ تھا کہ حج مخصوص زمانے میں آئے اور ان کے تجارتی مفادات متاثر

{۸۸} فیکون ترک الظّلم والقبائح...... داعیاً الیٰ ترکھا فی غیرہ۔(احکام القرآن للجصّاص ۳/ ۱۱۱)

{۸۹}ای محیطین بھم و مجتمعین۔ (قرطبی ۸/ ۱۲۵)

{۹۰} قاتلوھم بأجمعھم مجتمعین علی قتالھم کما انّھم یقاتلونکم علی ھذہ الصفة۔ (کبیر: ۱۶/ ۴۴)

نہ ہوں، کیونکہ فطری نظام کے مطابق حج کبھی سخت گرمی میں آ تا تھا اور کبھی شدید سردی میں، مختلف شہروں سے آنے والے تاجروں کو نا موافق موسم میں نقل وحمل میں مشکل پیش آتی تھی جس سے عربوں کی تجارت متاثر ہوتی تھی چنانچہ اس کا حل انہیں ''کبس'' کی صورت میں نظر آیا یعنی شمسی سال کے مقابلہ میں قمری سال میں جو کمی پائی جاتی تھی اسے چند ایام کے اضافہ سے پورا کر لیتے تھے۔ ''کبس'' کا یہ طریقہ انہوں نے یہود ونصاریٰ سے سیکھا تھا جو کہ شمسی سال پر اعتماد کرتے تھے اور شمسی سال 365¼ دنوں کا ہوتا ہے تو وہ ہر چار سال بعد اس کسر سے یومِ کامل بنا لیتے تھے اور ہر 120 سال کے بعد پورے مہینے کا اضافہ کر دیتے تھے جس کی وجہ سے ایک سال 13 مہینوں کا ہو جاتا تھا اور اسے وہ ''کبیسہ'' کا نام دیتے تھے۔ {۹۱}

قمری سال میں اضافہ کی طرح مہینوں میں تاخیر کا رواج عام ہو چکا تھا یعنی اپنی ذاتی اور تجارتی مصلحتوں کی خاطر ایک مہینے کی حرمت دوسرے مہینے کی طرف منتقل کر دیتے تھے، مثلاً محرم کے بجائے صفر کو حرمت والا مہینہ بنا لیتے اور ذوالحجہ کے بجائے کسی دوسرے مہینے میں حج ادا کر لیتے اور اگر دشمن کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کی صورت میں رجب آ جاتا تو وہ کہتے اس سال ہم شعبان کو رجب سمجھیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ تکمیل وتاخیر اور کبیسہ کی اس رسم کا موجد نعیم بن ثعلبہ کنانی تھا۔ {۹۲} وہ حج کے موقع پر کھڑے ہو کر اعلان کرتا کہ اس سال میں محرم کی حرمت کو مؤخر کرتے ہوئے صفر کو حرام قرار دیتا ہوں، اسی سے ملتا جلتا اعلان وہ اگلے سال کر دیتا، اس ادل بدل کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھول ہی گئے کہ کون سا مہینہ محرم کا ہے اور کون سا صفر کا، بالآخر انہوں نے یہ کیا کہ چار مخصوص مہینوں کو حرام سمجھنے کے بجائے وہ مطلقاً سال کے چار مہینوں کو حرمت والا قرار دے لیتے تھے خواہ وہ جونسے بھی ہوں۔

اسی سے ملتی جلتی دوسری صورت اس رسمِ بد کی یہ بیان کی گئی ہے کہ چار مہینوں کی حرمت تسلیم کرنے کے باوجود اہلِ عرب اپنی نفسانی اغراض کی وجہ سے ان کا لحاظ نہیں کرتے تھے، اگر حرمت والے مہینے میں انہیں قتل وقتال اور ڈاکہ زنی کی ضرورت پیش آتی تو وہ اس کی حرمت اگلے مہینے کی طرف منتقل کر دیتے۔ وہ سال بھر میں چار مہینے تو پورے کر لیتے تھے لیکن اللہ کی متعین کردہ ترتیب کا لحاظ نہ کرتے تھے، جس مہینہ کو چاہتے ذوالحجہ اور جسے چاہتے رمضان کہہ دیتے اور اگر مہینوں کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑتا تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ مثلاً اگر لڑائی میں دس مہینے گزر جاتے تو وہ کہتے کہ اب کے برس، سال چودہ مہینوں کا ہوگا، یوں باقی ماندہ چار مہینوں کو اشہرِ حرم بنا لیتے تھے۔

{۹۱} کبیر ۴۵/۱۶

{۹۲} قال الکلبی اول من فعل ذلک رجلٌ من کنانۃ یقال لہ نعیم بن ثعلبۃ (روح المعانی ۱۳۶/۶)

اس ردّو بدل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زمانہ میں اس کا امتیاز ہی دشوار ہو گیا تھا کہ کون سا مہینہ رمضان یا شوال کا ہے اور کون سا ذوالقعدہ، ذوالحجہ یا رجب کا ہے۔

ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور نویں سال میں آنحضرت ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو موسمِ حج میں تمام کفار و مشرکین سے برأت کا اعلان کرنے کے لیے بھیجا تو یہ مہینہ حقیقی حساب سے اگرچہ ذوالحجہ کا تھا مگر جاہلیت کے اس پرانے دستور کے مطابق یہ مہینہ ذوالقعدہ کا قرار پایا اس لیے رسولِ کریم ﷺ نے اپنے منیٰ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

﴿ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق السمٰوٰت و الارض.﴾{۹۳} ''یعنی زمانہ پھر پھرا کر پھر اپنی اسی ہیئت پر آ گیا جس پر اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت رکھا تھا''

یعنی جو مہینہ اصلی ذوالحجہ کا تھا جاہلیت والوں کے نزدیک بھی اس سال وہی مہینہ ذوالحجہ کا مہینہ قرار پایا۔

یہ تھی وہ رسمِ جاہلیت جو مہینوں کی تعداد اور ترتیب اور تعیین میں کمی بیشی اور ردّو بدل کر کے کی جاتی تھی جس کے نتیجہ میں ان تمام احکامِ شرعیہ میں خلل آتا تھا جو کسی خاص مہینہ یا اس کی کسی خاص تاریخ سے متعلق ہیں یا جو سال کے شروع یا ختم سے متعلق ہیں مثلاً عشرۂ ذی الحجہ میں احکامِ حج اور عشرۂ محرم کے روزے اور ختمِ سال پر زکوٰۃ وغیرہ کے احکام۔

بات تو مختصر سی تھی کہ مہینہ کا نام بدل کر مقدم و مؤخر کر دیا اور محرم کو صفر اور صفر کو محرم بنا دیا لیکن اس کے نتیجہ میں سینکڑوں احکامِ شرعیہ کی تحریف ہو کر عمل برباد ہوا۔{۹۴}

﴿زُيِّنَ لَهُمْ سُوٓءُ أَعْمَـٰلِهِمْ﴾ ان کے لیے ان کے بُرے اعمال کو شیطان نے مزین کر دیا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں بہت اچھا کر رہے ہیں۔

﴿وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَـٰفِرِينَ﴾ اور اللہ ایسے لوگوں کو راہِ ہدایت پر چلنے کی توفیق نہیں دیتا جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی ضلالت میں گرتے چلے جاتے ہیں۔

{۹۳} بخاری، تفسیر، سورۃ۹، بدء الخلق ۲، مغازی۷۷، اضاحی۵، توحید۲۴/ مسلم، قسامۃ ۲۹/ ابوداؤد، مناسک۶۷

{۹۴} معارف القرآن ۴/ ۳۷۱

حکمت وہدایت

۱......اللہ تعالیٰ نے کائنات کا جو متوازن اور مستحکم نظام قائم کیا ہے اس میں قمری مہینوں کی تعداد بارہ رکھی ہے، جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اسی دن اس نے اسماء کی تعیین کے ساتھ مہینوں کا نظام بھی مرتب فرمادیا تھا، اس ترتیب کو باقی رکھنے میں حکمِ الٰہی کی اتباع اور اسے توڑنے میں معصیت اور گناہ ہے۔

۲......مختلف عبادات کی ادائیگی کے لیے شریعتِ اسلامیہ میں صرف قمری تاریخوں پر اعتماد کیا جاتا ہے، شمسی، ہندی یا قبطی تاریخوں پر اعتماد نہیں کیا جاتا، اگرچہ ان میں بھی مہینوں کی تعداد بارہ سے زائد نہیں، اس پر واضح دلیل یہ ہے کہ بارہ میں سے چار مہینوں کو حرمت والے مہینے قرار دیا گیا ہے اور ان چاروں کا تعلق چاند سے ہے یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔

قرآنِ کریم میں بھی اس کی صراحت ہے، سورۂ یونس میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ {۹۵}
یونس ۱۰/۵

''وہی تو ہے جس نے سورج کو ضیاء اور چاند کو نور بخشا اور چاند کے لیے منزلیں مقرر کردیں تاکہ تم سالوں اور تاریخوں کا حساب معلوم کرسکو۔''

اس آیت سے ثابت ہوا کہ چاند کی منزلیں مقرر کرنے کا اصل مقصد تاریخوں کا حساب معلوم کرنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تاریخ اور حساب کتاب کا مدار چاند کی گردش پر رکھا جائے۔

سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیت بھی قمری تاریخ کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے:

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ {۹۶}

''اور یہ آپ سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے سوال کرتے ہیں، آپ انہیں بتادیجیے کہ یہ لوگوں (کی عبادت) کے اوقات اور موسم حج کے لیے ہے''

اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ روزہ، زکوٰۃ، حج، عیدین جیسی عبادات اور ان کے احکام میں شریعت نے قمری تاریخوں کا اعتبار کیا ہے۔

۳......اسلام، حق اور استقامت کا دین ہے کیونکہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ﴾ {۹۷}

{۹۵} یونس ۱۰/۵

{۹۶} البقرۃ ۲/۱۸۹

{۹۷} التوبۃ/۳۶

۴......ویسے تو سارے ہی مہینوں میں گناہ کرنا ظلم ہے مگر ''اشہرِ حرم'' میں گناہ کرنا ظلمِ شدید ہے۔{۹۸} امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ گناہ کی قباحت کے حوالے سے تمام مہینوں کو برابر ٹھہراتے ہیں۔{۹۹}

۵......اللہ تعالیٰ کی خصوصی معیت یعنی نصرت اور تائید اہلِ تقوٰی کو حاصل ہوتی ہے۔

۶......مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مشرکوں کے ساتھ ہر جہت سے قتال کریں اور یہ کہ من حیث الجماعت قتال کریں۔{۱۰۰}

۷......باطل تاویلوں اور حیلہ بازی کے ذریعے حرام کو حلال ٹھہرانا قطعاً غلط ہے۔

۸......مشرکین کے اندر پہلے ہی علمی اور عملی بہت ساری خرابیاں پائی جاتی تھیں، حرمت والے مہینوں میں ادل بدل کے ذریعہ انہوں نے اپنے گناہوں میں مزید اضافہ کرلیا۔

۹......عربوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو توحید و رسالت اور بعث بعد الموت کا انکار کرتے تھے، حلال کو حرام اور حرام کو حلال بھی ٹھہرا لیتے تھے مگر انہیں اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ اشہرِ حرم کی تعداد کسی نہ کسی طرح پوری کرلیں خواہ اس کی خاطر مہینوں میں ردّ و بدل کرنا پڑے یا بارہ مہینوں میں ایک دو مہینوں کا اضافہ کرنا پڑے، یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے کہ جو حقوق و فرائض کی ادائیگی کا تو اہتمام نہیں کرتے مگر دین کے ظواہر اور مستحبات کی خاطر لڑنے مرنے کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں۔

۱۰......مہینوں کے ردّ و بدل میں عربوں کے پیشِ نظر مادی مصلحتوں کے سوا کچھ نہ تھا، ایک مصلحت تو یہ تھی کہ حج ایسے موسم اور زمانے میں ادا کیا جائے جو ان کی تجارت کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو، دوسری مصلحت یہ تھی کہ ان کی لوٹ مار اور قتل و قتال کے راستے میں کوئی شرعی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

۱۱......شیطان کی تدبیروں میں سے سب سے مؤثر تدبیر یہ ہے کہ وہ گناہوں کو خوبصورت اور ہلکا پھلکا بنا کر پیش کرتا ہے، بسا اوقات وہ معصیت کو نیکی کا لباس پہنا دیتا ہے جسے دیکھ کر بڑے بڑے عقلمند دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

۱۲......اہلِ کفر و فسق اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور توفیق سے محروم رہ جاتے ہیں۔

{۹۸} روح المعانی ۶/ ۱۳۳، قرطبی ۸/ ۱۲۴

{۹۹} وقال مالك وابوحنيفة...... ولى الشهر الحرام وغيره سواء۔ (تفسير منير ۱۰/ ۲۰۸)

{۱۰۰} بأن نكون مجتمعين فى حال قتالنا إيّاهم۔ (احكام القرآن للجصّاص ۳/ ۱۱۱)

جہاد کی ترغیب اور نصرتِ الٰہی

﴿۳۸......۴۰﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى

اے ایمان والو! تم کو کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ کوچ کرو اللہ کی راہ میں تو گرے جاتے ہو زمین پر؟

الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ

کیا خوش ہوگئے دنیا کی زندگی پر آخرت کو چھوڑ کر؟ سو کچھ نہیں نفع اٹھانا دنیا کی زندگی کا آخرت کے مقابلہ میں

إِلَّا قَلِيلٌ ﴿۳۸﴾ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ

مگر بہت تھوڑا۔ اگر تم نہ نکلو گے تو دے گا تم کو عذاب دردناک اور بدلے میں لائیگا اور لوگ تمہارے سوا،

وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۹﴾ إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ

اور کچھ نہ بگاڑ سکو گے تم اس کا اور اللہ سب چیز پر قادر ہے۔ اگر تم نہ مدد کرو گے رسول کی تو اس کی مدد کی ہے

نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ

اللہ نے جس وقت اس کو نکالا تھا کافروں نے کہ وہ دوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے غار میں،

لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ

جب وہ کہہ رہا تھا اپنے رفیق سے، تو غم نہ کھا بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اتاری اپنی طرف سے اس پر تسکین

تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ

اور اس کی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں کہ تم نے نہیں دیکھیں اور نیچے ڈالی بات کافروں کی اور اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے

عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۴۰﴾

اور اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

ربط: مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ قتال کا حکم دینے کے بعد اس مشہور غزوہ کا ذکر ہے جس نے منافقین کے نفاق کا پول کھول کر رکھ دیا تھا اور عام مسلمانوں کو بھی سخت ابتلاء کا سامنا کرنا پڑا تھا، میری مراد غزوہ تبوک سے ہے جس کی تفصیل آیا چاہتی ہے، یہاں سے سورت کے آخر تک منافقوں کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے اور ان کی ایک ایک شرارت اور کمزوری بے نقاب کر کے رکھ دی گئی ہے تاکہ مسلمان ان سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں اور ان کے فتنے سے اپنے آپ کو بچا کر رکھیں۔

تسہیل: اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو تم زمین سے چپک کر رہ جاتے ہو، کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کرلیا ہے؟ حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں انتہائی حقیر ہے O اگر تم جہاد کے لیے نہیں نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہارے بدلے کسی دوسری قوم کو دین کی خدمت کے لیے کھڑا کردے گا اور تم اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے O اگر تم اللہ کے نبی کی مدد نہیں کرو گے تو اللہ خود اس کی مدد کرے گا، اللہ نے اس وقت بھی اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی تھی جب کافروں نے انہیں مکہ سے اس حال میں نکلنے پر مجبور کردیا تھا کہ وہ صرف دو میں سے دوسرا تھا، جس وقت کہ وہ دونوں غار میں تھے اور وہاں وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے کہ غم نہ کرو یقیناً اللہ کی تائید ہمارے ساتھ ہے، اس وقت اللہ نے اسے سکونِ قلب کی خصوصی نعمت سے نواز دیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تمہیں نظر نہیں آتے، اللہ نے کافروں کا بول نیچا کردیا اور اللہ ہی کا بول بالا رہا اور اللہ غالب اور حکیم ہے O

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات کی تفسیر سے پہلے ان کا پسِ منظر جان لینا ضروری ہے۔ یہ ۹ھ ہجری کا واقعہ ہے جب رسول اللہ ﷺ کو تاجروں کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ روم کا بادشاہ ہرقل عرب کی شمالی سرحدوں پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے اور اس نے اپنے ساتھ بعض عرب قبائل کو بھی شامل کرلیا ہے، اس روایت سے قطع نظر بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ رومیوں کا عربوں پر ایسا رعب تھا کہ عرب ان کے مقابلے میں آنے کا کبھی تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، سپہ سالارِ اعظم ﷺ ایک طرف عربوں کے دل و دماغ سے رومیوں کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا خوف نکالنا چاہتے تھے اور دوسری طرف رومیوں کو یہ بتانا مقصد تھا کہ وہ مسلمانوں کو لقمۂ تر یا مالِ مفت نہ سمجھیں اور ان پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کریں، درجِ ذیل آیت جو کہ غزوۂ تبوک ہی کے سلسلہ میں آئی ہے اس میں بھی اسی حکمت کی طرف اشارہ ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ {۱۰۱}

"اے ایمان والو! تم ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس پھیلے ہوئے ہیں اور چاہیے کہ وہ جنگ میں تمہاری سختی محسوس کریں اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔"

چنانچہ غزوۂ تبوک سے مذکورہ بالا دونوں مقاصد پورے ہوگئے، رومیوں نے مسلمانوں کے اس کھلے ہوئے چیلنج

{۱۰۱} التوبۃ ۹/۱۲۳

کے مقابلہ میں پسپائی اختیار کی اور انہیں مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوئی۔

جب رسولِ اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو رومیوں سے مقابلہ کے لیے تبوک کی طرف چلنے کی دعوت دی جو کہ مدینہ منورہ سے سات سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے تو کلمہ پڑھنے والے چھ گروہوں میں تقسیم ہو گئے:

(۱)......وہ لوگ جو شرکت کے لیے بلا تردّد تیار ہو گئے۔

(۲)......قدرے توقّف اور تردّد کے بعد شرکت پر آمادگی ظاہر کر دی۔

(۳)......جو واقعی معذور تھے۔

(۴)......وہ مخلص مسلمان جو محض سستی اور کاہلی کی بناء پر شرکت نہ کر سکے۔

(۵)......وہ منافقین جو گئے ہی نہیں۔

(۶)......وہ منافقین جو گئے تو سہی مگر محض جاسوسی کے لیے۔

مخلص مسلمانوں نے بڑے ذوق وشوق سے اس میں حصہ لیا اور ایمان وایثار کی روشن مثالیں قائم کیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پورے لشکر کو سامان فراہم کرنے کی ذمہ داری لی، رجب کے مہینے میں رسول اللہ ﷺ تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے تبوک کے لیے روانہ ہوئے، اس سے پہلے کسی غزوہ میں اتنی بڑی تعداد شریک نہ ہوئی تھی، یہ زمانہ سخت گرمی کا تھا، کھجور، جس پر اہلِ مدینہ کی معیشت کا بہت زیادہ انحصار تھا اس کے کٹنے کے دن سر پر تھے، صحابہ مالی اعتبار سے بے حد تنگی کا شکار تھے اسی لیے اس لشکر کو ''جیش العسرة'' کہا جاتا ہے، سواریاں محدود تھیں، ایسے بھی تھے جن کے پاس پاؤں میں پہننے کے لیے ڈھنگ کے جوتے بھی نہ تھے بایں ہمہ وہ سات سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے تبوک پہنچ گئے مگر رومیوں کو مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوئی اور سرحد پار کر کے ان کا تعاقب کرنے کو رسول اللہ ﷺ نے مناسب نہ سمجھا، اس غزوہ سے جو مقاصد تھے وہ جنگ کیے بغیر حاصل ہو چکے تھے اس لیے تبوک میں چند راتیں گزارنے کے بعد مجاہدِ اعظم ﷺ نے اپنے جانثاروں کو مدینہ واپس چلنے کا حکم دیا۔

﴿تفسیر﴾

﴿۳۸﴾......اس آیتِ کریمہ میں ان تمام لوگوں سے خطاب ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے، ان میں مضبوط ایمان والے بھی تھے، ضعیف الایمان بھی تھے اور منافق بھی تھے، وہ بھی تھے جو دعوتِ جہاد سنتے ہی ہر چہ باداباد کہتے ہوئے فوراً تیار ہو گئے، نہ رومیوں کی طاقت سے گھبرائے، نہ ہی موسم کی سختی اور مسافت کی طوالت سے پریشان ہوئے اور وہ بھی تھے جنہوں نے اس دعوت کو ناقابلِ برداشت بوجھ جانا اور جھوٹے بہانے پیش کر کے گھروں میں بیٹھے رہنے کو

ترجیح دی، ان تمام قسم کے لوگوں کو زجر و توبیخ کے انداز میں خطاب کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے جو تم جہاد کا نام سن کر زمین کا بوجھ بن جاتے ہو۔ ”اثّاقلتم“ کا لفظ جس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک جثہ ہے جو زمین پر گرنے کے لیے ڈھیلا پڑ رہا ہے، اسے اوپر اُٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر چونکہ وہ اُٹھنا ہی نہیں چاہتا اس لیے اسے اوپر اُٹھانے میں سخت مشکل پیش آ رہی ہے...... جہاد قربانی کا تقاضا کرتا ہے...... مال و متاع، عیش و راحت، خواہشات، جذبات، جان اور اولاد، رشتوں اور تعلقات کی قربانی! اور یہ قربانی وہی دے سکتا ہے جو زمینی تقاضوں سے اوپر اُٹھ سکتا ہو اور روحانی فضاؤں میں اُڑان کا جذبہ رکھتا ہو۔

﴿اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ جو لوگ اللہ کی رضا کے لیے عیش و راحت اور مال و جان کی قربانی دینے کا جذبہ نہیں رکھتے ان کا یہ طرزِ عمل اس بات کی علامت ہے کہ وہ حبِّ دنیا کے مرض میں مبتلا ہیں اور حبِّ دنیا تمام گناہوں کی بنیاد ہے، جو شخص آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دیتا ہے وہ حقیقت میں خیرِ کثیر کو چھوڑ کر حقیر چیز کو اختیار کرتا ہے، صحیح مسلم اور ترمذی میں حضرت مستورد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

”آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنی انگلی دریا میں ڈبو دے، جو حیثیت انگلی کے ساتھ لگے ہوئے پانی کی، دریا کے سامنے ہے وہی حیثیت دنیا کی آخرت کے سامنے ہے۔“ {۱۰۲}

﴿۳۹﴾...... اس آیتِ کریمہ میں ترکِ جہاد پر وعید ہے، بظاہر غزوۂ تبوک کے پسِ منظر میں ایک مخصوص جماعت سے خطاب ہے لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار سے ان تمام لوگوں سے خطاب ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم دین کے لیے جہد و جہاد سے پہلو تہی کرتے رہے تو اللہ کے عذاب کی گرفت میں آ کر رہو گے، یہ عذاب صرف آخرت کا نہیں، دنیا کا بھی ہے جو کہ قحط سالی، غربت، ذلت و ہزیمت، انتشار و افتراق اور دین کی نعمت اور اس کی برکات سے محرومی کی صورت میں آ سکتا ہے۔

﴿وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو دین کی حفاظت و اشاعت کے لیے کھڑا کر دے جو ایمان میں تم سے زیادہ مضبوط اور اطاعت و جہاد میں تم سے سبقت لے جانے والے ہوں، تاریخ میں ایسا بارہا ہو چکا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

﴿وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا﴾ تمہارے جہد و جہاد سے اعراض کرنے سے اللہ اور اس کے رسول کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ سراسر تمہارا ہی نقصان ہو گا۔

{۱۰۲} مسلم، جنۃ/۵۵، ترمذی، زهد/ ۱۵، مسند احمد، ۴/ ۲۲۹-۲۳۰

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ وہ اللہ جس کے سامنے کچھ بھی ناممکن نہیں وہ اس پر قادر ہے کہ تمہیں ہلاک کردے اور تمہاری جگہ کسی اور کو جہاد کے لیے کھڑا کردے۔

﴿۴۰﴾......اب ایک تاریخی واقعہ بیان کیا جارہا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب سارے ہی صحابہ ہجرت کرچکے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ میں دو آدمیوں کو چھوڑ کر (حضرت ابوبکر وحضرت علی رضی اللہ عنہما) صرف وہی باقی بچا جو کسی معذوری سے نہیں جاسکا، یا وہ جو کسی آزمائش اور فتنہ میں پڑ گیا، آخر میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رفیقِ سفر بناتے ہوئے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، مشرکین نے تعاقب کیا اور آپ کی گرفتاری پر سو اونٹنیاں بطور انعام دینے کا اعلان کردیا، کئی سورماؤں نے قسمت آزمائی مگر اللہ کو بچاؤ منظور تھا، سو کوئی مہم جو بھی آپ تک نہ پہنچ سکا، آپ چھپتے چھپاتے غارِ ثور تک جا پہنچے، جب دونوں غار میں داخل ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے مکڑی کو بھیجا، اس نے غار کے دہانے پر جال بُن دیا، دو جنگلی کبوتریاں اُڑتی ہوئی آئیں اور وہاں آکر بیٹھ گئیں۔ مشرک تعاقب کرتے ہوئے غار تک پہنچ گئے، اگر وہ نیچے دیکھ لیتے تو رسول اللہ ﷺ پر ان کی نظر پڑ سکتی تھی مگر کسی غیبی طاقت نے انہیں نیچے جھانکنے سے روک دیا، مکڑی کے جالے اور کبوتریوں کے آشیانے نے بھی ان کی توجہ ادھر نہ جانے دی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مشرکین کی چلت پھرت کو دیکھا تو گھبرا کر عرض کیا: ''یارسول اللہ! اگر ان میں سے کسی نے ایک قدم بھی بڑھایا تو ہمیں دیکھ لے گا، آپ نے جواب دیا:

﴿ماظنک یا ابابکر باثنین اللہ ثالثھما﴾{۱۰۳} ''اے ابوبکر! ان دو کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے؟''

یہ ہے وہ واقعہ جس کے پسِ منظر میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی جس میں فرمایا جارہا ہے کہ اے لوگو! اگر تم اللہ کے رسول ﷺ کی مدد نہیں کروگے تو یہ مت سمجھو کہ وہ بے سہارا ہوجائیں گے، ان کی مدد کے لیے اللہ کافی ہے، وہ خود آپ کی حفاظت فرمائے گا جیسا کہ ہجرت کے موقع پر اس نے آپ کی حفاظت فرمائی تھی جب مشرکین نے آپ کو قتل کرنے کا عزمِ صمیم کرلیا تھا، آپ نے مکہ سے نکل کر غارِ ثور میں پناہ لی تو مشرک بھی تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آپہنچے، ان کے آثار دیکھ کر رفیقِ غار آپ کے تحفظ کے بارے پریشان ہوئے تو اللہ نے آپ کے قلبِ مبارک پر سکینہ نازل فرمادیا۔

سکینہ {۱۰۴} سے مراد امن اور احساسِ تحفظ کی وہ کیفیت ہے جس کی وجہ سے آپ کو پورا یقین تھا کہ دُشمن میرا

{۱۰۳} بخاری، تفسیر/ سورۃ ۹، فضائل الصّحابہ ۲/مسند احمد/۱، ۴

{۱۰۴} ماالقی فی قلبہ الأمنۃ (کشاف ۲/ ۲۶۰)

کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔

﴿وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ ''اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے فرمائی جنہیں تم نے دیکھا نہیں۔''

یہ لشکر فرشتوں کے بھی ہو سکتے ہیں اور پورے عالم کی قوتیں بھی ہو سکتی ہیں، باری تعالیٰ ان قوتوں کو جس کی تائید میں کھڑا کر دے اسے کوئی بھی شکست نہیں دے سکتا۔

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى﴾ ''اور اللہ نے کافروں کے کلمہ کو نیچے کر دیا'' کافروں کے کلمہ سے مراد کفر و شرک کا کلمہ اور اللہ کے کلمہ سے مراد کلمۂ توحید ہے۔ {۱۰۵}

دوسرا احتمال یہ ہے کہ کافروں کے کلمہ سے مراد ان کا وہ فیصلہ ہے جو انہوں نے نبوت کا چراغ گل کر دینے کے بارے میں دارالندوہ میں متفقہ طور پر کیا تھا اور اللہ کے کلمہ سے مراد اللہ کا فیصلہ ہے جو اس نے آپ کے بچاؤ اور حفاظت کی بابت کیا تھا اور یہ اللہ کی دائمی سنت ہے کہ وہ اپنے مخصوص بندوں خصوصاً انبیاء کرام علیہم السلام کی غیبی مدد فرماتا ہے جس کی وجہ سے بالآخر وہی غالب آ کر رہتے ہیں۔

سورۂ صافات میں ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ {۱۰۶}	اور رسولوں کے بارے میں ہمارا حکم پہلے ہو چکا، بے شک ان کی مدد کی جائے گی اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ ہر چیز پر غالب آ کر رہتا ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا وہ جسے غلبہ دینا چاہے اسے غالب آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

﴿حَكِيْمٌ﴾ وہ ہر چیز کو اپنے محل میں رکھتا ہے چنانچہ اس نے اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی اور دینِ اسلام کو حکمت کے ساتھ تمام ادیان پر غلبہ عطا فرمایا۔

حکمت وہدایت

۱...... جب امیر المؤمنین کی جانب سے دعوتِ عام ہو تو جہاد کے لیے نکلنا ہر مسلمان پر واجب ہوگا۔ (۳۸)

۲...... جہاد وہی کر سکتا ہے جس کے اندر زمینی اور نفسانی تقاضوں سے اوپر اٹھنے کا حوصلہ پایا جاتا ہو۔ (۳۸)

{۱۰۵} والمعنی ...... کلمة الشرک سافلة ...... و کلمة اللّٰه ...... وهی قوله لا اله الا اللّٰه۔ (کبیر ۶/۵۴)

{۱۰۶} الصّافات ۳۷/ ۱۷۱-۱۷۳

۳......جہاد صرف اسی کو کہا جائے گا جو اللہ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے ہو۔(۳۸)

۴......جہاد سے جان چھڑانا، حبِّ دنیا کے مرض کی نشاندہی کرتا ہے۔(۳۸)

۵......دنیا کی زندگی اور نعمتیں اخروی نعمتوں کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔(۳۸)

۶......جہاد سے پہلوتہی کرنے والوں کو ذلت و ہزیمت کے عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔(۳۹)

۷......اللہ کا دین کسی مخصوص قوم اور گروہ کا محتاج نہیں ہے وہ جسے چاہتا ہے اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمالیتا ہے اور ناقدری کرنے والوں کو دین کی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔(۳۹)

۸......اللہ کے رسول ﷺ، آپ کی اُمت اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کی نصرت واجب ہے۔(۴۰)

۹......واقعۂ ہجرت اور سورۂ توبہ کی آیت ۴۰ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت متعدد پہلوؤں سے ثابت ہوتی ہے:

(الف) واقعۂ ہجرت جو کہ اسلامی تاریخ کے نازک ترین واقعات میں سے تھا اس میں نبی کریم ﷺ نے صحبت و رفاقت کے لیے صدیقِ اکبر کا انتخاب کیا، یقیناً یہ انتخاب اللہ کی جانب سے تھا۔

(ب) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کی مذمت جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تعریف فرمائی ہے۔{۱۰۷}

(ج) نبیِ اکرم ﷺ نے حج کی فرضیت کے فوراً بعد جب پہلے حج کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو انہیں سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات کے ساتھ یہ آیتِ کریمہ بھی حاجیوں کے اجتماع میں سنانے کی تاکید فرمائی تھی۔

(د) حضرت ابوبکر کو اس آیت میں "ثانی اثنین" (دو میں سے دوسرا) قرار دیا گیا ہے اور وہ صرف غار میں "ثانی اثنین" نہیں تھے بلکہ اکثر دینی مناصب اور ذمہ داریوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ قبولِ ایمان، دعوت و تبلیغ، امامت و خلافت اور روضہ میں تدفین وغیرہ میں انہیں یہی حیثیت حاصل ہوئی، قبر سے اُٹھنے اور جنت میں داخل ہونے کے اعتبار سے بھی انہیں یہ اعزاز حاصل ہوگا۔

(ہ) حضورِ اکرم ﷺ کا یہ فرمانا کہ "یا ابا بکر ماظنک باثنین اللہ ثالثھما" (اے ابوبکر! ان دو کے بارے تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے؟){۱۰۸} جنابِ صدیق کے ایسے مقام اور مرتبہ کو ظاہر کرتا ہے جس

{۱۰۷} عن علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ قال: ان اللہ ذمّ النّاس کلھم ومدح اباابکر رضی اللہ عنہ (روح المعانی ۶، جلد ۱۰/۱۴۴)

{۱۰۸} تقدم تخریجہٗ فی تفسیر آیت ۴۰

بحیرۂ روم
القدس
اردن
وادی السرحان
مؤتہ
رومی لشکر کی واپسی
اذرح
معان
قلزم
سیناء
عقبہ
ایلہ
تبوک
دومۃ الجندل
مدین
مویلح
تیماء
مصر
مدائن صالح
خیبر
مدینہ منورہ
ینبع
بحیرۂ احمر
حجاز
100
200
300
400
500
کلومیٹر
بشکریہ اطلس القرآن اردو
غزوۂ تبوک (غزوۃ العُسرہ) (رجب ۹ھ)
﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ...﴾ ”توجہ فرمائی اللہ نے نبی اور مہاجرین اور انصار پر، وہ (مہاجرین وانصار) کہ جنہوں نے اتباع کیا آپ کا تنگی کی گھڑی میں“ [التوبہ: 117/9]
﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا﴾ ”اور (توجہ فرمائی اللہ نے) ان تین شخصوں پر جو چھوڑ دیے گئے تھے (حکم الٰہی کے انتظار میں)“ [التوبہ: 118/9]
﴿تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ﴾ ”تو وہ لوٹے جبکہ ان کی آنکھیں بہتی تھیں آنسوؤں سے اس غم سے کہ نہیں پاتے وہ جو وہ خرچ کریں“ [التوبہ: 92/9]

سے بلند مقام کا غیر نبی کے لیے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(و) اللہ کے نبی نے یہ جو فرمایا تھا ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ ''غم نہ کرو بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے'' تو یہ اللہ کے حکم سے فرمایا ہوگا اور اس میں جس معیت کا ذکر ہے وہ عمومی نہیں بلکہ خصوصی معیت ہے، سب سے اعلیٰ معیت وہ ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے اور اسی کا کچھ حصہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔

(ز) جو ''سکینہ'' جنابِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پر نازل ہوا اس کا نزول امت میں سے کسی اور کے لیے ثابت نہیں۔

(ح) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ واحد صحابی ہیں جن کی صحابیت قرآنِ کریم سے ثابت ہے کیونکہ مذکورہ بالا آیت میں ہے ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ﴾ ''جب وہ اپنے صاحب اور ساتھی سے فرما رہے تھے'' صاحب اور صحابی دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

(و) ویسے تو قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر کفر اور کفار کی مذمت اور ایمان اور مؤمنوں کی تعریف بار بار کی گئی ہے مگر متعین طور پر نام لے کر اس اُمت میں سے سوائے ابولہب کے کسی کی مذمت نہیں اور سوائے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کسی کی تعریف نہیں۔

حکمِ جہاد اور منافقوں کے بہانے

﴿۴۱......۵۲﴾

انْفِرُوا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ

نکلو ہلکے اور بوجھل اور لڑو اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں یہ بہتر ہے تمہارے حق میں

ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا

اگر تم کو سمجھ ہے۔ اگر مال ہوتا نزدیک اور سفر ہلکا تو وہ لوگ ضرور تیرے ساتھ ہو لیتے لیکن

لَّاتَّبَعُوكَ وَلَٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ

لمبی نظر آئی ان کو مسافت اور اب قسمیں کھائیںگے اللہ کی کہ اگر ہم سے ہوسکتا تو ہم ضرور چلتے تمہارے ساتھ،

لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ

وبال میں ڈالتے ہیں اپنی جانوں کو اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ اللہ بخشے تجھ کو کیوں

لَكَاذِبُونَ ﴿٤٢﴾ عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ

رخصت دے دی تو نے ان کو یہاں تک کہ ظاہر ہوجاتے تجھ پر سچ کہنے والے

صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

اور جان لیتا تو جھوٹوں کو؟ نہیں رخصت مانگتے تجھ سے وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر

الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾

اور آخرت کے دن پر اس سے کہ لڑیں اپنے مال اور جان سے اور اللہ خوب جانتا ہے ڈروالوں کو۔

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ

رخصت وہی مانگتے ہیں تجھ سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور شک میں

قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ

پڑے ہیں دل ان کے، سو وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں۔ اور اگر وہ چاہتے نکلنا تو ضرور

لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ

تیار کرتے کچھ سامان اس کا، لیکن پسند نہ کیا اللہ نے ان کا اٹھنا سو روک دیا ان کو اور حکم ہوا کہ

اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا

بیٹھے رہو ساتھ بیٹھنے والوں کے۔ اگر نکلتے تم میں تو کچھ نہ بڑھاتے تمہارے لئے مگر خرابی،

خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ

اور گھوڑے دوڑاتے تمہارے اندر بگاڑ کروانے کی تلاش میں اور تم میں بعضے جاسوس ہیں

وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا

ان کے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ وہ تلاش کرتے رہے ہیں بگاڑ کی پہلے سے اور الٹتے رہے ہیں

الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ

تیرے کام یہاں تک کہ آپہنچا سچا وعدہ اور غالب ہوا حکم اللہ کا اور وہ ناخوش ہی رہے۔

وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي

اور بعضے ان میں کہتے ہیں مجھ کو رخصت دے اور گمراہی میں نہ ڈال، سنتا ہے! وہ تو گمراہی میں

الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ

پڑ چکے ہیں اور بیشک دوزخ گھیر رہی ہے کافروں کو۔ اگر تجھ کو پہنچے کوئی خوبی تو وہ بری لگتی ہے

تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ

ان کو اور اگر پہنچے کوئی سختی تو کہتے [illegible] خوشیاں کرتے۔

وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ

تُو کہہ دے! ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے، وہی ہے کارساز ہمارا

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ

اور اللہ ہی پر چاہئے کہ بھروسہ کریں مسلمان۔ تُو کہہ دے! تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں

اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ

مگر دو خوبیوں میں سے ایک کی اور ہم امیدوار ہیں تمہارے حق میں کہ ڈالے تم پر اللہ کوئی عذاب

عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں، سو منتظر رہو ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔

تسہیل: تنگی اور آسانی ہر حال میں نکل پڑو اور اپنے اموال اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے، کاش! تمہیں اس کا یقین آ جائے ○ اگر دنیا کا سامان آسانی سے ملنے کی اُمید ہوتی اور سفر بھی مشقت کے بغیر ہوتا تو وہ آپ کا ضرور ساتھ دیتے لیکن انہوں نے اس مسافت کو دور دراز کا جانا تو اب وہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے، یہ لوگ جھوٹ بول کر اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ قطعاً جھوٹے ہیں ○ اے میرے حبیب! اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے ان منافقوں کو پیچھے رہنے کی اتنی جلدی اجازت کیوں دے دی؟ آپ کچھ دیر انتظار کرتے تو آپ پر یہ واضح ہو جاتا کہ ان میں سے سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں ○ جو لوگ واقعی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی بھی آپ سے یہ اجازت نہیں مانگیں گے کہ انہیں اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کرنے سے مستثنیٰ رکھا جائے اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے ○ اس قسم کی اجازت صرف وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں میں شک ہے اور وہ اسی شک کی وجہ سے تردّد کا شکار ہیں ○ اور اگر وہ آپ کے ساتھ چلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لیے کچھ تو تیاری کرتے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ان کے جانے کو پسند ہی نہیں کیا اس لیے انہیں اس کی توفیق ہی نہیں دی، اور ان سے کہہ دیا گیا کہ تم اپاہجوں کے ساتھ بیٹھے رہو ○ اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے درمیان فتنہ و فساد پھیلانے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کرتے اور فتنہ پردازی کی فکر میں دوڑے دوڑے پھرتے، اب بھی تمہارے درمیان ان کے جاسوس موجود ہیں اور ان ظالموں کو اللہ خوب جانتا ہے ○ یہ لوگ اس سے پہلے بھی فتنہ انگیزی کر چکے ہیں اور آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے اُلٹی سیدھی تدبیریں کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ سچا وعدہ پورا ہو کر رہا یعنی ان کے

ناک بھوں چڑھانے کے باوجود اللہ کے حکم کو غلبہ نصیب ہوا O ان میں ایسا شخص بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ مجھے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیجیے اور فتنے میں نہ ڈالیے، سن لو! فتنہ میں تو یہ لوگ پہلے ہی پڑے ہوئے ہیں اور جہنم ان کافروں کو گھیرے ہوئے ہے O اگر آپ کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو انہیں بُری لگتی ہے اور اگر کوئی مصیبت آپڑے تو آپس میں کہتے ہیں ہم نے پہلے سے اپنے بچاؤ کا سامان کرلیا تھا، یہ کہتے ہوئے وہ خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں O آپ ان سے فرمادیجیے کہ ہم پر صرف وہی مصیبت آسکتی ہے جو اللہ نے ہمارے مقدر میں لکھ رکھی ہے، وہی ہمارا حقیقی مالک ہے اور اللہ پر ہی مؤمنوں کو توکل کرنا چاہیے O آپ انہیں یہ بھی بتادیں کہ تم ہمارے لیے جس چیز کا انتظار کررہے ہو ہم اسے دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی سمجھتے ہیں، اور ہم تمہارے حق میں جس چیز کا انتظار کررہے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تمہیں خود سزا دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں دلواتا ہے، لہٰذا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کررہے ہیں O

تفسیر

﴿۴۱﴾......تمام مسلمانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ تنگی ہو یا آسانی، بڑھاپا ہو یا جوانی، صحت ہو یا بیماری، پیدل ہوں یا سوار، فقیر ہوں یا غنی، طبیعت میں نشاط ہو یا افسردگی، تمہاری تعداد تھوڑی ہو یا زیادہ ہر حال میں اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے نکل کھڑے ہو......"**خِفَافًا**"، "**وَثِقَالًا**" میں یہ سارے معانی آجاتے ہیں اور ان میں کوئی تضاد بھی نہیں۔{۱۰۹}

"یہی تمہارے حق میں بہتر ہے، کاش! تمہیں اس کا یقین آجائے" قرآن کے جو اوّلین مخاطب تھے انہیں واقعی یقین آگیا تھا کہ دینِ الٰہی کی سربلندی کے لیے نکلنا اور اس کے لیے مال و جان کی قربانی دینا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے چنانچہ وہ ہر قسم کی مشکلات اور اعذار کے باوجود نکل کھڑے ہوئے، نہ بڑھاپا اور بیماری ان کے عزم کو متزلزل کرسکی اور نہ ہی قلتِ تعداد، قلتِ وسائل اور گھریلو اعذار ان کے راستے میں رکاوٹ بنے چنانچہ انسانوں کے دل ان کے لیے کھل گئے اور زمین کی طنابیں ان کے لیے سکڑتی گئیں، عجیب لوگ تھے جن کے ہاتھوں عجائبات ظاہر ہوئے تھے، آج مسلمانوں کی کاہلی، کمزوری، عیش و عشرت اور دنیا اور اسبابِ دنیا کے ساتھ ان کی محبت دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ ان کی تاریخ میں ایسے اصحابِ ایثار اور جذبۂ جہاد سے سرشار لوگ بھی گزرے ہیں جنہیں دین کے لیے جہد و جہاد سے نہ

{۱۰۹} والصحیح اذالکل داخل فیه (کبیر ۱۶/۵۵)

بڑھاپے کی سردیاں روک سکیں نہ جوانی کی گرمیاں۔ وہ پُراسرار بندے قرآن کی تلاوت صرف ''قرآن خوانی'' کے لیے نہیں کرتے تھے بلکہ عمل کے لیے کرتے تھے چنانچہ یہ تلاوت انہیں عمل کے لیے بے چین کردیتی تھی۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: ''ہمارے ربّ نے ہمیں نکلنے کا حکم دیا ہے خواہ ہم بوڑھے ہوں یا نوجوان، لہٰذا مجھے جہاد کے لیے تیار کرو۔'' بیٹوں نے بصدادب عرض کیا: ''اباجان! آپ پر اللہ رحم فرمائے، آپ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئے، آپ نے حضرت ابوبکر کے ساتھ جہاد کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئے، اب تو ہم آپ کی طرف سے جہاد کریں گے'' لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بحری بیڑے میں چلے گئے، سمندر میں آپ کو موت نے آلیا، قریب میں کوئی جزیرہ نہ تھا جہاں انہیں دفن کیا جاتا، نو دنوں کے بعد جزیرہ ملا جہاں انہیں دفن کیا گیا، حیرت انگیز امر یہ تھا کہ ان نو دنوں میں ان کے جسم میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔

حیان بن زید شرعی سے روایت ہے کہ ہم صفوان بن عمرو کے ساتھ جہاد پر نکلے جو حمص کے گورنر تھے، میں نے مجاہدین میں دمشق کے ایسے بوڑھے کو دیکھا جس کی بھنویں اس کی آنکھوں پر گری ہوئی تھیں، میں نے ان سے کہا: ''چچا! آپ تو اللہ کے نزدیک معذور ہو، آپ نے اس بڑھاپے میں کیوں تکلیف کی؟'' بوڑھے مجاہد نے اپنی دونوں بھنویں اوپر کو اُٹھائیں اور کہا: ''بھتیجے! اللہ نے ہم سے ہر حال میں اپنی راہ میں نکلنے کا مطالبہ کیا ہے خواہ ہلکے ہوں یا بوجھل۔ یادرکھو! اللہ جس سے محبت کرتا ہے اسے آزمائش میں ڈالتا ہے، پھر اسے صحیح سالم واپس لاتا ہے لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے صرف اسی کو آزمائش میں ڈالتا ہے جو صبر وشکر اور ذکر کو لازم پکڑے اور اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرے۔'' {۱۱۰}

یہی وہ لوگ تھے جن کی قربانیوں کے نتیجے میں چاروں براعظموں میں اسلام کا پیغام پہنچ گیا تھا حالانکہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کو ابھی سو سال بھی نہیں ہوئے تھے۔

﴿وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ یہ حکم قرآن میں بار بار آیا ہے اور ہر جگہ مال کا ذکر پہلے اور جان کا ذکر بعد میں ہے کیونکہ جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے پہلے اموال کا خرچ کرنا ضروری ہے۔ میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے کے جو مراحل ہیں وہ انفاقِ مال کے بغیر طے نہیں ہوسکتے، جسے اللہ نے مال کے ساتھ صحتمند جسم سے بھی نوازا ہو اس پر دونوں کا جہاد میں لگانا ضروری ہے اور جس کے پاس ان میں سے ایک چیز ہو وہ اسے ہی پیش کردے،

{۱۱۰} کشاف ۲/۲۶۰

ابتداء میں مجاہدین اپنا ہی مال لگایا کرتے تھے، جب باری تعالیٰ نے مالِ غنیمت کی کثرت کی وجہ سے مسلمانوں کو خوشحالی عطا فرما دی تو پھر اسلامی حکومتیں پورے لشکر کی تیاری بیت المال سے کیا کرتی تھیں۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اگر تم جہاد کی حقیقت سمجھ لو تو تم جان لوگے کہ اللہ کی راہ میں نکلنے اور جہاد کرنے میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت کے فوائد پوشیدہ ہیں، آخرت میں رضاءِ الٰہی کا حقدار وہ ہوگا جو اس کے دین کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کا جذبہ رکھتا تھا اور دنیا میں بھی عزت اسی قوم کو ملتی ہے جو نہ صرف اپنا دفاع کر سکے بلکہ بوقتِ ضرورت شریر انسانوں کے خلاف اقدام بھی کر سکے۔

﴿۴۲﴾...... سچے مسلمانوں کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ جب انہیں جہاد و قتال کی دعوت دی گئی تو انہوں نے فوراً لبیک کہا لیکن منافقین نے ہر موقع پر ٹال مٹول سے کام لیا، وہ اللہ کے احکام کو بھی مادی نفع نقصان کی میزان میں تولنے کے عادی رہے ہیں، غزوۂ تبوک تو ویسے بھی بے پناہ مشکلات اور مصائب پر مشتمل تھا، سخت گرمی کا موسم، کھجوروں کی تیار فصل، سات سو کلومیٹر کا سفر، وسائل کی قلت، وقت کی سپر پاور سے ٹکراؤ...... منافقین نے جب پورے منظر پر نگاہ دوڑائی تو انہیں جھرجھری سی آ گئی اور وہ عین موقع پر حیلے بہانے تراش کر آقائے دو جہاں ﷺ سے گھر میں رہنے کی اجازت طلب کرنے لگے، کوئی اچانک بیمار پڑ گیا، کسی کو خیال آیا کہ گھر میں کوئی مرد نہیں اور کسی نے بوڑھے والدین اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی تنہائی کا عذر پیش کر کے اپنے آپ کو مستثنیٰ کروا لیا، آپ تو رؤف رّحیم تھے، کسی کو شرمندہ اور ذلیل کرنا آپ کو آتا ہی نہ تھا، جو کوئی عذر پیش کرتا آپ قبول فرما لیتے۔

اس آیت میں ان منافقین کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اگر انہیں آسانی سے مادی فوائد حاصل ہوتے نظر آتے اور سفر بھی ہلکا ہوتا تو یہ ضرور ساتھ دیتے مگر سفرِ تبوک کے تو تصور ہی سے ان کی جان نکلتی ہے اور بطور پیشین گوئی بتایا جا رہا ہے کہ جب آپ سفر سے واپس آ جائیں گے تو یہ قسمیں اُٹھا اُٹھا کر یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ ہم تو پوری طرح تیار تھے بس ناگہانی طور پر ایسی مجبوری پیش آ گئی کہ ہم جا نہ سکے۔

﴿يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ﴾ یہ جھوٹی قسمیں کھا کر {۱۱۱} اور جہاد سے جان چھڑا کر خود اپنے آپ ہی کو تباہ کر رہے ہیں۔

﴿۴۳﴾...... ﴿عَفَا اللَّهُ عَنكَ﴾ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک دعائیہ انداز میں کہ "اللہ آپ کو معاف کرے" دوسرا یہ کہ "اللہ نے آپ کو معاف کر دیا" دونوں صورتوں میں یہ محبت اور پیار کا انداز ہے کہ عتاب سے پہلے معافی کا

{۱۱۱} ای بهذا الحلف...... الخ۔ (نظم الدرر ۳/۳۲۳)

اعلان کردیا گیا، حضور اکرم ﷺ نے منافقوں کے جھوٹے عذرات قبول فرما کرانہیں گھر میں رہنے کی اجازت دے دی حالانکہ اگر آپ انہیں اجازت نہ بھی دیتے تو بھی وہ جہاد میں ہرگز نہ جاتے، یوں ان کے نفاق کا پردہ چاک ہوجاتا۔

﴿۴۴-۴۵﴾......ان دو آیتوں میں ایسے اصول اور صفات بیان کیے جارہے ہیں جن کی روشنی میں مؤمنوں اور منافقوں کو پہچانا جاسکتا ہے۔

جو لوگ اللہ پر ایمان اور آخرت کی جزا وسزا کا یقین رکھتے ہیں وہ جہاد سے پیچھے رہنے کے لیے عذرات تو کیا تلاش کریں گے وہ تو ''انفروا'' کے اعلان اور حکم کے انتظار میں رہتے ہیں اور حکم سنتے ہی نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ ''انسانوں میں سے بہترین معاش اس شخص کا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اپنے گھوڑے کی لگام تھامے تیار بیٹھا ہے، وہ جب بھی قتال کی پکار یا فریادرسی کی دعوت سنتا ہے تو وہ ایسی جگہ کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا جاتا ہے جہاں اسے قتل یا موت کا یقین ہوتا ہے۔{۱۱۲}

جہاد سے بچنے کے لیے وہ لوگ بہانے تراشتے ہیں جو نہ تو اللہ پر ایمانِ کامل رکھتے ہیں نہ انہیں آخرت میں اپنی قربانیوں کا صلہ ملنے کا یقین ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں دین کی حقیقت اور اس کے احکام پر پورا اطمینان ہوتا ہے بلکہ وہ تردّد اور تذبذب کا شکار ہوتے ہیں، آسان احکام میں تو وہ مسلمانوں کی موافقت کرتے ہیں مگر ایسے احکام جو مال اور جان کی قربانی کا تقاضا کرتے ہوں ان کی تعمیل سے بچنے کے لیے وہ جھوٹے اعذار پیش کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔

﴿۴۶﴾......منافق جھوٹ بولتے ہیں کہ ہمارا جہاد میں جانے کا ارادہ تو تھا مگر فلاں اور فلاں عذر پیش آجانے کی وجہ سے ہم اجازت مانگنے آئے ہیں اس لیے کہ اگر واقعی ان کا ارادہ ہوتا تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ تیاری تو کرتے جبکہ یہ تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

﴿وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ﴾ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی منافقت اور شرارت پسند طبیعت سے واقف ہے، اس لیے اللہ نے مخلص مجاہدین کے لشکر میں ان کی شمولیت کو پسند نہیں کیا، اور اپنے پیارے پیغمبر ﷺ کی زبان سے انہیں کہلوادیا کہ تم بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں اور خواتین کی طرح گھروں میں بیٹھ رہو۔{۱۱۳}

{۱۱۲} ابن ماجه، باب العزلة، صفحه ۲۸۶

{۱۱۳} أى الذين شأنهم ذلك كالمرضى والزمنى والصبيان والنساء۔ (نظم الدرر ۳/ ۳۲۸، روح المعانی ۶/ ۱۶۱، قرطبی ۸/ ۱۴۲)

﴿۴۷﴾......اے مسلمانو! ان منافقوں کا تمہارے ساتھ نہ جانا ہی بہتر تھا اس لیے کہ اگر یہ تمہارے ساتھ چلے جاتے تو پورے لشکر میں بزدلی اور فتنہ وفساد پھیلانے کی کوشش کرتے کیونکہ بعض اوقات چند گنے چنے بزدل اور سازشی پوری فوج کو بزدل بنادیتے ہیں، غزوۂ تبوک میں ایسا ہو چکا ہے جب ابتداء میں چند منافق میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے پھر چند ضعیف الایمان مسلمانوں نے ان کی اتباع کی اس کے بعد پورے لشکر میں اضطراب اور بزدلی پھیل گئی۔

﴿وَفِيكُمْ سَمّٰعُونَ لَهُمْ﴾ اور تمہارے اندر اب بھی ان کے جاسوس موجود ہیں {۱۱۴} اس لیے تمہیں چوکنا رہنا ہوگا۔

اس جملے کا دوسرا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ تمہاری صف میں ایسے ضعیف الایمان افراد موجود ہیں جو منافقوں کی باتوں پر کان دھرتے ہیں اور سابقہ تعلقات کی وجہ سے ان کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ {۱۱۵}

﴿وَاللّٰهُ عَلِيمٌۢ بِالظّٰلِمِينَ﴾ اللہ ظالموں کے نام بھی جانتا ہے، ان کے کام بھی جانتا ہے اور ان کے عزائم پر بھی اس کی نظر ہے۔

﴿۴۸﴾......منافقوں کی جانب سے فتنہ وفساد پھیلانے کی کوشش پہلی بار نہیں ہوئی اس سے پہلے بھی یہ بارہا مسلمانوں میں افتراق وانتشار پھیلانے اور اسلام کی دعوت کو ناکام بنانے کی کوشش کر چکے ہیں، ان کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تھے، ان کا داغدار ماضی ان کی بدفطرتی پر گواہ ہے، ان کی بہت ساری شرارتوں میں سے غزوۂ احد کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تین سو افراد کو ساتھ لے کر راستے سے جدا ہو گیا تھا۔

﴿حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ﴾ منافقوں کی تدبیروں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ فتحِ مکہ کی صورت میں مسلمانوں کو واضح غلبہ نصیب نہیں ہو گیا، اس غلبے کو بھی وہ دل سے ناپسند ہی کرتے رہے۔

﴿۴۹﴾......منافقوں نے جس قسم کے اعذار پیش کر کے جہاد سے جان بچائی ان میں سے ایک مضحکہ خیز عذر وہ تھا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، جب ہمارے آقا ﷺ نے غزوۂ تبوک کے لیے جانے کا ارادہ کیا تو بنوسلمہ کے بھائی جد بن قیس سے پوچھا کہ رومیوں کے ساتھ جہاد کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟ تو اس نے جواب دیا ''سب لوگ جانتے ہیں کہ میں عورتوں کے بارے میں کمزور واقع ہوا ہوں، میں جب بنو اصفر (رومیوں) کی

{۱۱۴} أی نمامون یسمعون حدیثکم لینقلوہ إلیہم۔ (کشاف ۲/ ۲۶۴)

{۱۱۵} تفسیر منیر ۱۰/ ۲۳۸

عورتوں کو دیکھوں گا تو اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکوں گا اور فتنے میں پڑ جاؤں گا لہٰذا مجھے تو گھر میں رہنے کی اجازت دے دیجیے اور فتنے میں نہ ڈالیے۔'' آپ نے اس سے منہ پھیرتے ہوئے فرمایا: ''جاؤ! میں نے تمہیں اجازت دی'' {۱۱۶} اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اللہ فرمارہے ہیں کہ یہ لوگ فتنہ سے بچاؤ کی بات کرتے ہیں حالانکہ اس قسم کی باتیں کر کے یہ فتنہ میں پڑ چکے ہیں۔

﴿وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌۢ بِالْكَـٰفِرِينَ﴾ دوزخ کا عذاب تو آخرت میں ہوگا اور اس میں داخل کیا جانے والا انسان چاروں طرف سے اس کے شعلوں میں گھرا ہوگا، مگر مستقبل کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن اس واقعے کو یوں بیان کرتا ہے گویا کہ یہ پیش آچکا ہے {۱۱۷} اور منافق ہر جانب سے شعلوں میں گھر چکے ہیں اور ان کے فرار کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔

﴿۵۰﴾......ان منافقوں کی بد باطنی اور کم عقلی کی انتہا یہ ہے کہ اگر انہیں مسلمانوں کو حاصل ہونے والی کسی کامیابی، بھلائی اور غنیمت کی اطلاع ملتی ہے تو وہ رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئے تو انہیں دوہری خوشی ہوتی ہے، مسلمانوں کو مصیبت پہنچنے کی خوشی الگ اور اپنے بچ جانے کی خوشی الگ۔ وہ ایک دوسرے کو خوش ہو کر بتاتے ہیں کہ ہم نے اپنے بچاؤ کی تدابیر اختیار کر لی تھیں اس لیے بچ گئے ورنہ ہم بھی پھنس جاتے۔

﴿۵۱﴾......جبکہ ایک سچے مؤمن کی سوچ یہ ہوتی ہے جس کا وہ برملا اظہار بھی کرتا ہے کہ جو برائی یا بھلائی اللہ نے ہمارے مقدر میں لکھ دی ہے وہ بہر صورت ہمیں پہنچ کر رہے گی، یہ سوچ مسلمان کے قدم ڈگمگانے نہیں دیتی اور اسے ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رکھتی ہے، مشکلات اور قربانیوں کو بھی وہ غلبۂ حق کے لیے ہونے والی جنگ اور جہاد کا حصہ سمجھتا ہے، اسے یقین ہوتا ہے کہ بالآخر فتح اہلِ حق ہی کو حاصل ہوگی، وہ صرف اللہ کو اپنا حامی و ناصر سمجھتا ہے اور اسی پر توکل کرتا ہے۔

﴿۵۲﴾......اے منافقو! تم ہمارے بارے میں دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی کا انتظار کر رہے ہو، اگر ہمیں فتح نصیب ہوئی تو یہ بھی کامیابی ہے اور اگر ہم شہادت پا گئے تو اس سے بڑا مقام کوئی نہیں ہے۔

اور ہم بھی تمہارے بارے میں دو باتوں میں سے ایک کا انتظار کر رہے ہیں، یا تو اسی دنیا میں تم ہمارے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو گے جس طرح سارے اہلِ باطل ذلیل و خوار ہوتے ہیں ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہے، اس سے تو کوئی کافر اور منافق بچ نہیں سکے گا۔

{۱۱۶} ابنِ کثیر ۴۷۵/۲

{۱۱۷} قیل ان اسباب تلک الاحاطة حاصلة فی الحال (کبیر ۶۶/۶، روح المعانی ۱۶۵/۶ بتغیّر)

حکمت وہدایت

۱......جب خلیفۃ المسلمین نفیرِ عام کا اعلان کردے تو ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر جہاد واجب ہو جاتا ہے، الّا یہ کہ اسے کوئی واقعی عذر درپیش ہو تو اسے گھر میں رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔(۴۱)

۲......جیسے جہاد بالنفس واجب ہے یونہی جہاد بالمال بھی واجب ہے۔(۴۲)

۳......حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھانے سے اللہ کا غضب اور عذاب نازل ہوتا ہے۔(۴۲) حضرت خیثمہ بن سلیمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جھوٹی قسمیں کھانے سے بستیاں ویران ہو جاتی ہیں۔'' {۱۱۸}

۴......قرآنِ کریم کے وجوہِ اعجاز میں سے ایک مستقبل کی پیشینگوئیاں بھی ہیں جیسے یہاں اللہ نے منافقوں کے بارے میں خبر دی کہ وہ قسمیں اُٹھائیں گے چنانچہ ایسے ہی ہوا۔(۴۲)

۵......محبّ اور محبوب کو بھی تنبیہ کرنا جائز ہے۔(۴۳)

۶......منافقوں کو اجازت دینے پر تنبیہ کرنے سے پہلے اللہ کی طرف سے معافی کا اعلان ہمارے آقا ﷺ کی تعظیم و تکریم پر دلالت کرتا ہے۔(۴۳)

۷......کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل خوب تحقیق کرنی چاہیے اور جلد بازی سے احتراز کرنا چاہیے۔(۴۳)

۸......واجبات کی ادائیگی سے پہلوتہی کے لیے رخصت کی اجازت طلب کرنا قطعاً نامناسب ہے۔(۴۳)

۹......جس کے دل میں واقعی ایمان وتقوٰی ہو وہ مال اور جان کی قربانی سے پیچھے نہیں رہتا۔(۴۴)

۱۰......جس کا دل ایمان کے بارے شکوک وشبہات کی آماجگاہ ہو وہ کبھی بھی قربانی کے لیے آمادہ نہیں ہوسکتا۔(۴۵)

۱۱......جو لوگ جہاد کے لیے مخلص ہوتے ہیں وہ وقت سے پہلے تیاری مکمل رکھتے ہیں۔(۴۶)

۱۲......لشکرِ اسلام میں منافقوں کی شرکت سے فتنہ وفساد کے سوا کسی خیر کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔(۴۷) لہٰذا ان سے بچ کر ہی رہنا چاہیے۔

۱۳......اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اہمیت رکھنے والے معاملات میں بہت زیادہ احتیاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔(۴۸)

۱۴......جھوٹ بولنے والوں کو اللہ رسوا کردیتا ہے اس لیے کہ اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے، لہٰذا کسی کو یہ دھوکہ نہیں ہونا

{۱۱۸} بحوالہ تفسیر منیر ۱۰/ ۲۳۲

چاہیے کہ میں اپنی ذکاوت وذہانت سے حقیقت چھپانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

۱۵......جو شخص کسی غرض کے لیے اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اسے وہ غرض بھی حاصل نہیں ہوتی، بعض منافقوں نے جہاد میں جانے سے اس لیے انکار کیا تا کہ وہ فتنہ سے بچ جائیں لیکن وہ مدینہ میں رہتے ہوئے بھی فتنہ میں پڑ گئے۔(۴۹)

۱۶......ایمان والوں کی تکلیف پر خوش ہونا اور ان کی خوشی پر رنجیدہ ہونا منافقت کی علامت ہے۔(۵۰)

۱۷......اس دنیا میں عزت اور ذلت، صحت اور بیماری، فتح یا شکست جو بھی معاملات پیش آتے ہیں یہ سب تقدیر میں لکھے جا چکے ہیں۔(۵۱)

۱۸......ایسی بات کہنا جائز ہے جس سے برسرِ پیکار دشمن کو تکلیف ہو۔(۵۲)

منافقوں کے اعمال کا ضیاع

﴿۵۳......۵۵﴾

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ

کہہ دے کہ مال خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہ ہوگا تم سے، بیشک تم نافرمان لوگ ہو۔

اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ

اور موقوف نہیں ہوا قبول ہونا ان کے خرچ کا مگر اسی بات پر کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور نہیں آتے

اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ

نماز کو مگر ہارے جی سے اور خرچ نہیں کرتے مگر برے دل سے۔ سو تو تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے، یہی چاہتا ہے

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

اللہ کہ ان کو عذاب میں رکھے ان چیزوں کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں اور نکلے ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں۔

تسہیل: اے پیغمبر! آپ ان منافقوں سے کہہ دیجیے تم چاہے خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، تمہارا خرچ کرنا ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ تم بلاشبہ نافرمان لوگ ہو ○ اور ان کی خیرات قبول ہونے سے اس کے سوا کوئی چیز مانع نہیں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ نماز ادا کرتے ہیں تو سستی اور کاہلی کے ساتھ اور نیک کام میں خرچ کرتے ہیں تو ناگواری کے ساتھ ○ اس قسم کے لوگوں کے اموال اور اولاد دیکھ کر تم تعجب نہ کرنا، بے شک اللہ یہ چاہتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے لیے دنیا میں بھی باعثِ عذاب ہوں اور ان کی جان نکلے تو اس وقت بھی وہ کافر ہی ہوں ○

شانِ نزول

پہلی آیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ نے جد بن قیس کو رومیوں کے مقابلے میں جہاد کی دعوت دی تو اس نے کہا تھا کہ میں کمزور آدمی ہوں، خواتین کو دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا لہٰذا مجھے معذور سمجھیں اور فتنے میں نہ ڈالیں البتہ میں مال کے ذریعے تعاون کر سکتا ہوں...... یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اگرچہ کوئی آیت کسی خاص واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہو مگر وہ اپنے شانِ نزول کے ساتھ خاص نہیں ہوگی بلکہ اس کا حکم عام ہوگا۔

﴿۵۳﴾...... یہاں بھی تمام منافقین سے خطاب کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ چاہے تم بظاہر خوشدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خرچ کرو یا ناگواری کے اظہار کے ساتھ، دونوں صورتوں میں تمہارا چندہ، صدقہ اور خیرات اس وقت تک قبول نہیں کیا جائے گا جب تک کہ تم اپنے دلوں کو ان شکوک و شبہات سے پاک نہیں کر لیتے جو دین کے معاملے میں پائے جاتے ہیں اور عدمِ قبول کی علت یہ ہے کہ تم ایمان کے دائرے سے خارج {۱۱۹} اور نافرمان لوگ ہو جبکہ صدقہ خیرات بلکہ ہر عبادت کی قبولیت کے لیے ایمان اور تقویٰ بنیادی شرط ہے، سورۂ مائدہ میں ہے:

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ {۱۲۰} ''اللہ تو بس تقویٰ والوں ہی سے قبول کرتا ہے۔''

﴿۵۴﴾......ان کی خیرات قبول نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

﴿وَلَا يَأْتُونَ الصَّلٰوةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى﴾ کسی کے ذہن میں اشکال پیدا ہو سکتا تھا کہ نماز پڑھنے اور صدقہ خیرات کی ادائیگی کے باوجود انہیں کافر کیوں کہا جا رہا ہے؟ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ محض دکھاوے کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں، اللہ کی رضا اور شریعت کا حکم سمجھ کر نہیں کرتے، نہ انہیں شرحِ صدر کی نعمت میسر ہے نہ طبیعت میں نشاط، نہ دل میں خشوع، نماز پڑھتے ہیں تو کسلمندی کے ساتھ اور شرعی مصارف پر خرچ کرتے ہیں تو قلبی ناگواری کے ساتھ، یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی جرمانہ اور تاوان ادا کر رہے ہیں، نہ انہیں دنیا میں اس کا کوئی فائدہ نظر آتا ہے نہ آخرت میں۔

{۱۱۹} ان انفقتم طائعین او مکرہین فلن یتقبل منکم ثمّ بیّن جلّ و عزّلم لا یقبل منہم فقال مامنعہم......الخ (قرطبی ۸/۱۴۶)

{۱۲۰} المائدة۵/۲۷

﴿۵۵﴾...... بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے لیکن درحقیقت قرآن کے ہر قاری اور سامع سے خطاب {۱۲۱} ہے کہ تم منافقوں کے پاس اموال اور اولاد دیکھ کر تعجب نہ کرنا کہ اللہ کے نافرمانوں اور بد باطنوں کو اتنے انعامات کس طرح حاصل ہو گئے، انہیں ان انعامات کا دیا جانا نہ تو اللہ کے راضی ہونے کی علامت ہے اور نہ ہی ان کے لیے باعثِ راحت و اطمینان ہے بلکہ اموال اور اولاد جو کہ اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی نعمتوں میں سے ہیں وہ منافقوں کے لیے عذاب سے کم نہیں۔

اوّل تو مال کمانے کے لیے بے پناہ مشقت، نہ اپنے تن بدن کی خبر نہ اہل و عیال میں دل بہلانے کی فرصت، پھر اگر حاصل ہو گیا تو اس کی حفاظت اور اسے بڑھانے کی فکر، پھر اگر کچھ مال ہاتھ سے جاتا رہا تو اس پر حسرت اور نا اُمیدی، یہی حال اولاد کا ہے، اگر وہ نافرمان ہو تو اس سے بڑا عذاب کوئی نہیں، بگڑی ہوئی اولاد انسان کی زندگی جہنم بنا دیتی ہے۔

ویسے عبداللہ بن ابی اور اس جیسے چند منافق ایسے تھے جن کی اولاد مخلص مسلمان تھی۔ وہ جب اپنی اولاد کو اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ سے بے پناہ محبت کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو انہیں سخت رنج ہوتا تھا، یہ سوچ کر بھی وہ پریشان ہو جاتے تھے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارا کمایا ہوا مال مسلمانوں کے مفادات میں خرچ ہوگا۔ {۱۲۲}

حکمت وہدایت

۱...... جیسے کفر و شرک، اعمال کو ضائع کر دیتے ہیں یونہی ریا اور دکھاوے سے بھی اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ (۵۳)

کافر اور مشرک کو نیک اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، آخرت میں اسے ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ابنِ جدعان زمانۂ جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا اور مساکین کو کھانا کھلاتا تھا، کیا اسے ان اعمال سے کوئی فائدہ ہوگا؟

آپ نے فرمایا: "کچھ بھی فائدہ نہیں ہوگا اس لیے کہ اس نے ایک دن بھی نہیں کہا: ربّ اغفرلی خطیئتی یوم الدین (اے میرے ربّ! قیامت کے دن میرے گناہ معاف فرما دینا) {۱۲۳}

۲...... ہر فاسق کو کافر نہیں کہا جا سکتا البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر کافر، فاسق ہوتا ہے۔ (۵۳)

{۱۲۱} ھذا الخطاب وان کان...... إلا ان المراد منہ کل المؤمنین۔ (کبیر ۶/۷۱)

{۱۲۲} ان کثیرا من المنافقین کان لھم اولاد اتقیاء...... الخ (کبیر ۶/۷۱)

{۱۲۳} مسلم/ ایمان/ ۳۶۵، مسند احمد ۶/۹۳

۳......نماز میں کاہلی اور غفلت منافقوں کی صفات میں سے ہے۔(۵۴) مسلمانوں کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ کہیں ان کی نماز منافقوں جیسی تو نہیں۔

۴......اللہ کی راہ میں جو کچھ دیا جائے خوشدلی سے دینا چاہیے۔(۵۴) بلکہ عطا کی توفیق ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

۵......اللہ کے باغیوں کے پاس جو بھی مال ومتاع ہے اسے استحسان کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔(۵۵)

۶......اموال اور اولاد کسی کے لیے دنیاوی عذاب کا اور کسی کے لیے اخروی عذاب کا سبب بن جاتے ہیں۔(۵۵)

۷......ایسے بدنصیب اور سنگدل والدین بھی ہوتے ہیں جو اولاد کو ہدایت کی راہ پر چلتا دیکھتے ہیں تو غیظ وغضب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔(۵۵)

منافقوں کی جھوٹی قسمیں اور طعن بازی

﴿۵۶......۵۹﴾

وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُم مِّنكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُونَ

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ بے شک تم میں ہیں اور وہ تم میں نہیں لیکن وہ لوگ ڈرتے ہیں تم سے۔ اگر وہ پائیں کوئی پناہ

مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ﴿۵۷﴾ وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ

کی جگہ یا غار یا سر گھسانے کو جگہ تو الٹے بھاگیں اسی طرف رسیاں تڑاتے۔ اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ تجھ کو طعن دیتے ہیں

فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴿۵۸﴾

خیرات بانٹنے میں، سو اگر ان کو ملے اس میں سے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو جبھی وہ ناخوش ہو جائیں۔ اور کیا اچھا

وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِينَا اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ

ہوتا اگر وہ راضی ہو جاتے اسی پر جو دیا ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے اور کہتے کافی ہے ہم کو اللہ، وہ دے گا ہم کو اپنے فضل

وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللّٰهِ رَاغِبُونَ ﴿۵۹﴾

سے اور اس کا رسول، ہم کو تو اللہ ہی چاہیے۔

تسھیل: یہ منافق قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم ہی میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ ڈرپوک لوگ ہیں ○ اگر ان لوگوں کو کوئی پناہ گاہ مل جاتی یا کوئی غار یا کوئی بھی چھپنے کی جگہ، تو وہ رسیاں تڑاتے ہوئے ادھر ہی بھاگ جاتے ○ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو صدقات کی تقسیم کے حوالے سے آپ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں

پھر اگر اس میں سے انہیں ان کی خواہش کے مطابق دے دیا جائے تو وہ خوش ہوجاتے ہیں اور اگر ان کی خواہش کے موافق نہ دیا جائے تو وہ ناراض ہوجاتے ہیں O اگر وہ اس پر راضی رہتے جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے انہیں دیا ہے اور یوں کہتے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور اللہ اپنے فضل سے اور اس کے پیغمبر اپنی مہربانی سے ہمیں اور دیں گے، ہم تو ہر حال میں اللہ ہی کی طرف متوجہ رہیں گے، تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا O

﴿۵۶-۵۷﴾...... ان دونوں آیتوں میں منافقت کا سبب بتایا جارہا ہے، منافق اگرچہ قسمیں کھا کر مسلمانوں میں سے ہونے کے دعوے کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں، اصل بات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے خوفزدہ ہو کر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں، اگر انہیں اپنے بچاؤ کے لیے کوئی قلعہ، کوئی جزیرہ، کوئی غار یا سرنگ مل جائے تو وہ وہاں پناہ لے لیں گے۔

قرآنِ کریم نے منافقوں کے دل میں بیٹھے ہوئے خوف کی جس طرح منظر کشی کی ہے اس سے بہتر منظر کشی لفظوں میں نہیں ہوسکتی۔

﴿۵۸﴾...... ایک طرف تو ان کے دلوں میں مسلمانوں کا یہ خوف تھا دوسری طرف وہ ضعیف الایمان مسلمانوں کی نظر میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کو مشکوک بنانے اور طعن و تشنیع کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ صدقات تقسیم فرمارہے تھے کہ ذوالخویصرہ تمیمی آگیا اور کہنے لگا ''اعدل یارسول اللہ'' (اے اللہ کے رسول عدل کیجیے) آپ نے فرمایا: ''تمہاری ہلاکت ہو اگر میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اُڑادوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو، اس کے ایسے ساتھی ہوں گے جن کی نماز اور روزے کے مقابلہ میں تم اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر سمجھوگے، وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر اپنے ہدف سے نکل جاتا ہے۔{۱۲۴}

اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

''ان منافقوں کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت مادی مفادات کی ہے، اگر انہیں چند سکے دے دیئے جائیں تو وہ خوش ہوجاتے ہیں اور اگر کچھ نہ دیا جائے تو وہ ناراض ہوجاتے ہیں۔''

﴿۵۹﴾...... حالانکہ اگر وہ صرف اسی پر قناعت کرتے جو کچھ انہیں دیا گیا تھا تو یہ ان کے لیے حرص و طمع اور طعن و تشنیع سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا۔

{۱۲۴} بخاری، تفسیر/ سورۃ ۱۰

حکمت وہدایت

۱......جھوٹی قسمیں کھانا منافقوں کا شعار ہے، حدیث میں ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں جب وہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے{۱۲۵} ہمارے زمانے میں اعتقادی منافق تو کہیں نظر نہیں آتے مگر مذکورہ نشانیاں اس قدر عام ہیں کہ ایسے افراد شاذ ونادر ملتے ہیں جو ان منافقانہ امراض سے محفوظ ہوں۔

۲......منافق سخت اضطراب اور خوف کی زندگی گزارتا ہے، اسے ہر وقت یہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کی حقیقت واشگاف نہ ہو جائے۔(۵۷)

۳......بزدلی، خوف اور کمزوری، کفر اور نفاق کے لوازم میں سے ہیں۔(۵۷)

۴......اللہ کے نیک بندوں پر طعنہ زنی قلبی فساد پر دلالت کرتی ہے۔(۵۸)

۵......منافقوں کو ایسے قول وعمل کی تلقین جو ان کی سعادت کا سبب بنے، اللہ کی رحمت پر دلالت کرتا ہے۔(۵۸)

۶......صرف مادی مفادات پر نظر رکھنا منافقت کی نشانی ہے لیکن جو شخص دینی مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دنیا طلب کرتا ہے وہ حق کا راستہ اختیار کرتا ہے۔(۵۸)

۷......آیت (۵۸) چار مراتب پر مشتمل ہے:

(الف) اللہ اور اس کے رسول کی عطا اور تقسیم پر راضی رہنا

(ب) زبان سے اللہ کی قضا اور عطا پر اپنی رضا کا اظہار کرنا

(ج) دنیا اور آخرت میں فضل الٰہی کی امید رکھنا

(د) عطا ہو یا محرومی ہر حال میں اللہ کی طرف متوجہ رہنا ایمان کی علامت ہے۔(۵۹)

{۱۲۵} بخاری، ایمان، ۲۸/شہادات، ۲۸/وصایا، ۸/ادب، ۶۹/مسلم، ایمان، ۱۰۷، ۱۰۸/ترمذی، ایمان، ۲۰

مصارفِ زکوٰۃ

﴿۶۰﴾

إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى

زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے

الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۶۰﴾

میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے رستہ میں اور راہ کے مسافر کو ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

ربط: جب منافقوں نے صدقات کی تقسیم کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ کو تنقید کا نشانہ بنایا تو صدقات کے مصارف بیان کرتے ہوئے ان پر یہ بات واضح کردی گئی کہ حقیقی مستحق یہ لوگ ہیں، تم نہیں ہو۔

تسہیل: صدقات تو صرف غریبوں، مسکینوں اور ان کارکنوں کے لیے ہیں جو ان کی وصولی پر متعین ہیں اور ان کے لیے ہیں جن کی دلجوئی منظور ہو اور غلاموں کی گردنیں چھڑانے اور قرضداروں کے قرض ادا کرنے اور اللہ کے دین کی سربلندی میں مصروف لوگوں اور مسافروں کی مدد کرنے میں یہ مال خرچ کرنا چاہیے، یہ مصارف اللہ کی طرف سے طے شدہ ہیں اور اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے ٥

﴿تفسیر﴾

﴿۶۰﴾...... اس آیتِ کریمہ میں صدقات کے مصارف بیان کیے گئے ہیں۔ صدقات، صدقہ کی جمع ہے، لغت میں اس مال کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے لیے خرچ کیا جائے، صدقہ کا لفظ صدق سے ماخوذ ہے، صدقہ کو صدقہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے دینے والے کے قول وفعل میں سچا ہونے پر دلالت کرتا ہے گویا خرچ کرنے میں اس کی کوئی ذاتی غرض نہیں بلکہ صرف رضاءِ الٰہی اس کے پیشِ نظر ہے، ویسے حدیث میں مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر صدقہ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ مثلاً راستے سے پتھر ہٹا دینا، بیمار کی عیادت کرنا، غمزدہ کی دلجوئی کرنا، مسلمان سے مسکرا کر ملنا، بوجھ اُٹھانے میں کسی کی مدد کردینا ان سب کو حدیث میں صدقہ کہا گیا ہے لیکن زیرِ نظر آیت میں صدقات کا لفظ جو استعمال ہوا ہے اس کے بارے میں اُمت کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے جو کہ محض نفلی صدقہ اور رضاکارانہ چندہ نہیں ہے جس کا دینا یا نہ دینا مسلمان کی مرضی پر موقوف ہو بلکہ یہ حتمی فریضہ ہے جس کی ادائیگی طے شدہ شرائط پائے جانے کی صورت میں ہر کلمہ گو پر واجب ہے۔

کسی نہ کسی انداز میں تمام آسمانی مذاہب میں زکوٰۃ کا تصور رہا ہے، بنی اسرائیل سے اللہ نے جو عہد لیا تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ {۱۲۶} ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا:

وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ {۱۲۷} — اور اللہ نے مجھے زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔

قرآنِ کریم میں اکثر مقامات پر نماز اور زکوٰۃ دونوں کو اکٹھے ذکر کیا گیا ہے، نماز حقوقِ الٰہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوقِ عباد میں سے ہے، ان دونوں کو اکٹھے ذکر کیے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے، روایاتِ حدیث، زکوٰۃ کی اہمیت کے حوالے سے بہت ساری ہیں، صرف دو یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع میں خطاب فرماتے ہوئے سنا، آپ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو جو تمہارا ربّ ہے، پانچ نمازیں پڑھو، ماہِ مبارک کے روزے رکھو، اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا کرو، اپنے امیر کی اطاعت کرو تو تم اپنے ربّ کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔'' {۱۲۸}

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بدّو نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جس کے کرنے سے میں جنّت میں داخل ہو جاؤں، آپ نے فرمایا ''اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کیا کرو اور رمضان کے روزے رکھو، اس نے کہا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں اس پر (اپنی طرف سے) اضافہ نہیں کروں گا، جب وہ واپس چلا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''جس کا دل چاہتا ہو کہ وہ کسی جنتی کو دیکھے، وہ اسے دیکھ لے۔ {۱۲۹}

زکوٰۃ مسلمان امراء سے لی جاتی ہے اور مسلم فقراء اور غرباء ہی میں تقسیم کی جاتی ہے، غیر مسلموں کو نفلی صدقات تو دیئے جا سکتے ہیں مگر زکوٰۃ کا دینا جائز نہیں۔ اصولاً یہ ذمہ داری اسلامی حکومت کی ہے کہ وہ زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام قائم کرے، اس مقصد کے لیے بیت المال قائم کیا جاتا ہے جو غریب، کمزور، معذور، بے روزگار اور بے سہارا بیمار

{۱۲۶} البقرۃ ۲/ ۴۳

{۱۲۸} ترمذی/ ۶۱۶

{۱۲۹} بخاری- الفتح ۳/ ۱۳۹۷، مسلم/ ۱۵

مسلمانوں کی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے، بے روزگاری الاؤنس کا تصور اسلام ہی نے دیا تھا جسے مسلمانوں نے فراموش کردیا اور غیر مسلموں نے اسے اپنالیا، زکوٰۃ کا مقصد گداگری کو فروغ دینا نہیں بلکہ اس کا سدِّ باب کرنا ہے، زکوٰۃ دینے والا کسی پر احسان نہیں کرتا بلکہ اس کے ذمہ فقراء کا ایک حق ہوتا ہے جسے وہ ادا کرتا ہے، قرآن میں ہے:

فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ {۱۳۰} ''اور ان کے اموال میں سوال کرنے والے اور نہ کرنے والے، دونوں کا متعین حق ہے۔''

زکوٰۃ کے مستحقین کی تفصیل اللہ نے خود بیان فرمادی ہے کیونکہ اگر زکوٰۃ کی تقسیم کو انسان کی صوابدید پر چھوڑا جاتا تو اس میں بدعنوانی کا سخت اندیشہ تھا اس لیے کہ ایک طرف تو انسان کی طبیعت میں مال کی اس قدر محبت ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، اسے ہروقت اپنا مال بڑھانے کی فکر لگی رہتی ہے خواہ وہ کسی بھی طریقے سے ہو چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے گداگری اور زکوٰۃ وصدقات کی وصولی کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے۔ دوسری طرف صدقات کی تقسیم میں اقرباء پروری کا بھی خطرہ تھا اس لیے باری تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف خود ہی بیان فرمادیے ہیں۔

حضرت زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر زکوٰۃ کا سوال کیا، آپ نے فرمایا: ''صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیرِ نبی کے بھی حوالہ نہیں کیا بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرمادیے ہیں، اگر ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں۔'' {۱۳۱}

زکوٰۃ کے مصارف درج ذیل ہیں:

(۱-۲)......لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ: بعض اہلِ علم، فقیر اور مسکین میں فرق نہیں کرتے بلکہ دونوں کو ایک ہی صنف شمار کرتے ہیں {۱۳۲} اور بعض حضرات دونوں میں فرق کرتے ہیں {۱۳۳} اور قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اگر ان میں کوئی فرق نہ ہوتا تو دونوں کو الگ الگ ذکر نہ کیا جاتا، ایک ہی کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا پھر کسی نے کہا فقیر اس خوددار انسان کو کہا جاتا ہے جو غربت کے باوجود کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے اور مسکین وہ ہے جو سوال کرنے پر مجبور ہوجائے اور بعض نے اس کے برعکس بھی کہا ہے۔ {۱۳۴}

{۱۳۰} المعارج ۷۰/ ۲۴-۲۵

{۱۳۱} ابوداؤد/ ۱/ ۲۳۷، باب من یعطی من الصّدقة وحدّ الغنی۔

{۱۳۲} ومن الناس من قال: لافرق بین الفقراء والمساکین......الخ (کبیر ۱۶/ ۸۲)

{۱۳۳} (حوالۂ مذکورہ) ظاهراللّفظ یدلّ علی ان المسکین غیرالفقیر، وانّهما صنفان۔ (قرطبی ۸/ ۱۵۴)

{۱۳۴} عن مجاهد: الفقیرالذی لایسأل والمسکین الذی یسأل ۔ (ابن کثیر ۲/ ۴۷۸)

لیکن حکمِ زکوٰۃ میں فقیر اور مسکین یکساں ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اس کی ضروریاتِ اصلیہ سے زائد نصاب کی مقدار میں مال نہ ہو اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، رہائشی مکان، استعمالی برتن، کپڑے اور فرنیچر یہ سب ضروریات میں شمار ہوتے ہیں۔

زکوٰۃ کا نصاب ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا ان کی قیمت ہے، وہ شخص جو صاحبِ نصاب تو نہیں مگر وہ صحت مند، مضبوط اور کمانے کے قابل ہو اسے اگر چہ زکوٰۃ دینا تو جائز ہے مگر اس کے لیے سوال کرنا حرام ہے۔ سرورِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿لاتحلّ المسئلة لرجل قویّ ولا لذی مرّة سویّ﴾ {۱۳۵} ''طاقت اور سکت والے اور صحیح سالم آدمی کے لیے بھیک مانگنا جائز نہیں۔''

(۳)...... وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا: عاملین ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کی جانب سے زکوٰۃ و صدقات کی وصولی اور ان کا حساب رکھنے کے لیے متعین ہوں۔ یہ لوگ اگر چہ مالدار ہوں ان کے لیے مالِ زکوٰۃ سے اپنی تنخواہ کا لینا جائز ہے۔ ارشادِ نبوی ہے کہ پانچ کے علاوہ کسی شخص کے لیے صدقہ حلال نہیں، ایک وہ شخص جو جہاد کے لیے نکلا ہو اور اس کے پاس بقدرِ ضرورت مال نہ ہو اگر چہ وہ گھر میں مالدار ہی کیوں نہ ہو، دوسرا صدقہ وصول کرنے والا عامل، تیسرا وہ شخص جس کے پاس اگر چہ مال تو ہو مگر وہ مالِ موجود سے زیادہ کا مقروض ہو، چوتھا وہ شخص جو کسی فقیر اور غریب کو پیسے دے کر اس سے مالِ زکوٰۃ خرید لے، پانچواں وہ شخص جسے کوئی مسکین انسان صدقہ کا مال بطورِ تحفہ کے دے دے۔ {۱۳۶}

حضرت ابنِ سعد مالکی کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مجھے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے متعین کیا میں جب اپنے کام سے فارغ ہو گیا اور زکوٰۃ لا کر آپ کے حوالے کر دی تو آپ نے مجھے وظیفہ ادا کرنے کے لیے کہا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ کام کسی معاوضہ کے لالچ میں نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے، آپ نے فرمایا جو کچھ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ لے لو، اس لیے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے عامل بنایا تھا، جب کام کے اختتام پر آپ نے مجھے محنتانہ دینا چاہا تو میں نے بھی وہی کہا تھا جو تم نے مجھ سے کہا ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''جب تمہیں سوال کے بغیر کچھ دیا جائے تو اسے کھا بھی سکتے ہو اور اسے صدقہ بھی کر سکتے ہو۔'' {۱۳۷}

{۱۳۵} ترمذی بحوالہ سیرۃ النبی، ص ۱۴۶، جلد ۵

{۱۳۶} (ابوداؤد ۱/ ۲۳۸، باب من یجوزله الصدقة، ابن ماجه ص ۱۳۲، باب من تحل له الصّدقة، ترمذی، کتاب الزکوٰة / ۲۲)

{۱۳۷} مسلم زکوٰة، ۱۱۲/ ابوداؤد، زکاة باب ۲۸/ النسائی، زکاة باب ۹۴/ مسند احمد ۱/ ۵۲

(۴)......وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ: یہ وہ لوگ تھے جن کی تالیفِ قلبی اور دلجوئی کے لیے انہیں صدقات دیئے جاتے تھے۔فقہاء نے لکھا ہے کہ ان میں مسلمان بھی شامل تھے اور غیر مسلم بھی، مسلمان کئی قسم کے تھے:

۱......وہ لوگ جو بظاہر ایمان قبول کر چکے تھے مگر متذبذب تھے، خطرہ تھا کہ دوبارہ کفر کی طرف نہ لوٹ جائیں جیسا کہ غزوۂ حنین کے موقع پر مالِ غنیمت میں سے مکہ کے نومسلموں کو حصہ دیا گیا بلکہ قدیم مسلمانوں سے زیادہ دیا گیا۔مقصد یہ تھا کہ وہ ایمان پر ثابت قدم رہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۲......وہ جو نومسلم بھی تھے اور حاجت مند بھی تھے۔

۳......وہ جو ایمان میں پختہ بھی تھے اور مالدار بھی تھے انہیں بھی بڑے بڑے عطیات دیئے گئے تاکہ ان کی قوم کے سرداروں کو ایمان قبول کرنے کی ترغیب ملے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عدی بن حاتم اور زبرقان بن بدر کو اسلام میں ثابت قدم ہونے کے باوجود صدقات دیئے تھے {۱۳۸} کیونکہ انہیں اپنی اپنی قوم میں نمایاں حیثیت اور مقام حاصل تھا۔

غیر مسلموں میں سے بعض تو وہ تھے جن کے شر سے بچنے کے لیے انہیں زکوٰۃ دی جاتی تھی، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اگر انہیں نوازا جاتا تو وہ اسلام کی اور آپ کی خوب تعریف کرتے تھے اور اگر انہیں منع کر دیا جاتا تو وہ مذمت کرتے تھے، ابوسفیان بن حرب، عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس اسی قسم کے لوگ تھے، ان میں سے ہر ایک کو ہوازن کے غنائم کی تقسیم کے موقع پر سوسو اونٹ دیئے گئے تھے۔ {۱۳۹}

علماء کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ غیر مسلموں کو کبھی بھی زکوٰۃ میں سے کچھ نہیں دیا گیا اور جتنی روایات اس سلسلہ میں نقل کی گئی ہیں وہ مالِ غنیمت کے بارے میں ہیں اور مالِ غنیمت کے خمس یعنی پانچویں حصہ میں سے غیر مسلموں کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ {۱۴۰}

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی مغلوبیت کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا تھا لیکن جب مادی اعتبار سے مسلمان مضبوط ہو گئے تو یہ حصہ ساقط کر دیا گیا، اگر بالفرض

{۱۳۸} تفسیر منیر ۱۰/۲۷۰

{۱۳۹} کبیر ۱۶/۸۵-۸۶، ابنِ کثیر ۲/۴۷۹

{۱۴۰} وصحح أنه عليه السلام يعطيهم من خمس......الخ (روح المعانی ۶/۱۷۸)، وامّا المؤلفة من المشركين فانّما يعطون من مال الفئ لامن الصدقات (كبير ۱۶/۸۶)

دنیا میں کبھی دوبارہ وہی حالات پیدا ہو جائیں جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھے تو مؤلفۃ القلوب والی مد دوبارہ بحال ہو جائے گی۔

عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس کے بارے میں آتا ہے کہ یہ دونوں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے زمین کا ایک ٹکڑا انہیں الاٹ کر دیا اور اس سلسلہ میں ایک خط بھی لکھ دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خط دیکھا تو اسے یہ کہتے ہوئے پھاڑ دیا کہ ہمارے آقا ﷺ تالیفِ قلبی کے لیے تعاون فرمایا کرتے تھے مگر اب اللہ نے اسلام کو عزت دے دی ہے اور تم جیسوں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، اگر تم اسلام پر ثابت قدم رہتے ہو تو فبھا ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی، یہ دونوں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس دوبارہ گئے اور ان سے سوال کیا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر ہیں؟ آپ نے خط دیا جبکہ عمر نے اسے پھاڑ دیا۔ آپ نے جواب دیا، کہ عمر کو ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ {۱۴۱} گویا آپ نے ان کے عمل کو درست قرار دیا اور صحابہ میں سے بھی کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ ساقط ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع تھا۔

اس روایت سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نظر میں اقرع اور عیینہ جیسے لوگوں کو مستقل نواز نا قرینِ مصلحت نہیں تھا مگر اس سے مؤلفۃ القلوب کا حصہ قیامت تک کے لیے ساقط ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

(۵)...... وَفِي الرِّقَابِ: (اور غلاموں کی گردنیں چھڑانے میں) یہاں ''رقاب'' کے بارے میں بحث کرنے سے پہلے اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے جو علامہ زمخشری نے بیان کیا ہے وہ یہ کہ پہلے چاروں مصارف ''حرفِ لام'' کے تحت آئے ہیں جبکہ بقیہ مصارف کے لیے ''حرفِ فی'' لایا گیا ہے، علامہ فرماتے ہیں کہ اس ادل بدل میں یہ بتانا مقصود ہے کہ آخری چار مصارف پہلوں کی بہ نسبت زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے نکات صحیح طور پر تو وہی سمجھ سکتے ہیں جو عربی زبان کی باریکیوں کو جانتے ہیں لیکن ہم نے اپنے قارئین کو متوجہ کرنے کے لیے اس نکتے کو بیان کرنا مناسب سمجھا ہے تا کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے وقت ان مصارف کی طرف اپنی توجہ خاص طور پر مبذول رکھیں۔

اب آیئے ''گردنیں چھڑانے'' کے مفہوم کی طرف، اکثر علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ غلام ہیں جن کے آقاؤں نے مال کی کوئی مقدار متعین کر کے کہہ دیا ہو کہ اگر تم ہمیں اتنا مال لا کر دے دو تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے اور

{۱۴۱} روح المعانی ۶/۱۷۷

وہ پوری قوت و طاقت اور محنت مزدوری کے باوجود یہ رقم ادا کرنے کے قابل نہ ہوسکیں تو ان کی مدد کی جائے گی تاکہ وہ آزادی حاصل کرسکیں۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام انسانوں کی آزادی کا سب سے بڑا حامی ہے، جتنے فضائل غلاموں کو آزاد کرنے کے اسلام میں بیان کیے گئے ہیں، اتنے دنیا کے کسی بھی مذہب میں بیان نہیں کیے گئے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اس کے باوجود اسلام کو غلامی کو رواج دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور کورچشمی دیکھیے کہ یہ الزام وہ لوگ لگاتے ہیں جو پوری دنیا کو اپنی غلامی کے شکنجوں میں جکڑنے کے منصوبے بنائے بیٹھے ہیں۔

رحمۃ للعالمین ﷺ نے بشارت سنائی کہ ''جو شخص مؤمن غلام کو خرید کر آزاد کرے گا اللہ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو دوزخ سے آزاد فرمائے گا۔'' {۱۴۲} یہ بشارت سن کر صحابہ میں ایسا جوش پیدا ہوا کہ ان میں سے بعض کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد سینکڑوں سے تجاوز کر گئی، حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تیس ہزار غلام خرید کر آزاد فرمائے۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ بے سہارا اور غریب قیدیوں کا تاوان ادا کر کے انہیں جیل سے رہائی دلانا بھی اسی مصرف میں شامل ہے۔

(۶)......وَالْغٰرِمِیْنَ: غارم اس مقروض کو کہا جاتا ہے جو قرض ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، البتہ بعض فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ یہ قرض اس نے کسی ناجائز کام کے لیے نہ لیا ہو، اگر وہ شراب نوشی، جوا بازی اور بدکاری کی وجہ سے زیر بار آگیا ہو تو مدِ زکوٰۃ سے اس کے ساتھ تعاون کرنا جائز نہیں ہوگا۔

(۷)......وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ: (اور اللہ کے راستے میں) اس سے مراد وہ مجاہدین ہیں {۱۴۳} جو اللہ کے دین کی سربلندی اور کفر و شرک کی بیخ کنی میں مصروف ہوں، اسی طرح وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو مگر اس کے پاس اب اتنا مال نہیں رہا جس سے وہ حج کا فریضہ ادا کرسکے، یونہی وہ علماء اور طلباء جو تعلیم و تعلم اور درس و تدریس میں مصروف ہیں مگر غربت و افلاس کی وجہ سے اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتے، یہ سب ''فی سبیل اللہ'' میں شامل ہیں۔ {۱۴۴}

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہو اور اس کی ادائیگی کے لیے مال کی

{۱۴۲} بخاری عتق باب ۱/ مسلم، عتق ۲۲-۲۵/ ترمذی، نذور، ۱۴

{۱۴۳} ای والمجاھدین (نظم الدرر ۳/ ۳۳۷)

{۱۴۴} ابن کثیر ۲/ ۴۸۰

ضرورت ہو مثلاً تعلیم و تبلیغ اور تصنیف و تالیف، تو مدّ زکوٰۃ سے اس شخص کے ساتھ بھی تعاون کیا جاسکتا ہے، {۱۴۵} ان تمام صورتوں میں اس شرط کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ متعلقہ شخص فقیر ہو اور مالِ موجود سے اپنی ضروریات پوری نہ کرسکتا ہو۔

(۸)...... **وَابْنِ السَّبِيلِ**: اس سے مراد وہ مسافر ہے جو اگرچہ اپنے ملک اور شہر میں مالدار ہو مگر زادِ سفر ختم ہو جانے کی وجہ سے سفر میں فقیر ہو جائے، ایسے شخص کو مالِ زکوٰۃ میں سے اتنا دیا جاسکتا ہے جس سے وہ سفر کی ضروریات پوری کرلے اور اپنے شہر میں واپس پہنچ جائے۔

﴿**فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ**﴾ آخر میں پھر تاکید کی جارہی ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت اور مصارف کی تعیین اللہ کی طرف سے ہے، اس میں کوئی شخص اپنی ذاتی رائے سے تبدیلی نہیں کرسکتا۔

﴿**وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ**﴾ اللہ اپنے بندوں کی مصلحتوں اور ضروریات کو خوب جانتا ہے اور اس کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

حکمت و ہدایت

اہلِ علم نے زکوٰۃ کی بہت ساری حکمتیں بیان کی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱......زکوٰۃ، تزکیۂ نفس کا بہترین ذریعہ ہے اور نفس کی پاکیزگی ایسی چیز ہے جو انبیاء کی بعثت کا اوّلین مقصد ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے:

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا {۱۴۶} ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر انہیں پاک صاف کر دیجیے۔

نفس کی بیماریوں میں سے ایک بڑی بیماری حبِّ مال ہے اور انفاق فی سبیل اللہ اس کا علاج ہے، اس سے دل کی قساوت کم ہوتی ہے اور رضاءِ الٰہی کی طلب میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲......دوسروں کے ساتھ احسان اور ان کی ضروریات کی تکمیل، اللہ کی صفات میں سے ہے اور ہمارے آقا ﷺ کا ارشاد ہے: "تخلقوا باخلاق الله" (اپنے اندر اللہ والی صفات پیدا کرو) {۱۴۷}

{۱۴۵} روح المعانی جلد ۱۰/۱۷۹

{۱۴۶} التوبة ۹/ ۱۰۳

{۱۴۷} تفسیر منیر/ ۱۰/ ۲۷۸

رسولِ اکرم ﷺ نے تعاون واحسان پر اتنا زور دیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر یہ جذبہ عام ہوگیا، ان میں سے جو اس کی استطاعت نہیں رکھتے تھے وہ بھی بازار جا کر مزدوری کرتے تھے تاکہ جو رقم ہاتھ آئے اس سے اپنے غریب اور معذور بھائیوں کی مدد کرسکیں۔

۳...... دنیا میں امیر اور غریب کی جنگ ہمیشہ سے ہے، آج اس جنگ کے شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھور ہے ہیں۔ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتے جارہے ہیں، پوری دنیا کے وسائل چند ملٹی نیشنل کمپنیوں اور افراد کے ہاتھوں میں سمٹتے جارہے ہیں، اگر اسلامی تعلیمات کے مطابق زکوٰۃ وصدقات کا نظام قائم کردیا جائے تو ان شعلوں کو بجھایا جاسکتا ہے اور اغنیاء اور فقراء کے درمیان حائل ہوجانے والی خلیج کو کم کیا جاسکتا ہے۔

۴...... زکوٰۃ تجارت کو ترقی دینے کا سبب بھی بن سکتی ہے، اس لیے کہ جب کسی بھی شخص کو ہر سال اپنے جمع کردہ سونا، چاندی، نقد رقوم اور ذخیرہ کی ہوئی چیزوں پر زکوٰۃ دینا پڑی گی تو وہ ضرور اسے تجارت میں لگائے گا تاکہ زکوٰۃ کی ادائیگی منافع سے کرے اور اس کا اصل سرمایہ محفوظ رہے۔

ماہرینِ معیشت طویل تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقتصادی اور تجارتی تنزلی کی بڑی وجہ سرمائے کا منجمد اور مال کا مدفون ہونا ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان نے چودہ سو سال پہلے زکوٰۃ فرض کرتے ہوئے یہ نکتہ بتا دیا تھا

''اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دنیا میں دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔'' {۱۴۸}

یہ دردناک عذاب آخرت میں تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا اس دنیا میں بھی مالیاتی بحران کی صورت میں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ وسائل کا چند ہاتھوں میں سمٹ جانا ہے۔

۵...... مال جو کہ ایک فانی اور زوال پذیر چیز ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی صورت میں اسے بقا مل جاتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے گھر میں کسی موقع پر بکرا ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا گیا، شام کو آپ تشریف لائے تو پوچھا: کچھ باقی بھی ہے؟ عرض کیا گیا، سب ختم ہوگیا سوائے پائے کے۔ آپ نے فرمایا سب باقی ہے سوائے پائے کے۔ {۱۴۹}

{۱۴۸} التوبۃ ۹/ ۳۴

{۱۴۹} ترمذی، قیامۃ، ۳۳/ مسند احمد ۶/ ۱۵۰

۶......اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے شکرِ منعم کی توفیق ملتی ہے اور منعم کا شکر ادا کرنا واجب ہے، ملائکہ اور انبیاء کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے، ایمان مضبوط ہوتا ہے، روحانیت میں ترقی ہوتی ہے، مصائب اور بیماریوں سے عافیت نصیب ہوتی ہے، رزق میں برکت ہوتی ہے۔

۷......زکوٰۃ وصدقات کے اہتمام سے جرائم کنٹرول میں آجاتے ہیں، اگر مسلمان اغنیاء اس اُمت کے غرباء پر خرچ نہیں کریں گے تو وہ چوری چکاری اور عصمت فروشی جیسے جرائم میں ملوث ہوجائیں گے بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ وہ مسلمانوں کے دُشمنوں کے ہتھے چڑھ کر ایمان ہی سے محروم ہوجائیں۔

۸......اسلام نے ایک طرف اغنیاء کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے تو دوسری جانب فقیروں کو سمجھایا ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ اس لیے کہ "الید العلیا خیر من الید السفلیٰ" (اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے) {۱۵۰}

اور جو لوگ محض مال جمع کرنے کے لیے بھکاری بن جاتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا کہ "قیامت کے دن ان کے چہرے پر گوشت کا لوتھڑا بھی نہیں ہوگا۔" {۱۵۱}

۹......زکوٰۃ کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد فلاحی معاشرہ کا قیام ہے جہاں کوئی بیمار علاج سے محروم نہ رہے، کسی بیروزگار کے بچے بھوک سے بلکتے اور تڑپتے نہ رہیں، انسان کو انسان کے سامنے ذلیل وخوار نہ ہونا پڑے، ہر ضرورت مند کی ضروریات گھر بیٹھے باعزت طریقہ سے پوری ہوتی رہیں۔

زکوٰۃ کی حکمتیں اور مقاصد بتانے کے بعد چند مسائل کا ذکر کرنا بھی مناسب ہے جو اس آیتِ کریمہ سے مناسبت رکھتے ہیں:

(۱) صدقاتِ واجبہ صرف انہی آٹھ مصارف میں خرچ کیے جائیں گے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں بیان فرمادیے ہیں، کسی بھی دوسرے مصرف میں ان کا خرچ کرنا جائز نہیں۔

(۲) زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ مستحق کو مالِ زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ دیا جائے، البتہ اگر مستحقین کسی شخص کو اپنا وکیل اور سرپرست ٹھہرالیں تو زکوٰۃ اس کے حوالے کردی جائے گی اور اس پر لازم ہوگا کہ وہ اس مال کو ان کے

{۱۵۰} بخاری، جلد ۱، کتاب الوصایا، باب تاویل قولہ من بعد وصیۃ......الخ/صفحہ ۳۸۴ وایضًا المجلّد الاوّل، کتاب الزکوٰۃ، باب لاصدقۃ الاّعن ظھر غنی......الخ/صفحہ ۱۹۲/ مسلم زکوٰۃ، ۹۴-۹۷/ ابوداؤد زکاۃ، ۲۸/ ترمذی زکاۃ ۳۸، زھد ۳۲

{۱۵۱} بخاری، ج ۱/ باب من سأل النّاس تکثّرا/ص ۱۹۹

کپڑے لتے، سامانِ خورد و نوش اور علاج معالجہ پر خرچ کرے۔

(۳) بلا ضرورت ایک ملک اور شہر کی زکوٰۃ دوسرے ملک اور شہر میں منتقل نہیں کرنی چاہیے البتہ اگر کسی شخص کے رشتہ دار غریب ہوں اور وہ کسی دوسرے شہر میں رہتے ہوں یا دوسرے ملک کے مسلمانوں میں زیادہ غربت ہو تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی منتقلی جائز ہے۔

(۴) اپنے قریبی عزیز اگر واقعی مستحق زکوٰۃ ہوں تو انہیں زکوٰۃ دینے میں دوہرا ثواب ہے، ایک ثواب صدقہ کا اور دوسرا صلہ رحمی کا، اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ اسے بتایا جائے کہ یہ مالِ زکوٰۃ ہے، البتہ یہ مسئلہ معلوم ہونے کے بعد ٹی وی، وی سی آر وغیرہ مالِ زکوٰۃ سے خرید کر تحفہ کے نام پر دینا بہر حال جائز نہیں۔ (ایسے بعض واقعات میرے علم میں آ چکے)

(۵) چوراہوں، بازاروں اور مسجدوں میں بھیک مانگنے والے پیشہ ور بھکاریوں کو نفلی صدقہ تو دیا جا سکتا ہے مگر فرض زکوٰۃ دینے میں احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ ان میں سے بعض خود صاحبِ نصاب ہوتے ہیں۔

(٦) اگر اللہ کے کسی بندے نے کسی شخص کو اپنے گمان کے مطابق مستحق سمجھ کر زکوٰۃ دی مگر بعد میں ثابت ہوا کہ وہ مالدار یا سید ہاشمی ہے تو زکوٰۃ ادا ہو گئی، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

منافقوں کی حرکتیں

﴿۶۱......۶۶﴾

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ۚ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ

اور بعضے ان میں بدگوئی کرتے ہیں نبی کی اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو کان ہے تُو کہہ! کان ہے تمہارے بھلے کے واسطے، یقین

بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۚ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ

رکھتا ہے اللہ پر اور یقین کرتا ہے مسلمانوں کی بات کا اور رحمت ہے ایمان والوں کے حق میں تم میں سے اور جو لوگ بدگوئی

رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ

کرتے ہیں اللہ کے رسول کی ان کیلئے عذاب ہے دردناک۔ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے آگے تاکہ تم کو راضی کریں

اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ

اور اللہ کو اور اس کے رسول کو بہت ضرور ہے راضی کرنا اگر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ کیا وہ جان نہیں چکے کہ جو کوئی مقابلہ کرے اللہ سے

وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ

اوراس کے رسول سے تو اس کے واسطے ہے دوزخ کی آگ، سدا رہے اس میں، یہی ہے بڑی رسوائی۔ ڈرا کرتے ہیں منافق اس

اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ

بات سے کہ نازل ہو مسلمانوں پر ایسی سورت کہ جتادے ان کو جو ان کے دل میں ہے تو کہہ دے! ٹھٹھے کرتے رہو، اللہ کھول کر رہے گا

مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ

اس چیز کو جس کا تم کو ڈر ہے۔ اور اگر تو ان سے پوچھے تو وہ کہیں گے ہم تو بات چیت کرتے تھے اور دل لگی، تُو کہہ! کیا اللہ سے

وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ

اوراس کے حکموں سے اوراس کے رسول سے تم ٹھٹھے کرتے تھے؟ بہانے مت بناؤ تم تو کافر ہو گئے اظہارِ ایمان کے پیچھے،

نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾

اگر ہم معاف کردینگے تم میں سے بعضوں کو تو البتہ عذاب بھی دینگے بعضوں کو اس سبب سے کہ وہ گنہگار تھے۔

ربط: منافقوں کی جہالتوں، حرکتوں اور ضلالتوں میں سے چند ایک کا بیان، گویا کہ اسی مضمون کا تسلسل جو پوری سورت میں پھیلا ہوا ہے۔

تسہیل: اوران منافقوں میں بعض ایسے ہیں جو اللہ کے نبی کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور آپس میں کہتے ہیں کہ یہ شخص کان کا کچا ہے۔ اے میرے پیغمبر! آپ ان سے فرما دیجیے کہ ہر بات خاموشی سے سن لینا تمہارے حق میں بہتر ہے آپ ﷺ تو وہ ہیں جو اللہ پر ایمان اور مخلص اہلِ ایمان پر یقین رکھتے ہیں اور تم میں سے ان لوگوں کے لیے اللہ کی خصوصی رحمت ہیں جو ایمان لائے اور جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے ○ اے مسلمانو! یہ تمہیں خوش کرنے کے لیے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ اگر یہ واقعی مؤمن ہوتے تو انہیں اللہ اوراس کے رسول کو خوش کرنے کی زیادہ فکر ہوتی ○ کیا یہ نہیں جانتے کہ جو شخص اللہ اوراس کے رسول کی مخالفت کرے گا اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا؟ اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے ○ منافقوں کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کو ان باتوں سے آگاہ کردے جو ان کے دلوں میں آپ فرما دیجیے تم مذاق کرتے رہو، اللہ اس چیز کو ظاہر کرکے رہے گا جس سے تم ڈرتے ہو ○ اگر آپ ان سے مذاق کے بارے میں سوال کریں تو وہ کہیں گے ہم تو یونہی دل لگی اور مذاق کر رہے تھے، آپ ان سے کہہ دیجیے کہ کیا تم اللہ کے ساتھ اوراس کی آیات اور رسولوں کے ساتھ مذاق کرتے ہو؟ ○ اب یہ فضول بہانے نہ بناؤ، تم نے دعویٰ ایمان کے بعد کفر کیا ہے، اگر ہم تم میں سے بعض کو قبولِ ایمان کی وجہ سے معاف بھی کردیں تو دوسروں کو ضرور سزا دیں گے اس لیے کہ وہ مجرم تھے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۶۱﴾......منافقین رسولِ اکرم ﷺ کو اذیت دینے اور بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، وہ دیکھتے تھے کہ آپ ہر کسی کی بات توجہ سے سنتے ہیں اور اس کے ظاہرِ حال کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں، نہ تو کسی کو جھوٹا کہہ کر شرمندہ کرتے ہیں اور نہ ہی بال کی کھال اُتارتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ آپ کے اس رویہ کو اخلاقِ کریمانہ پر محمول کرتے، آپس میں کہنے لگے کہ لگتا ہے محمد ﷺ کان کے کچے اور از حد سادہ انسان ہیں، قسم کھا کر جھوٹ بھی بول دیا جائے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔

﴿قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ﴾ فرمایا گیا کہ اللہ کا پیغمبر تمہارے لیے ''خیر کا کان'' ہے، شر کا نہیں، آپ سچے اور جھوٹے کو خوب پہچانتے ہیں مگر خلقِ عظیم کی وجہ سے کسی کو ذلیل نہیں کرتے، اس میں تمہاری بھلائی ہے ورنہ تم کسی کو منہ دکھلانے کے قابل نہ رہتے۔

﴿۶۲﴾......اے ایمان والو! ان منافقوں سے چوکنے رہو، جب ان کی منافقت اور جھوٹ کا پردہ تمہارے سامنے چاک ہو جاتا ہے تو پھر یہ تمہیں خوش کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ انسانوں کی حیثیت کیا ہے ایک مؤمن کی نظر میں سب سے اہم چیز اللہ اور اس کے رسول کی رضا ہوتی ہے۔

﴿۶۳﴾......یہ کیسے لوگ ہیں جو انسانوں کی ناراضگی اور ان کے ساتھ جنگ کرنے سے تو ڈرتے ہیں مگر اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنے سے نہیں ڈرتے۔

﴿۶۴﴾......اپنی حقیقت اور اپنے دلوں میں چھپی ہوئی غلاظت سے منافق خوب واقف ہیں اس لیے انہیں ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی ایسی سورت نہ نازل ہو جائے جو ان کی اصلیت کو واشگاف کر دے۔

﴿۶۵﴾......تفسیر کی کتابوں میں ایسے متعدد واقعات نقل کیے گئے ہیں جب منافقوں نے پسِ پردہ کوئی تکلیف دہ بات کہی اور بعد میں وہ اس سے پھر گئے یا اس کی الٹی سیدھی تاویل کرنے لگے، مثلاً ایک موقع پر کسی منافق نے کہا کہ یہ لوگ جو ہم سے زیادہ قرآن پڑھتے ہیں میرے خیال میں وہ پیٹ کے بارے میں زیادہ لالچی، بات میں ہم سے زیادہ جھوٹے اور جنگ کے وقت بزدل ہیں، یہ بات رسولِ اکرم ﷺ تک پہنچی، یہ منافق اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جب آپ سفر میں روانہ ہونے کے لیے ناقہ پر سوار ہو گئے تھے۔ اس منافق نے کہا: ''یا رسول اللہ! ہم تو گپ شپ لگا رہے تھے تو آپ نے فرمایا: کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے بارے میں گپ شپ لگا رہے

تھے؟{۱۵۲}

﴿۶۶﴾......منافقوں کی ہفوات جب نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوجاتیں تو وہ جھوٹے عذر تراشتے، ان سے کہا جارہا ہے کہ اب ان اعذار کا کوئی فائدہ نہیں، ممکن ہے تم میں سے خلوصِ دل سے توبہ کرنے والوں کو معاف کردیا جائے مگر محض ڈرامہ بازی کرنے والوں کو سزا مل کر رہے گی۔

حکمت وہدایت

۱......رسولِ اکرم ﷺ کو تکلیف دینا حرام ہے خواہ وہ کسی بھی طریقے سے ہو۔(۶۱)

۲...... ہمارے آقا ﷺ اخلاق کے بلندترین مرتبہ پر فائز تھے، اپنے مخالفوں کی بات بھی پوری توجہ اور سنجیدگی سے سنتے تھے۔(۶۱)

۳......حضورِ اکرم ﷺ ایمان والوں کے لیے خاص طور پر رحمت تھے اور ہیں۔(۶۱)

۴......منافق کو اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ انسانوں کو خوش کرنے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔(۶۲)

۵......منافق بڑا بزدل ہوتا ہے چنانچہ غضب اور انتقام سے بچنے کے لیے جھوٹی قسم کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔(۶۲)

۶......رضاءِ الٰہی کا طلب کرنا واجب ہے جس کی صورت یہ ہے کہ گناہوں سے بچا جائے اور اللہ کے پسندیدہ اعمال کیے جائیں۔(۶۲)

۷......اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کا انجام دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہیں۔(۶۳)

۸......جھوٹا اور منافق شخص اندیشوں اور وسوسوں سے کبھی نجات نہیں پاسکتا۔(۶۴)

۹......مذاق مذاق میں کلمۂ کفر کہنا بھی انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کردیتا ہے۔(۶۵)

۱۰......کفریہ ہفوات بکنے والے کا کوئی عذر قبول نہیں، اسے واضح طور پر توبہ کرنی ہوگی ورنہ وہ عبرتناک سزا کا مستحق ہوگا۔(۶۶)

۱۱......نفاق یا کفر سے بھی اگر کوئی توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔(۶۶)

{۱۵۲} ابن کثیر ۲/ ۴۸۲

منافقوں کے اوصاف اور ان کی اخروی جزا

﴿۶۷......۷۰﴾

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

منافق مرد اور منافق عورتیں سب کی ایک چال ہے سکھائیں بات بری اور چھڑائیں بات بھلی اور بند رکھیں اپنی مٹھی، بھول

الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾

گئے اللہ کو سو وہ بھول گیا ان کو، تحقیق منافق وہی ہیں نافرمان۔ وعدہ دیا ہے اللہ نے منافق مرد اور منافق عورتوں کو اور کافروں

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ

کو دوزخ کی آگ کا، پڑے رہیں گے اس میں، وہی بس ہے ان کو اور اللہ نے ان کو پھٹکار دیا اور ان کے لئے عذاب ہے

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ

برقرار رہنے والا۔ جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے تم سے زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال اور اولاد، پھر

قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ

فائدہ اٹھا گئے اپنے حصے سے پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصہ سے جیسے فائدہ اٹھا گئے تم سے اگلے اپنے حصہ سے اور تم بھی

كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ

چلتے ہو انہی کی سی چال، وہ لوگ مٹ گئے ان کے عمل دنیا میں اور آخرت میں اور وہی لوگ پڑے نقصان میں۔

اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ

کیا پہنچی نہیں ان کو خبر ان لوگوں کی جو ان سے پہلے تھے قوم نوح کی اور عاد کی اور ثمود کی اور قوم ابراہیم کی

مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ڏ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ۭ

اور مدین والوں کی اور ان بستیوں کی خبر جو الٹ دی گئی تھیں؟ پہنچے ان کے پاس ان کے

اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾

رسول صاف حکم لے کر، سو اللہ تو ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے۔

تسہیل: منافق مردوں اور منافق عورتوں سب کی حرکتیں ایک جیسی ہیں، یہ برائی کی تعلیم دیتے اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں، انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا بلاشبہ یہ منافق بڑے ہی نافرمان ہیں ○ اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ

رہیں گے وہ ان کے لیے کافی سزا ہے اور ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے O اے منافقو! تمہاری حالت ان کافروں جیسی ہے جو تم سے پہلے ہو چکے ہیں، وہ تم سے زیادہ طاقتور اور مال اور اولاد میں بھی تم سے بڑھ کر تھے انہوں نے دنیا میں اپنے حصے کے مزے لوٹ لیے اور تم نے بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹے جیسے انہوں نے لوٹے تھے اور تم بھی گناہوں میں ویسے ہی ڈوبے رہے جیسے وہ ڈوبے تھے، یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی لوگ ہیں خسارہ اُٹھانے والے O کیا انہیں ان لوگوں کے انجام کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے تھے؟ جیسے قومِ نوح، عاد اور ثمود اور قومِ ابراہیم اور مدین والوں اور ان بستیوں کے انجام کی خبر جو الٹ دی گئی تھیں، ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے مگر وہ سرکشی پر اڑے رہے چنانچہ انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ اس ہلاکت میں اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے O

﴿تفسیر﴾

﴿۶۸﴾......منافق کسی بھی جنس، کسی بھی علاقے اور زمانے کے ہوں، سب کی حرکتیں اور خصوصیات ایک جیسی ہوتی ہیں یعنی جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، خفیہ سازشیں کرنا، فتنہ وفساد پھیلانا، مال سے بے پناہ محبت کرنا، فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے ہاتھ روک کر رکھنا، وہ ایک دوسرے کو بھی ان بُرے کاموں کی ترغیب دیتے اور جہاد وانفاق جیسے نیک اعمال سے روکتے رہتے ہیں۔

﴿نَسُوا اللّٰهَ﴾ کفر ونفاق میں رسوخ کی وجہ سے وہ اللہ کو اور اس کے احکام کو بھول چکے ہیں، نہ اس کی رضا کی طلب نہ اس کے غضب کا ڈر، نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا، {۱۵۳} اسے یاد رکھنے کے جو فوائد ہیں وہ انہیں حاصل نہیں ہوں گے، نہ دنیا میں کوئی عزت نہ آخرت میں کوئی حیثیت، یہاں بھی بے وزن وہاں بھی بے وزن۔

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ عربی قاعدہ کے لحاظ سے معنی بنتا ہے کہ ''یہ منافق ہی فاسق ہیں'' فاسق تو دوسرے بھی ہیں مگر چونکہ سب سے بڑے فاسق منافق ہیں {۱۵۴} جن کے ظاہر اور باطن میں بڑا تضاد ہے اس لیے حصر کے ساتھ فرمایا گیا کہ ''منافق ہی فاسق ہیں۔''

{۱۵۳} انّهم تركوا أمره حتّى صار كالمنسيّ مصيّرهم بمنزلة المنسيّ......الخ(قرطبی ۸/ ۱۸۳)، ای فعل بهم فعل الناسی......الخ (نظم الدرر ۳/ ۳۴۴)

{۱۵۴} ای الكاملون فی التمرّد۔(روح المعانی ۶/ ۱۹۳)، هم الكاملون فی الفسق......الخ(كشاف ۲/ ۲۷۴، ابی سعود ۳/ ۱۶۷)

﴿۶۹﴾......ان منافقوں کے لیے آخرت میں دائمی عذاب ہوگا۔

﴿۷۰﴾......اے منافقو! تم کوئی انوکھی مخلوق نہیں ہو، تم سے پہلے بھی کافر اور منافق گزرے ہیں وہ مادی وسائل و اسباب اور اموال و اولاد میں تم سے بڑھ کر تھے اور اسی چیز نے انہیں فتنے میں ڈال دیا، لذت پرستی ان کی زندگی کا مقصدِ وحید بن کر رہ گیا، کل وہ لذت پرستی میں مبتلا تھے آج تم اسی بیماری میں مبتلا ہو فرق یہ ہے کہ ان کے پاس قوت و طاقت زیادہ تھی تمہارے پاس کم ہے، انہوں نے اللہ کی اتنی آیات نہ دیکھی تھیں نہ سنی تھیں جتنی تم دیکھ اور سن چکے ہو۔

﴿وَخُضۡتُمۡ﴾ خوض کے معنی گھسنے یادرآنے کے ہیں اور اس کا استعمال موقعِ ذم پر ہوتا ہے۔{۱۵۵}
ظاہری ٹیپ ٹاپ کے ساتھ بری عادتوں اور ناپاک خصلتوں میں گھسنے اور درآنے کی مثالیں دیکھنا ہوں تو آج بھی مہذب قوموں کے شفاخانوں محتاج خانوں، درس گاہوں کے پہلو بہ پہلوان کے نشاط خانے، شراب خانے، قمار خانے، ناچ گھر، اُن کے نگارخانے، اُن کے تھیٹر، اُن کے سینما اور اُن کے قحبہ خانے بلکہ ان کے ایک ایک گھر کے بیڈ روم (خواب گاہیں) دیکھ لیے جائیں {۱۵۶}

﴿أُوْلَٰٓئِكَ حَبِطَتۡ أَعۡمَٰلُهُمۡ﴾ اصل چیز اموال و اولاد نہیں، اعمال ہیں اور چونکہ منافقوں کے اعمال کی کوئی بنیاد نہیں اس لیے وہ دنیا میں بھی باطل اور آخرت میں بھی بے فائدہ ثابت ہوں گے۔

﴿۷۰﴾......کیا انہوں نے اپنے پیش رووں کی تاریخ نہیں پڑھی؟ قومِ نوح کی تاریخ جنہیں بادوباراں کے طوفان میں غرق کر دیا گیا، قوم عاد جنہیں تیز و تند ہوا نے اُٹھا اُٹھا کر پٹخا، قومِ ثمود جن کے کانوں کے پردے زبردست چنگھاڑ نے پھاڑ دیئے، قومِ ابراہیم کے سرکش لوگ جنہیں دیکھتے ہی دیکھتے ہلاکت نے آلیا، اصحابِ مدین جنہیں زلزلے نے اوندھے منہ گرا دیا، قومِ لوط جن کی بستیاں اُلٹ دی گئیں اور ان پر پتھروں کی بارش کر دی گئی۔

﴿فَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيَظۡلِمَهُمۡ﴾ ان میں سے کسی پر بھی اللہ نے ظلم نہیں کیا، وہ ظلم سے بہت دور ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے، ان کا کفر و انکار، فتنہ و فساد، ضد و عناد، جور و جفا، لذت اور شہوت پرستی، دولت و اقتدار پر گھمنڈ معاملات میں کمی بیشی اور اخلاقی تنزلی یہ سب اپنے اوپر ظلم کی صورتیں ہیں اور جو قوم ان بیماریوں میں مبتلا ہو جائے، اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس پر کسی نہ کسی انداز میں عذاب آ کر رہتا ہے، مکہ کے مشرکوں اور مدینہ کے منافقوں کے حق میں بھی یہ سنتِ الٰہیہ پوری ہو کر رہی، مشرکوں کے بڑے بڑے سردار بدر میں مارے گئے اور مدینہ کے منافقوں کو پہلے مدینہ سے اور پھر خیبر سے بصد ذلت و خواری جلاوطن ہونا پڑا۔

{۱۵۵} واکثر ما ورد فی القرآن، ورد فیما یذمّ (المفردات/ ۱۶۱)

{۱۵۶} تفسیر ماجدی ۲/ ۳۷۸

حکمت وہدایت

۱......منافقت انتہائی مہلک مرض ہے جن لوگوں کے اندر یہ مرض پایا جاتا ہو ان کی حرکتیں اور خصوصیات ہر زمان اور مکان میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔(۶۷)

۲......برائیوں کی ترغیب، بھلائیوں سے روک ٹوک اور بخل منافقوں کی نمایاں صفات ہیں۔(۶۷)

۳......جیسا عمل ہوتا ہے ویسی ہی اس کی جزاء ہوتی ہے، منافقوں نے اللہ کو بھلا دیا، اللہ نے انہیں بھلا دیا......اللہ تو بھولتا نہیں اس کے بھلانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے منافقوں کو اپنی رحمت سے محروم کردیا۔{۱۵۷}

۴......منافقوں کے لیے دو قسم کا عذاب ہوگا، دوزخ کی آگ کا عذاب اور عذابِ مقیم......اللہ ہی جانے اس کی نوعیت کیا ہوگی۔(۶۷)

۵......مال اور اولاد پر گھمنڈ ان عوامل میں سے ہے جن کی وجہ سے انسان قبولِ حق سے محروم رہتا ہے۔(۶۹)

۶......لذت پرستی، دنیا کو آخرت پر ترجیح اور ناپاک عادتوں میں گھستے چلے جانے کی وجہ سے اللہ کا عذاب آتا ہے۔(۶۹)

۷......انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ہلاک شدہ قوموں کا انجام دیکھنے کے باوجود شر و فساد میں انہی کی اتباع کرتا ہے۔(۶۹)

۸......سب سے زیادہ خسارہ میں وہ شخص ہے جس کے اعمال دنیا ہی میں ضائع ہوگئے۔(۶۹)

۹......تباہ شدہ قوموں کے حالات کا مطالعہ کرکے ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔(۷۰)

۱۰......گناہ کے بغیر اللہ کسی کو سزا نہیں دیتا کیونکہ وہ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔(۷۰)

مؤمنوں کے اوصاف اور ان کی جزا

﴿۷۱......۷۲﴾

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں، سکھلاتے ہیں

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ

نیک بات اور منع کرتے ہیں بری بات سے اور قائم رکھتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ

وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ

اور حکم پر چلتے ہیں اللہ کے اور اس کے رسول کے، وہی لوگ ہیں جن پر رحم کرے گا اللہ، بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

{۱۵۷} کبیر ۱۶/۹۷، کشاف ۲/۲۷۴، نظم الدرر ۳/۳۴۴، ابی سعود ۳/۱۶۷

وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً

وعدہ دیا ہے اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں کا کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں، رہا کریں انہی

فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

میں اور ستھرے مکانوں کا رہنے کے باغوں میں اور رضامندی اللہ کی ان سب سے بڑی ہے، یہی ہے بڑی کامیابی۔

ربط: قرآن کا معروف اسلوب ہے کہ وہ متضاد مضامین اور مناظر ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے، یہاں بھی وہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے، منافقوں کے بعد مؤمنوں کے اوصاف بیان کیے جا رہے ہیں۔

تسہیل: اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہیں، نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ عنقریب رحم فرمائے گا، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے○ اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں سے ایسے باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے ساتھ نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ان سدا بہار باغات میں ان کے لیے پاکیزہ مکانات ہوں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اللہ کی رضا حاصل ہوگی، یہی بڑی کامیابی ہے○

تفسیر

﴿۷۱﴾......قرآن نے منافقوں کے بارے میں یہ تو کہا ہے کہ وہ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں مگر قرآن یہ نہیں کہتا کہ ان کے درمیان اخوت اور ولایت کا رشتہ بھی پایا جاتا ہے کیونکہ منافقت کے ساتھ خلوص، محبت اور ایثار کا جمع ہونا ناممکن ہے، حد یہ کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے لیے بھی ولایت کا رشتہ ثابت کیا ہے مگر منافقوں کے لیے نہیں، اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا بیان کی جا سکتی ہے کہ یہ ایسی ذات کا کلام ہے جو انسانوں کی نفسیات اور ان کے مزاج سے خوب اچھی طرح واقف ہے، وہ لوگ جو اخلاص کے ساتھ کسی باطل مذہب کے ماننے والے ہوں ان کے درمیان بھی احسان و ایثار اور اخوت و محبت کا تعلق ہو سکتا ہے مگر منافقوں میں نہیں۔

مؤمن مرد ہوں یا عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے دوست، حامی اور مددگار ہوتے ہیں۔ ہمارے آقا ﷺ نے مؤمنوں کو اس عمارت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کے مختلف حصے اور بلاک ایک دوسرے کی مضبوطی کا سبب ہوتے ہیں {۱۵۸} اور انہیں اس جسم کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کے ایک عضو میں اگر تکلیف ہو تو پورا جسم بخار اور بے خوابی کا

{۱۵۸} بخاری، الفتح ۵،۶۰۲۶،۲۴۴۶/ مسلم ۲۵۸۵

شکار ہو جاتا ہے۔{۱۵۹}

سارے مؤمن ملک وملت کے دفاع، عدل وانصاف کے قیام، دین کی دعوت وتبلیغ اور انفرادی واجتماعی مسائل و ضروریات کے حل میں ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔

﴿يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ﴾ یہ اہلِ ایمان کی ایسی امتیازی صفت ہے جو انہیں نہ صرف منافقوں بلکہ تمام کفار سے ممتاز کرتی ہے، خود باری تعالیٰ نے اس صفت کو مسلمانوں کے لیے وجہِ فضیلت قرار دیا ہے، سورۂ آلِ عمران میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ {۱۶۰}

تمام امتوں میں تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کی اصلاح کے لیے پیدا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ﴾ اہلِ ایمان کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق تمام شرائط و آداب کا لحاظ کرتے ہوئے نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے ہیں اور ہر معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، جن کے اندر یہ صفات پائی جاتی ہیں وہ اللہ کی رحمت کے حقدار ہیں...... یہ جتنی بھی صفات بیان کی گئی ہیں منافقین کا معاملہ ان کے حوالے سے بالکل برعکس ہے۔ وہ نماز پڑھتے تو ہیں مگر قائم نہیں کرتے، مسلمان زکوٰۃ دیتے ہیں جبکہ منافق بخل کرتے ہیں، مسلمان اطاعت شعار ہیں جبکہ منافق ''فاسق'' ہیں یعنی اطاعت کا طوق گلے سے اتار پھینکنے والے، مسلمانوں پر اللہ کی رحمت جبکہ منافقوں پر اس کی لعنت ہوتی ہے۔

﴿إِنَّ اللهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ اللہ غالب ہے اس کے لیے اپنے وعدوں اور وعیدوں میں سے کسی بھی چیز کا پورا کرنا مشکل نہیں، عزیز ہونے کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے، ہر چیز کو اپنے مقام اور محل پر رکھتا ہے اور ہر فیصلہ حکمت ودانائی کے ساتھ کرتا ہے۔

﴿۷۲﴾......منافقوں کو دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے جبکہ مسلمانوں کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔

﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ أَكْبَرُ﴾ سب سے بڑی کامیابی اور نعمت جو مسلمانوں کو حاصل ہوگی وہ ہے اللہ کی رضا، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ عزّ وجلّ جنت والوں سے کہیں

{۱۵۹} بخاری، الفتح ۱۰/۱۰۱۱، ۶۰/ مسلم ۲۵۸۶

{۱۶۰} آل عمران ۳/۱۱۰

گے اے اہلِ جنت! وہ جواب میں کہیں گے "لبّیک ربنا وسعدیک والخیر فی یدیک" (اے ہمارے ربّ! ہم آپ کی خدمت کے لیے بار بار حاضر ہیں اور تمام بھلائیاں آپ کے دستِ قدرت میں ہیں) اللہ پوچھیں گے میرے بندو! کیا تم مجھ سے راضی ہو؟ بندے کہیں گے اے ہمارے ربّ! ہم آپ سے کیوں راضی نہ ہوں گے جبکہ آپ نے ہمیں وہ نعمتیں عطا کی ہیں جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں کیں، اللہ فرمائیں گے کیا میں تمہیں اس سے بھی بہتر چیز عطا نہ کروں؟ بندے عرض کریں گے یا ربّ! اس سے بہتر چیز کون سی ہو سکتی ہے، اللہ فرمائیں گے میں تمہارے لیے اپنی رضا کا اعلان کرتا ہوں اور آج کے بعد کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ {۱۶۱}

حکمت وہدایت

۱......اہلِ ایمان مرد ہوں یا خواتین، ایک دوسرے کے معاون اور محبّ ہوتے ہیں۔ (۷۱)

۲......امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ صلوٰۃ، اداءِ زکوٰۃ، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اہلِ ایمان کی نمایاں صفات میں سے ہیں۔ (۷۱)

۳......اللہ کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت اس کی رضا ہے۔ (۷۲)

۴......حقیقی کامیابی یہ ہے کہ انسان دوزخ سے نجات پا جائے اور جنت میں داخل ہونے کا حقدار بن جائے۔ (۷۲)

کفار اور منافقین سے جہاد

﴿۷۳......۷۴﴾

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ جَٰهِدِ ٱلْكُفَّارَ وَٱلْمُنَٰفِقِينَ وَٱغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ

اے نبی! لڑائی کر کافروں سے اور منافقوں سے اور تند خوئی کر ان پر اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے

وَبِئْسَ ٱلْمَصِيرُ ﴿٧٣﴾ يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ مَا قَالُوا۟ وَلَقَدْ قَالُوا۟ كَلِمَةَ ٱلْكُفْرِ وَكَفَرُوا۟

اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ ہم نے نہیں کہا اور بے شک کہا ہے انہوں نے لفظ کفر کا

بَعْدَ إِسْلَٰمِهِمْ وَهَمُّوا۟ بِمَا لَمْ يَنَالُوا۟ ۚ وَمَا نَقَمُوٓا۟ إِلَّآ أَنْ أَغْنَىٰهُمُ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ

اور منکر ہو گئے مسلمان ہو کر اور قصد کیا تھا اس چیز کا جو ان کو نہ ملی اور یہ سب کچھ اسی کا بدلہ تھا کہ دولتمند کر دیا ان کو اللہ

مِن فَضْلِهِۦ ۚ فَإِن يَتُوبُوا۟ يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۖ وَإِن يَتَوَلَّوْا۟ يُعَذِّبْهُمُ ٱللَّهُ

نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے، سو اگر توبہ کر لیں تو بھلا ہے ان کے حق میں اور اگر نہ مانیں گے تو عذاب دیگا ان کو

{۱۶۱} بخاری رقاق ۵۱، توحید ۳۸/ مسلم جنّۃ ۹/ ترمذی جنّۃ ۱۸ مسند احمد ۴/ ۸۸، ۹۵

عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٧٤﴾

اللہ عذاب دردناک دنیااورآخرت میں اورنہیں ان کا روئے زمین پر کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔

تسہیل: اے پیغمبر! کفاراور منافقین کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کریں اوران کے ساتھ سختی سے پیش آئیں، ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت بُری جگہ ہے O یہ منافق اللہ کے نام کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے ایسا نہیں کہا حالانکہ انہوں نے کلمۂ کفر کہا تھا اورانہوں نے اپنے ظاہری اسلام کے بعد کفر کا ارتکاب کیا تھا اورانہوں نے ایک اور کام کا بھی ارادہ کیا تھا جسے وہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے اورانہوں نے یہ اس بات کا بدلہ دیا کہ اللہ اوراس کے رسول نے انہیں اپنے فضل سے غنی کردیا تو اگر یہ توبہ کرلیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوگا اوراگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو اللہ انہیں دنیا اور آخرت میں المناک سزادے گا اوران کا روئے زمین پر نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار O

تفسیر

﴿۷۳﴾......حضورِ اکرم ﷺ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کی وجہ سے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی بشاشت کے ساتھ پیش آتے تھے، انتہائی ناموافق حالات میں بھی چہرۂ انور پر تبسّم رہتا تھا، منافقین کے ساتھ بھی آپ نرمی اور عفوو درگزر کا معاملہ رکھتے تھے، لیکن جب ان کی بدکلامی، شرارت اور خباثت حد سے بڑھ گئی تو آپ کو ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا اس لیے کہ صبر اور نرمی کی بھی ایک حد ہوتی ہے، حد سے زیادہ نرمی کا بھی نقصان ہوتا ہے۔

آیتِ کریمہ میں کفار اور منافقین دونوں کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا ہے، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کفار کے ساتھ تلوار سے اور منافقوں کے ساتھ زبان سے جہاد کیا جائے گا۔ {۱۶۲}

شانِ نزول

﴿۷۴﴾......اس آیت کے شانِ نزول میں جو متعدد واقعات نقل کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک انصاری تھا جس کا نام جُلاّس بن سوید تھا، اس نے غزوۂ تبوک کے موقع پر کہا کہ محمد ﷺ جو کچھ کہتے ہیں وہ اگر حق ہے تو ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں، جُلاّس کا لے پالک عمیر بن سعد مخلص مسلمان تھا، اس نے جُلاّس کو اس کلمۂ کفر سے توبہ کرنے کے لیے کہا اور خود حضورِ اکرم ﷺ کو بھی اس کی کافرانہ گفتگو کی اطلاع دے دی۔ آپ نے جُلاّس کو بُلا بھیجا، وہ قسمیں کھانے لگا کہ اللہ کی قسم یارسول اللہ! میں نے ایسا نہیں کہا، عمیر نے اپنی اطلاع کی سچائی پر قسم بھی کھائی اور ہاتھ اُٹھا کر دعا بھی کی کہ اے اللہ! آپ وحی کے ذریعہ اس معاملہ کی حقیقت اپنے پیغمبر پر واضح فرمادیں۔ اس کی دعا پر

{۱۶۲} وقال ابن عباس: امر اللہ تعالیٰ بجهاد الكفار بالسيف والمنافقين باللسان۔(ابنِ کثیر ۲/ ۴۸۷)

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے آمین کہی، ابھی یہ لوگ اپنی جگہ سے ہٹے بھی نہ تھے کہ بذریعہ وحی یہ آیت نازل ہوگئی، جلاّس نے یہ آیت سنی تو اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہوئے توبہ کرلی، بعد میں بھی یہ اپنی توبہ پر قائم رہے اور ان کے حالات درست ہوگئے۔{۱۶۳}

بعض روایات میں ہے کہ جب وحی نازل ہوئی تو رسولِ اکرم ﷺ نے عمیر کا کان پکڑ کر فرمایا:

﴿یاغلام وعت اذنک وصدقک ربک﴾{۱۶۴} ''اے لڑکے! تمہارے کانوں نے بات کو سنا اور تمہارے ربّ نے تصدیق فرمائی۔''

﴿وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا﴾ (انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے وہ کر نہ سکے) سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے، آپ کے حکم سے منادی نے اعلان کردیا کہ حضور تنگ گھاٹی سے گزرنے والے ہیں، اس سے کوئی دوسرا نہ گزرے، آپ کی سواری کی لگام حضرت حذیفہ کے ہاتھ میں تھی اور حضرت عمار اسے ہانک رہے تھے کہ اچانک کچھ لوگ نقاب پہنے ہوئے اپنی سواریوں پر آئے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت حذیفہ کو حکم دیا کہ انہیں روکو، انہوں نے اپنے نیزے سے ان کی سواریوں کو مارنا شروع کیا حتیٰ کہ ان کا رُخ پھیر دیا۔ اللہ نے ان پر رعب ڈال دیا، وہ یہ سمجھے کہ ہمیں حذیفہ نے پہچان لیا ہے چنانچہ وہ اپنی سواریاں بھگاتے ہوئے عام لوگوں کے ساتھ جا ملے۔

آپ نے حضرت حذیفہ سے پوچھا: ''کیا تم انہیں پہچانتے ہو؟'' انہوں نے عرض کیا: ''فلاں اور فلاں کو پہچانتا ہوں۔'' پھر آپ نے پوچھا: ''جانتے ہو ان کا کیا ارادہ تھا؟'' عرض کیا: ''اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''یہ مجھے گرانا چاہتے تھے۔'' عرض کیا: ''اگر آپ اجازت دیں تو ہم ان کی گردنیں اُڑا دیں۔'' آپ نے فرمایا:

﴿أکره ان یتحدث العرب عنا ان محمد علیه الصلاة والسلام قاتل بقوم حتی اذا اظهره الله تعالیٰ بهم أقبل علیهم یقتلهم﴾{۱۶۵} ''میں ناپسند کرتا ہوں کہ عرب ہمارے بارے میں یہ کہیں کہ محمد علیہ الصلاۃ والسلام نے کچھ لوگوں کے تعاون سے قتال کیا اور جب اللہ نے ان کی وجہ سے اسے غلبہ عطا کردیا تو انہی کو قتل کرنا شروع کردیا۔''

﴿وَمَا نَقَمُوا﴾ اسلام نے ان منافقوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جس کا وہ انتقام لیں، اگر کوئی زیادتی

{۱۶۳} روح المعانی ۶، الجزء العاشر/۲۰۱

{۱۶۴} بحوالہ تفسیرِ منار/۱۰/۴۸۰

{۱۶۵} حوالہ مذکورہ

ہوئی تو وہ صرف یہ تھی کہ یہ فقیر اور تنگدست تھے، اللہ اور اس کے رسول نے مالِ غنیمت عطا کر کے انہیں خوشحال کر دیا۔

﴿فَاِنْ يَّتُوْبُوْا﴾ منافقوں کی شرارتوں اور غلاظتوں کے باوجود ان کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، انہیں سمجھایا جا رہا ہے کہ توبہ کرنا تمہارے لیے دین اور دنیا ہر اعتبار سے بہتر ہوگا ورنہ یاد رکھو روئے زمین پر تمہارا کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا، اس لیے کہ جسے اللہ چھوڑ دے اور اس کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دے، اگر اس کی کوئی مدد کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔

حکمت وہدایت

۱......اسلامی جماعت قائم رکھنے اور اسلامی مملکت کا نظام چلانے کے لیے کبھی کبھی سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔(۷۳)

۲......جو شخص ایمان قبول کرنے کے بعد کلمۂ کفر کہے وہ مرتد ہو جائے گا۔(۷۴)

۳......گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے۔(۷۴)

۴......جو شخص کفر وفسق پر اصرار کرے حتیٰ کہ اسی حالت میں اسے موت آ جائے اس کے لیے شدید وعید ہے۔(۷۴)

بدعہدی کا انجام

﴿۷۵......۷۸﴾

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾

اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ عہد کیا تھا اللہ سے اگر دیوے ہم کو اپنے فضل سے تو ہم ضرور خیرات کریں اور ہو رہیں

فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا

ہم نیکی کرنے والوں میں۔ پھر جب دیا ان کو اپنے فضل سے تو اس میں بخل کیا اور پھر گئے ٹلا کر۔ پھر اس کا اثر رکھ دیا

فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا

نفاق ان کے دلوں میں جس دن تک کہ وہ اس سے ملیں گے، اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف کیا اللہ سے جو وعدہ اس سے

يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ

کیا تھا اور اس وجہ سے کہ بولتے تھے جھوٹ۔ کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ جانتا ہے ان کا بھید اور ان کا مشورہ، اور یہ کہ اللہ

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾

خوب جانتا ہے سب چھپی باتوں کو؟

تسہیل: ان منافقوں میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے ہمیں اپنے فضل سے نوازا تو ہم خوب صدقہ خیرات کریں گے اور نیک بن کر زندگی گزاریں گے ○ مگر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے مالدار کر دیا تو وہ کنجوسی کرنے لگے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ دور ہی ہوتے چلے گئے ○ ان کی اس بدعہدی اور اس کے ساتھ ساتھ جھوٹ بولنے کی عادت کی وجہ سے اللہ نے حشر کے دن تک ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا ہے ○ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ان کی خفیہ سرگوشیوں کو بھی جانتا ہے اور ان کے مشوروں کو بھی؟ اور یہ کہ اللہ غیب جاننے والا ہے ○

تفسیر

﴿۷۵-۷۸﴾......ان آیات کے شانِ نزول میں وہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ثعلبہ بن حاطب نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ میرے لیے اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ مجھے مال عطا فرمادے۔ آپ نے فرمایا: ''اے ثعلبہ! تم پر افسوس ہے، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ میرے جیسے رہو؟ اگر میں چاہتا تو میرا ربّ میرے ساتھ ان پہاڑوں کو چلا دیتا۔'' ثعلبہ نے اپنی درخواست دوبارہ دہرائی تو آپ نے فرمایا: ''ثعلبہ وہ تھوڑا مال جس کا تم شکر ادا کر سکو، اس مالِ کثیر سے بہتر ہے جس کا شکر ادا کرنا تمہارے بس میں نہ ہو۔'' ثعلبہ نے جب تیسری بار دعا کی درخواست کی تو آپ نے دعا فرمائی:

''اللّٰھم ارزقه مالا'' (اے اللہ! اسے مال عطا فرما)

ثعلبہ نے بکریاں خرید لیں، اللہ نے ان میں اتنی برکت دی کہ مدینہ کی زمین ان کے لیے تنگ پڑ گئی، وہ اس ریوڑ کو لے کر مضافات میں چلا گیا، دن کی نمازیں تو وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھ لیتا تھا مگر رات کی نمازوں میں حاضر نہ ہوتا، اس کے ریوڑ میں یوں اضافہ ہوا جیسے کیڑوں مکوڑوں میں اضافہ ہوتا ہے، اسے ریوڑ لے کر مزید دور جانا پڑا جس کی وجہ سے مسجدِ نبوی کی نمازیں تو چھوٹ ہی گئیں، جمعہ اور نمازِ جنازہ میں بھی حاضر ہونا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ رسولِ اکرم ﷺ کو جب اس کے مال کی کثرت اور مصروفیت کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا: ''ویح ثعلبة بن حاطب'' (افسوس ہے ثعلبہ بن حاطب پر) جب زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ثعلبہ کی طرف دو نمائندے بھیجے، اس نے زکوٰۃ کی تفصیل دیکھ کر کہا: ''ماھذا الا جزیة'' (یہ تو ٹیکس کے سوا کچھ نہیں) جب یہ دونوں عامل مدینہ واپس آئے تو ان کے جواب دینے سے پہلے انہیں دیکھتے ہی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ویح ثعلبة بن حاطب'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ثعلبہ کے رشتہ داروں نے یہ آیت سنی تو جا کر اسے بُرا بھلا کہا کہ تمہارے بارے

میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، وہ اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری زکوٰۃ قبول کرنے سے منع کر دیا ہے۔'' وہ رونے لگا اور سر پر مٹی ڈالنے لگا، مگر اس کے باوجود آپ نے اس کی زکوٰۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نبی کریم ﷺ کی رحلت کے بعد وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑی لجاجت سے اپنا صدقہ قبول کرنے کی درخواست کی مگر انہوں نے فرمایا کہ جو صدقہ میرے آقا ﷺ نے قبول نہیں فرمایا، میں وہ کیسے قبول کر سکتا ہوں؟ پھر وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کی خدمت میں آیا اور پہلے سے بھی زیادہ لجاجت کے ساتھ اور کچھ معززین کو سفارشی بنا کر صدقہ قبول کرنے کی درخواست کی مگر انہوں نے دوٹوک جواب دیا کہ جس صدقہ کو میرے آقا ﷺ اور ان کے خلیفۂ اوّل نے رد فرما دیا، میں اسے قبول کرنے کی کیسے جسارت کر سکتا ہوں؟ پھر سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کا انتقال ہو گیا۔{۱۶۶}

دو اشکال

یہ قصہ اکثر تفسیروں میں ثعلبہ بن حاطب ہی کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے، مگر بعض اہلِ علم نے اس کے بارے میں اشکالات ظاہر کیے ہیں جن میں سب سے مضبوط اشکال یہ ہے کہ ثعلبہ بدری اور انصاری صحابی ہیں اور اصحابِ بدر کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ایمان کی گواہی دی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر حضرت عمر سے فرمایا تھا:

"ومّا یدریک لعلّ اللہ اطّلع علی اھل بدر فقال اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم."{۱۶۷}	"تمہیں کیا خبر، اُمید ہے کہ اللہ نے اہلِ بدر کے جہد و ایثار کو دیکھ کر فرما دیا ہو کہ تم جو چاہو کرتے رہو میں تمہیں معاف کر چکا۔"

اللہ کی طرف سے یہ اعلان گویا اہلِ بدر کے ایمان و استقامت پر اعتماد کا اظہار ہے کہ اب یہ کفر و فسوق سے اتنے متنفر ہو چکے کہ یہ کسی کھلی ہوئی معصیت کا ارتکاب نہیں کر سکتے اور واقعی وہ اللہ کے اعتماد پر پورے اُترے۔

اصحابِ بدر کی اس فضیلت کی بناء پر علماء کی ایک جماعت نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ مذکورہ بالا آیات

{۱۶۶} ابن کثیر ۲/ ۴۹۰-۴۹۱، کبیر ۶/ ۱۰۵-۱۰۶، روح المعانی ۶/ ۲۰۸-۲۰۹

{۱۶۷} بخاری، تفسیر، سورۃ ۶۰/ مسلم، جہاد، باب ۹۸/ ترمذی، تفسیر، سورۃ ۶۰/ مسند احمد ۲/ ۱۰۶

ثعلبہ بدری کے بارے میں نازل ہوئیں، ثعلبہ کے بجائے نبتل بن حارث، جدّ بن قیس اور معتّب بن قشیر وغیرہ کو ان آیات کا مصداق قرار دے دیا گیا ہے۔ {۱٦۸}

دوسرا اشکال یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ کسی بھی توبہ کرنے والے کے ظاہرِ حال کا اعتبار کرتے ہوئے اس کی توبہ قبول کرلی جائے، یہ صاحب جوروتے ہوئے آئے، اپنے سر پر خاک بھی ڈالی اور توبہ کرتے ہوئے صدقہ بھی پیش کیا، ان کا صدقہ اور ان کی توبہ کیوں قبول نہ کی گئی؟

اس اشکال کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ جن صاحب کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں ان کے بارے میں خصوصی طور پر حضورِ اکرم ﷺ کو بتا دیا گیا تھا کہ اس شخص کو منافقت سے توبہ کی توفیق کبھی بھی نصیب نہیں ہوگی، اس لیے اسے مرتد قرار دے کر ارتداد کی سزا نہیں دی گئی بلکہ تادیب اور سزا کے طور پر اس کا صدقہ قبول نہیں کیا گیا۔

ہر دور کا مسئلہ

جیسا کہ ہم بار بار یہ وضاحت کرتے آرہے ہیں کہ قرآنِ کریم کی آیات اپنے شانِ نزول کے ساتھ خاص نہیں ہیں، ان آیات میں بھی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ تصویر ہمیں ہر دور میں دکھائی دیتی ہے، نفسِ انسانی حریص بھی ہے اور بخیل بھی، حرص اور بخل سے وہی بچ پاتا ہے جس کے دل کی گہرائی میں ایمان اُتر جاتا ہے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیے گئے ایک ایک روپے کا اجر و ثواب دنیا اور آخرت میں ملنے کی اُمید ہوتی ہے۔

بے شمار لوگ ہیں جو غربت کے زمانے میں اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر ان کے مالی حالات اچھے ہوگئے تو وہ دل کھول کر نیکی کے کاموں میں خرچ کریں گے، مگر ہوتا یہ ہے کہ ذرائعِ آمدنی میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے بخل میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد و پیمان کو فراموش کردیتے ہیں۔

حکمت وہدایت

۱......اللہ کے ساتھ جو وعدہ کیا جائے اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ البتہ اس بارے میں بحث ہوئی ہے کہ کیا معاہدہ کے لیے زبان سے تلفظ ضروری ہے یا دل کی نیت ہی کافی ہے، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ جب تک زبان سے تلفظ نہ کیا جائے صرف دل میں سوچنے سے نہ نذر کا اعتبار ہوگا نہ قسم اور طلاق کا، اس لیے کہ سرورِ عالم ﷺ کا فرمان ہے:

{۱٦۸} قال الضحاک نزل فی رجال من المنافقين نبتل بن الحارث و جدّ بن قیس و معتّب بن قشیر. (قرطبی ۸/ ۱۹۲)

''میری اُمت سے دل میں آنے والے خیالات کے بارے میں کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا جب تک کہ زبان سے تلفظ نہ کرے یا اسے عملی شکل نہ دے۔''{۱۶۹}

۲......اگر کسی شخص نے یوں کہا کہ اگر فلاں چیز میری ملکیت میں آ گئی تو وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہوگی تو مالک ہونے کی صورت میں اس پر اس کا صدقہ کرنا لازم ہوگا۔(۷۵){۱۷۰}

۳......منافقین کی بدعہدی تین صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے (۱) امورِ خیر میں خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں (۲) اللہ کے وعدوں اور اس کی اطاعت سے روگردانی کرتے ہیں (۳) اسلام سے اعراض کی وجہ سے وہ دن بدن دور ہوتے جاتے ہیں۔

۴......بدعہدی کی وجہ سے دل میں نفاق پیدا ہوتا ہے لہٰذا مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اس سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔

۵......آیت نمبر ۷۷ سے ثابت ہوتا ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں اس کا حالتِ نفاق میں انتقال ہوا تھا اور اسے ہم قرآن کی ایسی پیشین گوئی قرار دے سکتے ہیں جو قرآن کے وجوہِ اعجاز میں سے ایک وجہ ہے۔

۶......نفاق اگر دل میں ہو تو کفر ہے اور اگر عمل میں ہو تو گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے منافق کی جو چار نشانیاں بتائی ہیں وہ یہ کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرے تو عہد شکنی کرتا ہے اور جب جھگڑا ہو جائے تو گالی گلوچ پر اُتر آتا ہے۔{۱۷۱}

ان نشانیوں کا تعلق عمل سے ہے اور جس شخص کے اندر یہ نشانیاں پائی جائیں اسے عملی منافق کہا جائے گا۔

۷......اللہ تعالیٰ کو علاّم تو کہا جا سکتا ہے مگر علاّمہ نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ ''علاّمہ'' کے معنی میں ایک قسم کا تکلف پایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حق میں تکلف محال ہے۔

{۱۶۹} بخاری، عتق،۶ - طلاق، ۱۱- ایمان، ۱۵/ مسلم، ایمان، ۲۰۱-۲۰۲/ ابوداؤد، طلاق، ۱۵/ ترمذی، طلاق

{۱۷۰} احکام القرآن للجصاص ۳/ ۱۴۳

{۱۷۱} ترمذی ۲، ۹۱، باب ماجاء فی علامۃ المنافق/ مسلم، ایمان ۱۰۶/ بخاری ایمان ۲۴، جزیۃ ۱۷/ ابوداؤد، سنۃ ۱۵

منافقوں کی طعن و تشنیع اور بُرا انجام

﴿۷۹.....۸۰﴾

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ

وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور ان پر جو نہیں رکھتے

لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ

مگر اپنی محنت کا پھر ان پر ٹھٹھے کرتے ہیں، اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے۔

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً

تو ان کے لئے بخشش مانگ یا نہ مانگ، اگر ان کے لئے ستر بار بخشش مانگے تو بھی ہرگز نہ بخشے گا ان کو اللہ،

فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

یہ اس واسطے کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اللہ رستہ نہیں دیتا

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

نافرمان لوگوں کو۔

شانِ نزول

جب رسولِ اکرم ﷺ اپنے جانثاروں کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرنے کی ترغیب دیتے تو ہر شخص اپنی بساط کے مطابق بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا، غرباء بھی کسی سے پیچھے نہ رہتے اور ان کے بس میں جو کچھ ہوتا دربارِ اقدس میں حاضر کر دیتے مثلاً ایک موقع پر جب آپ نے ترغیب دی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار درہم، حضرت عاصم بن عدی انصاری رضی اللہ عنہ نے کھجور کے ستر وسق اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بہت بڑا عطیہ پیش کیا، حضرت ابوعقیل رضی اللہ عنہ ایک غریب صحابی تھے، انہوں نے رات بھر کسی زمیندار کے کھیتوں میں مزدوری کی، صبح ہوئی تو اس نے انہیں دو صاع (تقریباً یعنی ساڑھے تین کلو) کھجوریں اُجرت کے طور پر دیں۔ انہوں نے ایک صاع اپنے اہل و عیال کے لیے رکھا اور دوسرا صاع اپنے آقا ﷺ کے حضور پیش کر دیا، منافقوں نے پہلے حضرات کے بارے میں کہا کہ وہ نام و نمود کے طلبگار ہیں اور حضرت ابوعقیل کے بارے میں کہا کہ یہ چاہتے ہیں کہ میرا نام بھی بڑے لوگوں کے ساتھ لیا جائے ورنہ اللہ کو اس کے صاع کی ضرورت ہی کیا ہے۔ {۱۷۲}

{۱۷۲} کبیر ۱۶/ ۱۰، کشاف ۲/ ۲۷۹-۲۸۰

﴿سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ﴾ یہ اہلِ ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں، اللہ انہیں اس تمسخر کی سزا دے گا۔ {۱۷۳}

﴿۸۰﴾...... ہمارے آقا علیہ السلام شفقت کی بناء پر منافقوں کے لیے استغفار کیا کرتے تھے اور صرف منافقوں کے لیے نہیں بلکہ گالیاں دینے اور پتھر برسانے والے مشرکوں کے لیے بھی استغفار فرماتے تھے، تمنا بس یہ تھی کہ اللہ انہیں ہدایت اور توبہ کی توفیق دے دے لیکن اس آیت میں اللہ نے اپنے حبیب کو اطلاع دے دی کہ آپ کے استغفار سے انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں ہوگا خواہ آپ ان کے لیے ستر بار ہی استغفار کیوں نہ کریں...... ''ستر'' سے کوئی معین عدد مراد نہیں بلکہ یہ عربی زبان میں کثرت اور مبالغہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ آپ کتنی ہی بار استغفار کیوں نہ کریں ان منافقوں کی مغفرت نہیں ہوسکتی۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ انہیں آپ کے استغفار سے فائدہ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ نہ اللہ کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں نہ آپ کی نبوت ورسالت پر، بلکہ ان کے دل کفر ونفاق سے بھرے ہوئے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ اور اللہ کا دستور یہ ہے کہ جو لوگ کفر ونفاق پر اس طرح اصرار کریں کہ ان کے اندر توبہ اور ایمان کی استعداد ہی ختم ہو جائے تو انہیں ہدایت نہیں دی جاتی ورنہ جن کے اندر استعداد باقی ہو ان کے لیے مغفرت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، سورۂ نساء میں گزر چکا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا {۱۷۴}

''جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کرلیا تھا تو اگر یہ آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے خود بھی استغفار کرتے اور ان کے لیے رسول بھی استغفار کرتے تو یہ اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے اور رحم کرنے والا پاتے۔''

حکمت وہدایت

۱......مؤمن کو طعنہ دینا اور اس کا مذاق اُڑانا حرام ہے۔ (۷۹)

۲...... جب اللہ کے نیک بندوں کا مذاق اُڑایا جائے تو اللہ کو بڑی غیرت آتی ہے، اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ جو لوگ ایمان والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، اللہ ان کا مذاق اُڑاتا ہے۔ (۷۹)

۳......جس کا کفر پر خاتمہ ہو جائے اسے استغفار کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے استغفار جائز ہی نہیں۔

{۱۷۳} والتعبیر عنہا بذلک للمشاکلۃ (ابی سعود ۴/ ۱۷۳) ای جازاھم علی سخریتھم...... والتعبیر بذلک للمشاکلۃ (روح المعانی ۶/ ۲۱۴)

{۱۷۴} النساء ۴/ ۶۴

حضور اکرم ﷺ کے استغفار کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کافروں اور منافقوں کو توبہ کی توفیق دے دے اور جب آپ کو اللہ کی طرف سے بتادیا گیا کہ دلوں پر مہر لگ جانے کی وجہ سے ہدایت ان کے مقدر میں نہیں تو آپ نے بھی استغفار کا سلسلہ ختم فرمادیا۔

۴......کفر ونفاق اور گناہوں پر اصرار ہدایت سے محرومی کا سبب بنتا ہے۔(۸۰)

جہاد سے جان چھڑانے والوں کی خوشی

﴿۸۱......۸۳﴾

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ

خوش ہوگئے پیچھے رہنے والے اپنے بیٹھ رہنے سے جدا ہوکر رسول اللہ سے اور گھبرائے اس سے کہ لڑیں

وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ

اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں اور بولے کہ مت کوچ کرو گرمی میں، تُو کہہ! دوزخ کی آگ سخت گرم ہے

كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝۸۱ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸۲

اگر ان کو سمجھ ہوتی۔ سو وہ ہنس لیویں تھوڑا اور رووئیں بہت سا، بدلہ اس کا جو وہ کماتے تھے۔ سو اگر پھر لیجائے تجھ کو

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا

اللہ کسی فرقہ کی طرف ان میں سے، پھر اجازت چاہیں تجھ سے نکلنے کی تو تُو کہہ دینا کہ تم ہرگز نہ نکلو گے

مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا

میرے ساتھ کبھی اور نہ لڑو گے میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے، تم کو پسند آیا بیٹھ رہنا پہلی بار، سو بیٹھے رہو

مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۝۸۳

پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔

تسہیل: جہاد سے پیچھے رہ جانے والے اس بات پر خوش ہیں کہ ہم اللہ کے رسول کے جانے کے بعد گھروں میں بیٹھے ہیں اور انہوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ وہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں، وہ دوسروں سے بھی کہتے ہیں کہ اتنی سخت گرمی میں گھر سے باہر نہ نکلو، ان سے کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ کی گرمی اس سے بھی زیادہ سخت ہے، کاش! وہ اس بات کو سمجھتے ○ یہ دنیا میں چند دن ہنس لیں پھر انہیں آخرت میں بہت دنوں رونا پڑے گا اس لیے کہ جو کچھ یہ کرتے

رہے ہیں اس کی یہی جزا ہوگی ۝ اگر اللہ آپ کو زندہ سلامت ان کے درمیان واپس لے جائے پھر ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی اجازت مانگے تو آپ فرما دیجیے گا کہ اب تم کبھی بھی نہ تو میرے ساتھ چل سکتے ہو اور نہ ہی میری معیت میں دشمن سے جنگ کر سکتے ہو، تم نے پچھلی دفعہ گھر بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا تو اب بھی گھر بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو ۝

تفسیر

﴿۸۱﴾......جن لوگوں نے غزوۂ تبوک میں شرکت سے اپنے آپ کو حیلوں بہانوں کے ذریعے چھڑا لیا تھا ان کے لیے حقارت کے طور پر "مخلّفون" کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو کہ "مخلّف" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں متروک یعنی جسے پیچھے چھوڑ دیا گیا ہو {۱۷۵} اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ جہاد سے جان چھڑانے پر خوش ہو رہے ہیں انہیں جان لینا چاہیے کہ اللہ نے انہیں اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ وہ اس مقدس سفر میں رسولِ امین ﷺ کے ساتھ جائیں۔

ان کی شقاوت کی انتہاء یہ تھی کہ وہ خود بھی جہاد سے محروم رہے اور دوسروں کو بھی یہ کہہ کر منع کرتے رہے کہ اتنی سخت گرمی میں گھر سے نکلنا مناسب نہیں، انہوں نے دنیا کی گرمی کو تو محسوس کیا مگر دوزخ کی آگ کو بھول گئے، یہ وہ آگ ہے جو دنیا کی آگ سے ستّر گنا سخت ہے، وہ چہروں کو بگاڑ دے گی، جسم کا چمڑا ادھیڑ دے گی اور ہڈیوں کو گھلا کر رکھ دے گی، اگر انہیں شعور ہوتا تو خوش ہونے کے بجائے پریشان ہوتے اور ہنسنے کے بجائے روتے کہ ہم کتنی بڑی سعادت سے محروم رہ گئے۔

﴿۸۲﴾......ان کی خوشی اور ہنسی بہت محدود ہوگی یعنی صرف دنیا کی زندگی میں، جبکہ ان کے رونے کا زمانہ بہت طویل ہوگا بلکہ اس کی کوئی انتہاء نہیں ہوگی، آخرت میں انہیں ہمیشہ رونا ہی ہوگا۔{۱۷۶}

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ہنسنے اور رونے دونوں کا تعلق دنیا سے ہے، منافقت کا پردہ اُٹھنے سے پہلے تو یہ خوش ہوں گے مگر وحی کے ذریعے ان کی حقیقت کھل جانے کے بعد یہ ذلیل و رسوا بھی ہوں گے اور روتے دھوتے بھی رہیں گے۔{۱۷۷}

{۱۷۵} والمخلّف المتروك (قرطبی ۱۹۷/۸)

{۱۷۶} ومعنى الآية انّهم، وان فرحوا وضحكوا فى كل عمر هم فهذا قليل وانّما حزنهم وبكاء هم فى الآخره فكثير لانّه عقاب دائم لا ينقطع (کبیر ۱۱۴/۱۶)

{۱۷۷} روح المعانی جلد ۱۰/۸۳

ایک تیسرا مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے اور تینوں صحیح ہیں، وہ یہ کہ انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ تمہارے جرائم کا تقاضا یہ ہے کہ تم ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔{۱۷۸} یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿لو تعلمون ما أعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا.﴾ {۱۷۹} ''اگر تم جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔''

﴿۸۳﴾...... آئندہ کے لیے ان منافقوں کو بتا دیا جائے کہ نہ تو تمہیں میرے ساتھ کسی بھی سفر میں نکلنے کی اجازت ہے اور نہ ہی میری قیادت میں دشمن کے ساتھ جہاد و قتال کی، تمہارے جیسے منافقوں، کم ہمتوں، بزدلوں اور عیش پسندوں کی مجھے ضرورت نہیں...... یہ محرومی ان کے لیے بہت بڑی سزا تھی اگر وہ سمجھتے۔

حکمت و ہدایت

۱...... اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے چھوڑنے پر خوش ہونا منافقت کی علامات میں سے ہے۔(۸۱)

۲...... اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے کراہت بھی منافقوں کا شیوہ ہے۔(۸۲)

۳...... بہت زیادہ ہنسنا اچھی بات نہیں، اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔(۸۳)

۴...... جو اطاعت سے جان چھڑاتے ہیں ایک وقت آتا ہے کہ انہیں اطاعت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔(۸۴)

منافقوں پر نمازِ جنازہ سے ممانعت

﴿۸۴......۸۵﴾

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ

اور نماز نہ پڑھ ان میں سے کسی پر جو مر جائے کبھی اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر، وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور

وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ

وہ مر گئے نافرمان۔ اور تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ عذاب میں رکھے ان کو ان چیزوں کے

اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

باعث دنیا میں اور نکلے ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں۔

{۱۷۸} یقصد به التهدید.... جزآء علی ما اقترفوه او اکتسبوه من الجرائم والنفاق (تفسیر منیر ۱۰/۳۳۱)

{۱۷۹} بخاری، کسوف ۲، تفسیر سورۃ ۱۲۵، نکاح ۱۰۷، رقاق ۲۷، مسلم، صلوۃ ۱۱۲، کسوف ۱/ نسائی، سہو، ۱۰۲

تسہیل: ان منافقوں میں سے اگر کوئی مر جائے تو آپ ہرگز اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہوں کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور نافرمانی ہی کی حالت میں انہیں موت آئی ہے ٥ اور ان کے پاس اموال اور اولاد دیکھ کر تم دھوکے کا شکار نہ ہو جاؤ، اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کو ان کے لیے دنیا میں باعثِ عذاب بنا دے اور انہیں موت آئے تو کفر کی حالت میں آئے ٥

شانِ نزول

﴿۸۴﴾......حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب عبداللہ بن ابی فوت ہو گیا تو اس کے بیٹے نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے قمیص مبارک کا سوال کیا تا کہ اس میں اپنے والد کو کفن دے سکے، آپ نے اسے قمیص عطا فرما دی، پھر اس نے آپ سے نمازِ جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، آپ نے اس کی یہ درخواست بھی قبول فرمالی اور جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہو گئے، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آپ کا دامن پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ اللہ نے آپ کو منافقوں کے لیے دعا کرنے سے منع فرمایا ہے اس کے باوجود آپ اس منافق کی نمازِ جنازہ کیوں پڑھ رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے کیونکہ ارشادِ باری ہے:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً {۱۸۰}

''آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں اگر آپ ان کے لیے ستّر بار بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ انہیں نہیں بخشے گا''

اور میں ستّر بار سے بھی زائد مرتبہ استغفار کروں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یہ تو منافق تھا مگر آپ نے (اس کے مخلص بیٹے کی دلجوئی کے لیے) نمازِ جنازہ پڑھ ہی دی۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''ولا تصل علی احدمنهم مات ابدا ولا تقم علی قبره.'' {۱۸۱}

اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے کسی منافق کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔ {۱۸۲}

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ابن ابی کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا تھا مگر جبرئیلِ امین

{۱۸۰} التوبة ۹/۸۰

{۱۸۱} ابن کثیر ۲/۴۹۶، بخاری ۲/ کتاب التفسیر، سورة ۹، ص ۶۷۴

{۱۸۲} بالفاظ ترمذی ۲/ کتاب [illegible] سورة ۹ ص [illegible]

کے منع کرنے پر آپ نے ارادہ منسوخ فرمادیا۔{۱۸۳}

زیرِ نظر آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو حکم دیا کہ آپ نہ تو کسی منافق کی نمازِ جنازہ پڑھیں اور نہ ہی اس کی دعا یا زیارت کے لیے اس کی قبر پر کھڑے ہوں اس لیے کہ نمازِ جنازہ یا قبر پر قیام صاحبِ قبر کے احترام کے طور پر ہوتا ہے جبکہ منافق کافر ہونے کی وجہ سے کسی قسم کے اکرام واحترام کے حقدار نہیں۔

﴿۸۵﴾......اسی سورت میں یہ آیت الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ پہلے بھی گزر چکی ہے اور وہاں اس کی تفسیر بیان کردی گئی تھی۔{۱۸۴}

چونکہ مال اور اولاد کی محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور بعض اوقات وہ اس میں اتنا مبالغہ کرتا ہے کہ آخرت کو بھول جاتا ہے، ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مال واولاد کی کثرت کو خوش نصیبی اور رضاءِ الٰہی کی سند سمجھتے ہیں اس لیے تاکید کے طور پر یہ مضمون دوبارہ لایا گیا ہے۔

حکمت وہدایت

۱......غیر مسلم کی نمازِ جنازہ جائز نہیں البتہ مسلمان کی نمازِ جنازہ واجب علی الکفایہ ہے اگر چند ایک نے پڑھ لی تو سب بری الذّمہ ہوجائیں گے اور اگر کسی نے بھی نہ پڑھی تو سب گناہ گار ہوں گے۔

۲......کافر کی میت کو غسل دینا اور دعا کے لیے اس کی قبر پر کھڑا ہونا حرام ہے۔(۸۴)

۳......مال اور اولاد پر فخر وغرور کے بجائے آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔(۸۵)

مختلف مزاج کے لوگ

﴿۸۶......۸۹﴾

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور لڑائی کرو اس کے رسول کے ساتھ ہو کر تو

مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ

تجھ سے رخصت مانگتے ہیں مقدور والے ان کے اور کہتے ہیں ہم کو چھوڑدے کہ رہ جائیں ساتھ

{۱۸۳} روح المعانی ۶، الجزء العاشر/۲۲۵

{۱۸۴} دیکھیے آیت:۵۵

عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨٧﴾ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا

بیٹھنے والوں کے۔ خوش ہوئے کہ رہ جائیں پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ اور مہر کردی گئی ان کے دل پر،

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٨٨﴾

سو وہ نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ساتھ اس کے وہ لڑے ہیں اپنے مال اور جان سے اور انہی کے

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ

لئے ہیں خوبیاں اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔ تیار کر رکھے ہیں اللہ نے ان کے واسطے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں،

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٨٩﴾

رہا کریں ان میں، یہی ہے بڑی کامیابی۔

تسہیل: اور جب بھی کوئی ایسی سورت نازل ہوتی ہے جس میں حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی مانو اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد میں حصہ لو تو ان میں سے اصحابِ ثروت آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں گھروں میں بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہنے کی اجازت دے دیجیے ○ یہ لوگ خواتینِ خانہ کے ساتھ بیٹھے رہنے پر راضی ہیں، اصل بات یہ ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ کچھ سمجھتے ہی نہیں ○ دوسری طرف اللہ کے پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں، اب ساری بھلائیاں انہی کے لیے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں ○ ان کے لیے اللہ نے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے ساتھ ساتھ نہریں بہہ رہی ہیں، یہ بڑی کامیابی ہے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۸۶-۸۹﴾......ان آیات میں دو مختلف قسم کا مزاج رکھنے والے لوگوں کا ذکر ہے۔ ایک طرف منافق تھے جن کے مزاج میں بزدلی، ذلت، بے حمیتی، حیلہ سازی اور دنیا کی محبت رچ بس چکی تھی، جب کبھی جہاد کا حکم نازل ہوتا تو ان میں سے ایسے لوگ جن کے پاس مال بھی تھا اور وہ قدرت بھی رکھتے تھے۔ {۱۸۵} مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعے کوشش کرتے کہ انہیں عورتوں کی طرح گھروں میں رہنے کی اجازت دے دی جائے......اس لیے ان کی مردانگی پر انگلی اٹھاتے ہوئے انہیں عورتوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

{۱۸۵} اولو الثروۃ والقدرۃ (کبیر ۱۱۸/۱۶) أی ذو الفضل والسّعۃ والقدرۃ علی الجهاد بدنًا ومالًا (ابی سعود ۱۷۷/۳)

﴿وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ اللہ فرماتے ہیں اصل وجہ یہ ہے کہ ان کی منافقت کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ حمیت کیا ہے اور بے حمیتی کیا ہے اور نہ ہی جہاد کے فوائد اور حکمتیں ان پر کھل سکتی ہیں۔ دوسری طرف اللہ کا پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے لوگ ہیں جو اخلاص وایثار، جذبۂ جہاد اور محبتِ الٰہیہ سے سرشار ہیں، یہ ہر وقت قربانی کے لیے تیار رہتے ہیں، دنیا کی سعادتیں بھی ایسے ہی لوگوں کے لیے ہیں اور آخرت کی نعمتوں کے بھی یہی حقدار ہوں گے۔

حکمت وہدایت

۱.....شریعتِ الٰہیہ کا پہلا ماٰخذ قرآن اور دوسرا سنت ہے۔(۸۶)

۲.....مجبوری کی صورت میں امیر اور قائد سے اجازت اور رخصت لینا جائز ہے۔

۳.....قدرت کے باوجود جہاد سے جان بچانا حرام ہے۔(۸۶)

۴.....امیر سے اجازت لیے بغیر جہاد سے غائب رہنا جائز نہیں۔

۵.....اللہ کی رضا کے لیے اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کی بے پناہ فضیلت ہے۔

دیہاتیوں کی اجازت طلبی

﴿۹۰﴾

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ

اور آئے بہانے کرنے والے گنوار، تاکہ ان کو رخصت مل جائے اور بیٹھ رہے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ سے

وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

اور اس کے رسول سے، اب پہنچائے گا ان کو جو کافر ہیں ان میں عذاب دردناک۔

تسہیل: عرب دیہاتیوں میں سے بہت سے لوگوں نے عذر پیش کیے تاکہ انہیں گھر میں رہنے کی اجازت دے دی جائے اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جھوٹ بولا، وہ اجازت لیے بغیر ہی گھر بیٹھے رہے، ان دیہاتیوں میں سے جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے انہیں دردناک عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا O

﴿تفسیر﴾

﴿۹۰﴾.....اس آیت میں خصوصی طور پر عرب بدوؤں کا ذکر ہے، ان میں کچھ تو ایسے تھے جنہوں نے کوئی نہ کوئی عذر

پیش کر کے گھر میں رہنے کی اجازت حاصل کرلی اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اجازت لینے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی ویسے ہی گھر میں پڑے رہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے پیغمبر کے سامنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ ان کے دل میں ایمان نہیں تھا۔

حکمت وہدایت

ا......قرآن نے عذر پیش کرنے والوں کے لیے "معذّرون" کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لفظ کو 'ذال' کی تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور تخفیف کے ساتھ بھی۔ ان دونوں قراٗتوں کے اعتبار سے اس ایک لفظ میں چار قسم کے لوگ آ گئے:

(۱) جو واقعی معذور تھے۔

(۲) جن کے پاس کوئی حقیقی عذر نہ تھا صرف صوری عذر تھا۔

(۳) بہت کمزور سا عذر تھا جسے بحث وتحقیق کی صورت میں وہ ثابت نہیں کر سکتے تھے۔

(۴) جن کے پاس حقیقی یا صوری کوئی عذر نہ تھا وہ سراسر جھوٹے تھے۔

حقیقی مجبور اور مصنوعی معذور

﴿۹۱......۹۳﴾

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ

نہیں ہے ضعیفوں پر اور نہ مریضوں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کے پاس نہیں ہے خرچ کرنے کو کچھ گناہ، جبکہ دل سے

حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ﴿۹۱﴾

صاف ہوں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ، نہیں ہے نیکی والوں پر الزام کی کوئی راہ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور نہ ان

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪

لوگوں پر کہ جب تیرے پاس آئے تا کہ تُو ان کو سواری دے تو نے کہا میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ تم کو اس پر سوار کردوں تو

تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ﴿۹۲﴾

اُلٹے پھرے اور ان کی آنکھوں سے بہتے تھے آنسو اس غم میں کہ نہیں پاتے وہ چیز جو خرچ کریں۔ راہ الزام کی تو ان پر ہے جو

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا

رخصت مانگتے ہیں تجھ سے اور وہ مالدار ہیں، خوش ہوئے اس بات سے کہ رہ جائیں ساتھ پیچھے رہنے والیوں کے

مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر سو وہ نہیں جانتے۔

تسہیل: ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جو بیمار یا معذور ہوں یا جن کے پاس زادِ راہ نہ ہو، شرط یہ ہے کہ وہ دل سے اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں، ایسے مخلصوں پر کوئی الزام نہیں اور اللہ غفور رحیم ہے O اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا جنہوں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ ان کے لیے سواری کا انتظام کردیا جائے تو وہ جہاد میں جانے کے لیے تیار ہیں اور آپ نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے لیے سواری کا انتظام نہیں کرسکتا، یہ جواب سن کر وہ اس حال میں واپس گئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور انہیں اس بات کا بڑا غم تھا کہ ان کے پاس اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں O قابلِ اعتراض تو وہ لوگ ہیں جو مالدار ہونے کے باوجود آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں، وہ خواتین کے ساتھ بیٹھے رہنے پر خوش ہیں، اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے اس لیے وہ کچھ نہیں جانتے O

﴿تفسیر﴾

﴿۹۱-۹۳﴾......ان آیات میں بھی دو قسم کے لوگوں کا بیان ہے۔ ایک قسم کے لوگ تو وہ تھے جو اللہ اور اس کے پیغمبر کے وفادار اور انتہائی مخلص تھے، ان کے دل اسلام کے ساتھ دھڑکتے تھے، وہ اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ چاہتے تھے مگر معذوری، بڑھاپے، بچپن، بیماری اور زادِ راہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ عملی طور پر جہاد میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب بیت المال نہیں تھا اور ہر کسی کو اپنے لیے سواری اور زادِ راہ کا یا تو خود انتظام کرنا پڑتا تھا یا صاحبِ ثروت مسلمان حسبِ استطاعت غریب مسلمانوں کے لیے سواری اور اسلحہ وغیرہ کا انتظام کردیا کرتے تھے، چند ایسے مسلمانوں کا تذکرہ بھی روایات میں ملتا ہے {۱۸۶} جنہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ ہمارے لیے سواری کا انتظام کردیا جائے تو ہم جہاد میں جانے کے لیے تیار ہیں جب آپ نے معذرت کی تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی، انہیں رنج اس بات کا تھا کہ آج جہاد کا موقع ہاتھ آیا ہے مگر ہمارے پاس نہ نفقہ ہے اور نہ ہی سواری ہے کہ ہم شرکتِ جہاد کی حسرت پوری کرسکیں۔

{۱۸۶} وقیل نزلت فی بنی مقرّن وعلی هذا جمهور المفسرین۔ (قرطبی ۸/۲۰۹)، نزلت فی بنی مقرّن من مزینه۔ (ابن کثیر ۲/۵۰۰)

دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جو مالی اعتبار سے خوشحال تھے، سواری کا انتظام بھی کر سکتے تھے اور اسلحہ بھی مہیا کر سکتے تھے، جہاد کے لیے نکلنے میں ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن چونکہ ان کے دل اخلاص اور جذبۂ جہاد سے خالی تھے اس لیے اللہ کے نبی کا ساتھ دینے کے بجائے انہوں نے بوڑھوں، معذوروں، بچوں، بیماروں اور خواتین کے ساتھ گھر میں رہنا پسند کیا حالانکہ یہ چیز اہلِ عرب کے عرف کے اعتبار سے بھی انتہائی معیوب تھی۔

﴿وَطَبَعَ اللّٰهُ﴾ ان کی اس حرکت کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی جس سے ان میں ایسی قساوت اور سختی پیدا ہوگئی کہ وہ حق بات قبول کرنے کے قابل نہ رہے، وہ جان ہی نہیں سکتے کہ کونسے احکام میں ان کے لیے دین اور دنیا کے منافع ہیں اور کن چیزوں میں ان کے لیے نقصانات ہیں۔

حکمت وہدایت

۱......اسلام کسی فرد اور جماعت کو ایسے احکام کا مکلّف نہیں بناتا جن کا بجالانا ان کے بس میں نہ ہو لہٰذا اگر کمزور، معذور، بیمار اور بوڑھے جہاد میں حصہ نہ لیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، شرط بس یہ ہے کہ ان کے قول وعمل سے ظاہر ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ مخلص ہیں۔(۹۱)

۲......اپنے آقا ﷺ کے کریمانہ اخلاق، تواضع اور رحمت کی وجہ سے مسلمان ہر معاملے میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔(۹۲)

۳......صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، ایمان ویقین، سمع وطاعت اور رقّتِ قلبی جیسے اوصاف سے متصف تھے۔(۹۲)

یہ دعا کثرت سے مانگنی چاہیے:

﴿ألّٰلھمّ إنّا نحبّھم بحبّک فأحببنا کما أحببتھم وأجعلنا معھم فی دار کرامتک﴾{۱۸۷}

''اے اللہ ہم ان سے محبت کرتے ہیں تیری محبت کی وجہ سے، لہٰذا ہم سے بھی محبت فرما جیسے تو ان سے محبت کرتا ہے اور ہمیں ان کے ساتھ جنت میں جمع فرما''

۴......اسلام حقیقت وعقل اور رحمت وعدل پر مبنی دین ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے مخلص مگر معذور افراد کو جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور قدرت کے باوجود جھوٹے عذر پیش کرنے والوں کو اپنے غضب اور عذاب کا مستحق قرار دیا ہے۔(۹۳)

{۱۸۷} ایسر التفاسیر ۲/۴۱۳

منافقوں کی جھوٹی قسمیں اور اعذار

﴿۹۴......۹۶﴾

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ

بہانے لائیں گے تمہارے پاس جب تم پھر کر جاؤ گے ان کی طرف، تو کہہ! بہانے مت بناؤ، ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہاری

نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ

بات ہم کو بتا چکا ہے اللہ تمہارے احوال اور ابھی دیکھے گا اللہ تمہارے کام اور اس کا رسول، پھر تم لوٹائے جاؤ گے طرف اس

وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ

جاننے والے چھپے اور کھلے کی، سو وہ بتائیگا تم کو جو تم کر رہے تھے۔ اب قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم پھر

لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا

جاؤ گے ان کی طرف تا کہ تم ان سے درگزر کرو سو تم درگزر کرو ان سے، بیشک وہ لوگ پلید ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ

يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى

ان کے کاموں کا۔ وہ لوگ قسمیں کھائیں گے تمہارے سامنے تا کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم راضی ہو گئے ان سے تو

عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

اللہ راضی نہیں ہوتا نافرمان لوگوں سے۔

تسہیل: جب تم جہاد سے فارغ ہو کر واپس جاؤ گے تو پیچھے رہ جانے والے تمہارے سامنے طرح طرح کے عذر پیش کریں گے مگر تم ان سے صاف کہہ دینا کہ بہانے نہ بناؤ ہم تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں کریں گے، اللہ ہمیں تمہارے حالات کی اطلاع دے چکا ہے اور آئندہ بھی اللہ اور اس کا رسول تمہارا طرزِ عمل دیکھیں گے، پھر تمہیں اس کے پاس لوٹا دیا جائے گا جو پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ○ جب تم واپس پلٹو گے تو یہ تمہارے سامنے اللہ کے نام کی قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے صرفِ نظر کر لو تو تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، بلاشبہ وہ نری گندگی ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو وہ کرتے رہے ○ یہ اس لیے قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، اگر بالفرض تم ان سے راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ ایسے نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوگا ○

﴿تفسیر﴾

﴿۹۴﴾...... مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے پہلے سے اطلاع دی جارہی ہے کہ جب تم غزوۂ تبوک سے فارغ ہو کر مدینہ واپس جاؤ گے تو منافقین، جہاد میں اپنی عدمِ شرکت کے بارے میں جھوٹے اعذار بیان کریں گے، تم انہیں صاف صاف بتا دینا کہ ہم تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کریں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے ہمیں اس شر اور فساد کے بارے میں بتا چکا ہے جو تمہارے دلوں میں پوشیدہ ہے۔

﴿وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ﴾ آج کے بعد دیکھا جائے گا کہ تم کیا کرتے ہو؟ قول وفعل کے تضاد اور منافقت سے توبہ کرتے ہو یا اسی پر قائم رہتے ہو؟ صرف کھوکھلی باتوں اور جھوٹی قسموں سے کام نہیں چلے گا بلکہ تمہیں اپنے عمل سے سچائی کا ثبوت دینا ہوگا۔

﴿۹۵﴾...... یہ منافق صرف جھوٹے عذر ہی بیان نہیں کریں گے بلکہ قسمیں کھا کر انہیں مؤکد کریں گے۔

﴿إِنَّهُمْ رِجْسٌ﴾ اے مسلمانو! تم ان جھوٹوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو، ان کے دلوں میں جو نجاست بھری ہوئی ہے اس کی وجہ سے یہ سراسر نجاست بن کر رہ گئے ہیں اور نجاست سے صرفِ نظر ہی بہتر ہوتا ہے۔

﴿۹۶﴾...... قسمیں کھانے سے ان کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ تم ان سے اعراض کرو اور ان کی بزدلی، بے عقلی اور بخل پر انہیں برا نہ کہو، دوسرا مقصد یہ ہے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، حالانکہ اگر یہ واقعی مومن ہوتے تو انہیں سب سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی فکر ہوتی۔

حکمت وہدایت

۱...... مسلمان کو ایسا کام کرنا ہی نہیں چاہیے جس سے بعد میں معذرت کرنی پڑے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ﴿إيّاک وکل أمر یعتذر منه﴾ {۱۸۸} ''ایسے کاموں سے بچ کر رہو جن سے معذرت کرنی پڑتی ہے''۔

۲...... اگر واقعی کوئی عذر لاحق ہو تو اس کا پیش کرنا جائز اور قبول کرنا آقا ﷺ کی سنّت ہے۔

۳...... احکامِ شریعت پر عمل سے بچنے کے لیے بہانے بنانا منافقوں کا شیوہ ہے۔ (۹۴)

۴...... کسی کے زبانی دعووں کو پرکھنے کے لیے اس کا عمل اور مستقبل بہترین گواہ ہوتا ہے۔ (۴))

{۱۸۸} بحوالہ التفسیر المنیر ۱۱/۹

۵......منافق معنوی طور پر نجس ہوتے ہیں، ان سے ایسے ہی بچنا چاہیے جیسے حسّی نجاست سے بچا جاتا ہے کیونکہ جوان سے دوستی رکھے گا اس کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ ان کے اخلاق واعمال سے متاثر ہو جائے گا۔(۹۵)

۶......جو شخص علانیہ فسق وفجور کا ارتکاب کرے اس سے محبت اور اس کی حرکتوں پر رضامندی کا اظہار حرام ہے۔(۹۶)

۷......اگر اللہ ناراض ہو تو انسانوں کی رضامندی سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں ہوگا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ''جو شخص انسانوں کی ناراضگی کے باوجود اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ اسے انسانوں کی طرف سے کافی ہو جائے گا اور جو شخص اللہ کو ناراض کر کے انسانوں کو راضی کرے گا اسے اللہ انسانوں کے حوالے کر دے گا''۔{۱۸۹}

بدوؤں کا کفر اور ایمان

﴿۹۷......۹۹﴾

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى

گنوار بہت سخت ہیں کفر میں اور نفاق میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ سیکھیں وہ قاعدے جو نازل کئے اللہ نے اپنے رسول پر اور

رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۹۷ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ

اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور بعضے گنوار ایسے ہیں کہ شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو تاوان اور انتظار کرتے

بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۹۸ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ

ہیں تم پر زمانہ کی گردشوں کا، ان ہی پر آئے گردش بُری اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور بعضے گنوار وہ ہیں کہ ایمان لاتے

يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ

ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو نزدیک ہونا اللہ سے اور دعا لینی رسول کی، سنتا ہے! وہ

اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۹۹ ع

ان کے حق میں نزدیکی ہے، داخل کرے گا ان کو اللہ اپنی رحمت میں، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ربط: مدینہ کے مومنوں اور منافقوں کا ذکر کرنے کے بعد مدینہ سے باہر جو بدّو رہتے تھے ان کے مومنوں اور منافقوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

{۱۸۹} ترمذی، زھد، ۶۵

تسہیل: ان منافقوں میں جو دیہاتی ہیں وہ کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ انہیں ان احکام کا علم ہی نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں اور اللہ علیم وحکیم ہے ○ اور ان دیہاتیوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ وہ جو کچھ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اسے اپنے اوپر تاوان سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں زمانے کی گردشوں کا انتظار کرتے ہیں حالانکہ خود ان پر برا وقت آنے والا ہے اور اللہ خوب سننے اور جاننے والا ہے ○ ان بدوؤں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور وہ نیک کاموں میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے قرب اور رسولِ اکرم ﷺ کی دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، سن لو! کہ ان کا یہ عمل یقیناً اللہ کے تقرب کا ذریعہ ہے اور اللہ ضرور انہیں اپنی رحمت میں داخل کرلے گا، بلا شبہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۹۷﴾...... بدوی عربوں کی دو صفات اس آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہیں:

پہلی یہ کہ وہ کفر و نفاق میں ان کافروں کے مقابلہ میں زیادہ سخت ہوتے ہیں جو شہر میں بستے ہیں، علمی مجالس اور شخصیات سے محرومی اور وحشی جانوروں اور چوپایوں کی صحبت کی وجہ سے ان کی طبیعت میں سختی اور ان کے دلوں میں قساوت پیدا ہوجاتی ہے، وہ جن مشکل حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کا اثر ان کے مزاج پر بھی پڑتا ہے۔

امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے بدویوں کی سنگدلی کے کئی واقعات نقل کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض دیہاتی حضورِ اکرم ﷺ سے ملاقات کے لیے آئے تو انہوں نے کہا ''کیا تم اپنے بچوں کو بوسہ دیتے ہو؟'' لوگوں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے کہا ''اللہ کی قسم ہم تو بوسہ نہیں دیتے'' اس پر آپ نے فرمایا ''اگر اللہ نے تمہارے دلوں سے شفقت نکال دی ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں''۔ {۱۹۰}

دوسری صفت بدویوں کی یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے معاملہ میں اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ وہ ان حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہیں، اس لیے کہ مدینہ میں رہنے والوں کو سرورِ دو عالم ﷺ کی صحبت اور حصولِ علم کے جو مواقع حاصل تھے ان سے بدّو محروم تھے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ بندوں کے ظاہری حالات بھی جانتا ہے اور ان کی باطنی کیفیات سے بھی باخبر ہے کون دیہاتی ہے اور کون شہری، کون عالم ہے اور کون جاہل، کون مخلص ہے اور کون منافق، ان سب باتوں سے وہ باخبر

{۱۹۰} مسلم، فضائل، ۶۴، ادب، ۱۸/ ابن ماجہ، ادب ۳/ مسند احمد ۶/۵۶، ۷۰

ہے، وہ حکیم ودانا بھی ہے، اس نے مختلف لوگوں کو مختلف صفات اور خصوصیات سے نوازا ہے اور انہیں مختلف نسلوں اور خاندانوں میں جو تقسیم کر رکھا ہے تو اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔

﴿۹۸﴾...... بدوؤں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو جہاد وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں مگر اس سے ان کا مقصود اللہ کی رضا نہیں ہوتا بلکہ محض اپنا بچاؤ اور دکھاوا پیشِ نظر ہوتا ہے، چونکہ ثواب کی نیت نہیں ہوتی اس لیے وہ جہاد میں خرچ کرنے کو اپنے اوپر ایک تاوان سمجھتے ہیں۔

﴿وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ﴾ یہ منافق تمہارے بارے میں زمانے کی گردشوں کے انتظار میں ہیں، ایسی گردش جو معاذ اللہ تمہارا خاتمہ کر دے، ایک عرصہ تک منافق یہ توقع لگائے رہے کہ مشرک اور یہود مسلمانوں پر غالب آ کر ان کا قلع قمع کر دیں گے، جب اس سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے رومیوں سے امید قائم کر لی کہ وہ تبوک میں جانے والے مسلمانوں کو زندہ واپس نہیں آنے دیں گے، جب ان کی یہ امید بھی خاک میں مل گئی تو وہ سرورِ دو عالم ﷺ کی موت کا انتظار کرنے لگے، انہیں یقین تھا کہ آپ کی موت کے ساتھ ہی معاذ اللہ اسلام کی موت بھی واقع ہو جائے گی مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان کی کوئی اُمید بھی پوری نہ ہوئی۔

﴿عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ﴾ یہ بدّو اور منافق خود بدی کی گردش میں آ چکے ہیں جو انہیں چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے، کسی صورت بھی یہ اس کے برے انجام سے نہیں بچ سکتے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ جہاں کہیں بھی اللہ کی صفات ذکر کی گئی ہیں ان کا آیت کے مضمون سے گہرا ربط ہوتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہے، بتایا جا رہا ہے کہ یہ منافق آپس میں اسلام اور مسلمانوں اور اپنے ظاہرداری کے نفقات کے بارے میں جو باتیں کرتے ہیں اللہ ان باتوں کو سنتا ہے اور یہ اپنے دلوں میں جو کفر ونفاق اور بھید چھپائے ہوئے ہیں اللہ انہیں جانتا ہے۔

﴿۹۹﴾...... سارے بدّو ایک جیسے نہیں ہیں ان میں ایسے بھی ہیں جو دل سے ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ صرف اللہ کے تقرّب اور رسولِ اکرم ﷺ کی دعاؤں کے حصول کے لیے، دنیا کا سود وزیاں اور نام ونمود ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ایسے مخلصوں سے اگر کوئی خطا ہو جائے یا عمل میں کمی رہ جائے تو اللہ معاف کر دیتا ہے اور ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتے ہوئے بہتر سے بہتر عمل کی توفیق بھی دیتا ہے۔

حکمت وہدایت

۱......ایسے دیہات جن میں تعلیم وتربیت کی سہولیات حاصل نہ ہوں ان میں رہائش رکھنا مناسب نہیں۔

۲......دیہاتوں میں رہنے والوں کی طبیعت میں عام طور پر سختی پیدا ہوجاتی ہے اور انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص دیہات میں رہائش رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو مشکل میں ڈال لیتا ہے اور جو شکار کا پیچھا کرتا ہے وہ غافل ہوجاتا ہے اور جو بادشاہوں کے پاس آتا جاتا ہے وہ فتنے میں پڑجاتا ہے'' {۱۹۱}

۳......شہروں کی طرح دیہاتوں میں بھی مومن اور کافر، نیک اور بد، عالم اور جاہل ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں مگر دیہاتوں کے کافر اور منافق کفرونفاق میں زیادہ شدید ہوتے ہیں۔

۴......صدقہ کرنے والوں کو دعا دینا اللہ کا حکم اور رسولِ اکرم ﷺ کی مبارک سنّت ہے۔

مخلص اور منافق

﴿۱۰۰......۱۰۱﴾
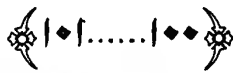
وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ، اللہ

عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ

راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے اور تیار کر رکھے ہیں واسطے ان کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں، رہا کریں

الْعَظِيْمُ ۝ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ڔ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ڀ مَرَدُوْا عَلَى

انہی میں ہمیشہ، یہی ہے بڑی کامیابی۔ اور بعضے تمہارے گرد کے گنوار منافق ہیں اور بعضے لوگ مدینہ والے اڑ رہے ہیں

النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝

نفاق پر، تُو ان کو نہیں جانتا ہم کو وہ معلوم ہیں، ان کو ہم عذاب دینگے دوبار پھر وہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف۔

تسہیل: وہ مہاجر اور انصار جو ایمان قبول کرنے میں دوسروں سے سبقت لے گئے اور وہ لوگ جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کی اتباع کی ان سب سے اللہ راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، ان کے لیے اللہ نے ایسے باغات تیار

{۱۹۱} ابوداؤد، اضاحی، ۱۴/ ترمذی، فتن، ۶۹/ نسائی، صید، ۲۴/ مسند احمد ۱/ ۳۵۷

کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے یہی عظیم الشان کامیابی ہے O کچھ لوگ تمہارے گردو پیش رہنے والے گنواروں میں اور کچھ مدینہ والوں میں ایسے منافق ہیں جو منافقت کی آخری حد تک پہنچے ہوئے ہیں، انہیں آپ نہیں جانتے بلکہ صرف ہم ہی جانتے ہیں، ہم انہیں دوہری سزا دیں گے، پھر انہیں بڑی بھاری سزا کی طرف لوٹا دیا جائے گا O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۰۰﴾......اس آیتِ کریمہ میں امتِ اسلامیہ کے تین بہترین طبقات کا ذکر ہے:

پہلا طبقہ......مہاجروں میں سے السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا ہے، "السّٰبِقُوْنَ" کا معنی ہے سبقت لے جانے والے، اور "اَوَّلُوْنَ" کا معنی ہے سب سے پہلے، سب سے مقدم، مہاجروں میں سے السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ وہ ہیں جنہوں نے غزوۂ بدر یا صلحِ حدیبیہ سے پہلے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی {۱۹۲} اس لیے کہ اس وقت تک مشرکین نہ تو اہلِ ایمان کو مکّہ میں امن وسکون سے رہنے دیتے تھے اور نہ ہی مدینہ یا کسی دوسرے مقام کی طرف بآسانی ہجرت کی اجازت دیتے تھے، یہ سارے کے سارے مہاجر مخلص اور سچے مومن تھے ان میں سے کوئی بھی منافق نہ تھا، یہ دین کا بنیادی اثاثہ اور مضبوط بنیاد تھے۔

ان "سابقون" میں بھی بعض کو بعض پر سبقت اور فضیلت حاصل ہے، سب سے افضل چاروں خلفاء ہیں ان کے بعد عشرہ مبشرہ، پھر وہ جنہیں بدر میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، پھر اصحاب احد پھر اصحابِ بیعتِ رضوان۔

دوسرا طبقہ......انصار میں سے السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا ہے یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنہوں نے نبوت کے گیارہویں سال منٰی میں سرورِ دوعالم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی، {۱۹۳} ان کی تعداد سات تھی اور اسی مقام پر اگلے سال ستر مردوں اور دو خواتین نے ہمارے آقا ﷺ کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا یہ وہ وقت تھا جب آپ کسی ایسے قبیلے کی تلاش میں تھے جو آپ کو اور آپ کے اصحاب کو پناہ دے دے، آپ نے کئی قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا مگر کوئی بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوا، اللہ نے ازل سے یہ سعادت انصار کے مقدر میں طے کر رکھی تھی انہوں نے آپ ﷺ سے بیعت کی اور آپ ﷺ سے یہ عہد لیا کہ آپ انہیں چھوڑ کر اپنی قوم کی طرف واپس نہیں جائیں گے آپ نے ان سے وعدہ کیا اور یہ فرمایا کہ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو جس سے تم جنگ

{۱۹۲} المراد منہ السابقون الأوّلون فی الهجرة۔ (کبیر ۱۲۷/۶)

{۱۹۳} أهل بیعة العقبة الأولی۔ (ابی سعود ۱۸۵/۳، بیضاوی ۱۶۸/۳، کشاف ۲۸۹/۲)

کرو گے اس سے میں بھی جنگ کروں گا اور جس سے تم صلح کرو گے اس سے میں بھی صلح کروں گا۔

تیسرا طبقہ...... وہ ہے جو ایمان اور اخلاص کے ساتھ قیامت تک پہلے دو طبقوں کی اتباع کرنے والا ہے۔{۱۹۴}

﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ ان تینوں طبقات کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا، ان کی عبادت واطاعت اور قربانیوں کو اس نے قبول کر لیا اور وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے، اللہ نے انہیں کفر وشرک کے اندھیروں سے نجات دے کر ایمان کا نور عطا فرمایا اور انہیں دینی اور دنیوی نعمتوں سے نوازا۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تیسرے طبقے سے مراد بھی صحابہ کرام ہیں جو ''السابقون الاولون'' کے بعد ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت اور نصرت میں ان کی اتباع کی۔

﴿۱۰۱﴾...... مومنوں کا ذکر کرنے کے بعد منافقوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! مدینہ کے اردگرد بھی منافق رہتے ہیں اور خود مدینہ بھی منافقوں کے وجود سے خالی نہیں ان میں سے بعض منافقت میں بڑے ماہر ہیں وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتے جس سے کسی کو ان کے بارے میں منافقت کا شبہ ہو، تم انہیں پہچان نہیں سکتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے۔

﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ﴾ ان منافقوں کو دو بار دنیا میں عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے پہلا عذاب {۱۹۵} یہ ہے کہ ان کے ضمیر انہیں دوغلے پن پر ملامت کرتے ہیں، ہر لحہ ڈر لگا رہتا ہے کہ ہماری منافقت کا پردہ چاک ہو جائے گا، ایسا بھی ہوا کہ خود سرورِ دو عالم ﷺ نے ایک موقع پر ۳۶ کے قریب منافقوں میں سے ایک ایک کا نام لیکر انہیں مجلس سے اٹھا دیا۔{۱۹۶}

دوسرے عذاب سے منافق موت کے وقت دوچار ہوتے ہیں جب فرشتے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر ضربیں لگاتے ہوئے ان کی جان نکالتے ہیں۔

﴿ثُمَّ يُرَدُّوْنَ﴾ دنیوی عذاب بھگتنے کے بعد انہیں قیامت کے دن آخرت کے عذابِ عظیم کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

{۱۹۴} مایتّبعون فیہ من أفعالهم وأقوالهم۔ (قرطبی ۸/۲۱۸)

{۱۹۵} وقیل: العذاب الأوّل الفضیحة باطلاع النبی ﷺ علیهم۔ (قرطبی ۸/۲۲۰)

{۱۹۶} طبرانی بحوالہ روح المعانی ۷/۱۶

حکمت وہدایت

۱......نیکی میں سبقت لیجانے والوں کواللہ کے ہاں فضیلت اور عظمت حاصل ہوتی ہے۔(۱۰۰)

۲......علامہ ابنِ عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں میں تقدّم کی وجہ سے سبقت حاصل ہوتی ہے یعنی صفت، زمان یامکان۔صفت سے مراد ایمان، زمان سے مراد وقت کے اعتبار سے تقدّم ہے اور مکان سے مراد یہ ہے کہ بعض لوگوں نے دارِ ہجرت کے بجائے دارِنصرت یعنی مدینہ کو اپنا مسکن بنالیا اور جولوگ پہلے سے یہاں مقیم تھے انہوں نے انصار ہونے کا حق ادا کیا۔

ان تین صفات کے اعتبار سے سبقت کی اہمیت اپنی جگہ مگر کسی کو سب سے زیادہ فضیلت صفات میں سبقت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے،اس دعوٰی پر سب سے واضح دلیل ہمارے آقا ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

﴿نحن الآخرون الاولون، بیدانهم اوتوا الکتاب من قبلنا وأوتینا من بعدهم﴾{۱۹۷}

’’ہم آخر میں آئے ہیں مگر ہم سب سے اوّل ہیں فرق بس یہ ہے کہ انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی اور ہمیں ان کے بعد دی گئی‘‘

اس حدیث میں آپ نے بتایا ہے کہ ہم دوسری امتوں کے بعد دنیا میں آئے ہیں مگر ایمان، اتباع، ذمہ داریوں کی ادائیگی اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنے، شریعت وکتاب کو من وعن باقی رکھنے اور تسلیم کرنے میں ہم ان سے مقدّم اور افضل ہیں۔{۱۹۸}

۳......رب العٰلمین کا صحابہ کرام کے تینوں طبقات کے بارے میں ’’رضی اللہ عنہم‘‘ فرمانا بہت بڑی شہادت ہے، اس شہادت کے بعد عبداللہ بن سبا جیسی ذہنیت رکھنے والے افراد کی غوغا آرائی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ابوصخر حمید بن زیاد کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ سارے کے سارے صحابہ جنتی ہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ کس دلیل کی بنیاد پر یہ فرمارہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا یہ آیتِ کریمہ پڑھ لو ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ تم پر خود ہی بات واضح ہوجائے گی۔

۴......صحابہ کرام کے بعد آنے والوں کے لیے اللہ کی رضا مشروط ہے، اخلاص کے ساتھ اتباع کی شرط سے، یہ اخلاص

{۱۹۷} مسلم، جلد ۱، صفحہ ۲۸۲

{۱۹۸} قرطبی ۸/۲۱۷، احکام القرآن ۲/ ۹۹۰-۹۹۳

اور احسان قول وعمل دونوں میں ہونا چاہیے، جو شخص مہاجرین اور انصار کے بارے میں بدگوئی کرتا ہے وہ اللہ کی رضا کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

۵...... ماضی کے منافق بھی دو قسم کے تھے اور آج کے منافق بھی دو قسم کے ہیں، کچھ تو ایسے ہیں جن کی منافقت کا پول آسانی سے کھل جاتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جنھیں منافقت میں بڑی مہارت حاصل ہے اور وہ اسلام دوستی بلکہ مسلم قیادت کے خوبصورت پردے میں اپنا نفاق چھپانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں...... آج کے عالمِ اسلام کی اکثر لیڈر شپ اسی قسم کے منافقوں پر مشتمل ہے۔

اعتراف کرنے والے

﴿۱۰۲......۱۰۶﴾

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ

اور بعضے لوگ ہیں کہ اقرار کیا انہوں نے اپنے گناہوں کا، ملایا انہوں نے ایک کام نیک اور دوسرا بد، قریب ہے کہ اللہ معاف کرے ان کو بیشک اللہ بخشنے والا

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ

مہربان ہے۔ لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو اس کی وجہ سے اور دعا دے ان کو، بیشک تیری دعا ان کے

اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ

لئے تسکین ہے اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ آپ قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں سے اور لیتا ہے زکوتیں اور یہ کہ اللہ ہی توبہ

عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ

قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اور کہہ! کہ عمل کیے جاؤ پھر آگے دیکھ لے گا اللہ تمہارے کام کو اور اس کا رسول اور مسلمان اور تم جلد لوٹائے

عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

جاؤ گے اس کے پاس جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں سے واقف ہے، پھر وہ جتادے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے۔ اور بعضے اور لوگ ہیں

تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

کہ ان کا کام ڈھیل میں ہے حکم پر اللہ کے، یا وہ ان کو عذاب دے اور یا ان کو معاف کرے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

تسہیل: کچھ اور لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا صاف صاف اقرار کرلیا انہوں نے اچھے اور برے دونوں قسم کے عمل کیے تھے، اللہ سے امید ہے کہ وہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، بلاشبہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے O آپ ان کے اموال میں سے صدقہ قبول فرمالیجیے، آپ کا قبول کرنا انہیں پاک صاف کرنے اور نیکی کی راہ میں آگے بڑھنے کا ذریعہ

بنے گا، اس کے ساتھ ان کے لیے دعا بھی کیجیے کیونکہ آپ کی دعا ان کے اطمینانِ قلب کا باعث ہوگی اور اللہ خوب سننے اور جاننے والا ہے O کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور ان کے صدقات منظور فرماتا ہے بلاشبہ اللہ ہی توبہ کرنے والا اور بے حد مہربان ہے O اور آپ ان سے فرما دیجیے کہ عمل کیے جاؤ اوّل تو دنیا ہی میں اللہ اور اس کا رسول اور اہلِ ایمان تمہارا طرزِ عمل دیکھ لیں گے ورنہ آخرت میں تو بہر حال تمہیں اس اللہ کے حضور پیش ہونا ہے جو ظاہر اور پوشیدہ کا جاننے والا ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم دنیا میں کرتے رہے تھے O اور کچھ اور لوگ بھی ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے تک ملتوی ہے چاہے تو اللہ انہیں سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ کرلے اور اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے O

﴿تفسیر﴾

شانِ نزول

﴿۱۰۲﴾......حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے گئے تو مخلص صحابہ میں سے چھ حضرات ایسے تھے جو کسی صحیح عذر کے بغیر اس غزوہ میں شرکت نہ کر سکے انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ان میں سے حضرت ابولبابہ اور دو دوسرے افراد نے اپنے آپ کو مسجدِ نبوی کے ستونوں کے ساتھ باندھ لیا اور کہہ دیا کہ ہم اس وقت تک اپنے آپ کو آزاد نہیں کریں گے جب تک کہ خود رسول اللہ ﷺ اپنے دستِ مبارک سے ہمیں آزاد نہ فرمائیں، رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس تشریف لائے تو آپ نے ان لوگوں کے بارے میں سوال کیا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے تبایا گیا کہ غزوہ میں عدمِ شرکت پر ندامت کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا ہے اور یہ عہد بھی کیا ہے کہ جب تک آپ نہیں کھولیں گے یہ یونہی بندھے رہیں گے، آپ نے فرما دیا کہ جب تک مجھے اللہ کی طرف سے حکم نہیں دیا جائے گا میں ان کی رسّیاں نہیں کھولوں گا، چنانچہ یہ آیتِ کریمہ ﴿وآخرون اعترفوا﴾ نازل ہوئی تو آپ نے ان کی معذرت قبول کرتے ہوئے انہیں آزاد کر دیا، بقیہ تین افراد کا معاملہ آگے آرہا ہے۔{۱۹۹}

یہ آیتِ کریمہ اگرچہ چند مخصوص افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر اس کا حکم قیامت تک ان تمام مسلمانوں کے لیے عام ہے جن کے اعمال ملے جلے ہوں، اگر وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلیں تو ان کے لیے مغفرت کی اُمید ہے۔{۲۰۰}

{۱۹۹} روح المعانی ۱۷/۷

{۲۰۰} تفسیر منیر ۲۲/۱۱

حدیث میں بھی اس قسم کے لوگوں کا ذکر آیا ہے چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس میں انہوں نے واقعۂ معراج کی تفصیل بیان کی ہے، اس روایت میں یہ بھی ہے کہ سرورِ عالم ﷺ کے سامنے کچھ ایسے لوگ آئے جن کے چہرے کا کچھ حصہ ازحد حسین اور کچھ بے حد قبیح تھا، انہیں نہر میں غسل دے کر واپس لایا گیا تو ان کی بدصورتی ختم ہو چکی تھی اور وہ بے حد حسین نظر آرہے تھے ان کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اچھے اور برے دونوں قسم کے اعمال کیے تھے، اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔{۲۰۱}

زکوٰۃ یا کفّارہ؟

﴿۱۰۳﴾......حضرت ابولبابہ اور ان کے ساتھیوں کو جب رسیوں سے آزاد کر دیا گیا تو وہ اپنے اموال لیکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ انہیں ہماری طرف سے صدقہ کر دیجیے اور ہمارے لیے استغفار کیجیے، آپ نے فرمایا کہ ''مجھے تمہارے اموال میں سے کسی چیز کے لینے کا حکم نہیں دیا گیا'' اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، چنانچہ آپ نے ان کے اموال میں سے کچھ حصہ لے کر صدقہ کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو ان لوگوں کے اموال میں سے جس صدقہ کی وصولی کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد اس گناہ کا کفارہ ہے جو ان حضرات سے غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے کی صورت میں ظاہر ہوا یا اس سے فرض زکوٰۃ مراد ہے؟ دونوں ہی قول تفسیروں میں منقول ہیں، امام حسن بصریؒ وغیرہ اسے کفارہ قرار دیتے ہیں{۲۰۱} جبکہ اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ مراد ہے جو کہ ہر صاحبِ نصاب، عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہوتی ہے۔{۲۰۲}

سوال ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں ماقبل کے مضمون سے اس آیت کی مناسبت کیا ہوگی؟ تو جواب یہ ہے کہ ان حضرات نے خود اقرار کیا تھا کہ ہمارے تخلّف کا اصل سبب مال کی محبت تھی اور آئندہ اس کی محبت ہم اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیں گے تو ان سے کہا گیا کہ تمہارے دعوٰی کی سچائی تب ظاہر ہوگی جب تم اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا کرو گے اس لیے کہ عمل اور معنی کے بغیر خالی خولی دعووں کا اللہ کے ہاں کوئی اعتبار نہیں، علاوہ ازیں ان کا گناہ تو اگرچہ

{۲۰۱} بخاری ۶۷۴/۲

{۲۰۱} وهذا قول الحسن، وكان يقول ليس المراد من هذه الآية الصدقة الواجبة وانّما هي كفارة الذنب الّذي صدر منهم۔ (كبير ۱۴۳/۱۶)

{۲۰۲} وعن الجبائي ان المراد بها الزكاة۔ (روح المعانی ۲۰/۷)، والصحيح انها الزكوات المفروضات۔ (احكام القرآن للجصاص ۱۴۸/۳)

توبہ سے معاف ہوگیا تھا مگر اس کی معافی کے باوجود اس کی ظلمت اور کدورت زکوٰۃ کی ادائیگی سے دور ہوگئی۔

جب ہم نے اس سے فرض زکوٰۃ مراد لے لی تو یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ نہ تو زکوٰۃ کی وصولی کا حکم نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص تھا اور نہ ہی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ان صحابہ تک محدود تھا بلکہ یہ حکم پوری امت کے لیے ہے،{۲۰۳} کوئی بھی حکم اس وقت تک اپنے شانِ نزول تک محدود نہیں ہوتا جب تک تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو، جب آقا ﷺ دنیا میں نہ رہے تو اب جو بھی شخص مسلمانوں کا امیر ہوگا وہ اس آیت کا مخاطب ہوگا کہ مسلمانوں کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کر کے صحیح مصرف پر خرچ کرنے کا انتظام کرو؟۔{۲۰۴}

خلیفۂ اوّل کی عزیمت

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جو مختلف فتنے اٹھے تھے ان میں سے ایک فتنہ ان لوگوں کا تھا جنہوں نے اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود بیت المال میں زکوٰۃ جمع کرانے سے انکار کر دیا تھا، استدلال یہ تھا کہ اللہ نے زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم صرف آنحضرت ﷺ کو دیا تھا، آپ ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہم سے زکوٰۃ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پورے عزم کے ساتھ اعلان فرمادیا کہ میں اس وقت تک ان کے ساتھ جہاد کرتا رہوں گا جب تک کہ جانور کی وہ رسّی بھی بیت المال میں جمع نہ کرائیں جو حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں جمع کرایا کرتے تھے، آپ کی عزیمت کی وجہ سے دوسرے فتنوں کی طرح یہ فتنہ بھی بہت جلد دم توڑ گیا ورنہ اندیشہ تھا کہ کہیں اسلامی احکام مذاق نہ بن کر رہ جائیں، آج زکوٰۃ نشانہ بنی، کل نماز اور روزہ نشانہ نہ بن جائیں۔ کوئی صاحبِ نظر ہی اندازہ کرسکتا ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عزیمت اور استقامت کا جو مختلف فتنوں کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہوگئے تھے اور انہوں نے سرکش موجوں میں گھری ہوئی امتِ اسلامیہ کی کشتی کو اس وقت ساحل پر لگایا تھا جب دشمن اس کے ڈوب جانے کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔

﴿۱۰۴﴾...... کیا یہ توبہ کرنے والے اور سارے اہلِ ایمان جانتے نہیں ہیں کہ اللہ توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات پر اجر و ثواب سے نوازتا ہے؟

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ ایمان کو توبہ اور صدقہ خیرات کی ترغیب دی گئی ہے۔

{۲۰۳} فالظاھر انّھم وسائرالناس سواء فی الاحکام والعبادات وانّھم غیر مخصوصین بھادون غیرھم من النّاس۔ (احکام القرآن للجصّاص ۱۴۸/۳)

{۲۰۴} "خذمن اموالھم" لیس مقصورًا علی النّبی ﷺ وانّما یشمل الأئمۃ بعدہ۔ (تفسیر منیر ۱۱/۳۵)

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَالتَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ توبہ قبول کرنا اللہ کی شان بھی ہے اور اس کی خصوصیت بھی، صرف وہی ہے جو خطا کاروں کی توبہ قبول کرتا اور ان پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے، نہ معلوم کتنی ہی آیات اور احادیث میں بندوں کو توبہ کی ترغیب دی گئی ہے، ہمارا اللہ توبہ کی ترغیب بھی دیتا ہے اور توبہ کرنے والوں سے محبت بھی کرتا ہے، کوئی عمل ایسا نہیں جس کے کرنے سے بندہ اتنی جلدی اللہ کا محبوب بنتا ہو جتنی جلدی توبہ کرنے سے اللہ کا محبوب بنتا ہے، توبہ سے محبوبیت کے مراحل منٹوں میں طے ہوتے ہیں، ندامت کے آنسو زمین پر گرنے سے قبل ہی رحمت کی چادر میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔

﴿۱۰۵﴾...... آپ ان توبہ کرنے والوں سے فرما دیجیے کہ تم عمل کرتے رہو تمہارا کوئی عمل بھی اللہ سے مخفی نہیں، وہ اپنے رسول اور اہلِ ایمان کو بھی تمہارے اعمال کے بارے میں مطلع فرما دے گا، یہ اطلاع قیامت کے دن تو لازماً ہو گی دنیا میں بھی ہو سکتی ہے، انسان کتنے حجابوں میں ہی عمل کیوں نہ کرے اللہ اسے انسانوں پر ظاہر فرما دیتا ہے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اگر بالفرض تم میں سے کوئی کسی بند چٹان میں عمل کرے جس میں نہ کھڑکی ہو نہ دروازہ، اللہ اسے بھی انسانوں پر ظاہر فرما دے گا وہ کیسا ہی عمل کیوں نہ ہو''۔{۲۰۵}

بلکہ ایک حدیث سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان جو بھی اعمال کرتا ہے ان کے بارے میں اس کے مرحوم رشتہ داروں کو برزخ میں اطلاع دی جاتی ہے اگر وہ اعمال اچھے ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر برے ہوں تو وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اسے اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرما۔{۲۰۶}

﴿۱۰۶﴾...... غزوۂ تبوک میں شرکت سے محروم رہ جانے والے تین قسم کے لوگ تھے:

۱...... خالص منافق جو نفاق پر اڑے رہے۔

۲...... وہ مخلص مومن جنہوں نے اپنے آپ کو ستونوں سے باندھ لیا تھا اور انہیں اس وقت کھولا گیا تھا جب ان کی توبہ کا اللہ نے اعلان فرمایا تھا۔

۳...... وہ سچے اہلِ ایمان جنہوں نے اپنی کاہلی اور غلطی کا صاف صاف اقرار کر لیا تھا مگر اپنے آپ کو کسی ستون سے نہیں باندھا، حضور اکرم ﷺ نے ان کے معاملے کو مؤخر کر دیا تھا اور انہیں اپنی توبہ کی قبولیت کے لیے پچاس دن انتظار کرنا پڑا تھا یہ پچاس دن ان کی زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔

اس آیتِ کریمہ میں انہی حضرات کا ذکر ہے، یہ تین مخلص صحابی تھے، ان کے معاملے کو باری تعالیٰ نے عذاب

{۲۰۵} مسند احمد ۲۸/۳

{۲۰۶} مسند احمد ۱۶۵/۳

اورتوبہ کے درمیان معلق رکھا مگر کسی شک اور تردّد کی وجہ سے نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ شک اور تردّد سے پاک ہے بلکہ ان کے دلوں میں خوف اور اُمید کی کیفیت پیدا کرنے اور غم کی آگ بڑھکانے کے لیے تاکہ وہ سچے دل سے توبہ کریں چنانچہ ایسا ہی ہوا، غم کی شدت کا تو یہ عالم تھا کہ انہیں لگتا تھا ہمارے سینے اس کی شدّت سے پھٹ جائیں گے اور توبہ ایسی قبول ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دائمی کتاب میں اس کا ذکر محفوظ کر دیا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ خوب جانتا ہے کہ کون سزا کا مستحق ہے اور کون عفو و درگزر کے قابل ہے اور کونسی چیز بندوں کے تزکیہ وتربیت کے لیے ضروری ہے اور کونسی غیر ضروری ہے، وہ حکیم بھی ہے اس کا ہر قول وفعل حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

حکمت وہدایت

۱......یوں تو پورا قرآن دلوں میں امید کا چراغ روشن کرتا ہے مگر چند آیات ایسی ہیں جنہیں گناہگاروں کے دل میں سب سے زیادہ امید پیدا کرنے والی قرار دیا جاتا ہے ان میں سے ایک سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۲ بھی ہے۔

۲......مسلمانوں کی اکثریت ایسی ہے کہ ان کے اعمال ملے جلے ہیں وہ اطاعت وعبادت بھی کرتے ہیں اور ان سے گناہ بھی سرزد ہو جاتے ہیں، ان میں سے توبہ کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی امید رکھنی چاہیے۔(۱۰۲)

۳......قرآن کریم ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مختلف عقائد وخیالات اور اخلاق واعمال کے لوگ اپنا چہرہ دیکھ سکتے اور صراحۃً یا اشارۃً اپنا ذکر پڑھ سکتے ہیں۔

۴......صدقہ گناہوں کے لیے کفّارہ بنتا ہے اور دلوں کو حرص اور بخل جیسے گناہوں کی نجاست سے پاک کر دیتا ہے۔(۱۰۳)

۵......صدقہ وخیرات سے انسان کو خود بھی روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور پوری قوم بھی اس سے مستفید ہوتی ہے مگر قرآن نے یہاں صرف پہلا فائدہ بیان کرنے پر اس لیے اکتفا کیا ہے تاکہ بتایا جائے کہ اصل مقصود پہلا فائدہ ہی ہے، اگر بالفرض زکوٰۃ کا کوئی مصرف باقی نہ رہے تو بھی مالداروں سے زکوٰۃ کا حکم ساقط نہیں ہوگا۔

۶......صدقہ وصول کرنے والوں کے لیے مستحب ہے کہ وہ صدقہ دینے والے کے لیے دعا کرے۔(۱۰۳)

۷......حضورِ اکرم ﷺ نے صدقہ دینے والوں کے لیے ان الفاظ میں دعا فرمائی تھی ﴿اللّٰھم صلّ علیٰ آل ابی اوفی﴾ ''اے اللہ! ابو اوفی کی آل پر رحمت نازل فرما''{۲۰۷}

{۲۰۷} بخاری، دعوات، ۶۳۳۲ باب ۱۹، قول اللہ تعالیٰ ''وصلّ علیھم

بعد میں صلوٰۃ کا لفظ انبیاء کے لیے مخصوص ہوگیا اس لیے اکثر فقہاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اب کسی کے لیے لفظِ صلوٰۃ سے دعا نہ کی جائے بلکہ اس لفظ کو صرف انبیاء علیہم السلام کے لیے مخصوص رکھا جائے تاکہ اشتباہ نہ ہو۔{۲۰۸}

۸......اصل میں صدقات لینے اور قبول کرنے والا اللہ ہے، نبی ہو یا غیر نبی یہ اللہ اور بندے کے درمیان واسطہ ہیں۔(۱۰۴)

صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لایتصدق احدبتمرة من کسب طیب الا اخذها الله بیمینه، فتربو فی کف الرحمن حتی تکون اعظم من الجبل﴾{۲۰۹}

''جب کوئی اپنی حلال کمائی میں سے ایک کھجور بھی صدقہ کرتا ہے تو اللہ اسے اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے پھر وہ رحمان کے ہاتھ میں بڑھتی رہتی ہے حتّٰی کہ پہاڑ سے بھی بڑی ہوجاتی ہے۔''

۹......خوف اور اُمید کی بڑی فضیلت ہے، خوف انسان کو گناہوں کے چھوڑنے پر اور اُمید زیادہ سے زیادہ نیکیاں جمع کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔(۱۰۶)

مسجدِ ضرار اور مسجدِ تقویٰ

﴿۱۰۷......۱۱۰﴾

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ

اور جنھوں نے بنائی ہے ایک مسجد ضد پر اور کفر پر اور پھوٹ ڈالنے کو مسلمانوں میں اور گھات لگانے کو اس شخص کی جو لڑ رہا ہے

حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ

اللہ سے اور اس کے رسول سے پہلے سے اور وہ قسمیں کھائینگے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

لَكٰذِبُوْنَ ۞ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ

تو نہ کھڑا ہو اس میں کبھی، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد دھری گئی پرہیزگاری پر اول دن سے، وہ لائق ہے کہ تُو کھڑا ہو اس میں، اس میں

فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۞ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ

ایسے لوگ ہیں جو دوست رکھتے ہیں پاک رہنے کو اور اللہ دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو۔ بھلا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ سے

{۲۰۸} بیان القرآن، جلد ۱/ ۱۴۰

{۲۰۹} صحیح مسلم/ جلد ۱/ کتاب الزکوٰۃ صفحہ ۳۲۶

عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ

ڈرنے پراوراس کی رضامندی پر وہ بہتر یا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی کنارہ پر ایک گھاٹی کے جو گرنے کو ہے پھر اس کو لے کر ڈھے پڑا

فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا

دوزخ کی آگ میں اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔ ہمیشہ رہے گا اس عمارت سے جو انہوں نے بنائی تھی، شبہ ان کے دلوں میں،

رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

مگر جب ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں ان کے دل کے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

شانِ نزول

بنی عمرو بن عوف جو قبیلۂ اوس کے لوگ تھے، انہوں نے مسجدِ قبا تعمیر کی اور نبی کریم ﷺ سے نماز پڑھوا کر اس کا افتتاح کروایا، بنوغنم بن عوف، جو قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، ان کے لیے یہ بات باعثِ حسد بن گئی، انہوں نے کہا کہ ہم بھی مسجد تعمیر کریں گے اور نبی کریم ﷺ سے درخواست کریں گے کہ اس میں نماز پڑھائیں، نیز جب ابو عامر الراہب شام سے واپس آیا کرے گا تو وہ بھی اس میں نماز پڑھے گا، چنانچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! ہم نے حاجت مندوں، بیماروں اور بارش وغیرہ کے موسم کے لیے مسجد تعمیر کی ہے، اگر آپ اس میں آکر نماز پڑھائیں تو ہمیں خوشی ہوگی مگر اس موقع پر آپ غزوۂ تبوک کی تیاری میں مصروف تھے لہٰذا آپ نے معذرت کرلی، جب آپ تبوک سے واپس تشریف لائے تو یہ لوگ دوبارہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اس سے پہلے وہ تین دن یعنی جمعہ، ہفتہ، اتوار، اس مسجد میں نماز ادا بھی کرچکے تھے، آپ ﷺ نے اپنی قمیص منگوائی تاکہ وہ زیبِ تن فرما کر قبیلۂ خزرج کی تعمیر کردہ اس مسجد میں نماز پڑھائیں، ابھی آپ نے یہ ارادہ ہی فرمایا تھا کہ قرآن مجید کی یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوگئی ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا ...... الخ﴾

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بعد آپ نے مالک بن دخشم، معن بن عدی اور اس کے بھائی عاصم بن عدی کو بلوایا اور انہیں حکم دیا کہ جاؤ! اس مسجد کو گرا کر جلادو جس کے بنانے والے ظالم ہیں، چنانچہ ان حضرات نے اس مسجد کو منہدم کرنے کے بعد آگ لگادی۔ {۲۱۰}

ابو عامر کا تعارف

مذکورہ بالا سطور میں ابو عامر الراہب نامی شخص کا ذکر ہے یہ بھی قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتا تھا اور مذہباً عیسائی تھا،

{۲۱۰} روح المعانی، الجزء الحادی عشر/۶۶،۶۷

اسے اہلِ کتاب میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ شخص حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ (غسیل الملائکہ) کا والد تھا، نبی کریم ﷺ اسے فاسق کے نام سے پکارتے تھے، غزوۂ احد کا جو معرکہ ہوا، اس میں مشرکین کی طرف سے یہ بھی شریک تھا اور اس معرکہ کے لیے مشرکین کو ابھارنے میں پیش پیش تھا، نبی کریم ﷺ نے اس شقی القلب کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت فرما کر اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دی مگر اس نے بڑے تکبر سے آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، آپ نے اس کے لیے بددعا فرمائی کہ یا اللہ! اسے اپنے وطن سے دور جلاوطنی کی حالت میں موت دینا، چنانچہ آپ کی بددعا قبول ہوئی اور اسے ایسی حالت میں ہی موت آئی، غزوۂ احد کے بعد یہ ہرقل، بادشاہِ روم کے پاس گیا (بعض روایات میں غزوۂ خندق اور بعض میں غزوۂ حنین کا ذکر ہے) وہاں سے اس نے اپنے منافق ٹولے کو پیغام بھیجا کہ میں عنقریب قیصرِ روم کی طرف سے ایک ایسے لشکر کے ساتھ آؤں گا جو محمد ﷺ سے لڑے گا اور ان پر غلبہ پالے گا لہٰذا تم کوئی ایسی پناہ گاہ بناؤ جہاں میں اور میرا لشکر آکر ٹھہریں چنانچہ اس کے اس مشورہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے منافقین کے بارہ افراد نے یہ مسجد بنا ڈالی۔

تسہیل: بعض منافق ایسے ہیں جنہوں نے اس غرض سے مسجد بنائی کہ اسلام کو نقصان پہنچائیں اور وہاں بیٹھ کر کفر کے منصوبے بنائیں، مسلمانوں میں تفرقہ ڈالیں اور ان لوگوں کو قیام کی جگہ فراہم کریں جو پہلے ہی سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں اور اگر ان سے پوچھا جائے تو وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارے پیشِ نظر بھلائی کے سوا کچھ نہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے دعوے میں بالکل جھوٹے ہیں ○ اے میرے حبیب! آپ اس مسجد میں کبھی بھی نماز کے لیے کھڑے نہ ہونا البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد روزِ اوّل ہی سے تقوی پر رکھی گئی ہے وہ واقعی اس لائق ہے کہ آپ اس میں نماز کے لیے کھڑے ہوں اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک صاف رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ بھی ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو خوب پاک صاف رہتے ہیں ○ خود ہی سوچو کیا وہ شخص بہتر ہے جو اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھتا ہے یا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسی گھاٹی کے کنارے پر رکھی ہے جو گرنے کو ہے پھر وہ واقعی اپنے بانی کو لے کر دوزخ کی آگ میں جا گرے، اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا ○ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی الا یہ کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ علم والا بھی ہے اور حکمت والا بھی ○

تفسیر

﴿۱۰۷﴾......منافقین نے مسجد قباء کے مقابلے میں مسجدِ ضرار کی جو بنیاد رکھی، اس کے چار بڑے اسباب تھے:

(۱)......اہلِ قباء کو ضرر پہنچانا۔

(۲)......نبی کریم ﷺ اور آپ کے پیغام کے خلاف اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک مرکز قائم کرنا۔

(۳)......مسلمانوں کی جمعیّت کو منتشر کرنا۔

(۴)......اپنے سرغنہ، ابو عامر الرّاہب کے لیے قرار گاہ بنانا۔

﴿وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ﴾ مسجدِ ضرار کو منافقین نے بنایا تو اپنے مذموم مقاصد کی خاطر تھا لیکن قسمیں کھا کر ظاہر یہ کیا کہ اس کی تعمیر سے ہمارا مقصود مسلمانوں کی بھلائی ہے تاکہ کمزور، بیمار اور وہ لوگ جو بارش، آندھی کی صورت میں دور نہیں جاسکتے وہ یہیں نماز پڑھ لیا کریں۔

﴿وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾ اللہ دلوں کے راز جاننے والا ہے، وہ منافقین کے دلوں میں پوشیدہ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت سے باخبر ہے، وہ جانتا ہے کہ منافقین اس مسجد سے متعلق بیان کردہ کسی بات میں بھی سچے نہیں۔

﴿۱۰۸﴾......﴿لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا﴾ قرآن نے "لاتصلِّ فیہ ابدًا" (آپ اس میں کبھی بھی نماز نہ ادا کریں) کے الفاظ استعمال نہیں کیے بلکہ "لَا تَقُمْ" فرمایا، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں "قیام" کا لفظ "صلوٰۃ" کے معنی میں ہے اور قرآن سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے، مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾ {۲۱۱}

اسی طرح سورۂ مزمّل میں ہے: ﴿قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ {۲۱۲} یہاں قیام، صلوٰۃ ہی کے معنیٰ میں ہے۔

﴿لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ﴾ سیاقِ کلام سے پتہ چلتا ہے کہ مسجدِ تقویٰ، مسجدِ قبا ہی کو کہا گیا ہے اس لیے کہ اسے مسجدِ ضرار کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے، سیاق کے علاوہ احادیث سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب میں نے نبی کریم ﷺ سے مسجدِ تقویٰ کے بارے میں سوال کیا کہ یہ کونسی مسجد ہے، تو آپ نے اپنے دستِ مبارک میں چند کنکر پکڑے اور انہیں زمین پر مارا، پھر فرمایا "ھو مسجد کم ھٰذا" {۲۱۳}

{۲۱۱} البقرۃ/۲۳۸

{۲۱۲} المزمل/۲

{۲۱۳} مسلم، حج، حدیث ۵۱۴

• مسند احمد وغیرہ کی روایت میں ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا تو آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا "ھو مسجدی ھذا"{۲۱۴}

اللہ تعالیٰ نے اخلاص وخشیّت سے تعمیر کی گئی اس مسجد کو بڑا عجیب نام دیا، اور اسے مسجدِ تقویٰ فرمایا، تقوی ایک ایسا جامع لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ کام جو رضائے الٰہی کا سبب بنے، وہ کیا جائے اور ہر وہ فعل جس سے بارگاہِ ایزدی میں دھتکارے جانے کا خطرہ ہو، اس سے باز رہا جائے، یہ میرے آقا کے شیدائی تھے جو اس صفت سے علیٰ وجہ الکمال متصف تھے، انہی اہلِ تقوٰی کی مسجدِ تقوٰی میں اللہ اپنے حبیب کو عبادت کا حکم فرمارہے ہیں کہ جس مسجد کا مقصد ہی اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا، مسلمانوں کی جمعیّت کو انتشار سے بچانا ہے، آپ اس میں نماز ادا کریں۔

شانِ نزول

﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا﴾ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے انصار کی ایک جماعت سے پوچھا کہ اے انصار! اللہ نے تمہاری پاکیزگی کی تعریف کی ہے، تم حاجت کے بعد پاکی کیسے حاصل کرتے ہو؟

انہوں نے جواب دیا ہم حاجت کے بعد پہلے تین پتھر استعمال کرتے ہیں پھر پانی استعمال کرتے ہیں، یہ جواب سُن کر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مسجدِ تقوٰی میں عبادت کی ادائیگی کو ترجیح دینے کی دوسری علت بتائی جارہی ہے کہ ایک تو مسجد نیک نیتی سے بنائی گئی ہے اور دوسرے اس مسجد والے خود بھی پاک صاف ہیں، "يَتَطَهَّرُوا" میں مبالغہ والا معنی پایا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے پاک صاف ہیں، ظاہر کے اعتبار سے بھی اور باطن کے اعتبار سے بھی جبکہ منافقین ہر اعتبار سے آلودہ ہیں، ان کی زبانیں بھی آپ کی گستاخی میں دراز ہوتی رہتی ہیں اور ان کے دلوں میں بھی بغض وحسد کی آگ جل رہی ہے۔

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾ چونکہ یہ ظاہری طہارت کا اہتمام کرتے ہیں اور وضو، غسل وغیرہ کے ذریعے اپنا جسم پاک رکھتے ہیں اور معنوی طہارت کا بھی لحاظ رکھتے ہیں چنانچہ ذکر ودعا، تسبیح وتہلیل، نماز، روزہ جیسی عبادات سے روحانی حیات حاصل کرتے ہیں تو اللہ بھی ایسے پاکیزہ نفوس کو پسند کرتا ہے، ان سے محبت کرتا ہے اور انہیں قرب نصیب کرتا ہے، بعض مفسرین نے "یتطھروا" سے مراد گناہوں اور اخلاقِ مذمومہ سے اجتناب

{۲۱۴} مسند احمد ۸/۳، ۵/۱۱۶، ۳۳۱، ۳۳۵/ النسائی، مساجد، باب ۸۸/ ترمذی کتاب التفسیر، سورۃ ۹، باب ۱۴

لیا ہے، {۲۱۵} اور بعض نے ''جنابت'' سے پاکی مراد لی ہے۔ {۲۱۶}

﴿۱۰۹﴾...... اس آیتِ کریمہ میں دونوں مسجدوں کا مقصد اور ان کے درمیان فرق بیان کیا گیا ہے، مسجدِ ضرار بنانے والے منافقوں کا مقصد اہلِ قبا کو اذیت پہنچانا تھا چانچہ اس مذموم مقصد کی وجہ سے ان کے باطنی خبث میں اور اضافہ ہوتا گیا جبکہ اہلِ قباء نے مسجدِ قباء کی بنیاد خالصتاً لوجہ اللہ رکھی تھی، چنانچہ وہ اس نیت کی وجہ سے اللہ کے مزید قریب ہو گئے۔

اس فرق کو بیان کرنے کا مقصد ذہنوں میں یہ حقیقت بٹھانا ہے کہ اسلام سچا دین ہے چنانچہ اس کے دوام اور قوت کو کمزور نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ اس کے ماننے والوں کو اللہ مختلف انعامات سے نوازیں گے جن میں سب سے برا انعام رب تعالیٰ کی رضا ہے، دینِ حق کے مقابلے میں ادیانِ باطلہ مکڑی کے جالے کی مانند کمزور اور بے جان اور ان کے ماننے والے اپنے بُرے اعمال کی وجہ سے ہمیشہ نقصان میں رہے ہیں اور انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، منافقین نے جس بری نیّت سے مسجدِ ضرار بنائی تھی اس میں انہیں ذلّت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا، دنیا کی اس ذلّت کے علاوہ انہیں جہنّم کے دائمی عذاب کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ مسجدِ ضرار اور مسجدِ قبا کے اہداف بیان کرنے کے بعد منافقین کا انجام بیان کیا کہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ عقائد و اخلاق کی بنیاد پر اعمال کی توفیق عطا فرماتا ہے اور منافق عقائد کے کھوٹے اور اخلاق کے اعتبار سے رذیل ہوتے ہیں اس لیے انہیں ایسے اعمال کی توفیق بھی نہیں ہوتی جو ہدایت کا ذریعہ اور سبب بنتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا:

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا ... الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ رَسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ {۲۱۷}

''کیسے ہدایت دے گا اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لانے کے بعد، رسول کی حقانیت کی گواہی دینے کے بعد اور واضح دلائل آ جانے کے بعد کفر کرتے ہیں اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت عطا نہیں کرتا''

﴿۱۱۰﴾...... ''ریب'' نفس کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے دل میں اضطراب، شک اور تردّد پرورش کرتا رہتا ہے، یقین کی کمزوری اور دوغلے پن کی وجہ سے وہ مسجدِ ضرار جسے منافق تعمیر کر کے خوش تھے کہ اب ہم مسلمانوں کے

{۲۱۵} وفسره بعضهم بالتخلّص عن المعاصي والخصال المذمومة۔ (روح المعانی ۳۱/۷)

{۲۱۶} لا ینامون اللیل علی الجنابۃ۔ (کشاف ۲۹۶/۲)

{۲۱۷} آل عمران/۸۶

خلاف سازشوں کا ایک مرکز بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، وہی بالآخران کے دل میں چھپی منافقت کا پول کھولنے کا سبب بن گئی اور نبی کریم ﷺ کو بذریعۂ وحی اطلاع ہو گئی کہ یہ مسجد بنانے والے اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں بلکہ منافق ہیں جن کی فطرت میں اسلام سے دشمنی اور کفر سے دوستی ہے۔

انہیں اس مسجد کی تعمیر کے وقت سے ہی یہ خدشہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کو بذریعۂ وحی ان کی شیطنت کی اطلاع مل جائے گی تو آپ اس کو منہدم کروا دیں گے اس لیے کہ وہ اپنے دل میں چھپی آلودہ نیتوں سے بہرحال واقف تھے، شک اور اضطراب صرف ان منافقوں کے ساتھ خاص نہیں جو مسجدِ ضرار کے بانی تھے بلکہ یہ وہ کیفیت ہے جس کا سامن ہر منافق کو کرنا پڑتا ہے، نفاق اور شک ایسے ہی لازم ملزوم ہیں جیسے دل اور دھڑکن، سورۂ توبہ میں ارشادِ باری ہے:

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ {۲۱۸}

''منافقوں کو ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کوئی سورت مسلمانوں پر ایسی نہ اترے جو ان کے دلوں کی باتیں انہیں بتا دے''

اسی طرح سورۃ المنافقون میں ہے:

يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ {۲۱۹}

''وہ ہر سخت آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں''

﴿اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ﴾ تقطّع میں تین قرأتیں ہیں، ایک تو مذکورہ قرأت یعنی تا کا فتحہ اور طاَ کی تشدید، دوسری قراءت، تاء کا ضمہ ہے یعنی باب تفعیل سے، اور معنی یہ کہ یہ شک اور تردّد ان کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

علامہ زمخشری نے یہاں یہ معنی بیان کیا ہے کہ مسجدِ ضرار کا انہدام ان کے شک اور نفاق میں اضافہ کرتا چلا جائے گا اور اس انہدام کا صدمہ وہ بھول نہیں پائیں گے، ہاں جب یہ صدمہ ان کی جان لے لے گا تو پھر ان کے دلوں کو تسلّی ہو گی، لیکن جب تک ان کے دل ان کے سینوں میں دھڑکتے رہیں گے وہ اضطراب کی کیفیت سے دوچار رہیں گے۔

بعض حضرات نے یہ معنی بھی کیا ہے کہ جب تک وہ صدقِ دل سے توبہ نہیں کریں گے شک اور تردّد کا بیج ان کے دلوں میں نشوونما پاتا رہے گا اور جب وہ صدق سے سے توبہ کر کے اپنے فعل پر نادم ہوں گے تو توبہ کی برکت سے اللہ انہیں اس روحانی بیماری سے نجات عطا فرما دیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ مخلوق کے اعمال کو جانتا بھی ہے کہ کون کیا کر رہا ہے اور وہ حکیم بھی ہے، اسی حکمت کی بناء پر ہی اس نے منافقوں کے حالات تمہارے اوپر منکشف فرما دیے تاکہ تمہیں حقیقت تک پہنچنے میں آسانی ہو اور دوست، دشمن کو پہچان سکو۔

{۲۱۸} التوبة/۶۴

{۲۱۹} المنافقون/۴

حکمت وہدایت

۱......مسجدِ ضراران چار مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے بنائی گئی تھی جو اس آیت کی تفسیر میں گزر چکے اور اس کو مسجدِ ضرار منافقوں کی شرارتوں کی بنا پر کہا گیا ہے ورنہ فی ذاتہ اس مسجد میں کوئی ضرر کی بات نہ تھی، یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی صورت تو مسجدوں کی سی تھی مگر حقیقتاً وہ مسجد تھی ہی نہیں۔

۲......مذکورہ آیت کی بناء پر مالکیہ نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ جو مسجد بھی کسی کے ضرر، ریاً اور دکھلاوے کے لیے بنائی جائے وہ مسجدِ ضرار ہی کے حکم میں ہوگی۔

۳......جو شخص کسی ظالم قوم کا امام ہو اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے ہاں اگر کوئی معقول عذر اس کے پاس ہو یا وہ توبہ کر لے تو پھر اسے امام بنایا جا سکتا ہے۔ مجمع بن جاریہ کو مسجد قباء کی امامت سے روک دیا تھا جو مسجدِ ضرار میں امامت کرواتا تھا، پھر جب اس نے بتایا کہ مجھے منافقوں کی خفیہ سازش کے بارے میں معلومات نہ تھیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔{۲۲۰}

۴......ہر وہ چیز جو دوسروں کی تکلیف کا سبب بنے اسے منہدم کرنا جائز ہے مثلاً روٹی پکانے کے تنور کے لیے کسی غیر مناسب جگہ کا انتخاب، اسی طرح کنواں، چکی وغیرہ جو دوسروں کے ضرر کا سبب بنتے ہوں۔

۵......ابنِ عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منافقین نے مسجدِ ضرار بنا کر گویا اس بات کا ثبوت دیا کہ مسجدِ قباء اور مسجدِ نبوی کی کوئی تعظیم وحرمت نہیں اور اس اعتقاد کی وجہ سے وہ کافر ٹھہرے۔

۶......منافقوں کا مقصد مسجد ضرار کی تعمیر سے یہ تھا کہ اس بہانے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے تاکہ ان کے دل میں جو ہماری عداوت ہے وہ نکل جائے، موجودہ دور کے بعض منافق بھی مخلص مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے اور اپنا نفاق چھپانے کے لیے ان کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

۷......اسلام ظاہری وباطنی ہر قسم کی نظافت کی ترغیب دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اہلِ قباء کی تعریف فرمائی۔
نجاست زائل کرنے کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ کے نزدیک ازالۂ نجاست واجب اور فرض ہے، چنانچہ اگر کسی شخص نے نجاست زدہ کپڑوں میں نماز پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوگی چاہے اسے نجاست کے ہونے کا علم تھا یا نہیں تھا، امام مالک رحمہ اللہ کا ایک قول بھی یہی ہے جبکہ دوسرا قول ازالۂ نجاست کے سنت ہونے کا ہے۔

{۲۲۰}تفسیر منیر ۴۸/۱۱

پیمانہ: 1 سنٹی میٹر = 2925 میٹر
مجمع الاسیال کی طرف
وادی قناۃ
بنوحارثہ
جرف
مجمع الاسیال کی طرف
عرصہ
بنوعبدالاشہل وزعوراء
عبیت
السافلہ
ثنیۃ الوداع
ثنیۃ الثور
بنوسلمہ
راس الثنیہ
بنوظفر
بنوحارث بن خزرج
بدائع
مسجد رسول اللہ ﷺ
بنونجار
(مالک ومازن
اوردینار وعدی)
البقیع
حرۂ واقم
(الحرۃ الشرقیہ)
حرۂ وبرہ
(الحرۃ الغربیہ)
جبل سلع
وادی بطحان
بنوزریق
بنوواقف
بنوساعدہ
بنوحارث بن خزرج
بنوقینقاع
بنوبیاضہ
یثرب
وادی مہزور
بنوسالم بن عوف
بنوقریظہ
جبل بنی عبید
وادی مذینب
وادی العقیق
جبل حمارات
العالیہ
بنونضیر
بنوعوف بن خزرج
قلعہ کعب بن اشرف
وادی رانوناء
عصبہ
بنوعوف بن مالک بن اوس
مسجد قباء
قباء
مکہ کو
بنوانیف
جبل عیر
مسجد قُباء
﴿لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ ”نہ کھڑے ہوں آپ اس مسجد (ضرار) میں کبھی بھی، البتہ وہ مسجد کہ بنیاد رکھی گئی ہے (اس کی) تقویٰ پر پہلے ہی دن سے، زیادہ حق دار ہے اس کی کہ کھڑے ہوں آپ اس میں، اس میں تو ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں اس بات کو کہ پاک ہوں وہ اور اللہ پسند کرتا ہے پاک رہنے والوں کو۔“ (التوبہ: 108/9)
اطلس القرآن اردو

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نجاست بقدرِ درھم یعنی ہتھیلی کے اندرونی حصے کے برابر ہو تو اعادۂ صلوٰۃ ہے ورنہ نہیں۔

۸......رضائے الٰہی کے لیے کیا گیا عمل بارگاہِ ربّ العزت میں قبولیت اختیار کرتا ہے۔

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔ {۲۲۱}

سچے اہلِ ایمان کی صفات

﴿۱۱۱......۱۱۲﴾

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ

اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں،

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ

پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں، وعدہ ہو چکا اس کے ذمہ پر سچا توریت اور انجیل اور قرآن میں اور کون ہے قول کا پورا

وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ

اللہ سے زیادہ؟ سو خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے کیا ہے اس سے اور یہی ہے بڑی کامیابی۔ وہ توبہ کرنے والے ہیں

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ

بندگی کرنے والے، شکر کرنے والے، بے تعلق رہنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے،

السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ

حکم کرنے والے نیک بات کا اور منع کرنے والے بری بات سے، اور حفاظت کرنے والے ان حدود کے جو باندھی اللہ نے

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور خوشخبری سنا دے ایمان والوں کو۔

ربط: منافقین کی قبیح حرکات اور عدمِ قدرت کی بناء پر جہاد میں نہ جانے والے مومنین کی صفات بیان کرنے کے بعد ان مومنین کا ذکر ہے جو ایمان میں سچے اور جہاد میں پیش پیش رہتے ہیں۔

تسہیل: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنّت کے بدلے خرید لیا ہے یہ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے بھی جاتے ہیں، جنت کا یہ وعدہ سچا ہے جو تورات، انجیل اور قرآن مجید تینوں کتابوں میں مذکور ہے، اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے؟ پس اے

{۲۲۱} الکہف/۴۶

مجاہدو! تم اس سودے پر خوشیاں مناؤ جو اللہ کے ساتھ تم کر چکے ہو، اور یہی بڑی کامیابی ہے O سچے اور کامل ایمان والے وہ ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، اللہ کی حمد وثنا کرنے والے، روزے رکھنے والے، رکوع اور سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں، اے میرے پیغمبر! آپ ان مؤمنوں کو خوشخبری سنا دیجیے جن کے اندر یہ صفات پائی جاتی ہیں O

﴿تفسیر﴾

﴿۱۱۱﴾......اس آیتِ کریمہ میں جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لیے ایک منفرد انداز اختیار کیا گیا ہے، ارشادِ باری ہوا کہ میں نے مؤمنین کی جانوں اور ان کے اموال کو جنّت کے بدلے خرید لیا، جانِ تو ہے ہی پروردگارِ عالم کی امانت اور اس کی ملکیت، لیکن باوجود ملکیت کے اللہ کا یہ فرمانا اس کے فضل اور بے پایاں احسان واکرام کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے؟

﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا﴾ مؤمنوں کے ساتھ یہ وعدہ ہے، وہ اللہ نے کیا ہے، اس نے محض اپنے فضل سے یہ بات اپنے اوپر لازم کرلی ہے کہ وہ جہاد میں شہید ہونے والے مخلص مسلمانوں کو جنت اور اس کی نعمتیں عطا فرمائے گا، یہ وعدہ توراۃ، انجیل اور قرآن تینوں کتابوں میں موجود ہے، توراۃ وانجیل میں ہونیوالی تحریفات سے یہ شبہ ذہن میں آسکتا ہے کہ یہ وعدہ تو ان کتابوں میں موجود نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن دیگر کتب سماویہ کی تصدیق کرتا ہے، جب اللہ اس میں یہ فرمادیں کہ توراۃ وانجیل میں یہ وعدہ موجود تھا تو پھر یقینی طور پر یہ وعدہ ان کتابوں میں موجود ہوگا اگرچہ تحریف کے بعد ان میں موجود نہ بھی ہو۔

﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ﴾ ماقبل "وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا" کے الفاظ اللہ نے تاکید کے لیے ارشاد فرمائے اور اللہ کے ارشادات سچ پر مبنی ہوتے ہیں جیسے ارشادِ باری ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا {۲۲۲} "کون زیادہ سچا ہوسکتا اللہ سے از روئے بات کے"

سورۂ نساء ہی میں ارشاد ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا {۲۲۳} "کون زیادہ سچا ہوسکتا ہے اللہ سے قول کے اعتبار سے"

ایسی سچی ذات تم سے یہ معاملہ کررہی ہے لہٰذا اے مومنو! اس سودے پر تم خوش ہوجاؤ، جو سودا تمہاری دنیاوی اور اخروی کامیابی کا سبب بنے گا۔

{۲۲۲} النساء/۸۷

{۲۲۳} النساء/۱۲۲

نزول کے اعتبار سے اگر چہ یہ آیت انصار کے ساتھ خاص ہے لیکن حکم اس کا عام ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من سلّ سیفه فی سبل الله فقد بایع الله﴾{۲۲۴} ”جس نے راہِ خدا میں تلوار سونتی اس نے اللہ سے بیع کرلی“

ایک اور روایت میں ہے:

﴿لیس لأبدانکم ثمن الا الجنّة فلا تبیعوها الّا بها﴾{۲۲۵} ”تمہارے بدنوں کا بدلہ جنت کے علاوہ کچھ نہیں چنانچہ تم جنت کے بدلے ہی اپنے جسموں کا سودا کرنا“

حضرت حسن سے ایک قول منقول ہے، فرماتے ہیں:

﴿ماعلیٰ ظهر الأرض مومن الّا وقد دخل فی هٰذه البیعة﴾{۲۲۶} ”روئے زمین پر رہنے والا ہر مومن اس بیع میں داخل ہے“

﴿۱۱۲﴾......اس آیت میں مومنوں کی چند صفات بیان کی گئی ہیں۔

(۱)...... ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ﴾ توبہ کرنے والے اور گناہوں سے اجتناب کرنے والے۔

انسانوں کے احوال کے اعتبار سے توبہ کی مختلف قسمیں ہیں۔

کافر کی توبہ یہ ہے کہ وہ کفر چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو جائے اور جو شرک وفکر اس سے صادر ہوا اس سے توبہ کرے، اسی سورۃ میں ارشادِ باری ہے:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾{۲۲۷}

منافق کی توبہ یہ ہے کہ وہ نفاق کو چھوڑ کر اپنے حال کی اصلاح کرے۔

گناہوں میں مبتلا انسان کی توبہ یہ ہے کہ وہ گناہوں کو چھوڑ دے، جو کچھ ہو چکا، اس پر نادم ہو اور آئندہ گناہ سے بچنے کا عزم کرے۔

اعمالِ خیر میں کوتاہی کرنے والے کی توبہ یہ ہے کہ وہ نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے اور زمانہ ماضی میں ہونے والی تقصیر کا ازالہ کرے۔ اور جس شخص نے غفلت میں زندگی گزاری اس کی توبہ ذکر و شکر کی کثرت ہے۔

{۲۲۴} درمنثور/جلد۳/صفحہ ۲۸۰

{۲۲۵} تفسیر طبری/جلد ۱۱/صفحہ ۲۳

{۲۲۶} تفسیرِ منیر ۵۶/۱۱

{۲۲۷} التوبہ/۱۱

(۲-۳)......﴿الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ﴾ مؤمنین کی دوسری اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ خالص اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں پر اس کی تعریف میں رطب اللّسان رہتے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جب کوئی خوشی حاصل ہوتی تو آپ فرماتے "الحمدلله الذی بنعمته تتمّ الصّالحات" اور جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آتا تو فرماتے "الحمدلله علیٰ کلّ حال" {۲۲۸}

(۴)......﴿السّٰٓئِحُوْنَ﴾ طلبِ علم، حصولِ رزق حلال اور جہاد کے لیے اللہ کی راہ میں نکلتے ہیں۔

﴿السّٰٓئِحُوْنَ﴾ کی تفسیر بعض مفسرین نے "الصّائمون" (روزے دار) سے کی ہے، {۲۲۹} جیسا کہ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے "السائحون هم الصّائمون" {۲۳۰}

جبکہ بعض مفسرین نے اس سے ہجرت مراد لی ہے {۲۳۱} اور بعض نے اس کی تفسیر "المجاهدون" {۲۳۲} سے کی ہے۔

(۵-۶)......﴿الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ﴾ سے مراد نماز ہے، {۲۳۳} قرآن مجید میں کبھی تو نماز کے لیے صلوٰۃ ہی کا لفظ استعمال کیا گیا، کبھی اسے قیام کے ساتھ تعبیر کیا گیا، کبھی رکوع اور سجود کے ساتھ، مقصد تعبیر بدلنے سے یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں خدا کے سامنے جھکنے کا تصور نقش ہو جائے، بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ رکوع اور سجدہ کی تخصیص اس وجہ سے کی گئی ہے کہ یہ تمام ارکان میں سے اعظم واشرف ارکان ہیں، بہر حال نماز کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے تواضع بھی مؤمنین کا خاص وصف ہے۔

(۷-۸)......﴿الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ یہاں درمیان میں واؤ عاطفہ لائی جو جمیعت کا

{۲۲۸} مستدرك حاکم ۱/۴۹۹، وصحّحه الألبانی فی صحیح الجامع ۴/۲۰۱، بحواله حصن المسلم من اذکار الکتاب والسنّة صفحه ۹۰-۹۱

{۲۲۹} ای الصّائمون۔ (روح المعانی ۷، الجزء الحادی عشر، ۴۵/ احکام القرآن للجصّاص ۳/ ۱۵۸/ کشاف ۲/۲۹۹)

{۲۳۰} درمنثور/جلد ۳/صفحه ۲۸۱، کنزالاعمال حدیث رقم ۲۹۰۴

{۲۳۱} قال عطاء: السائحون المهاجرون۔ (قرطبی ۸/۲۴۶)

{۲۳۲} والمراد به من خرج مجاهدا۔ (کبیر ۶/۱۵۴)

{۲۳۳} والمراد منه اقامة الصلوات۔ (کبیر ۶/۱۵۴)

فائدہ دیتی ہے، گویا یہ بتا دیا کہ مومنین ان دونوں صفات کا مجموعہ ہوتے ہیں، وہ نیکی کا حکم بھی دیتے ہیں اور برائی سے روکتے بھی ہیں، امر بالمعروف بھی اور نہی عن المنکر بھی، ایمان و اطاعت کی دعوت دیتے ہیں اور شرک اور دیگر گناہوں سے روکتے ہیں۔ صحیح معنی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اسلامی حکومت ہی سرانجام دے سکتی ہے، ایسا نظامِ حکومت جس میں حاکمیت صرف اللہ کی تسلیم کی جائے۔

(۹)......﴿وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾ انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کے احکامات کا نفاذ چاہتے ہیں اور حدود سے تجاوز کرنے والے باغیوں، سرکشوں اور ظالموں کو لگام دینے کی کوشش کرتے ہیں، یہاں بھی یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ کی حدود کی حفاظت، اسلامی حکومت کے قیام کے بغیر ایک سہانا خواب ہے۔ جب تک اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا جائے گا اللہ کی حدود ضائع ہوتی رہیں گی اور جب ہم معبودِ حقیقی کے ساتھ پیوست ہو جائیں گے تو اللہ کی سرحدیں خود بخود محفوظ ہو جائیں گی۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اے میرے حبیب! ان صفات کے ساتھ متصف ہو جانے والے مومنوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔ کون ہیں وہ مومن جن کے لیے یہ خوشخبری ہے؟ وہ خوش نصیب جن کے اندر مذکورہ بالا صفات پائی جاتی ہیں، اور کیا ہے وہ خوشخبری؟ وہ خوشخبری اتنی عظیم ہے کہ انسانی فہم میں آ ہی نہیں سکتی اس لیے اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔

حکمت وہدایت

۱......جہاد جان اور مال سے ہو یا دونوں سے اس کا بدلہ جنت ہے، انسان کا کام بس یہ ہے کہ ریا اور نمود و نمائش سے دامن بچا کر جان و مال جہاد میں لگائے اور اللہ کی ذات سے اجر کی امید رکھے۔

۲......جہاد فی سبیل اللہ جو اللہ کی رضا کے لیے ہو اس کا بدلہ جنت ہے۔

۳......جہاد کی مشروعیت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔

۴......جو اوصاف آیت ۱۱۲ میں ذکر کیے گئے ہیں وہ انسان کی اصلاح میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

۵......جنت کی بشارت انہی مومنوں کے لیے ہے جو ان اوصاف سے متصف ہوں گے۔

مشرکین کے لیے استغفار کا حکم

۱۱۳......۱۱۶

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ

لائق نہیں نبی کو اور مسلمانوں کو کہ بخشش چاہیں مشرکوں کی اور اگرچہ وہ ہوں قرابت والے، جب کہ

مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ

کھل چکا ان پر کہ وہ ہیں دوزخ والے۔ اور بخشش مانگنا ابراہیم کا اپنے باپ کے واسطے، سو نہ تھا

لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ

مگر وعدہ کے سبب کہ وعدہ کر چکا تھا اس سے، پھر جب کھل گیا ابراہیم پر کہ وہ دشمن ہے اللہ کا

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ

تو اس سے بیزار ہو گیا، بیشک ابراہیم بڑا نرم دل تھا تحمل کرنے والا۔ اور اللہ ایسا نہیں کہ گمراہ کرے کسی قوم کو جبکہ ان کو راہ پر

لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾ إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ

لا چکا جب تک کھول نہ دے ان پر جس سے ان کو بچنا چاہیے، بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ اللہ ہی کی سلطنت ہے

وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۱۶﴾

آسمانوں اور زمین میں، جلاتا ہے اور مارتا ہے اور تمہارا کوئی نہیں اللہ کے سوا حمایتی اور نہ مددگار۔

ربط: پہلے منافقین اور کفار سے برأت کا اعلان کیا زندگی میں، اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ موت کے وقت بھی ان سے بری ہے اور مقصود اس سے یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان ہر حال میں ان سے دور رہیں۔

تسہیل: اللہ کے نبی اور مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں اگر چہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ ان کا دوزخی ہونا واضح ہو چکا ہو O اور ابراہیم کا اپنے والد کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا اس وعدہ کی وجہ سے تھا جو وہ اس سے کر چکے تھے، لیکن جب ان کے سامنے یہ بات کھل کر آ گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے بے تعلقی اختیار کر لی، بلاشبہ ابراہیم بڑے نرم دل اور بردبار تھے O اور اللہ کا یہ دستور نہیں کہ وہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کر دے جب تک کہ انہیں وہ چیزیں واضح طور پر نہ بتا دے جن سے بچنا ضروری ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے O اس میں کوئی شک نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت صرف اللہ کے لیے ہے وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور مسلمانو! اللہ کے سوا نہ کوئی تمہارا دوست ہے اور نہ ہی کوئی مددگار ہے O

شانِ نزول

﴿۱۱۳﴾...... جب ابو طالب کی وفات وقت قریب آیا تو نبی کریم ﷺ اس کے پاس آئے اور فرمایا چچا جان! لا الہ الا اللہ کہہ دیجیے میں روزِ قیامت اللہ کے ہاں آپ کا سفارشی ہوں گا، ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ بھی ابو طالب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے ابو طالب سے کہا کہ کیا آپ عبدالمطلب کی ملّت سے اعراض کریں گے؟ پھر انہوں نے ابو طالب کے ساتھ گفتگو جاری رکھی یہاں تک کہ ابو طالب نے آخری کلمہ اپنی زبان سے یہ کہا "ھو علیٰ ملّة عبدالمطّلب" (میں عبدالمطلب کے مذہب پر ہوں) نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں آپ کے لیے اس وقت تک استغفار کرتا رہوں گا جب تک مجھے منع نہیں کر دیا جاتا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس شانِ نزول کے علاوہ بھی متعدد شان نزول کتب تفسیر میں مذکور ہیں۔

﴿تفسیر﴾

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوٓا﴾ یہاں "ما" کو نافیہ بھی بنا سکتے ہیں اور ناھیہ بھی نافیہ کی صورت میں معنی ہوگا اللہ کا نبی ایسا نہیں کر سکتا، اور ناھیہ کی صورت میں معنی ہوگا اللہ کے نبی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں صورتوں میں مقصود مشرکین کے لیے استغفار کی ممانعت ہے اور اس ممانعت کی علّت یہ ہے کہ مشرکین کے لیے جہنم واجب ہو چکی، اب ان کے لیے استغفار فائدہ مند نہیں ہے، اس لیے کہ ایمان اور شرک دو الگ الگ چیزیں ہیں، ارشاد باری ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ {۲۳۴}

"بے شک اللہ اس جرم کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے معاف کر دے گا"

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زندہ مشرکین کے لیے استغفار اور دعا جائز ہے تاکہ انہیں ایمان کی توفیق مل جائے {۲۳۵} اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اہلِ ایمان کی جمعیت اور اتحاد کی بنیاد نہ قوم ہے، نہ زبان، نہ رنگ و نسل اور نہ ہی رشتہ داریاں ان کی جمعیت اور اخوت کی بنیاد صرف ایمان ہے، بنیاد سے ہٹ کر تمام روابط کھوکھلے اور بودے ہیں اسی لیے فرمایا کہ مشرک اگرچہ تمہارا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو وہ نہ تمہاری دعاؤں اور استغفار کا حقدار ہے اور نہ ہی یہ دعا اور استغفار اس کی بخشش کا سامان کرے گا۔

{۲۳۴} النساء/۱۱٦

{۲۳۵} وفیه دلیل علی جواز الاستغفار لأحیاء هم فإنّه طلب توفیقهم للایمان۔ (بیضاوی ۳/۱۷٦)

﴿۱۱۴﴾......حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ آزر کے بارے میں فرمایا تھا:

سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا {۲۳۶} ''میں اپنے پروردگار سے آپ کے لیے دعاءِ مغفرت کرتا رہوں گا، وہ مجھ پر بے حد مہربان ہے''

اس سے ذہنوں میں یہ اشکال آ سکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مشرک باپ کے لیے مغفرت کی دعا کیوں کی؟

اس اشکال کو دور کیا جا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کو دلیل نہ بناؤ اس لیے کہ انہوں نے اپنے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے استغفار کریں گے شاید اللہ انہیں ہدایت کی دولت عطا فرما دیں اور وہ ایمان لے آئیں، سورۂ شعراء میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا یوں مذکور ہے۔

وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ {۲۳۷} ''اور میرے باپ کو بخش دے بیشک وہ گمراہوں میں سے تھا''

لیکن جب ان پر واضح ہو گیا کہ میرا باپ حالتِ کفر میں مرا ہے اور کافر کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں تو انہوں نے فوراً براءت کا اظہار کر دیا۔

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ﴾ یہ جملہ لانے کا مقصد بھی یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اپنے مشرک باپ کے لیے استغفار کیوں کرتے تھے، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے جب اپنے والد آزر کو دعوتِ ایمان دی تو اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا {۲۳۸} ''سن! اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے پتھروں سے مار ڈالوں گا اور مجھ سے دور ہو جا عرصۂ دراز تک''

لیکن حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نہایت حلیم الطبع اور رقیق القلب تھے، اسی رقّت اور نرمی کی وجہ سے وہ اپنے باپ کے لیے استغفار فرمایا کرتے تھے، قرطبی رحمہ اللہ نے لفظ ''اوّاہ'' کے پندرہ معانی نقل کیے ہیں لیکن بغور دیکھا جائے تو سب معانی قریب قریب ہیں {۲۳۹} مثلاً بکثرت آہ و بکاء کرنے والا، بندوں پر بہت زیادہ رحم کرنے والا، بکثرت دعا کرنے والا وغیرہ۔

{۲۳۶} مریم ۴۷

{۲۳۷} الشعراء/۸۶

{۲۳۸} مریم/۴۶

{۲۳۹} قلت وھذہ الاقوال متداخلة۔ (قرطبی ۲۵۱/۸)

﴿۱۱۵﴾......اسلام آسان مذہب ہے، اس میں مأمورات اور ممنوعات کو واضح کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے بارے میں نہ یہ عادت ہے اور نہ اس کے عدل وحکمت کا تقاضا ہے کہ کسی معاملے میں وحی اتار کر انسانوں کو آگاہ نہ کرے لیکن اس کے کرنے پر سزا دے۔

﴿حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ﴾ جب اللہ کی طرف سے تعلیم وبیان ہو جائے، جہالت کا عذر زائل ہو جائے اور کسی فعل کو حرام قرار دے دیا جائے اور پھر بھی کوئی باز نہ آئے تو پھر وہ اس حرام کے ارتکاب پر پکڑتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ ''اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے'' وہ جانتا ہے کہ تم علم کے لحاظ سے محدود ہو، گمراہی کے اسباب کا پتہ از خود نہیں لگا سکتے لہٰذا وہ تمہاری فطرت اور طبیعت کے موافق احکام اتارتا ہے، جو تمہارے اوپر گراں نہ ہوں اور جب تک کسی معاملے کو واضح نہیں کرتا اس وقت اس کے ارتکاب پر سزا بھی نہیں دیتا۔

﴿۱۱۶﴾......اللہ زمین وآسمان کا مالک اور موت وحیات کا مختار ہے، وہ تمہیں دنیوی زندگی بھی عطا کرتا ہے اور ہدایت کی صورت میں روحانی زندگی بھی بخشتا ہے، یونہی وہ ایک متعین وقت پر دنیوی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیتا ہے اور اگر اس کی لائی ہوئی تعلیمات سے روگردانی کی جائے تو وہ روحانی موت دے کر ہدایت سے محروم کر دیتا ہے، نہ اس کے فیصلوں کو کوئی رد کر سکتا ہے اور نہ اس کے قطعی احکام کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔

﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ اے مسلمانو! اللہ کے علاوہ کوئی تمہارا حامی وناصر نہیں ہو سکتا، اس سے اپنا تعلق مضبوط کر لو تو تم سارے رشتوں اور سہاروں سے بے نیاز ہو جاؤ گے، مشرک رشتہ داروں کے بارے میں استغفار کی ممانعت ہو یا دیگر منہیات، تم ہر حال میں ان سے باز رہو۔

قرآن بار بار تاکید اس لیے لا رہا ہے کہ بعض نو مسلموں کو یہ سوال اب بھی پریشان کر رہا تھا کہ خون ونسب کے رشتوں کو کیسے نظر انداز کر دیا جائے؟ ان کی اہمیت سے کیسے انکار کر دیا جائے؟ صدیوں کے خاندانی اور قبائلی تعلقات پر نظریاتی روابط کو کیسے ترجیح دی جائے؟

قرآن نے اس خلجان کو ذہنوں سے اکھاڑ پھینکا اور اسلامی اور غیر اسلامی معاشرے میں روابط کی فیصلہ کن شکل متعین کرتے ہوئے فرمایا کہ کفر واسلام میں ایسے ہی تضاد ہے جیسے دن کی روشنی اور رات کی سیاہی میں، کسی کافر کے بارے میں تمہارے دلوں میں کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے حتّٰی کہ ان کے لیے استغفار تک کی بھی ممانعت ہے۔

حکمت وہدایت

۱......کفر کی حالت میں مرنے والے شخص کے بارے میں دعائے مغفرت کرنا اور اس کے نام کے ساتھ مرحوم، مغفور

وغیرہ لکھنا حرام ہے۔

۲......مسلمانوں کو حکم ہے کہ کفار سے زندگی اور موت کسی حال میں بھی تعلق نہ رکھیں۔

۳......ہر انسان کے ظاہر حال کو دیکھ کر حکم لگایا جائے گا، دل کے حالات اللہ کے حوالے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص بظاہر کفر پر مرتا ہے تو اسے کافر اور اگر کوئی بظاہر ایمان کی حالت میں مرتا ہے تو اسے مومن سمجھا جائے گا۔

۴......جب تک کسی حکم کے بارے میں نص نہ آجائے اور اسے بیان نہ کر دیا جائے تب تک اس کے کرنے پر اللہ کی طرف سے مؤاخذہ نہیں ہوتا۔

۵......گناہ کرتے رہنے سے انسان گمراہی کے قریب تر اور ہدایت سے بعید تر ہوتا جاتا ہے۔

۶......ایک مومن کا نظریہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ قادرِ مطلق ہے، وہی میری مدد کے لیے کافی ہے، دنیا کے سارے سہارے عارضی اور فانی ہیں چنانچہ اس کے ہاتھ صرف اللہ کے سامنے ہی دراز ہونے چاہئیں۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ فرمایا ''خدا تعالیٰ ہی سے بھیک مانگا کرو''۔

حاضرین میں سے کسی نے پوچھا حضرت! اگر کاسۂ گدائی ہی نہ ہو تو کیا کریں؟ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا:

''خالی ہاتھ اس کی بارگاہ میں پہنچ جائے کاسہ بھی وہیں سے مل جائے گا۔ {۲۴۰}

سچ بولنے والوں کی توبہ

﴿۱۱۷......۱۱۹﴾

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ

اللہ مہربان ہوا نبی پر اور مہاجرین اور انصار پر جو ساتھ رہے نبی کے مشکل کی گھڑی میں،

سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ

بعد اس کے کہ قریب تھا کہ دل پھر جائیں بعضوں کے ان میں سے، پھر مہربان ہوا ان پر،

اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ

بیشک وہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا۔ اور ان تین شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی

الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ

ان پر زمین باوجود کشادہ ہونے کے اور تنگ ہوگئیں ان پر ان کی جانیں اور سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں اللہ سے

{۲۴۰} تذکرہ مولانا ادریس کاندھلوی صفحہ ۲۳۹

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١١٨﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ

مگراسی کی طرف، پھر مہربان ہوا ان پر تا کہ وہ پھر آئیں، بیشک اللہ ہی ہے مہربان، رحم والا۔ اے ایمان والو! ڈرتے رہو

وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١١٩﴾

اللہ سے اور رہو ساتھ سچوں کے۔

ربط: یہ آیات بھی ماقبل کا تتمہ ہیں، موضوع وہی ہے جو مسلسل چلا آ رہا ہے یعنی غزوۂ تبوک اور اس سے پیچھے رہ جانے والے۔ قرآن کا یہ انداز ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو متعدد آیات میں بیان کرتا ہے، اس انداز میں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ قاریِ قرآن اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا، دوسرا یہ کہ بار بار کسی واقعہ کو صراحۃً یا اشارۃً ذکر کرنے سے اس کے بصائر و عبر ذہن میں تازہ ہوتے رہتے ہیں۔

تسہیل: یقیناً اللہ توبہ قبول کر چکا اپنے پیغمبر کی اور ان مہاجرین اور انصار کی جنہوں نے تنگی ترشی کے زمانے میں پیغمبر کا ساتھ دیا، اگر چہ ان میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگانے لگے تھے مگر پھر اللہ نے انہیں توبہ پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائی، یقیناً وہ ان پر شفقت کرنے والا اور بڑا مہربان ہے ○ اور ان تین افراد کی توبہ بھی اللہ نے قبول فرمالی جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا حتّٰی کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنی جان سے بھی تنگ آ گئے اور انہیں یقین آ گیا کہ اللہ کی گرفت سے انہیں اللہ ہی کی طرف رجوع کیے بغیر پناہ نہیں مل سکتی، تو اللہ نے انہیں توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمادی، بلاشبہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا اور بے حد مہربان ہے ○ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہمیشہ سچوں کے ساتھ رہو ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۱۷﴾...... غزوۂ تبوک کے حوالے سے مخلص اہلِ ایمان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱)...... جو حکم ملتے ہی جہاد کے لیے تیار ہوگئے۔

(۲)...... جنہیں ابتداء میں کچھ تردّد رہا لیکن پھر اس کیفیت سے نکل کر پورے شرحِ صدر کے ساتھ جہاد میں شریک ہوگئے۔

(۳)...... جو محض سستی کی بناء پر شریک نہ ہو سکے، انہیں اپنی اس غلطی پر ندامت بھی تھی اور انہوں نے اس کا برملا اعتراف بھی کیا، پھر ان میں سے بعض تو وہ تھے جنہوں نے اپنے آپ کو مسجدِ نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا تھا اور تین

حضرات ایسے تھے جنہوں نے یہ عمل نہ کیا اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کر دیا تھا، رسولِ اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو ان کے بائیکاٹ کا حکم دیا، پچاس دن کے بعد اللہ نے ان کی توبہ کا اعلان فرمایا مگر انہیں شرمندگی سے بچانے کے لیے پہلے اپنے نبی مکرم ﷺ اور جانثار صحابہ کی توبہ کی قبولیت کا اعلان فرمایا۔

توبہ کیوں؟

یہاں سوال ہوتا ہے کہ توبہ تو کسی گناہ سے کی جاتی ہے، اللہ کے نبی تو ویسے بھی معصوم تھے اور جو صحابہ فوز اجہاد کے لیے تیار ہو گئے تھے انہوں نے بھی کوئی غلطی نہیں کی تو ان کی توبہ قبول کرنے کا کیا مطلب؟

اس سوال کا ایک جواب تو وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ اصل میں تو انہی تین حضرات کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کرنا تھا جن کا بائیکاٹ چل رہا تھا مگر اللہ جو کہ بڑا غفور رحیم اور ستّار ہے اس نے ان تینوں کو تنہائی اور ندامت سے بچانے کے لیے سارے صحابہ حتّٰی کہ اپنے نبی کی توبہ قبول کرنے کا بھی اعلان فرما دیا، اس اعلان میں ایک اور پیغام بھی پوشیدہ ہے وہ یہ کہ توبہ اور استغفار سے کوئی بھی انسان مستثنیٰ نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بلا استثناء سارے اہلِ ایمان کو توبہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

سورۂ نور میں ہے:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا {۲۴۱} ''تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو''

ویسے بھی ضروری نہیں کہ توبہ گناہ ہی سے کی جائے، نماز کے فوراً بعد مسلمان استغفار کرتے ہیں حالانکہ نماز تو خالص عبادت ہے۔

اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے بھی توبہ کی جاتی ہے اور قربِ الٰہی کے درجات کی کوئی انتہا نہیں، جو شخص جس مقام پر پہنچا ہو اس سے آگے بھی کوئی بلند مقام ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں پہلے مقام پر رک جانا ایک قسم کی کوتاہی ہے۔

جب لفظِ توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو اس کی دو معنیٰ ہوتے ہیں:

(۱)......اللہ کی رحمت کا بندے پر متوجہ ہونا۔

(۲)......بندوں کو توبہ کی توفیق دینا اور ان کی توبہ قبول کرنا، اللہ کی رحمت کے متوجہ ہونے کو تو ہر کوئی بہت بڑی نعمت سمجھتا ہے مگر یہ نکتہ ایمانی عقل والوں ہی کی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ باری تعالیٰ کی طرف سے توبہ کی توفیق ملتے رہنا

{۲۴۱}النور ۳۱/۲۴

بھی ایسی نعمت ہے کہ اس پر اس کا شکرادا کرنا چاہیے۔

امام ابنِ قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''سالکین کے مقامات میں سے سب سے افضل مقام توبہ ہے اس لیے کہ یہ اس کی ترقی کی منزلوں میں پہلی منزل بھی ہے، درمیانی بھی اور آخری بھی، بندہ اس سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہوسکتا، موت تک اس کا رشتہ اس سے برقرار رہتا ہے، توبہ بندۂ مومن کی ابتداء بھی ہے اور بندگی کے سفر کی انتہا میں بھی، اس کی ویسے ہی ضرورت ہے جیسے ابتدا میں ضرورت تھی۔ {۲۴۲}

﴿فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان مہاجرین اور انصار کی تعریف فرمائی ہے جنہوں نے تنگی کے زمانے میں اپنے آقا ﷺ کی اتباع فرمائی، جس زمانے میں غزوۂ تبوک پیش آیا اس وقت مسلمان افلاس اور تنگی میں تھے، گزشتہ سال کی کھجور ختم ہوچکی تھی اور نئی ابھی تک توڑنے کے قابل نہیں ہوئی تھی، کھجور ہی اہلِ مدینہ کا ذریعہ معاش تھی اور یہی طویل سفر میں ان کا زادِراہ ہوتی تھی، چنانچہ اس سفر میں ایسا بھی ہوا کہ دو مجاہدین کے حصّے میں صرف ایک کھجور آئی، پینے کا پانی بھی نہ ہونے کے برابر تھا حتّٰی کہ بعض مجاہدین نے اونٹ ذبح کیے اور ان کی اوجھڑی کو نچوڑ کر اپنی خشک زبانیں ترکیں،

سواریاں اتنی تھوڑی تھیں کہ دس مجاہدین کے حصے میں ایک اونٹ آیا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے۔

موسم کا حال یہ تھا کہ آسمان آگ برسا رہا تھا اور زمین تانبے کی طرح گرم تھی، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ ہمیں ''سَاعَةِ الْعُسْرَةِ'' کے بارے میں کچھ بتایئے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم شدید گرمی کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں تبوک کی طرف نکلے ایک جگہ ہم نے پڑاؤ ڈالا تو ہمیں اتنی شدید پیاس لگی کہ لگتا تھا ہماری گردنیں کٹ کر گر پڑیں گی، حتّٰی کہ یوں بھی ہوا کہ کسی شخص نے اپنا اونٹ ذبح کرکے اس کی اوجھڑی کو نچوڑ کر پانی نکالا، اس پانی کو پیا بھی اور اپنے سینے پر بھی ملا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے تو آپ ہمارے لیے دعا کیجیے۔ آپ نے دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے، ابھی ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ آسمان پر بادل چھا گئے، بارش برسنے لگی اور صحابہ نے اپنے برتن پانی سے بھر لیے، یہ بادل دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ {۲۴۳}

﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ﴾ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا تھا جو ابتداء میں تذبذب کا شکار ہوگیا تھا، یہ وہ لوگ

{۲۴۲} مدارج السالکین (۱/۱۹۸) بحوالہ نضرۃ النعیم ۱۲۹۴/۴

{۲۴۳} بحوالہ ابنِ کثیر ۵۱۸/۲-۵۱۹

تھے جو مخلص مسلمان تھے مگر موسم کی سختی اور سامان کی قلت کی وجہ سے ہمت ہار گئے تھے مگر جب انہوں نے خلوصِ دل سے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول کر لی گئی۔

﴿ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴾ توبہ اس لیے قبول کر لی گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بے حد شفقت کرتا ہے اور وہ بے انتہا مہربان ہے، اس کی شفقت و رحمت تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے سامنے ندامت کے آنسو بہانے والے کسی گناہگار کو محروم نہ رکھے۔

نصیحت آموز واقعہ

﴿۱۱۸﴾......وہ تین حضرات جن کا معاملہ مؤخر کیا گیا تھا ان کی توبہ بھی قبول کر لی گئی، یہ تین حضرات...... حضرت کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم ہیں، ان تینوں کا واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دوسری کتبِ حدیث میں تفصیل سے آیا ہے اور بڑا نصیحت آموز اور ایمان افروز ہے اس لیے ہم حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اسے یہاں نقل کرتے ہیں (ہم نے لفظی ترجمہ کے بجائے مفہوم واضح کرنے پر زیادہ زور دیا ہے)

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں غزوۂ تبوک کے علاوہ کسی اور غزوہ سے محروم نہ رہا تھا، بدر میں اگرچہ نہ جا سکا لیکن اس وقت صورتحال مختلف تھی، نبی کریم ﷺ باقاعدہ جنگ کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ اچانک مڈبھیڑ ہو گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس غزوہ میں شریک نہ ہونے والوں سے باز پرس نہیں ہوئی تھی، غزوۂ تبوک کا موقع آیا تو میں بڑا خوشحال تھا، میں نے اس غزوہ کے لیے دو سواریاں تیار کی تھیں، نبی اکرم ﷺ نے اس مہم کی تیاری کے لیے واضح احکامات صادر فرمائے حالانکہ عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ آپ ہمیشہ اپنی مہم کو خفیہ رکھتے تھے، یہ سخت گرمی کا زمانہ تھا، سفر دور کا تھا، راستے میں نشیب و فراز تھے، دشمن کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی، آپ ﷺ نے چونکہ واضح اعلان کیا ہوا تھا اس لیے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد آپ کے ساتھ شریکِ سفر تھی، میں تیاری کے بارے میں زیادہ فکر مند نہ تھا اس لیے کہ سواریاں موجود تھیں، چنانچہ دیر ہوتی رہی یہاں تک کہ آپ ﷺ کوچ فرما گئے، میں نے سوچا کہ مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ جا ملوں، کاش! کہ میں نے ایسا کیا ہوتا لیکن مجھے اس کی توفیق نہ ہوئی، میں باہر نکلتا تو منافقین اور معذورین کے علاوہ کوئی اور نظر نہ آتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے تبوک جاتے ہوئے راستے میں تو میرا کوئی تذکرہ نہ فرمایا، البتہ تبوک پہنچ کر اتنا فرمایا کہ کعب نے کیا کیا؟ بنو سلمہ کے ایک شخص نے کہا حضور ﷺ اسے مال و جمال پر اکڑ نے روکے رکھا، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے میرا دفاع کرتے ہوئے کہا، تم نے بہت بری بات کی ہے، یارسول اللہ! اللہ کی قسم! ہم نے کعب میں خیر ہی دیکھی ہے۔

کعب فرماتے ہیں کہ حضور تبوک سے واپس تشریف لائے تو میں جھوٹ یاد کرنے لگا تا کہ نبی کریم ﷺ کے غضب سے نجات مل سکے لیکن بالآخر میرے دل نے گواہی دی کہ اس بحران سے سچ کے ذریعے ہی نجات حاصل کی جاسکتی ہے، حضور ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو پیچھے رہنے والے آ کر قسمیں کھانے لگے اور عذرات پیش کرنے لگے، حضور ان سے بیعت لیتے اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرماتے ہوئے دل کا معاملہ سپردِ خدا فرمادیتے، میری باری آئی تو حضور ﷺ کے چہرے پر غضبناک تبسّم تھا، آپ ﷺ نے پوچھا کعب! کس عذر کی بناء پر تم رک گئے تھے؟ کیا سواری نہیں تھی؟ کعب فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ! میں کسی دنیادار حکمران کے سامنے ہوتا تو جھوٹ بول سکتا تھا لیکن آپ کے سامنے جھوت نہیں بول سکتا کیونکہ اس طرح میں آپ کو راضی کرلوں گا مگر اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے، میں سچی بات کروں گا، بیشک آپ ناراض تو ہوں گے لیکن مجھے امید ہے کہ بالآخر اللہ مجھے معاف فرمادے گا۔

حضور! اللہ کی قسم میرے پاس کوئی عذر نہ تھا، اتنی خوشحالی مجھے پہلے کبھی حاصل نہ تھی جتنی تبوک کے موقع پر تھی، آپ نے میری بات سن کر فرمایا جاؤ! تمہارا فیصلہ خدا کرے گا۔ میں اٹھا تو میرے قبیلے بنوسلمہ کے لوگ میرے پاس پہنچ گئے اور کہنے لگے کعب! ہمیں یاد نہیں کہ تم نے اس سے پہلے کوئی گناہ کیا ہو، کیا یہ اچھا نہ تھا کہ کوئی عذر تلاش کر لیتے اور حضور تمہارے گناہ پر طلبِ مغفرت کر دیتے، کعب فرماتے ہیں قوم کی باتوں سے میرے پائے استقلال میں لغزش آنے لگی اور میں نے سوچا کہ میں خدمتِ اقدس میں جا کر سابقہ بیان واپس لوں، لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتا میں نے پوچھا کیا میرے جیسا سلوک کسی اور کے ساتھ بھی ہوا ہے؟ جواب ملا، ہاں! مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے، ان بدری اور برگزیدہ انسانوں کے نام سُن کر میں نے سوچا کہ ان کی پیروی کروں گا اور اپنے موقف پر قائم رہوں گا۔

آزمائش کا آغاز

اب ابتلاء کا زمانہ شروع ہو چکا تھا، رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ہمارے ساتھ بات کرنے سے منع کر دیا، پھر کیا تھا لوگ اچانک اجنبی بن گئے، رویّے یکدم بدل گئے، مدینہ کی سرزمین ہمیں یوں محسوس ہوتی جیسے ہم نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے، پچاس شب وروز اسی اجنبیت میں بیت گئے، کعب فرماتے ہیں کہ میرے دوسرے دو ساتھی تو گھروں میں بند ہو کر رہ گئے مگر میں بہت ہی سخت جان تھا، گھر سے باہر بھی نکلتا، بازاروں کا رخ بھی کرتا، مسلمانوں

کے ساتھ نماز بھی پڑھتا مگر کوئی شخص مجھ سے بات نہ کرتا، میں حضور کی مجلس میں جاتا، سلام کرتا اور پھر غور سے دیکھتا کہ حضور نے لب مبارک ہلائے ہیں یا نہیں، نماز بھی حضور کے قریب پڑھتا اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا رہتا، جب میں نماز میں ہوتا تو حضور میری طرف دیکھتے اور جب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تو چہرۂ انور پھیر لیتے۔

جب لوگوں کے اس بائیکاٹ کا زمانہ بہت طویل ہوا تو ایک دن اپنے چچازاد حضرت ابوقتادہ کی دیوار پر چڑھ گیا اور انہیں سلام کیا لیکن انہوں نے جواب نہ دیا، یہ وہی ابوقتادہ ہیں جن سے مجھے بے پناہ محبت تھی لیکن آج وہ بھی اجنبی بنے ہوئے تھے، میں نے سلسلۂ تکلّم پھر شروع کیا اور پوچھا کہ اے ابوقتادہ! خدا کے لیے گواہی دو کیا میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا؟ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ "اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں" یہ جواب سننا تھا کہ میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے، آنسوؤں کی لڑیاں لگ گئیں اور میں دیوار پھلانگ کر واپس ہو گیا۔

ایک دن میں مدینہ کے بازاروں میں پھر رہا تھا کہ شام کے نبطیوں میں سے ایک نبطی، جو بازار میں غلّہ فروخت کر رہا تھا، یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے کعب کے گھر کا پتہ بتادو، لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ کعب ہے، اس نے مجھے ایک خط تھما دیا جو غسّان کے بادشاہ کی طرف سے تھا اور اس میں لکھا تھا:

"امّا بعد! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے آقا نے تم پر بڑا ظلم کیا ہے، اللہ نے تمہیں ذلّت و بربادی کے شہر میں نہیں رکھا، آپ ہمارے پاس آجائیں، ہم آپ کے ساتھ ہمدردی کریں گے۔"

میں نے خط پڑھتے ہی جلتے تنور میں ڈال دیا۔

پچاس راتوں میں سے ابھی چالیس ہی گزری تھیں کہ رسولِ خدا کا ایک پیغام لانے والا آیا اور کہا کہ رسولِ خدا حکم فرماتے ہیں کہ اپنی بیویوں سے علیحدگی اختیار کرلو، میں نے پوچھا طلاق دے دوں؟ انہوں نے کہا کہ قریب نہ جائیں، میرے دوسرے دو ساتھیوں کو بھی یہی حکم ملا، میں نے اپنی بیوی کو کہا کہ تم میکے چلی جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معاملے کا فیصلہ آجائے، ھلال بن امیہ کی بیوی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! ھلال بہت بوڑھے ہیں، کیا آپ پسند نہیں فرماتے کہ میں ان کی خدمت کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ضرور خدمت کرو۔ مگر وہ تمہارے قریب نہ آئیں، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ تو کسی چیز کی طرف حرکت نہیں کرسکتے اور خدا کی قسم! وہ تو اس وقت سے رو رہے ہیں جب سے ان کے بارے میں یہ احکامات نازل ہوئے ہیں۔

مجھے میرے بعض رشتہ داروں نے کہا کہ آپ بھی اپنی بیوی کے بارے میں حضور سے اجازت حاصل کرلیں کیونکہ ھلال بن امیہ کی بیوی کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ ان کی خدمت کرے، لیکن میں نے انکار کردیا، پچاس

روز مکمل ہو چکے تھے اور لوگوں نے ہم سے بات کرنا بالکل چھوڑ دی تھی۔

قبولیتِ توبہ کی مبارک ساعت

کعب فرماتے ہیں کہ پچاسویں دن میں اپنے گھر کے اوپر صبح کی نماز پڑھ رہا تھا، میرا دل تنگ ہو چکا تھا اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ ہو چکی تھی، اچانک جبلِ سلع سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی، وہ کہہ رہا تھا: اے کعب بن مالک! خوشخبری ہو، میرے دوسرے دو ساتھیوں تک بھی خوشخبری پہنچ چکی تھی، لوگ مبارک سلامت کرتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے میں سجدے میں گر گیا، ایک شخص نے میری طرف سرپٹ گھوڑا دوڑایا، قبیلۂ اسلم کا ایک شخص میرے پاس دوڑتے ہوئے آیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا، اس کی آواز پہلے مجھ تک پہنچ گئی اور میں نے اس شہادت کے صلہ میں اپنے کپڑے اسے پہنا دیے، فرماتے ہیں خدا کی قسم! میرے پاس صرف ایک وہی جوڑا تھا، چنانچہ حضور ﷺ کی مجلس میں جانے کے لیے میں نے کپڑے عاریتاً مانگے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، طلحہ بن عبید کھڑے ہوئے اور دوڑ کر مجھے مبارکباد دی۔

آج کعب نے جی بھر کر آقا کو دیکھا اور حضور بھی شفقت کی نگاہوں سے اپنے شیدائی کو دیکھ رہے تھے آپ ﷺ کا چہرۂ انور چمک رہا تھا اور ہر خوشی کے موقع پر آپ کا چہرۂ اقدس یونہی آفتاب کی طرح چمکتا تھا، کعب فرماتے ہیں میں نے حضور کو سلام کیا تو آپ نے فرمایا "کعب! تمہیں ایک ایسا دن مبارک ہو جو تمہاری پیدائش سے موت تک اچھا دن ہے" میں نے کہا حضور یہ معافی آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے؟ حضور ﷺ نے فرمایا، اللہ کی طرف سے ہے، میں نے عرض کیا کہ میں اپنا سارا مال صدقہ کرتا ہوں، حضور نے فرمایا بہتر یہ ہے کہ کچھ حصہ اپنے پاس رکھ لو تو میں نے خیبر کا حصّہ اپنے پاس رکھ لیا۔ {۲۴۴}

کعب فرماتے ہیں میں اپنے سچ کی وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوا اور پھر اتنے بڑے انعام کا مستحق ہوا چنانچہ میں نے پوری زندگی جھوٹ کو قریب نہ آنے دیا، اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

﴿۱۱۹﴾...... جہاد سے پیچھے رہ جانے والے حضرات کی توبہ کی قبولیت کی اصل وجہ ان کا تقوٰی اور خوفِ خدا تھا، اس لیے اس آیتِ کریمہ میں تقوٰی اختیار کرنے اور سچوں کی صحبت میں رہنے کی تلقین کی گئی ہے، ان کی صحبت اختیار کرنے والوں کے اندر تقوٰی کی صفت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

{۲۴۴} مسلم ۲/ کتاب التوبہ/ صفحہ ۳۶۰-۳۶۴/ بخاری ۲، باب حدیث کعب بن مالک/ صفحہ ۶۳۴-۶۳۶

قرآنِ حکیم نے علماء اور صلحاء کے بجائے ''صادقین'' کا لفظ اختیار فرما کر یہ بتادیا ہے کہ عالمِ باعمل اور حقیقی صالح وہی شخص ہوسکتا ہے جس کے اندر سچائی کی صفت پائی جاتی ہو، وہ وعدے میں بھی سچا ہو، قول وعمل میں بھی سچا ہو، نیت اور ارادے میں بھی سچا ہو، اس کے ظاہر و باطن اور قول وعمل میں تضاد نہ ہو، علماء اور صلحاء کو تو جھوٹ سے بچنا ہی چاہیے، عام مسلمان کے بارے میں بھی متعدد روایات میں آیا ہے کہ ''مومن کے اندر ہر برائی ہوسکتی ہے مگر جھوٹ اور خیانت کی خصلت نہیں ہوسکتی۔{۲۴۵}

حکمت وہدایت

۱......رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی فضیلت کا بیان ہے، جنہوں نے ناقابلِ تصور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے جہاد میں حصہ لیا، ان کی محبت اور وفا کے واقعات تو بے شمار ہیں یہاں صرف دو واقعات عبرت ونصیحت کے لیے عرض کیے جاتے ہیں۔

پہلا واقعہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا ہے جن کا اونٹ چلنے سے عاجز آ گیا تو وہ اپنا سامان پیٹھ پر لاد کر پاپیادہ ہی رسول اللہ ﷺ کے پیچھے روانہ ہوگئے، آپ نے جب دور سے انہیں آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا ''یہ ابوذر ہوں گے'' لوگوں نے تصدیق کی کہ واقعی ابوذر ہیں، اس موقع پر آپ نے فرمایا:

﴿رحمه الله اباذر، يمشي وحده، ويموت وحده، ويبعث وحده﴾{۲۴۶}

''اللہ ابوذر پر رحم فرمائے، تنہا چلے گا، تنہا مرے گا اور قیامت کے دن تنہا اٹھایا جائے گا''

دوسرا واقعہ: حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ ایک انصاری صحابی تھے، لشکر کی روانگی کے وقت پیچھے رہ گئے، ایک دن سخت گرمی میں اس وقت اپنے باغ میں پہنچے جبکہ سورج آگ برسا رہا تھا، ان کی حسین وجمیل بیوی نے ٹھنڈے سائبان میں ان کا بستر تیار رکھا تھا، دسترخوان پر تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی موجود تھا، سب کچھ دیکھا تو فرمانے لگے، گھنا سایہ بھی ہے، ٹھنڈا پانی اور خوبصورت بیوی بھی ہے مگر میرے آقا ﷺ جھلسا دینے والی ہوا اور گرمی کا سامنا کر رہے ہیں اس حال میں ابوخیثمہ دنیا کے مزے لوٹے یہ کوئی اچھی بات نہیں، یہ خیال آنا تھا کہ بیوی سے کہا میں تبوک جا رہا ہوں، اونٹ پر بیٹھے، تلوار اور نیزا ہاتھ میں پکڑا اور اسلامی کارواں کے نقشِ قدم پر چل پڑے، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ سے آنے والے راستے پر گرد وغبار اڑانے والے شہ سوار کو دیکھا تو فرمایا (كن اباخيثمة) ''ابوخیثمہ ہوں گے''

{۲۴۵} مسند احمد/۵/۲۵۲

{۲۴۶} زاد المعاد: ۳/۳۵

قریب آئے تو سرورِ دو عالم ﷺ نے مسرت کا اظہار کیا اور مغفرت کی دعا فرمائی۔{۲۴۷}

۲......''غزوۂ عسرہ'' کو بعض اعتبار سے دوسرے غزوات پر فضیلت حاصل ہے۔

۳......دلوں میں وساوس کی یلغار کے باوجود سچے اہلِ ایمان کو سچائی کا ساتھ دینے اور جہاد کی توفیق دے دی جاتی ہے۔

۴......حضرت کعب بن مالک اور ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان قرآنِ کریم میں کیا گیا۔

۵......نیت و ارادہ اور قول و عمل میں تقوی اور سچائی واجب ہے۔

۶......حقیقی صلحاء وہی ہیں جن کے قول و عمل میں تضاد نہ ہو اور وہ ہر صورت میں سچ بولیں۔

ایمان کی بنیاد سچائی پر اور منافقت کی بنیاد جھوٹ پر ہے، جھوٹ اور ایمان ایسی دو ضدیں ہیں جو جمع نہیں ہوسکتیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے یعنی سچے مومن اور منافق۔ سورۂ احزاب میں ہے:

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ {۲۴۸}

''تاکہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کے سبب جزا دے اور منافقوں کو اگر چاہے تو عذاب دے یا ان کی توبہ قبول فرمالے''

سچائی ہی وہ صفت ہے جو قیامت کے دن انسان کو اللہ کے عذاب سے بچا سکتی ہے۔

سورۂ مائدہ میں ہے:

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ {۲۴۹}

''یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ دے گی ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

احادیث بھی سچائی کی فضیلت اور جھوٹ کی مذمّت سے بھری پڑی ہیں اس کے باوجود آج مسلم معاشرہ میں سچائی ناپید اور جھوٹ عام ہے۔

{۲۴۷} کشاف ۲/ ۶۱-۶۲

{۲۴۸} احزاب/ ۲۴

{۲۴۹} المائدة۵/ ۱۱۹

جہاد کی فرضیّت اور اس کا ثواب

۱۲۰......۱۲۱

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ

نہ چاہئے مدینہ والوں کو اور ان کے گرد کے گنواروں کو کہ پیچھے رہ جائیں رسول اللہ کے ساتھ سے

لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ

اور نہ یہ کہ اپنی جان کو چاہیں زیادہ رسول کی جان سے، یہ اس واسطے کہ جہاد کرنے والے، نہیں پہنچتی

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ

ان کو پیاس اور نہ محنت اور نہ بھوک اللہ کی راہ میں اور نہیں قدم رکھتے کہیں جس سے کہ خفا ہوں کافر اور نہ چھینتے ہیں دشمن سے

لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً

کوئی چیز مگر لکھا جاتا ہے ان کے واسطے اس کے بدلے نیک عمل، بیشک اللہ نہیں ضائع کرتا حق نیکی کرنے والوں کا۔ اور نہ

وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا

خرچ کرتے ہیں کوئی خرچ چھوٹا اور نہ بڑا اور نہ طے کرتے ہیں کوئی میدان مگر لکھ لیا جاتا ہے ان کے واسطے تاکہ بدلہ دے

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

ان کو اللہ بہتر اس کام کا جو کرتے تھے۔

تسہیل: اہلِ مدینہ اور ان کے گردو پیش میں رہنے والے دیہاتیوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ جہاد میں اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دیں اور نہ ہی یہ کہ وہ اپنی جانوں کو رسول اللہ کی جان سے زیادہ عزیز رکھیں، جہاد میں ساتھ دینا اس لیے ضروری ہے کہ انہیں اللہ کی راہ میں بھوک، پیاس اور محنت ومشقت کا جو سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ جو بھی ایسا قدم اٹھاتے ہیں جو کفار کے لیے غیظ وغضب کا باعث ہوتا ہے اور دشمن کے خلاف وہ جو بھی انتقامی کاروائی کرتے ہیں ان میں سے ہر ہر کام کے بدلے ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے، یقیناً اللہ اہلِ اخلاص کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا O یونہی وہ تھوڑا یا زیادہ جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جتنے میدان بھی وہ طے کرتے ہیں یہ سب ان کے نامۂ اعمال میں لکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ اللہ انہیں ان کے کارناموں کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے O اور مسلمانوں کو یہ بھی نہیں چاہیے کہ وہ سارے کے سارے جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں، ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ گھروں سے نکل آئیں تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور واپس جا کر اپنی قوم کو خبردار کریں تاکہ وہ

بھی اللہ کی نافرمانی سے باز آجائیں O

حکمت وہدایت

۱......مومن کے لیے جائز نہیں کہ اپنی ذات کو رسولِ اکرم ﷺ کی ذات پر ترجیح دے۔(۱۲۰) اس لیے کہ ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے حقیقی بھائی، اولاد، والدین سارے انسانوں اور اپنی جان سے بھی زیادہ اللہ کے نبی سے محبت نہ رکھی جائے۔

۲......جہاد کے سلسلہ میں مجاہد کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں سے ایک ایک مصیبت اور تکلیف پر اسے اجر وثواب سے نوازا جاتا ہے۔(۱۲۰)

۳......مجاہد محسن ہوتا ہے......دشمنوں کے حق میں بھی کیونکہ وہ انہیں دائرۂ کفر سے نکال کر دائرۂ اسلام میں لاتا ہے...... مسلمانوں کے حق میں بھی کیونکہ جہاد کے ذریعے وہ ان کے دین وایمان، ملک اور وطن، عزت وآبرو اور اموال کی حفاظت کرتا ہے......انسانیت کے حق میں بھی کیونکہ وہ انہیں ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جو ظلم وستم اور لوٹ کھسوٹ سے پاک ہو۔(۱۲۰)

۴......جو لوگ کسی مجبوری اور معقول عذر کی بناء پر جہاد میں نہ جاسکیں انہیں وہ اجر ملتا ہے جو برسرِ پیکار مجاہدین کو ملتا ہے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مدینہ میں تم کچھ ایسے لوگوں کو چھوڑ کر آئے ہو جو ہر قدم پر، ہر نفقہ میں اور ہر وادی کو طے کرتے ہوئے تمہارے ساتھ ہیں، صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! وہ مدینہ میں رہتے ہوئے ہمارے ساتھ کیسے ہوسکتے ہیں آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو کسی عذر کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کرسکے'' {۲۵۰}

اصل چیز سچی نیت ہے اگر کسی نیک عمل کے کرنے کی سچی نیت ہو مگر مجبوری کی بناء پر انسان نہ کرسکے تو اس کے نامۂ اعمال میں اجر وثواب ضرور لکھ دیا جاتا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت میں اللہ کے نبی نے یہاں تک فرمادیا ﴿نیة المؤمن خیر من عمله﴾ {۲۵۱} ''مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے''۔

{۲۵۰} بخاری ۲/صفحہ۶۳۷ وایضًا المجلّد الأوّل، باب من حبسه العذر/صفحہ۳۹۸

{۲۵۱} بیہقی بحوالہ التفسیر المنیر ۱۱/۷۶

طلبِ علم کی اہمیت

﴿۱۲۲﴾

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا

اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ کوچ کریں سارے، سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور

فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۲۲﴾

تاکہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو جب کہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف، تاکہ وہ بچتے رہیں۔

تسہیل: اور مسلمانوں کو یہ بھی نہیں چاہیے کہ وہ سارے کے سارے جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں، ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ گھروں سے نکل آئیں تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور واپس جا کر اپنی قوم کو خبردار کریں تاکہ وہ بھی اللہ کی نافرمانی سے باز آجائیں ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۲۲﴾...... غزوۂ تبوک میں شرکت سے بلا عذر محروم رہنے والوں کی جس انداز میں مذمت کی گئی اور جہاد کے جو فضائل بیان کیے گئے ان سے کسی کے ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی کہ ہر جہاد میں سارے مسلمانوں کا شرکت کرنا فرض اور تخلّف حرام ہے حالانکہ شرعی حکم یہ نہیں ہے، عام حالات میں جہاد فرضِ کفایہ ہے، مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اگر جہاد کے لیے کافی ہوں تو انہی کا جہاد میں مشغول ہونا باقی مسلمانوں کو اس فریضے سے سبکدوش کر دیتا ہے، ہاں اگر وہ کافی نہ ہوں تو جہاد کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا پہلے آس پاس کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہوگا پھر ان سے قریب رہنے والوں پر حتّٰی کہ ضرورت پڑنے پر مسلمانوں کا امیر سارے اہلِ ایمان کو میدانِ جہاد میں نکلنے کا حکم دے گا، پھر ہر مسلمان پر جہاد میں شرکت فرض اور اس سے تخلّف حرام ہو جائے گا۔

حکمت و ہدایت

۱...... جہاد فرضِ کفایہ ہے اس لیے کہ اگر سارے مسلمان جہاد کے لیے چلے جائیں تو امت کی باقی مصلحتیں اور شعبے تعطّل کا شکار ہو جائیں گے البتہ اگر ایسے ناموافق حالات پیش آجائیں کہ برسرِ پیکار مجاہدین عالمِ اسلام یا اس کے کسی علاقے کا دفاع کرنے میں ناکام ہو جائیں تو پھر دوسرے مسلمانوں پر بھی جہاد فرض ہو جائے گا۔

۲......دین کا اتنا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے جس کے بغیر نہ تو وہ فرائض ادا کرسکتا ہے، نہ حرام سے بچ سکتا ہے۔
اسی بات کو تفصیلاً یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ عقائدِ صحیحہ، طہارت ونجاست، نماز، روزہ اور تمام فرض عبادات کا علم اوران کے احکام سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے یونہی جس کے پاس بقدرِ نصاب مال ہو اس پر زکوٰۃ کے احکام، جس پر حج فرض ہوجائے اس کے لیے حج کے مسائل، جو تجارت وصنعت کا پیشہ اختیار کرے یا نکاح کرے تو اس پر تجارت اور نکاح سے تعلق رکھنے والی شرعی ہدایات کا علم حاصل کرنا فرض ہوجاتا ہے۔
قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ اعمال جو باطنی اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں ان کا سیکھنا بھی ہر مسلمان پر فرض ہے۔{۲۵۲}
عام مسلمان جو کہ مصروفیت کی بناء پر حصولِ علم کے لیے پورا وقت نہیں دے سکتے وہ اس کے لیے چند طریقے اختیار کرسکتے ہیں۔
(الف) آج کل دنیا کی تقریباً ہر زبان میں نہ صرف قرآنِ کریم بلکہ احادیث اور فقہی مسائل کی کتابوں کا ترجمہ ہوچکا ہے، یہ کتابیں کسی صاحبِ علم سے سبقاً سبقاً پڑھ لی جائیں، اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو خود مطالعہ کیا جائے اور جہاں بات سمجھ نہ آئے وہاں نشان لگادیا جائے اور بعد میں کسی مستند عالمِ دین سے سمجھ لیا جائے۔
(ب) جب کوئی کام دین یا دنیا کا، کرنے کا ارادہ ہو جس کے شرعی مسائل معلوم نہ ہوں تو کسی اللہ والے عالم سے اس کے بارے میں پوچھ لیا جائے اور پھر اس کی ہدایات کے مطابق عمل کیا جائے۔
(ج) علماء کرام درسِ قرآن اور علمی عملی اصلاح کے لیے جن مجالس کا اہتمام کرتے ہیں ان میں پابندی سے شرکت کی جائے۔
(د) آج کل مستند علماءِ کرام کے زیرِ انتظام انٹرنیٹ کے ذریعہ جو ویب سائٹس چل رہی ہیں ان سے بھی پوری دنیا کے مسلمان مستفید ہوسکتے ہیں۔
۳......عربی گرائمر اور زبان سیکھ کر کتاب وسنت کا سمجھنا، ان کی تفسیر اور تشریح کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنا، ان سے نکلنے والے مسائل کا علم حاصل کرنا، صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال وآثار سے واقف ہونا فرضِ کفایہ ہے۔

علمِ دین کی فضیلت

۴......علمِ دین کے فضائل اور اس کے متعلقات پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، جو ان فضائل کا مطالعہ کرے ناممکن

{۲۵۲} تفسیر مظہری ۴۴۸/۵

ہے کہ اس کے دل میں حصولِ علم کا جذبہ پیدا نہ ہو، ہم دسیوں روایات میں سے چند ایک کا ترجمہ یہاں نقل کرتے ہیں۔

صحیح بخاری اور ترمذی میں ہے:

جس انسان کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں {۲۵۳}

''جو شخص حصولِ علم کے لیے کسی راستے پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کے راستے کو آسان فرما دیتے ہیں اور یہ کہ فرشتے طالبِ علم کی راہ میں اپنے پَر بچھاتے ہیں اور یہ کہ ارض و سما کی ساری مخلوق اور پانی کی مچھلیاں اس کے لیے دعا اور استغفار کرتی ہیں اور یہ کہ عالم کو عابد پر ایسے ہی فضیلت حاصل ہے جیسے چودھویں کے چاند کو سب ستاروں پر اور یہ کہ علماء، انبیاء کے وارث ہیں اور یہ کہ انبیاء نے اپنی وراثت میں سونا چاندی نہیں بلکہ علم چھوڑا ہے تو جس شخص نے علم کی وراثت حاصل کر لی اس نے بڑی دولت حاصل کر لی''۔{۲۵۴}

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''اے ابوذر! اگر تم کہیں جا کر کتاب اللہ کی کوئی ایک آیت سیکھ لو تو یہ تمہارے لیے سو رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے اور اگر تم کہیں جا کر علمِ دین کا ایک باب سیکھ لو خواہ اس پر عمل ہو رہا ہو یا نہ ہو رہا ہو تو یہ تمہارے لیے ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے''۔{۲۵۵}

اربابِ علم کی ذمّہ داری

۵......علمِ دین حاصل کرنے کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے اور اللہ کو ناراض کرنے والے کاموں سے بچنے کی تلقین کی جائے، اگرچہ یہاں صرف ''انذار'' (ڈرانے) کا ذکر ہے مگر اوّل تو ایک ضد کے ذکر سے دوسری ضد خود بخود سمجھ آ جاتی ہے، جب ''انذار'' کا ذکر کیا گیا تو ''بشارت'' کی ذمہ داری خود ہی سمجھ آ گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر ڈرانے کے ساتھ خوشخبری سنانے کو بھی دعوتِ حق دینے والوں کی ذمہ داری بتایا گیا ہے، خود ہمارے آقا ﷺ جنہیں یقیناً داعیِ اعظم ہونے کا شرف حاصل ہے، انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے بشیر اور نذیر دونوں ناموں سے پکارا ہے۔

{۲۵۳} ترمذی ۲، ابواب العلم، باب فضل العلم/صفحہ ۹۳، بخاری ۱/ صفحہ ۱۶ باب من یّرد اللہ بہ خیرا یفقّھہ فی الدّین

{۲۵۴} ابوداؤد ۲/باب فی فضل العلم/صفحہ ۱۵۷

{۲۵۵} ابنِ ماجہ، مقدمہ، صفحہ ۲۰

صرف ''انذار'' کے ذکر پر اکتفا کی وجہ یہ بھی ہے کہ پوری دنیا کے اہلِ علم اور اربابِ عقل خواہ ان کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے، ان کا اتفاق ہے کہ دفعِ مضرت یعنی نقصان سے بچنا مقدم اور اہم ہے جلبِ منفعت یعنی فوائد حاصل کرنے سے، عام کاروباری انسان بھی نفع کے حصول سے زیادہ نقصان سے بچنے کی تدبیروں پر زیادہ توجہ دیتا ہے، انذار میں بھی زیادہ زور دنیا اور آخرت کو تباہ کرنے والے کاموں سے بچنے پر دیا جاتا ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کا ہے کہ اردو کا لفظ ''ڈراوا'' عربی لفظ ''انذار'' کے ترجمے کا حق تو کیا ادا کرے گا بعض سننے والوں کے لیے غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے وہ محبت کرنے والے والدین اور چور اچکے کے ڈرانے کو ایک ہی پلڑے میں رکھ دیتے ہیں جبکہ ان کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے، حالانکہ ماں باپ کے دل میں اولاد کی محبت کی بھی کیا حقیقت ہے اس محبت کے مقابلے میں جو اللہ کو اپنے بندوں سے اور اللہ کے نبی کو اپنے امتیوں سے ہے، آپ ﷺ کا ڈراوا سراسر خیر خواہی اور شفقت پر مبنی ہوتا تھا۔

حقیقت میں اس خطیب اور مقرر پر ''نذیر'' کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا جس کا دل اللہ کی رضا، اخلاص، انسانیت کی محبت اور دین کے درد سے خالی ہو، ہمارے معاشرے میں مقفع مسجع تقریر اور راگ رنگ میں ڈوبی ہوئی خطابت کا جادو جگانے والے مقرر تو بے شمار ہیں مگر دل میں رحمت و شفقت، خیر خواہی اور انسانیت کا درد رکھنے والے صاحبِ علم داعی نہ ہونے کے برابر ہیں، جو حقیقی داعی ہوتے ہیں ان کی دعوت اور تقریر آورد نہیں آمد کا شاہکار ہوتی ہے۔

حربی سیاست

﴿۱۲۳﴾

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قَٰتِلُواْ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلْكُفَّارِ وَلْيَجِدُواْ فِيكُمْ

اے ایمان والو! لڑتے جاؤ اپنے نزدیک کے کافروں سے اور چاہیے کہ ان پر معلوم ہو تمہارے

غِلْظَةً ۚ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٣﴾

اندر سختی اور جانو کہ اللہ ساتھ ہے ڈر والوں کے۔

تسہیل: اے ایمان والو! تمہارے آس پاس جو کفار ہیں ان سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تمہارے رویہ میں سختی محسوس کریں اور یہ جان لو کہ اللہ تقوٰی والوں کے ساتھ ہے ○

﴿تفسیر﴾

﴿۱۲۳﴾......سابقہ آیات میں کفار کے ساتھ جہاد کی ترغیب تھی، یہاں اس کی تفصیل ہے کہ کفار تو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں بیک وقت پوری دنیا کے مشرکوں اور کافروں کے ساتھ جہاد کرنا ممکن نہیں، جنگی مصلحت اور حربی سیاست کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بیک وقت سارے محاذوں پر جنگ نہ چھیڑی جائے، حملہ آور کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اس کے لیے ایک ہی وقت میں متعدد محاذوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے جہاد میں اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا، پہلے مکّہ والوں سے قتال کیا، پھر اہلِ عرب سے، پھر یہ جنگ رومیوں کی طرف منتقل ہوگئی، اس کے بعد آپ کے صحابہ مصر اور عراق میں داخل ہو گئے۔

دعوت و تبلیغ میں بھی اسلام نے ''الأقرب فالأقرب'' کی ترتیب کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے یعنی پہلے قریب ترین عزیزوں کو دعوت دی جائے پھر اس کے دائرے کو وسیع کیا جائے، چنانچہ حضور اقدس ﷺ کو پہلے حکم دیا گیا:

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ {۲۵۶} ''سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے''

اس کے بعد حکم نازل ہوا:

وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا {۲۵۷} ''ہم نے قرآن اس لیے نازل کیا ہے تا کہ تم اہلِ مکّہ کو اور ان کو جو اس کے چاروں طرف ہیں ڈراؤ''

اس کے بعد یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ {۲۵۸} ''عنقریب تمہیں ایک سخت جنگجو قوم کے ساتھ لڑائی کے لیے بلایا جائے گا، یا تو تم ان سے جنگ کرتے رہو گے یا وہ اسلام لے آئیں گے''

پھر آگے چل کر اس آیت کے ذریعے پوری دنیا تک دعوت کے دائرہ کو وسیع کر دیا گیا:

أُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ {۲۵۹} ''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تا کہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی اور ان تمام انسانوں کو ڈراؤں جن تک یہ پہنچے''

{۲۵۶} شعراء ۲۶/۲۱۴

{۲۵۷} انعام ۶/۹۲

{۲۵۸} الفتح ۴۸/۱۶

{۲۵۹} الانعام ۶/۱۹

یہ آیتِ کریمہ اسلامی دعوت کو زمان ومکان کی حد بندیوں سے آزاد کرتی ہے۔

﴿وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً﴾ حربی سیاست اور مصلحت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ مسلمان میدانِ جنگ میں ایسا رویہ اختیار کریں جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ قوت وشجاعت، صبر واستقامت اور حمیت وغیرت جیسی صفات سے متصف ہیں اور ان کے دل میں کفروشرک اور ظلم وستم کے علمبرداروں کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے، اپنے آپ کو بہادر اور طاقتور ظاہر کرنے کے لیے اسلام نے مسلمانوں کو اکڑ کر چلنے کی بھی اجازت دی ہے اور رجزیہ اشعار پڑھنے، اپنی بہادری بیان کرنے اور نعرہ بازی کو بھی جائز رکھا ہے، میدانِ جنگ میں روایتی قسم کی صوفیت اور تواضع کفار کو دلیر کر سکتی ہے۔

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ تقویٰ والوں کو اللہ کی معیت اور نصرت حاصل ہوتی ہے، جو صلح ہو یا جنگ، مسجد ہو یا میدانِ جہاد ہر جگہ اور ہر شعبہ میں اللہ کے حکموں کی اتباع کرتے اور اس کے منع کیے ہوئے کاموں سے بچتے ہیں۔

حکمت وہدایت

۱......دعوت اور جہاد میں ''الأقرب فالأقرب'' کے اصول کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ پوری دنیا کی اصلاح کی فکر ہو مگر اپنے گھر اور خاندان کی کوئی فکر نہ ہو۔

۲......دعوت وتبلیغ میں حکمت وموعظت اور محبت وشفقت کا اسلوب مناسب ہے تو میدانِ جنگ میں سختی اور قوت وشجاعت کا اظہار مصلحت کا تقاضا اور اللہ کا حکم ہے۔

۳......تقویٰ صرف خشوع خضوع کا نام نہیں ہے بلکہ کفار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جانا بھی تقویٰ ہے اور ایسے ہی متقیوں کو اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ (۱۲۳)

قرآن کے بارے میں منافقین کا موقف

﴿۱۲۴......۱۲۷﴾

وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو بعضے ان میں کہتے ہیں کس کا تم میں سے زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان؟

الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٢٤﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ

سو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان اور وہ خوش وقت ہوتے ہیں۔

فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَتۡہُمۡ رِجۡسًا اِلٰی رِجۡسِہِمۡ وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

اور جن کے دل میں مرض ہے سو ان کے لئے بڑھا دی گندگی پر گندگی اور وہ مرنے تک کافر ہی رہے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ وہ

اَوَ لَا یَرَوۡنَ اَنَّہُمۡ یُفۡتَنُوۡنَ فِیۡ کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوۡ مَرَّتَیۡنِ ثُمَّ لَا یَتُوۡبُوۡنَ

آزمائے جاتے ہیں ہر برس میں ایک بار یا دو بار؟ پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ وہ نصیحت پکڑتے ہیں۔

وَ لَا ہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذَا مَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ نَّظَرَ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ ؕ ہَلۡ یَرٰىکُمۡ

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو دیکھنے لگتا ہے ان میں ایک دوسرے کی طرف کہ کیا دیکھتا ہے تم کو کوئی مسلمان؟ پھر

مِّنۡ اَحَدٍ ثُمَّ انۡصَرَفُوۡا ؕ صَرَفَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

چل دیتے ہیں، پھیر دیئے ہیں اللہ نے دل ان کے اس واسطے کہ وہ لوگ ہیں کہ سمجھ نہیں رکھتے۔

ربط: منافقین کے برے اعمال اور قبیح خصلتوں میں سے ایک اور خصلت یہاں بیان کی جارہی ہے یعنی قرآنِ کریم کا استہزاء اور اس کے سماع سے فرار۔

تسہیل: اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو بعض منافق غریب مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ اس سورت کی وجہ سے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ ہوا ہے؟ انہیں بتا دیجیے کہ اہلِ ایمان کے ایمان میں تو بہر حال اضافہ ہوتا ہے اور وہ اس پر خوش بھی ہوتے ہیں O مگر جن لوگوں کے دل میں نفاق کی بیماری ہے ان کی نجاست میں نئی سورت کی وجہ سے ایک اور نجاست کا اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ حالتِ کفر ہی میں مرجاتے ہیں O کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ انہیں ہر سال ایک یا دو بار کسی نہ کسی آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے؟ اس کے باوجود نہ تو یہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں O جب کوئی نئی سورت نازل کی جاتی ہے تو یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں کہ کہیں تمہیں کوئی مسلمان دیکھ تو نہیں رہا؟ پھر چپکے سے کھسک جاتے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دل ایمان سے پھیر دیے ہیں کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں O

تفسیر

﴿۱۲۴﴾...... جب قرآنِ کریم کی کوئی سورت نازل ہوتی تو وہ استہزاء {۲۶۰} کے طور پر غریب مسلمان سے سوال کرتے کہ اس سورت کی وجہ سے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ ہوا ہے یعنی تم میں سے کون ہے جو قرآن، اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر یقین رکھتا ہے کیونکہ قرآنِ کریم کی ہر سورت حقیقت میں ہمارے آقا ﷺ کی

{۲۶۰} انکارًا واستھزاء بالمؤمنین۔ (کشاف ۲/۳۱۰)

صداقت کا معجزہ تھی اور ہے، جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی تو آپ کی صداقت کے دلائل میں ایک اور دلیل کا اضافہ ہوجاتا۔

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ نزولِ قرآن میں زیادتی سے اہلِ ایمان کی ایمانی کیفیات یعنی یقین، قلبی اطمینان اور تقرب الی اللہ میں اضافہ ہوجاتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ وہ قرآن کے نزول اور ایمانی کیفیات میں زیادتی پر خوشی بھی محسوس کرتے تھے۔

﴿۱۲۵﴾...... جن کے دلوں میں شک اور نفاق کی نجاست ہے ان کی نجاست میں ہر سورت کے نزول کے ساتھ اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہ نجاست ان پر یوں مسلط ہوجاتی ہے کہ وہ موت تک اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرپاتے۔

﴿۱۲۶﴾...... کیا یہ منافق جانتے نہیں ہیں کہ انہیں ہر سال مختلف آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ جن سے اگر نصیحت حاصل کریں تو یہ حق اور باطل میں فرق کرسکتے ہیں، آئے نہ آئے دن کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ، معجزہ اور حادثہ پیش آتا ہی رہتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی صداقت، مسلمانوں کے غلبہ اور منافقوں اور کافروں کی ذلت و رسوائی کا شاہدِ عدل ہوتا ہے۔

﴿ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ﴾ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ معجزات اور حوادث انہیں شک کی بیماری سے نجات دینے کا ذریعہ ثابت ہوتے مگر انہیں نہ تو توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی ابتلاء سے سبق حاصل کرتے ہیں۔

﴿۱۲۷﴾...... پہلے ان منافقوں کا حال بیان کیا گیا تھا جو دوسروں سے کوئی نئی سورت سنتے تھے اور اس کی تاثیر کے بارے میں سوال کرتے تھے اور اس آیت میں ان منافقوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو نزولِ قرآن کے وقت حضورِ اکرم ﷺ کی مجلس میں موجود ہوتے تھے، {۲۶۱} یہ کفر و نفاق میں پہلے والوں سے بھی زیادہ سخت تھے، یہ آپ کی مبارک زبان سے قرآن سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے حالانکہ آپ کی تلاوت سے بڑے بڑے سنگدل بھی موم ہوجاتے تھے، اسی لیے مشرک پورا زور لگاتے تھے کہ کوئی شخص آپ سے براہِ راست قرآن نہ سنے، وہ جانتے تھے کہ جس نے سن لیا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔

جب منافقوں کی موجودگی میں کوئی سورت نازل ہوتی اور مسلمان شدتِ ادب اور تاثیر کی وجہ سے سر جھکائے ہوتے تو یہ ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے، اشاروں ہی اشاروں میں مشورہ کرتے اور چپکے سے کھسک جاتے۔

﴿قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ﴾ اللہ فرماتے ہیں کہ منافق ایسی قوم ہیں جو قرآنِ کریم میں تدبر نہ کرنے، اس کے

{۲۶۱} وھم فی مجال تبلیغ الوحی۔ (ابی سعود ۳/۲۰۳)

معانی سے اعراض کرنے اور استہزاء کی وجہ سے فطری سمجھ بوجھ سے محروم ہو چکے ہیں اس لیے اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ہدایت اور ایمان سے پھیر دیا ہے۔

حکمت وہدایت

۱......ایمانی کیفیات میں کمی بیشی ممکن ہے، نزولِ قرآن کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا تھا اور آج بھی ایسا ہوتا ہے، ہمارے سامنے جب ایسی جدید تحقیقات آتی ہیں جو قرآنی حقائق کی تائید کرتی ہیں تو الحمدللہ ہماری ایمانی کیفیات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

۲......ایمان اور نیک اعمال کی توفیق ملنے پر خوش ہونا جائز ہے۔(۱۲۴)

۳......کفریہ اور منافقانہ اعمال کی وجہ سے کفر ونفاق کی نجاست میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔(۱۲۵)

۴......قرآنِ کریم کا مذاق اڑانے والے اگر توبہ نہ کریں تو ان کی موت کفر پر واقع ہوتی ہے۔(۱۲۵)

۵......اللہ کی طرف سے نافرمان انسانوں پر مصائب وآلام آتے ہیں تاکہ وہ توبہ کریں۔(۱۲۶)

۶......ایمان کی دعوت دینے والے اسباب میں سب سے مؤثر قرآنِ کریم ہے، مگر بعض ایسے بدنصیب ہوتے ہیں جو اس کے سماع اور اس میں غور وتدبّر کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے اللہ نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا {۲۶۲} ''کیا یہ قرآنِ کریم میں غور وفکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟''

اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو دائمی طور پر ہدایت سے محروم کر دیتے ہیں۔(۱۲۷)

رسولِ اکرم ﷺ کی پانچ صفات

﴿۱۲۸......۱۲۹﴾

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ

آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا، بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے، حریص ہے تمہاری بھلائی پر، ایمان والوں پر

رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ

نہایت شفیق مہربان ہے۔ پھر بھی اگر منہ پھیریں تو کہہ دے کہ کافی ہے مجھ کو اللہ، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اسی پر میں

{۲۶۲} محمد ۴۷/۲۴

وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾

نے بھروسہ کیا اور وہی مالک ہے عرشِ عظیم کا۔

ربط: اس سورت میں مشرکین سے برأت، منافقین کی مذمت اور جہاد جیسے پُرخطر عمل کی اہمیت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے اس عظیم انعام کا ذکر فرمارہے ہیں جو انہوں نے حضرت خاتم النبیین ﷺ کی بعثت کی صورت میں عام انسانوں پر عموماً اور عربوں پر خصوصاً کیا، آپ کی تشریف آوری عربوں کے لیے بھی عز و شرف کا باعث ہے اور عالمِ انسانی کے لیے بھی، آپ کی صفاتِ عالیہ کا تقاضا ہے کہ آپ جہاد کا حکم دیں یا کسی دوسرے عمل کا، اسے بسرو چشم قبول کیا جائے اس لیے کہ آپ کی سیرت گواہ ہے کہ آپ انسانوں پر بے حد شفیق اور ان کی دنیوی اور اخروی کامیابی کے شدید حریص تھے۔

تسہیل: تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آچکے ہیں جن پر تمہارا تکلیف اور مشقت میں پڑنا گراں گزرتا ہے، وہ تمہارے ایمان کے بڑے حریص اور ایمان والوں کے لیے سراپا شفقت و رحمت ہیں O اس کے باوجود اگر وہ روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے O

تفسیر

﴿۱۲۸﴾...... اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں اہلِ عرب {۲۶۳} سے خطاب ہے جیسا کہ سورۃ الجمعہ میں ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ {۲۶۴} ''وہی ہے جس نے امیوں میں رسول بھیجا خود انہی میں سے''

اہلِ عرب کو اپنے حسب نسب پر بڑا ناز تھا اور وہ غیرِ عرب کی اطاعت کو اپنے لیے ننگ و عار کا باعث سمجھتے تھے، اللہ کے آخری نبی کا عربوں میں سے ہونا ان پر بہت بڑا احسان بھی تھا اور ان پر واضح حجت بھی۔

صحیح مسلم میں واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے رسولِ اکرم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے:

{۲۶۳} أی من جنسکم۔ (روح المعانی ۷، الجزء الحادی عشر/۸۲، من جنسکم عربی مثلکم۔ (بیضاوی ۳/۱۸۱)

{۲۶۴} الجمعۃ ۶۲/۲

﴿ان اللہ اصطفٰی کنانۃ من ولد اسمٰعیل واصطفٰی قریش من کنانۃ واصطفٰی من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم﴾ {۲٦۵}

''اللہ تعالیٰ نے اولادِ اسمٰعیل میں سے کنانہ کو برگزیدہ کیا اور بنو کنانہ میں سے قریش کو برگزیدہ کیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو برگزیدہ کیا اور بنو ہاشم میں سے مجھے برگزیدہ فرمایا''

اہلِ عرب میں سے ہونے کے باوجود آپ کی نبوت سارے انسانوں کے لیے تھی، جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ آپ کی دعوت ''الأقرب فالأقرب'' کے اصول پر مبنی تھی، عرب آپ کی دعوت پر براہِ راست ایمان لائے پھر عربوں کی دعوت سے عجم کو ایمان قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں سارے عالم سے خطاب ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ رسول ہونے کے باوجود جنسِ بشر ہی سے ہیں کیونکہ اگر آپ ملائکہ یا کسی دوسری مخلوق کی جنس سے ہوتے تو جنس ایک نہ ہونے کی وجہ سے استفادہ محال ہو جاتا۔ سورۂ یونس کی درجِ ذیل آیت سے اس دعوٰی کی تائید ہوتی ہے:

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ {۲٦٦}

''کیا لوگوں کے لیے یہ بات باعثِ تعجب ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص کی طرف وحی بھیجی ہے؟''

﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ ''تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے''

حضورِ اکرم ﷺ کی یہ صفت کفار اور مؤمنین دونوں کے حق میں تھی، آپ کسی بھی انسان کو نہ دنیا میں ذلیل دیکھنا چاہتے تھے نہ آخرت میں، آپ کی چاہت تو یہ تھی کہ ساری نسلِ انسانی ایمان قبول کرکے دنیا میں بھی عزت حاصل کرے اور آخرت میں بھی، آپ جب دیکھتے تھے کہ کفار اور مشرکین ہلاکت کے گڑھے کی طرف بڑھ رہے ہیں تو آپ کو شدید رنج ہوتا تھا۔ سورۂ کہف میں ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا {۲٦۷}

''ایسا لگتا ہے کہ اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائے تو آپ غم کی وجہ سے اپنی جان ہی کو ہلاکت میں ڈال لیں گے''

دنیاوی اعتبار سے بھی آپ سے کسی کی تکلیف اور پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی، بدر کے قیدیوں کو جب رسیوں میں جکڑ کر مدینہ لایا گیا تو ان کے کراہنے کی آواز سن کر آپ بے چین ہوگئے اور اس وقت تک آپ کو چین نہیں آیا

{۲٦۵} صحیح مسلم جلد ۲، کتاب الفضائل، باب فضل لنسب النبی ﷺ / صفحہ ۲۴۵

{۲٦٦} یونس ۱۰/۲

{۲٦۷} الکہف ۱۸/٦

جب تک کہ ان کے بندھن کھول نہیں دیئے گئے، حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلسل تیرہ سال تک مسلمانوں کو تختۂ مشق بنائے رکھا تھا۔

﴿حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ﴾ حضور اکرم ﷺ اپنی قوم کی ہدایت، مسلمانوں کی ثابت قدمی اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے شدید حریص تھے، سورۂ نحل میں ہے:

إِنْ تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ {۲۶۸} ''اگر چہ آپ ان کی ہدایت کی حرص رکھتے ہیں''

سورۂ یوسف میں ہے:

وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ {۲۶۹} ''اگر چہ آپ حرص رکھتے ہیں مگر انسانوں کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں''

نہ آپ کو دولت کی حرص تھی، نہ عہدہ و منصب اور شہرت و عزت کی بلکہ آپ کو اگر حرص تھی تو صرف یہ کہ دنیا میں رہنے والے سارے انسان اللہ کے فرمانبردار بندے بن جائیں۔

قریش کے سردار عتبہ نے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا میرے بھتیجے! جو دین تم لائے ہو اگر اس سے تمہارا مطلب مال و دولت ہے تو ہم یہ دولت تمہارے لیے اتنی اکٹھی کر دیں گے کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے، اگر عزت اور ناموری چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار تسلیم کر لیں گے اور کوئی فیصلہ تمہاری مرضی کے بغیر نہیں کریں گے، اگر بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تم کو بادشاہ بنا لیں گے، اگر آسیب اور جن وغیرہ کے اثر سے یہ بات ہے جس کا علاج تمہارے پاس نہیں ہے تو ہم اس کے لیے معالجین فراہم کر سکتے ہیں اور اس پر پوری فیاضی سے اپنا مال خرچ کر سکتے ہیں یہاں تک کہ تم کو اس سے شفاءِ کامل حاصل ہو جائے۔

جب عتبہ سب کہہ چکا تو آپ نے فرمایا مجھے نہ سیم و زر کی ضرورت ہے نہ ریاست و حکومت کی ضرورت ہے، میں تو رب العالمین کا پیغام لے کر آیا ہوں اور اسے ہر سننے والے کان تک پہنچانا میرا مقصدِ زندگی ہے، پھر عتبہ کو سورۂ فصلت کی کچھ آیات سنائیں جنہیں سن کر اگر چہ اس نے ایمان تو قبول نہ کیا مگر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماءِ حسنیٰ اور مبارک صفات میں سے دو صفتوں کے ساتھ ہمارے آقا ﷺ کو متصف فرمایا ہے، یہ بہت بڑا اعزاز اور آپ کی حرمت و تکریم کا موجب ہے۔

{۲۶۸} النحل ۱۶/۳۷

{۲۶۹} یوسف ۱۲/۱۰۳

﴿رَءُوفٌ﴾ مبالغہ کا اور ''رَحِيمٌ'' صفتِ مشبّہ کا صیغہ ہے، مبالغہ میں کثرت اور کمال اور صفتِ مشبّہ میں دوام اور ثبات کا معنی پایا جاتا ہے لہٰذا رؤف سے آپ کی شفقت کے کمال اور رحیم سے آپ کی رحمت کے دوام کی طرف اشارہ ہے مومنوں کے لیے بھی شکر و مسرت کا مقام ہے کہ آقا کی رافت بھی انہی کے لیے ہے اور رحمت بھی انہی کے لیے۔

شفقت و محبت کا یہ عالم تھا کہ بارہا ایسا ہوا کہ ساری ساری رات امت کے حق میں دعا کرتے ہوئے گزر جاتی، چھوٹے بچوں کو پیار کرتے، انہیں اپنی سواری پر آگے پیچھے سوار کر لیتے، نماز کی حالت میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز ہلکی فرما دیتے تاکہ ماں بچے کو جلد سنبھال سکے۔ مختصر یہ کہ محبت آپ کی زندگی کا جلی عنوان تھا تو رحمت آپ کی سیرت کا حسن، اللہ نے آپ کو 'رحمۃ للعالمین' قرار دیا اور یہ موقع نہیں کہ ہم آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے پر تفصیلی بحث کریں۔

﴿۱۲۹﴾...... پہلے امت سے خطاب تھا تو اب امت کے پیغمبر سے خطاب ہے کہ اگر وہ لوگ ایمان قبول کرنے سے انکار کریں جنہیں آپ دعوتِ توحید دے رہے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے۔

بندوں کو اللہ کے سوا کوئی بھی کافی نہیں ہو سکتا، سورۂ زمر میں ہے:

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ {۲۷۰} ''کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟''

عام مومن کی شان بھی یہی ہونی چاہیے کہ وہ دل میں بھی یہ یقین رکھے اور زبان سے بھی کہے ﴿حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے'' تو انبیاء کرام علیہم السلام جو کہ توحید و توکل اور ایمانی صفات میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں ان کے دل میں اللہ کے کافی ہونے کا یقین دوسروں سے کہیں زیادہ ہوگا۔

﴿لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں دعا اور استعانت کے لیے صرف اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میں صرف اسی پر توکل کرتا ہوں۔

﴿وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ میں اس پر کیسے توکل نہ کروں جبکہ وہ اس مرکز کا مالک ہے جہاں سے مخلوق کے سارے معاملات کی تدبیر ہوتی ہے۔ سورۂ یونس میں ہے:

{۲۷۰} الزمر ۳۹/۳۶

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ {۲۷۱} ''پھر وہ عرش پر قائم ہوگیا، تمام معاملات کی تدبیر کرتا ہے''۔

عرش کی عظمت حقیقت میں رب کی عظمت کی وجہ سے ہے جو اس پر قائم ہوا، ہم نہ تو عرش کی حقیقت جانتے ہیں اور نہ ہی اس پر قائم ہونے کی مگر اس پر ایمان ضرور رکھتے ہیں۔

''الْعَرْشِ''، مخلوقات میں سے سب سے بڑی مخلوق ہے، ساری مخلوق اس میں داخل ہے، عرش کے رب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ساری مخلوق کا رب ہے۔

حکمت وہدایت

۱......ہمارے آقا ﷺ دیگر صفات کے علاوہ پانچ ایسی صفات سے متصف تھے جو سارے انسانوں کو عموماً اور عربوں کو خصوصاً آپ پر ایمان لانے، آپ سے محبت کرنے اور آپ کے شریکِ غم ہونے کی دعوت دیتی ہیں۔(۱۲۹)

۲......اگر انسان آپ کی دعوت ونصرت سے اعراض کریں گے تو بھی آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ اللہ آپ کی حمایت اور حفاظت کے لیے کافی ہے۔(۱۳۰)

۳......بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی مذکورہ دو آیات سب سے آخر میں نازل ہوئی تھیں۔{۲۷۲}

۴......حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص صبح شام یہ کلمات سات مرتبہ پڑھے گا، اللہ پریشانی سے اس کی حفاظت فرمائے گا خواہ وہ کیسی ہی پریشانی کیوں نہ ہو۔

﴿حسبی اللہ لا الہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم﴾{۲۷۳}

{۲۷۱} یونس ۱۰/۳

{۲۷۲} عن أبی ھریرۃ أن آخرما نزل ھاتان الآیتان۔ (ابی سعود ۳/۲۰۴)

{۲۷۳} ابوداؤد ۴/۳۲۱، زادالمعاد ۲/۳۷۶ بحوالہ حصن المسلم من اذکار الکتاب والسنّہ/صفحہ ۴۳